بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

قُلۡ سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ

''فرما دیجیے تم زمین میں سیر و سیاحت کرو'' (سورۃ الانعام:۱۱)

مصنف کی دیگر تصانیف

فرشتے کی ایف آئی آر (حصہ اول) (سال اشاعت 2011ء)

مشرق کا موتی حوروں کا مسکن (سال اشاعت 2021ء)

مصنف کی زیرِ تصنیف کتب:

1۔ فرشتے کی ایف آئی آر (حصہ دوئم)

2۔ حسینائیں (قدرت کا انعامِ عظیم)

3۔ Angel in Hell

4۔ افسروں میں انسان، انسانوں میں افسر
(فرشتہ صفت انسانوں اور چھوٹے فرعونوں میں موازنہ)

5۔ فروٹ، سبزیوں اور جڑی بوٹیوں کے فوائد (نام زیرِ تجویز ہے)

قومِ قوسِ قزح

جہانِ حیرت میں سیاحت وسوداگری

مصنف:

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب

E-mail: eenets@yahoo.com

Whats-app: +92-300-8800265

نظارگی میرے احوال کی ہے اور کہیں
یہاں تو بس میرے احوال کا تماشہ ہے
(شاہد ماکلی)

اس کتاب کا کوئی بھی حوالہ یا حصہ، مصنف کی اجازت کے بغیر
الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا میں شائع نہیں کیا جا سکتا

قانونی مشیران:

جمشید احمد فیض
(سینئر ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان)

محمد طاہر سعید رامے
(ایم اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : قومِ قوسِ قزح - جہانِ حیرت میں سیاحت و سوداگری
مصنف : ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب
کمپوزنگ : اے اقبال M.Phil (Physics)
ٹائٹل ڈیزائن: عمران شنادر
پروف ریڈنگ: رضیہ ادریس .MLIS + B.Ed
خاص شکریہ: محمد سالار الٰہی
اشاعت : اپریل 2022ء
تزئین و اہتمام: حسن محمود عباسی
مطبع : حاجی منیر پرنٹرز، لاہور
تعداد : 1000
قیمت : Rs. 1500 /-
بیرون ملک: 50 USD

ISBN: 978-969-544138-1

نستعلیق مطبوعات: F-3 فیروز سنٹر غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
0300-4489310 / 0331-4489310
E-mail: nastalique786@gmail.com

انتساب

محترمہ بلقیس حمید

کے نام

جس کی درازی عمر اور اچھی صحت کے لیے

سانس سانس دعا گو رہتا ہوں

دنیا کا سب سے خوبصورت پھول اپنوں کی محبت کا ہوتا ہے اور اپنے وہ نہیں ہوتے جو خون کے رشتے میں ہوں اپنا ہر وہ فرد ہے جسے آپ کا خیال اور احساس ہو۔ کیونکہ زمانہ سب سے بڑا اُستاد ہے۔ بقول شاعر:

توبہ کی اُمید پر ہو چکے بہت گناہ یارب

مہلت تو مل رہی ہے توفیق بھی عطا کر

سامنے منزل تھی اور پیچھے اس کی آواز

رُکتا تو سفر جاتا

چلتا تو بچھڑ جانا

مے خانہ بھی اسی کا تھا، محفل بھی اس کی

اگر

پیتا تو ایمان جاتا

نہ پیتا تو صنم جاتا

سزا ایسی ملی مجھ کو، زخم ایسے لگے دل پر

چھپاتا تو جگر جاتا، سناتا تو بکھر جاتا

ہم لوگ تو مئے نوش ہیں بدنام ہیں ساغرؔ

پاکیزہ جو ہیں لوگ وہ کیا کیا نہیں کرتے

(ساغر صدیقی)

فہرست

✧ عرضِ مصنف		9
✧ Preface	مسٹر جسٹس فرخ محمود ملک	12
✧ احسان رانا کے ساگر سے چند قطرے	احسان رانا	13
✧ تاثراتِ احسان	احسان رانا	15
✧ فسوں کار	پروفیسر قدرت اللہ شہزاد	18
✧ فکر و خیال	پروفیسر قدرت اللہ شہزاد	21
✧ خیالِ رانا اور آداب	پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد رانا	22
✧ باغِ عدن	پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد رانا	23
✧ افریقہ کا سیاحت نامہ	پروفیسر محمد اکبر خان اکبر	24
✧ جداگانہ اسلوب والا مصنف ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب	پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد عاطش	26
✧ ''وسعت اور مشاہدہ''	پروفیسر ریاض احمد میاں	29
✧ پرورشِ لوح و قلم	پروفیسر نگہت ارشاد	30
✧ شفیق مصنف	سعد عباس عاجز	31
✧ Drifting	کرنل امین بدھ	33
✧ حیران کن شخصیت کی سحر انگیز تصانیف	نذیر خالد	34
✧ خیال اور تعارف	پنوں زادہ شاد	38
① باب 1: نائیجیریا (1981)		39
② باب 2: نیروبی۔ کینیا (1990ء)		71
③ باب 3: ہرارے (زمبابوے) (1990)		89
④ باب 4: بوٹسوانہ اور ساؤتھ افریقہ (1991)		107

⑤ باب5: بوٹسوانہ ٹریڈ فیئر (1991) 139

⑥ باب6: بوٹسوانہ ساؤتھ افریقہ (رینڈ ایسٹر شو آف جوہانسبرگ 1992) 165

⑦ باب7: ماریشس (1992) 219

⑧ باب8: آخری کوشش (1993) 237

⑨ باب9: ایتھوپیا (2000) 287

⑩ باب10: ٹوگو (2000) 303

⑪ باب11: توجہ فرمائیں مجھے کچھ کہنا ہے 319

عرضِ مصنف

''قومِ قوسِ قزح''۔۔۔ افریقی ممالک کی سیاحت اور سوداگری کے تجربات پر مبنی تصنیف

میں نے افریقہ میں جو دیکھا، محسوس کیا اور جو مجھ پر گزری وہ میں نے بلا کم و کاست بیان کر دی۔ یہ کتاب نہ افسانہ ہے نہ ہی اس میں کوئی فرضی کردار ہے بلکہ یہ میری زندگی کے رنگین و سنگین تجربوں کا مجموعہ ہے۔ افریقہ کے کئی نام ہیں جیسے:

1. Cradel of Mankind
2. The land of Ham (Ham means dark skin)
3. Mother of Mankind

ساؤتھ افریقہ مختلف اقوام کا مسکن ہے اس لیے اس ملک کو "Rainbow Nation" کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اسی طرح بوٹسوانہ کو بھی دنیا "Gem of Africa" کے نام سے پکارتی ہے۔ دیگر افریقن ممالک میں کینیا بھی شامل ہے جو Hebrew زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں ''Animal Horn''۔ Hebrew کو عبرانی زبان بھی کہتے ہیں۔ توریت شریف اسی زبان میں نازل ہوئی تھی۔ Lesotho کو The Kingdom in the sky کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

اس تصنیف میں بہت سے کرداروں کے نام احتراماً نہیں لکھے گئے اور فرضی نام اور کہانیاں لکھنا مجھے پسند نہیں کیونکہ خاندانی لوگوں کا وقت بدلتا ہے معیار نہیں جبکہ بدنسلوں کی قسمت بدلتی ہے اوقات نہیں۔ ہم اپنی نوجون نسل کو انہی فرضی قصے کہانیوں کی وجہ سے کتاب سے دور، دور اور بہت دور کر چکے ہیں۔ اب وہ کتاب کا نام لینا بھی گوارہ نہیں کرتے۔ ہم ویاگرا تو لاکھوں روپے کی منگوا کر ہضم کر چکے ہیں۔ سرکاری حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر مزے کیے گئے مگر کہانی ایک بھی جنم نہ لے سکی۔ نہ ہم نے ایڈونچر لکھا، نہ شکاریات، نہ رومانس نہ ہی معاشرتی کہانیاں لکھیں۔ گلی محلوں سے نکل کر گلبرگ، ڈیفنس اور دیگر پوش آبادیوں میں بسنے والے لکھاری اپنا کلچر اور اس کی کہانیاں بھی بھول گئے ہیں۔ میری تمام لکھاریوں سے گذارش ہے کہ نوجوان نسل کے لیے کچھ ایسا لکھیں کہ یہ

بچے کتاب کی طرف واپس آئیں اور انٹرنیٹ کو شکست ہو سکے۔ آپ لوگ جو بڑے بڑے رائٹرز کے طور پر جانے جاتے ہیں اپنی Face value اور سرکاری حیثیت کی وجہ سے اپنی کتاب تو فروخت کر لیتے ہیں لیکن اس کتاب کو نوجوان نسل جس کی ہمارے ملک میں اکثریت ہے ہاتھ بھی نہیں لگاتی۔ مجھ جیسے لوگوں کو اپنی کتاب قربانی کے گوشت کی طرح بانٹنے کی وجہ سے پزیرائی ملتی ہے۔ اللہ کے واسطے نوجوانوں کا سوچیں، ملک کی اکثریت کا سوچیں۔ اپنے ملک کو کچھ تو صلہ دیں۔

آپ کے زیرِ مطالعہ کتاب کے باب نمبر 8 میں ایک بینکر خاتون کا ذکر کئی بار آیا ہے جس کو بینکر یا دوست کہہ کر لکھا اور پکارا گیا ہے۔ کچھ احباب کا مشورہ ہے کہ اس کا نام ضرور لکھیں چاہے فرضی ہی ہو۔ فرضی کچھ بھی لکھنا میں گناہ تصور کرتا ہوں اس لئے اس کا نام اور نام کا مطلب بھی لکھے دیتا ہوں۔ "Valeria" یہ ایک Latin لفظ ہے جس کا مطلب ہے Strong and brave۔ وہ واقعی ایک مضبوط قوتِ ارادی کی مالک خاتون تھی۔ آج کل امریکہ کی بہت بڑی بزنس Icon ہے بلکہ مشہور سماجی اور سیاسی شخصیت بھی ہے۔ اسی کتاب کے باب نمبر 1 میں ڈاکٹر کرسٹینا کا ذکر ہے۔ اپنے ساؤتھ افریقہ قیام کے دوران مسلم سکالرز ڈاکٹر احمد دیدات اور ڈاکٹر یوسف دیدات کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا۔ ایک بار بہت جلدی میں تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ استفسار پر فرمانے لگے آج شام کی فلائیٹ سے منیلا (فلپائن) ایک مسلم سکالر اور بہت نیک خاتون کے جنازے میں شرکت کے لیے جا رہا ہوں۔ بس تم اتنا سمجھ لو کہ فلپائن میں مسلمانوں کی ماں اور اللہ تعالیٰ کی ولی فوت ہوگئی ہے۔ میں نے تفصیل پوچھنا چاہی تو بولے۔۔۔ ڈاکٹر کرسٹینا! میں نے تڑپ کر پوچھا جو پہلے کرسچن تھی اور Jos (نائیجیریا) سے مسلمان ہو کر آئی تھی؟ مگر میں اپنی چشمِ نم کو ڈاکٹر دیدات سے پوشیدہ نہ رکھ سکا۔

مولانا محمد عمر پالم پوریؒ بھارت سے زمبابوے تشریف لائے تو مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ میں نے پاکستان کے تبلیغی لوگوں کی سچائی اُن کے سامنے رکھتے ہوئے کچھ سوالات کئے مگر بدقسمتی سے انہوں نے جواب نہ دیا۔ اس کی تفصیل اپنی زیرِ تصنیف کتاب '' فرشتے کی ایف آئی آر۔ جلد دوئم'' میں پیش کروں گا۔

آج کل پاکستانی قوم کائی قبیلے کی وطن پرستی اور ایک قبیلے کو بہت بڑی سلطنت میں بدلتے روزانہ TV پر دیکھ رہی ہے۔ اسی سلطنتِ عثمانیہ نے بہت عرصے تک دنیا پر حکومت کی۔ وطنِ عزیز میں لوگ کائی قبیلے کو دیکھ رہے ہیں جبکہ '' کھائی'' قبیلہ ملک لوٹ کر فرار ہو چکا ہے اور باقیات بھولے بھالے لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہے کہ ہم نے دھیلے کی کرپشن نہیں کی۔ دوسری طرف رُسوائی قبیلہ سندھ کارڈ کھیلتا ہے اور افہام و تفہیم کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ بس کرپشن اور اثاثوں کا حساب نہیں دیتا اور بھولے بھالے لوگ ہر الیکشن میں ان کے جھانسے میں آ جاتے ہیں کیونکہ کھائی قبیلہ اور رُسوائی قبیلہ غریب عوام کے دکھ درد میں غم زدہ رہتے ہیں اور اسی غم کی وجہ سے

ملک کولوٹ کر اپنا غم غلط کرتے ہیں۔ اندرونی طور پر یہ ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ اب تو ان کی کوکھ سے ویا گرا اور لسّی قبیلہ بھی پیدا ہو چکا ہے۔ میرے ہم وطنوں کو اپنے ذاتی مفاد کو پسِ پشت ڈال کر اُس کا انتخاب کرنا چاہئے جو وطنِ عزیز کے لیے نسیمِ سحر اور عوام کے لیے آبِ حیات ہو۔

آپ کی دلچسپی اور ٹیپ کے بند کے طور پر کچھ اعداد و شمار پیش کر رہا ہوں۔ مولویوں اور تبلیغیوں کی تعداد میں پاکستان پہلے نمبر پر ہے۔ حاجیوں میں دوسرے نمبر پر اور ایماندار ممالک کی فہرست میں 160 ویں نمبر پر ہے جبکہ ہم نور البشر معلمِ اعظم حضرت محمد ﷺ کی اُمت ہیں اور آپؐ روزِ قیامت اپنی اُمت کی بخشش کے لیے اُمتی اُمتی پکاریں گے۔

میں نے اپنی تمام تصانیف جن میں پہلی ''فرشتے کی ایف آئی آر'' ہے۔ دوسری ''مشرق کا موتی حوروں کا مسکن'' اور تیسری ''قومِ قوسِ قزح'' جو اس وقت آپ کے زیرِ نظر ہے اپنے دوست احباب کو پیش کیں۔ مہذب، ادب شناس اور باطنی طور پر تعلیم یافتہ احباب نے اپنے اپنے انداز میں میری حوصلہ افزائی فرمائی جس کے لیے میں تمام احباب کا بے حد ممنون ہوں۔ تمام احباب کی تحریریں تبصروں کی شکل میں شامل کتاب ہیں۔

حرفِ آخر بقول شاعر:

دیمک زدہ کتاب تھی یادوں کی زندگی
ہر ورق کھولنے کی خواہش میں پھٹ گیا

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب
eenets@yahoo.com
whatsapp 0300-8800265

Preface

Dr Idrees Ahmed Aftab is indeed a very fascinating and entertaining writer.

A beautifully written book, the reader does not lose interest from page one to last.

Regards

Mr. Justice (R) Farrukh Mahmood Malik

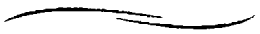

احسان رانا کے ساگر سے چند قطرے

گرامی۔منزلت۔۔۔آداب۔۔۔

آپ کی تصنیف لطیف کو باب باب۔کرن کرن اجالا خیال کیا اور لیل ونہار میں فاران سے اک روشنی دل و دماغ میں اترتی محسوس ہوئی۔۔۔پھر اک دو باب مطالعے کی زینت بنے تو پھولوں کا گلدستہ نظر میں تھا۔اس گلدستے کی حرف حرف مہکار اور شبنم کی شسکار اور باغباں کی گفتار اور کردار بھی اور اسی پھول پھول۔باب باب گل دستے میں۔۔معاشرے کی عکاسی بھی۔۔میں تو آنکھوں میں حیرانی سمیٹے ورق الٹتا پلٹتا جا رہا تھا۔۔اور تاثرات کا انمول زخیرہ بھی اٹھاے ہوے تھا۔۔۔اور اس اعتراف کے ساتھ کہ۔میں تاثرات کو تنقید کبھی نہیں کہتا۔۔کہ ہر شخص اس مقام پر کہاں

ع مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ابھی میں ڈاکٹر ادریس آفتاب کے مضامین کو ان کے اسم با مسمّٰی کے حوالے سے ہی ترتیب دے رہا تھا۔۔اور کان میں آواز آئی۔۔یہ آواز مرشد میرزا غالب کی تھی۔ع پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی۔۔۔لاریب یہ گرامی منزلت مصنف کے قلبی گداز کا اعجاز ہے کہ نشتر زنی اور لعن طعن کے بغیر معاشرتی کردار مصنف کی بطون سیرت سے ظہور میں آتے گئے۔اس تلخ وشیریں ابواب کو ابواثر حفیظ جالندھری دیکھ۔بے ساِختہ تلخابہ شیریں کا نام دیتے۔۔اب میں مشرق کا موتی اور حوروں کے مسکن میں چلتے چلتے کہاں آ گیا۔اسے برگساں کے الفاظ میں محبت کا رشتہ کہہ لیجئے۔۔۔مجھے مولانا حالی زیرلب کہہ رہے تھے۔۔۔ع ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔۔کہاں چلا کہاں رکا۔۔۔منم محو جمال۔اونمی دانم کجا رفتم۔۔۔لیکن۔۔وہ ایک باب اور بنگو مر گیا۔۔۔میں نے بنگو کے علاج معالجہ اور ایک طرز مسیحاء کے حوالے سے ایسے اور دریچے بھی آنکھوں میں کھلتے دیکھے۔۔جب ایک تڑپتی زخمی خاتون کے ننگے پستانوں سے لپٹے بچے کو ماں کی۔ممتا نچوڑتے دیکھ ایک شخص اٹھالایا۔اور وہ مسجد کے محراب میں اپنے آخری۔سانس لیتے بیٹے فرید کو مسجد کے فرش پر لٹا واپس آ رہا تھا۔۔یہ میرا دادا تھا جسے بیل گاڑی پر بیٹھ پاکستان کا مطلب کیا۔۔اور زندہ باد کا نعرہ لگا کے واہگہ سے لاہور آنا تھا۔۔۔مایوسی ہے تو گناہ لیکن میرے گناہوں میں کم بخت یوں داخل ہوتی ہے جیسے خاموش معبد میں جھینگر کی آواز۔۔سچا ادیب وشاعر سچ ڈلیور کرتا ہے۔

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔۔۔۔ کتاب کا یہ باب کہ بنگو مر گیا اور بنگو زندہ ہو گیا۔۔۔موت و حیات کا تسلسل اور ڈاکٹر ادریس کے جذبات و احساسات سیم و زر کی میزان میں انمول۔کردار۔۔۔ع دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں۔۔ کتے اور کتے کے کج فکر مالکان۔۔کے نسلی اور کنسل ہونے کے گھاؤ سے ایک بنگو کیا مرا اولاد آدم ملکوں ملکوں ارض و سما کی ہتھیلی پر سسک رہی ہے۔اور ادھر سے کسی ادریس احمد آفتاب کا گزر ہو ع

شائد آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

بنگو مر گیا۔۔پڑھتے پڑھتے۔۔غلام عباس کا اوور کوٹ اور منٹو۔۔کا افسانہ کتا آدمی بھی یاد آے۔۔۔لیکن یہ کسک اور احساس کی آنچ نے مجھے اس طرح پگھلایا نہ تھا۔۔۔۔یہ وسعت۔ یہ گہراء جو بنگو مر گیا میں نظر آیا۔۔۔۔میں بے اختیار اپنی بے اختیاری کا اعتراف کرتا ہوں کہ جہاں نظریاتی طور میں دن رات گزار رہا ہوں وہ شہر۔شہر تضادات ہے۔۔۔مجھے عقائد کی ٹھوکریں اٹھاتی سر کے بل گراتی ہیں نہ مجھ میں گرمی رفتار نہ طاقت گفتار۔۔۔ کتے کو پلید کہہ کر واعظ نے کتے سے دور کیا کیا انسانیت سے دور کر دیا۔۔۔ادریس احمد آفتاب نے کتے کو زندگی دے کر فرزند آدم کو اانسانیت کی معراج دکھا دی۔۔۔سرشت کو لاکھ ٹھکرا کر انمول کر دیا۔۔۔۔ایک معصومانہ آرزو ہے کہ ہمارے ثقہ نقاد۔۔۔اور بنگو مر گیا۔۔کو نقد و نظر کے حوالے سے ادبی دنیا میں اپنے قلم کا موضوع بنائیں۔۔۔میرا خراج عقیدت۔۔اس عظیم المرتبت ہستی کے لئے یہی ہے کہ وہ جس بنگو کو اٹھائیں میں اس بنگو کے مسیحا کے قدموں پر سر رکھ کے سو جاوں۔۔نیند۔۔گہری نیند۔۔ابدی نیند۔۔۔

احسان رانا
شاعر، مفکر، محقق
گوجرانوالا

تاثراتِ احسان

اردو فکشن کا پہلا ادیب جس نے اردو کہانی کو سچ کی خلعت پہنائی۔۔۔ادب جذبات احساسات نظریات کا سچا اظہار ھے۔پھر ممتاز کہانی کار کہانی لکھتے لکھتے۔۔۔کہانی کے سارے کردار فرضی ہیں۔اور یوں افسانہ جھوٹ اور بعید از حقیقت ہو کر رہ گیا۔۔۔اہل نظر ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی کتاب فرشتے کی ایف آءآر۔۔دیکھ لیں ان کی تصنیف۔۔۔۔کے کردار دیکھ لیں اور تازہ تیسری کتاب ''قوم قوسِ قزح'' دیکھ لیں۔۔۔کہانی حقیقت کے لباس میں طلوع ہوتی ہے۔۔نظریہ حیات ادریس آفتاب کا اس شعر میں کبھی اس شعر میں۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

.....

ہو حلقہء یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

کتاب اور صاحب کتاب کا مقام کتاب کے نام سے بھی متوجہ کرتا ہے۔۔قدرت نے یہ اعزاز ادریس احمد آفتاب کے لئے محفوظ رکھا تھا کہ کہانی اور سفر نامہ اصلی کرداروں اور ملمع سازی کے بغیر بڑی شگفتگی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے۔

ڈپٹی نزیر احمد اگر پہلا ناول نگار اور پریم چند پہلا افسانہ نگار ہے تو ادریس احمد آفتاب نے اس اعزاز کو پا لیا ہے کہ وہ اردو فکشن اور سفر نامے کا پہلا ادیب ہے جس نے سچ کے کڑوے ذائقے کو شیریں کیا اور صداقت کی خلعت ان اصناف کو پہنائی جو مبالغہ آراء اور جھوٹ سے اپنی پہچان یوں رکھے ہوے ہیں کہ فکشن میں یہ سوچنا یہ پوچھنا کہ سچ کیا اور مفروضہ کیا خارج از بحث ہے۔۔اس پہلو سے آپ دیکھیں تو تینوں کتابوں کی ورق گردانی میں آپ ادریس احمد آفتاب کو مجدد بھی اور انقلابی بھی کہہ سکتے ہیں۔۔۔وہ تو کولمبس تھا جس نے امریکہ دریافت کیا میں نے زندگی میں ایک نوائے سروش دھڑکن دھڑکن سنی ہے ادریس احمد آفتاب کی تحریروں میں اور اپنی آنکھوں سے اس صاحبِ بصیرت مصنف کو دیکھ لیا جس نے مصر کے بازار میں انسان کو انمول اور ہالی وڈ کے ماحول میں سچی محبت

سچے کرداروں سے سچی کہانیاں لکھیں۔۔۔جب تک سچ جھوٹ کو شکست دے گا اس وقت تک ایک سچے پارکھ۔سچے ادیب کا نام آفتاب کی طرح روشن رہے گا اور اسکی فکری تابانی سے ادب کی کہکشاں روشن رہے گی۔۔
''قومِ قوسِ قزح'' کتاب کا نام ہی نہیں خالق کائنات کے حکم کی بجا آوری کا حکم۔حکم کی تعمیل اور قبولیت کا گجر ہے

احسان رانا

جناب عالی۔۔۔آداب
قاصد کی دست بوسی ہوئی آپ کی تصنیف لطیف سے آنکھیں جو لذت کش انتظار تھیں جھوم اٹھیں۔۔۔سیاہ ابر سے ابھرتا ماہتاب۔۔کرن کرن اجالا لئے۔۔دل کیوں نہ گنگنا تا ع

جس بھی فن کار کے شہکار ہو تم
اس نے برسوں تجھے سوچا ہو گا

ورق ورق نظر افروز تھے.....کہاں میں اور کہاں حرفِ اظہار ع
اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی..... آپ نے بندہ پروری کی

میں نے پلکوں سے در یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں
(ساغر صدیقی)

احسان رانا

کتاب ''فرشتے کی ایف آئی آر'' جس نے ادبی حلقوں کو نہ صرف اپنی طرف متوجہ کیا بلکہ یہ کتاب آپ بیتی اور جگ بیتی کا حسین امتزاج قرار پائی۔اس منفرد کتاب کے مصنف محترم آئی اے آفتاب ہیں۔محترم آئی اے آفتاب روشن دماغ جہاں گشت افسر اور خوبصورت اقدار کے نقیب زمیندار ہیں۔ان سے بالمشافہ ملنے کا شوق دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔شوق کی تکمیل ڈاکٹر محمد شہزاد کے ذریعے ہوئی۔ بہاولپور میں خوبصورت وسیع وعریض بنگلے میں جناب آئی اے آفتاب نے شوقِ باغبانی کا سبز شہر بے مثال سجا رکھا ہے۔اس نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو شخص نے اپنی شرافت اور گرم جوشی سے گرویدہ کیا تو عالم عالم سیر وسیاحت اور مشرقی اقدار سے وابستگی کے حوالے سے بہت اچھی گفتگو کی۔باغبانی اور ادب سے وابستگی نے دنگ کر دیا۔

''فرشتے کی ایف آئی آر'' ان کی کتاب ساگر پبلی کیشنز صفاں والا چوک، لاہور سے دستیاب ہے۔

محبت آمیز نشست سے یہ کہتے ہوئے اُٹھے

ع پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

احسان رانا

معاشرتی زندگی میں محبت سے لبریز اقدار کے سفیر حق گوئی و بے باکی کے نقیب ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کے قلم سے ''مشرق کا موتی - حوروں کا مسکن'' زندہ جاوید کتاب ادبی دنیا میں آ گئی۔ جذب و کیف آبشار کا ترنم، اسلوب ندی کا شفاف نقرئی زم زم.....خوش آمدید کہتے ہوئے:

اے موجِ رواں ہاتھ پکڑ کر مجھے لے چل
ہے شوق بہت مجھ کو سمندر کے سفر کا

احسان رانا

فُسوں کار

اصنافِ نثر میں سفر نامہ اور خودنوشت مقبول ترین کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متذکرہ دونوں اصناف میں اُن لوگوں نے بھی طبع آزمائی کی جن کا تعلق براہِ راست ادب سے نہیں رہا۔ سیاسیات، سماجیات، دینیات، اقتصادیات، تجارت، سائنس و دیگر علوم وفنون سے وابستہ افراد نے آپ بیتیاں لکھیں اور سفر نامے رقم کیے۔ ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کا شمار بھی ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جن کا بظاہر ادب کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ عملی زندگی میں تعمیرات وتجارت کے شعبوں سے وابستگی رہی۔ مطالعہ ان کا شوق ہے۔ انہوں نے ''فرشتے کی ایف آئی آر'' کے نام سے خودنوشت لکھی تو ادبی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔ پھر یادداشتوں، سفر ناموں اور مضامین کا مجموعہ ''مشرق کا موتی حُوروں کا مسکن'' منظرِ عام پر آیا جس نے ان کی ادبی حیثیت کو مضبوط کر دیا۔ اب وہ ''قومِ قوسِ قزح'' کی صورت میں ثقہ بند سفر نامہ نگار کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ان کا سفر نامہ بہاول پور کے غیر افسانوی ادب میں اہم ترین اضافہ ہے۔

مبدائے فیاض نے ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کے باطن میں قصہ گوئی کی پرورش کی ہے جس کی نمود اُن کی کتب کی صورت ہمارے سامنے ہے۔ وہ خلوص کی گرمی سے آنکھوں کو نم ناک کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ اس کے مظاہر ہمیں سفری احوال میں کئی مقامات پر ملیں گے۔

ڈاکٹر ادریس کے مذہبی نظریات بہت واضح ہیں۔ وہ فرقہ پرستی سے سخت بیزار ہیں۔ سیرتِ طیبہ کو مذہبی عقائد پر ترجیح دیتے ہیں۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو عصبیت کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیتے۔ ختمِ نبوت کے شیدائی بلکہ پرچارک ہیں۔ جہاں احمدیت نظر آئی اضطراب کے عالم میں شعلہ جوالا بن جاتے ہیں۔ اس کا چھوٹا سا ثبوت وہ ردِ "Joss" نائیجیریا میں ڈاکٹر عبدالغفور غنی کے کلینک میں ڈاکٹر عبدالغنی کے کلینک میں مرزا غلام احمد کی تصویر وتحریر دیکھ کر رونما ہوا۔ سخت ناسازیِ طبع کے باوجود انہوں نے اس ڈاکٹر سے علاج کروانا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً وہاں سے لوٹ آئے۔ وہ مغربی بالخصوص افریقی ممالک میں احمدیت کا دامِ فریب بچھائے جانے پر سخت فکرمند ہیں۔ وہ علماء اور مغربی تحریکوں کے اغماض کو احمدیت کے پھیلاؤ کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ اپنی کتب میں احمدیت کے خلاف مبلغ کا

کردار نبھاتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر ادریس کی تینوں کتب میں یہ خوبی دیکھنے میں آئی کہ جہاں کوئی نامانوس اصطلاح مستعمل ہوئی تو قاری کی سہولت کے لیے فوراً وضاحت کر دی گئی۔ مثلاً اس کتاب میں Alpha Animal کی ترکیب آئی تو قوسین میں لکھ دیا (اکسانے والی)۔

اس سفر نامے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کو قبائلی معاشرت سے گہری واقفیت حاصل ہے جس سے وہ اپنے قاری کو متعارف کرانا ضروری سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر ادریس جب یہ کہتے ہیں کہ ہر افریقی کو جنگلی پن کا دورہ ضرور پڑتا ہے تو وہ اس ضمن میں معلومات کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ادریس غیر ضروری تفصیل سے گریز کرتے ہیں۔ جہاں جہاں ایسے مقام آئے کہ جن کا تذکرہ ان کے پہلی کتاب ''فرشتے کی ایف آئی آر'' میں ہے تو وہ اعادہ کے بجائے قاری کو کتاب پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً لندن اور سعودی عرب کے اسفار کے ذکر میں مذکورہ کتاب پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

ڈاکٹر ادریس ہر صاحبِ ذوق کی طرح جمال پرست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظریں پری وشوں کی متلاشی رہتی ہیں۔ فضائی میزبان ہوں یا کوئی اور، حسیناؤں سے ان کی دوستی جلد ہو جاتی ہے اور خوب نبھتی ہے۔ وہ جہاں بھی مہ جبینوں کا ذکر کرتے ہیں دل جمعی سے کرتے ہیں۔ اس ضمن میں تشبیہات و استعارات کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ حلیہ نگاری میں جز رسی سے کام نہیں لیتے بلکہ فیاضی برتتے ہیں۔ نائجیریا کے سفر میں کوئی بھی ائیر ہوسٹس ''چونکا دینے والی'' نظر نہیں آئی تو مایوس، بے چین اور ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ منزل پر پہنچ کر ہی سُکھ کا سانس لیتے ہیں۔ یاد رہے کہ ان کے زیادہ تر اسفار عہدِ شباب کے ہیں۔ وہ اپنی قوتِ پرواز پر بھروسہ کرتے ہوئے آسمانِ محبت میں بے ارادہ ''کسی'' کے دامِ ہم رنگ میں گرفتار بھی دکھائی دیتے ہیں۔ قربتوں اور خلوتوں کے باوجود طہارتِ نفس کا خیال رکھتے بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریر میں قوسِ قزح کے رنگوں اور لطیف جذبوں کو الفت کی خوشبو میں بھگو کر پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر ادریس رجائیت پسند ہیں۔ کئی مقامات پر وہ قنوطیت کو شگفتگی میں بدلتے دکھائی دیتے ہیں۔ دیارِ غیر میں رہ کر اپنی جنم بھومی سے محبت ان کی تحریر سے پھوٹ پھوٹ پڑتی ہے۔ وہ سماج کے منفی رویوں سے شاکی ہیں اور ان کے خلاف بلند آہنگ ہو جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی نثر میں جینے کا ڈھنگ، انا کے تحفظ کا سلیقہ، خود اعتمادی اور بلند حوصلگی کے عناصر

غالب ہیں۔فنی چابک دستی،تخلیقی ثروت مندی اور احساس کی ندرت نے ان کے سفر نامہ کو پر کشش بنا دیا ہے اور سلیقہ اظہار نے وقار،نکھار اور اعتبار بخشا ہے۔

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی اثر آفریں نثر احساس و جذبے کی لطافت کے ساتھ ساتھ اظہار کی نئی جہت اور فکری بالیدگی سے مالا مال ہے۔وہ معاشرتی اقدار و روایات کا بھرپور ادراک رکھتے ہیں۔وہ جہاں بھی فطرت کی رعنائیاں اور دل فریبیاں دیکھتے ہیں،مسحور ہو جاتے ہیں۔ان کا عمیق مشاہدہ تخلیقی جوہر بن کر قوتِ اظہار میں جاذبیت و فسوں کاری کی شان پیدا کر دیتا ہے جو انہیں ادبی دنیا کی صفِ اول میں لا کھڑا کرتا ہے۔

پروفیسر قدرت اللہ شہزاد
سابق صدر شعبہ اُردو
صادق پبلک سکول، بہاول پور

فکر و خیال

پانچ چھ سال قبل برادرم ڈاکٹر محمد شہزاد رانا نے ایک خود نوشت "فرشتے کی ایف آئی آر" پڑھنے کو دی۔ آپ بیتی کا نام عجیب سا لگا۔ پڑھنی شروع کی تو لمحہ بہ لمحہ دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ ضخیم خود نوشت چند روز میں ختم کر لی تو خیال آیا کیوں نہ مصنف ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب سے ملا جائے۔ وہ بہاولپور میں ہی رہتے ہیں۔ تلاش بسیار کے بعد ان کا اتا پتہ ملا۔ ڈاکٹر محمد شہزاد صاحب کے ہمراہ ہی ان کی خوب صورت رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ ان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوئے۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ ڈاکٹر ادریس سے مل کر ان کی شخصیت سمیت ہر چیز کو دیکھ کر ان کی خوش ذوقی کی داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ پھر ڈاکٹر ادریس کی خوش مزاجی اور مشفقانہ برتاؤ کے سبب ہمارا دوستانہ ہو گیا۔

ڈاکٹر ادریس کی یادداشتوں پر مشتمل نئی کتاب "مشرق کا موتی حوروں کا مسکن" جوں ہی زیور طبع سے آراستہ ہو کر آئی تو ڈاکٹر محمد شہزاد رانا صاحب کے ہاتھ بھجوائی۔ یہ کتاب 14 ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب الگ یونٹ ہے۔ جو چاہیں پہلے پڑھ لیں۔ ابھی صرف دو باب پڑھے ہیں۔ چوتھا باب "قبر سے فریاد" اور بارھواں باب "جو ہم پہ گزری"۔

"قبر کی فریاد" عبرت انگیز داستان ہے جس کی مرکزی کردار خالدہ کا تعلق میرے آبائی محلّہ سادات پورہ سے ہے۔ اس کتاب میں درج بہت سی معلومات میرے لیے نئی ہیں تاہم دیگر حقائق سے بخوبی واقف ہوں۔ ڈاکٹر ادریس نے ماضی کے اس بھولے بسرے منفی کردار پر خامہ فرسائی کر کے اسے تاریخی دوام بخشا ہے۔

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی پر اثر اور دل نشیں نثر کے حوالے سے صرف اتنا کہوں گا کہ یہ قاری کو اس طرح جکڑتی ہے کہ وہ مدہوشی کے عالم میں تا دیر اسی میں گم رہتا ہے۔

ڈاکٹر ادریس صاحب! آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ اتنا قیمتی تحفہ عنایت فرمایا۔

پروفیسر قدرت اللہ شہزاد
سابق صدر شعبہ اُردو
صادق پبلک سکول، بہاول پور

خیالِ رانا اور آداب

بارش۔۔ہوا کے جھونکے۔خوشگوار ماحول میں مشرق کا موتی۔۔حوروں کا مسکن۔۔۔ورق ورق نظر افروز ہے۔۔نواں باب چائے کہانی تک آ گیا ہوں۔۔۔شائد مطالعہ کا اور باب بھی کھلتا۔۔۔لیکن لبنیٰ کے ساتھ آپ کے مکالمے نے دل میں آگ سلگا دی۔۔جانے اس آگ کے شعلوں میں جو شکل نظر آئی بس تصویر نظر آئی۔۔۔لبنیٰ کے پیراگراف میں قلم، حرف و بیان کی چوٹی پر آفتاب کی کرنیں بکھیرتا بکھری کائناتِ حُسن کو سمیٹ لیتا ہے! جیسے لبنیٰ نے کالی چادر سمیٹ لی ہو اور سویا سمندر جاگ اٹھے۔۔۔اب فجر کی اذان ہوگئی ہے۔۔۔مؤذن کی اذان پر شائد کتاب ہاتھ سے نہ رکھ سکتا۔ایک آواز، اذان ہوگئی ہے۔۔۔ثواب سمیٹنے کے یقین نے بیگم کی نسوانی لہجے کو مضراب بنا دیا۔۔۔اسے کیا معلوم کہ وہ فجر کے ساتھ اور میں آفتاب کے ساتھ ہوں۔

ع جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اُمید واثق۔۔۔۔میری عبارت کو ہفت کلامی نہ کہا جائے گا۔۔۔یہ لفظ بھی پہلی بار اس کتاب کے مطالعے سے مجھے ملا۔۔۔اور لطف دے گیا کہ آپ دوران سفر بصارت و بصیرت سے چہروں کا الٹرا ساؤنڈ کرتے ہیں۔۔یہ اس جری سیاح کے لئے ضروری بھی تھا جو سکوٹر پر سیر عالم کو نکلا۔۔اور تحریر میں شگفتگی۔۔واہ۔۔''سکوٹر کی غذائی ضروریات پوری کی'' کوئی اور ہوتا تو یہی لکھتا کہ سکوٹر کی ٹینکی پٹرول سے بھر لی۔۔۔یہ اعجاز خطابت بھی آپ کا حیران کر گیا جو لبنیٰ نے کالی چادر کھول کر جدید لباس سے منظر کو آفتاب آمد دلیلِ آفتاب ثابت کر دکھایا۔۔۔کاش میں بھی ان آنکھوں کو دیکھ پاتا جو آفتاب کے کرن کرن اجالوں میں محبت کی شمعیں روشن کرتے زیرِ لب بالائے لب زندگی کو نغمے سنا رہی تھی مگر

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
دل میں اک حسرتِ تعمیر تھی سو آج بھی ہے

آداب آداب آداب

ع بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد رانا

باغِ عدن

خودنوشت "فرشتے کی ایف آئی آر" کے مصنف ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب نے گذشتہ شب مثل بہشت اپنی قیام گاہ! جسے برملا طور پر باغ عدن بھی کہا جا سکتا ہے، میں احباب کے اعزاز میں عشائیہ کا اہتمام کیا۔ جس میں راقم، ڈاکٹر محمد شہزاد کے علاوہ ڈاکٹر سہیل بلوچ، ڈاکٹر ذوالفقار رحمانی، ڈاکٹر شیر زمان، ڈاکٹر شوکت مامون سمیت کچھ اور معالجین اور دو تین افسران نے لذت کام و دہن کے ساتھ ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب صاحب کی دل نشیں گفتگو سے حظ اٹھایا۔ انہوں نے اپنی آئندہ آنے والی کتاب کے کچھ مندرجات بھی بیان کیے۔ ڈاکٹر ادریس کی یہ کتاب اختتامی ابواب میں ہے۔ جوں ہی یہ تکمیل کو پہنچے گی اسے زیور طبع سے آراستہ ہونے کے لیے پریس بھیج دیا جائے گا۔ یہ کتاب ان کی خودنوشت کا دوسرا حصہ متصور ہو گی۔ کیونکہ اس میں ڈاکٹر ادریس کے وہ تجربات، مشاہدات اور اسفار ہیں جو ان کی پہلی تصنیف میں شامل نہیں۔ احباب کو اس کتاب کا شدت سے انتظار تھا۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد رانا
میڈیا سٹڈیز
دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

افریقہ کا سیاحت نامہ

کچھ کتابوں کے مندرجات اس قدر دلچسپ و جالب ہوتے ہیں کہ جب تک پوری کتاب پڑھ نہ لی جائے چین نہیں آتا، کتاب ہاتھ سے رکھنے کو دل نہیں کرتا. ایسی کتابیں قارئین کے دل پر گہرا اثر قائم کرتی ہیں جو بہت دیر پا ہوا کرتا ہے۔

افسانوی ادب یقیناً دنیا کی سب سے مقبول ادبی صنف ہے مگر اس بات میں بھی کوئی مبالغہ نہیں کہ حقیقت افسانے سے کہیں زیادہ دلچسپ اور پر اثر ہوتی ہے۔

فکشن میں بھی دلچسپی کے لوازمات پیدا کیے جاتے ہیں مگر جو بات سچائی پر مبنی تحاریر میں ہوتی ہے فکشن اس کے آس پاس بھی نہیں پھٹک سکتا۔

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب دنیائے ادب کے وہ روشن ستارے ہیں جن کی کئی ادبی حیثیتوں سے قارئین کا ایک وسیع حلقہ آگاہ ہے۔

وہ ایک اعلی سوانح نگار، بے مثل مضمون نویس، بے بدل سفرنامہ نگار اور انتہائی عرق ریزی سے کام کرنے والے محقق ہیں۔

اب تک ان کی دو کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ نما ہو چکی ہیں، فرشتے کی ایف آئی آر اور مشرق کا موتی حوروں کا مسکن کو جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے وہ ان کی تحریری انفرادیت کا ایک پختہ ثبوت ہے۔

ایک آفاقی حقیقت ہے کہ جو تحریر پڑھنے والے کے دل میں اتر جائے وہی قابل توصیف وستائش قرار پاتی ہے۔

ہماری خوش بختی ہے کہ ان کا تیسرا ادبی شاہکار "قومِ قوسِ قزح" کے نام سے آیا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ مسجع و مقفع عبارت کے بجائے سادہ اور رواں الفاظ میں اپنی بات بیان کر دیتے ہیں ان کی تحریر میں سچائی، بے ساختہ پن اور ادبی حسن موجود ہے۔

ان کا پر تاثیر طرز نگارش منظر کشی، واقعہ نگاری، خاکہ نویسی، کرادر نگاری اور لطف زبان جیسی خوبیوں کا حامل ہے۔

ان کی شخصیت میں جو اصول پسندی، احترام آدمیت، امانت و دیانت، وضع داری اور رکھ رکھاو موجود ہے وہ ان کی تحریر میں جا بجا جھلکتا ہوا محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ان کی تحریر فکر و خیال کی گہرائی، خوبی بندش، حسن اسلوب، طرز ادا سے عبارت ہے جو ان کے عمیق مشاہدے کی مرہون منت معلوم ہوتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب بھی مقبولیت کے نئے مدارج طے کرے گی۔

پروفیسر محمد اکبر خاں اکبر
کیڈٹ کالج قلعہ سیف اللہ
کوئٹہ

جداگانہ اسلوب والا مصنف ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب

ایک دن معلوم ہوا کہ ڈاکٹر محمد اصغر ہاشمی پروفیسر شعبہ فزکس اسلامیہ یونیورسٹی نے شعبہ اُردو اقبالیات کے تمام اساتذہ کو اپنے گھر کھانے پر بلایا ہے۔ ہم سب حیرت زدہ ہوئے کہ ہاشمی صاحب تو اچھے بھلے آدمی تھے انہیں اچانک کیا ہو گیا؟ لیکن چونکہ کھانے کا مسئلہ اور معاملہ تھا لہٰذا ہم سب اُن کے گھر پہنچ گئے۔ دیکھا تو وہاں اُردو کے نام ور ناول نگار طارق اسماعیل ساگر تشریف رکھتے ہیں۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اسی ملاقات میں ایک اور صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ ہاشمی صاحب کے سسر ہیں اور بس.....لیکن پھر ایک دن پروفیسر ڈاکٹر محمد مختار، وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی کے ساتھ ڈاکٹر ادریس کے دولت کدہ پر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ یہاں پر ڈاکٹر صاحب کے دولت کدہ پر کتاب کی رونمائی کے سلسلے میں ایک پروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب کی نوتعمیر شدہ فیکٹری کا افتتاح بھی اسی تقریب میں شامل تھا اور لنچ کا اہتمام تو کمال کا تھا لیکن گفتگو بہت مختصر ہوئی جس کے باعث صاحب خانہ کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ البتہ جب اسلامیہ یونیورسٹی میں ''ڈاکٹر مختار سٹڈی سرکلز'' کا آغاز ہوا اور ''اہل قلم ڈائریکٹری بہاول پور'' ترتیب پانے لگی تو ایک کتاب سے تعارف حاصل ہوا جس کا عنوان ہی چونکا دینے والا تھا یعنی ''فرشتے کی ایف آئی آر''۔ عنوان ہی دل کش تھا لیکن میں مصروفیات کے ہجوم میں اس کتاب کو توجہ سے نہیں دیکھ سکا۔ البتہ کہیں کہیں سے اور کبھی کبھی دو چار صفحے ضرور دیکھتا اور مصنف کی دلیری کی داد دیتا رہا۔

چند دن پہلے ایک فون آیا۔ فون کرنے والے نے اپنا نام ادریس احمد آفتاب بتایا۔ میں خوش ہوا کہ میں اس نام سے بھی بہت زیادہ واقف تھا کہ جب بھی کوئی فون کرنے کے لیے ''ڈائریکٹری'' دیکھتا تو ''آسیہ کامل'' اور ''آفتاب احمد'' وغیرہ کے بعد یہی نام سب سے زیادہ بھلا لگتا تھا۔ ادریس احمد آفتاب یعنی ''ٹرپل اے'' اور اسی شخص نے ''فرشتے کی ایف آئی آر'' لکھی تھی۔ بہرحال وہ آئے اور ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ تب ہم ایک دوسرے پر کھلے اور ہمیں معلوم ہوا کہ ہم مل کر بہت سا علمی کام کر سکتے ہیں۔ تبھی میں نے ان کے چند مضامین دیکھے اور خود ہی کہا کہ میں ان پر ایک تعارفی نوٹ لکھنا چاہتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ وہ اسی غرض سے تشریف لائے ہیں لیکن

میں اس کام کو کرنے سے پہلے ان کی اولین کتاب دیکھنا چاہتا تھا۔ دیکھا تو معلوم ہوا اور پتا چلا کہ ''فرشتے کی ایف آئی آر'' درحقیقت ادریس احمد آفتاب کی دلچسپ خودنوشت سوانح عمری ہے۔ ہم نے اردو کی بڑی بڑی سوانح عمریاں دیکھی ہیں مثلاً ''شہاب نامہ''، ''یادوں کی برات'' اور ''اپنا گریباں چاک'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی حیثیت اس طرح کوئی نہیں بتاتے جس طرح ادریس آفتاب نے بتائی ہے۔ نہ کوئی جھوٹ، نہ کوئی طوفان اور نہ ہی کوئی ایسی بات جسے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آئے۔ اگر کہیں جھوٹ بولا تو بولا اور کہیں فریب کیا تو کیا اور کہیں پھینٹی لگی تو لگی۔ اپنے نہ پڑھنے کا احوال بے کم وکاست لکھا اور پھر پڑھنے کی طرف متوجہ ہونے کی تفصیل بھی بتائی۔ اسی پر ان کے ہم جماعتوں، دوستوں اور عزیز واقارب کے احوال بھی آ گئے۔ اسی میں میرا ایک بڑا مسئلہ بھی حل ہو گیا اور مسئلہ بھی بڑا دلچسپ لیکن اُس کی نوعیت سمجھنے کے لیے تھوڑا غور کرنا پڑتا ہے مثلاً یہ کہ ہماری کون سی زبان ہے؟ اور ہمارا کیا لباس ہے اور ہمارا کھانا کیا ہے؟ اسی طرح ہماری معاشرت کیا ہے؟ تو بھی قصہ یہ ہے کہ ان کے لیے سمجھ دار انسان نہیں جھگڑتے، بے وقوف البتہ جھگڑتے ہیں کہ ان سب چیزوں کا تعلق ہماری معاش سے ہے۔ معاش جہاں لے جائے گی سو وہاں جانا پڑے گا اور جہاں جانا پڑے گا وہیں کی زبان، وہیں کا لباس اور وہیں کے رسم ورواج بھی اپنانا پڑیں گے۔ ادریس احمد آفتاب کے آباؤ اجداد بھی مشرقی پنجاب کے علاقے ''خان پور'' سے تعلق رکھتے تھے جو کھسکتے کھسکتے بہاول پور آ گئے اور اب خود کو پنجابی کی بجائے سرائیکی کہلواتے ہیں۔ حالانکہ یہ نہ پنجابی اور نہ سرائیکی بلکہ پشتون ہیں اور بھائی پشتون بھی کب؟ درحقیقت تو شامی یعنی عرب ہیں۔ گویا انسان کا تعلق سرزمین سے نہیں نظریے سے ہونا چاہیے۔ بہرحال ان کی شخصیت میں ظاہری حُسن وخوب صورتی کے علاوہ اعلیٰ درجے کا اعتماد بھی ہے اور یہ اعتماد وہ ہے جو صرف اُس شخص کو حاصل ہوتا ہے جو محنتی، مخلص، مستقل مزاج اور اپنی دُھن کا پکا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جس نے محنت کر کے دیانت داری کے ساتھ کھایا کمایا ہو۔ ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کسی زمانے میں بہت سے مریضوں کا علاج معالجہ کرتے رہے اور آج کل بہاول پور کی سمال انڈسٹری میں غالباً اپنی نگرانی میں لکڑی کا کام کراتے اور اسی سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ انہوں نے ٹھیکے داری بھی کی اور وہ مزدوری کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ گویا ماشاءاللہ سے ہرفن مولا ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں بہت سی زبانوں پر اس حد تک عبور حاصل ہے کہ پاکستان میں سرائیکی، پنجابی اور اُردو بولتے ہیں۔ ایران میں فارسی اور عرب دنیا میں عربی زبان میں گفتگو کرتے اور آسانی کے ساتھ دوسروں تک اپنا مطلب پہنچاتے ہیں لیکن یہ کسی بھی جگہ اپنے نقطہ نظر سے ہٹتے نہیں لیکن ہر مسلک کے افراد سے اپنا تعلق قائم رکھتے ہیں، لیکن ہر جگہ پاکستانی رہتے

ہیں۔مثال کے طور پر دہلی میں ہر صورت اپنی پاکستانیت قائم رکھتے ہیں اور بغداد میں ایسے سکوٹر پر سفر کرتے ہیں جس پر پاکستان اور عراق دونوں ملکوں کے جھنڈے لگے ہوں۔سفر کا ذکر ہو رہا ہے تو یاد رکھئے کہ ادریس آفتاب نے سکوٹر پر بہاول پور سے لندن تک کا سفر کیا ہے اور ان سفروں میں جگہ جگہ انہیں بھی مستنصر حسین تارڑ کی طرح حسینائیں مل جاتی ہیں۔مستنصر کا تو پتا نہیں لیکن ادریس آفتاب تو اپنے حُسن وصورت کے سبب بھی ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔جیسا کہ لبنیٰ کریم کرودی، ادریس آفتاب پر مرمرٹیں۔وہ خود کو اپنے لبادے میں چھپائے رکھنا چاہتی تھیں لیکن ادریس آفتاب کی ذہانت اور فطانت کے سبب اس کے لیے یہ ممکن نہ ہوا۔اسی طرح دہلی میں بھی ادریس آفتاب کو ایک ہوٹل میں سیکڑوں کھیلنے، کھانے اور ناچنے گانے والی حسیناؤں کے درمیان ایک ایسی خاتون مل گئی جو''خاتون'' سے زیادہ کسی ایجنسی کی افسر نظر آتی تھیں لیکن اس سفر کے عنوان میں شامل''سترہ دن'' کے لفظ سے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے سترہ دن یاد آتے ہیں لیکن اس سے زیادہ مشکل بات یہ ہے کہ ادریس آفتاب ایک ماہ کا ویزا لے کر ہندوستان اس ارادے سے گئے کہ اپنا آبائی گھر دیکھیں اور اپنے شہروں یا قصبات کی سیر کر کے آئیں گے لیکن وہ سترہ دن دہلی میں گزار کر اپنے گھر دیکھے بغیر واپس آ گئے۔

ادریس آفتاب صرف پاکستانی ہی نہیں بلکہ بہت اچھے مصلح بھی ہیں جو دنیا کو خرابیوں سے بچانا چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کے دو مضامین چائے کہانی اور منشیات کے حوالے سے لکھا گیا مضمون دیکھنا چاہیے جہاں وہ مصلح ادیب کی بجائے طبیب نظر آتے ہیں کہ چائے اور منشیات کے نقصان اس طور آگاہ کرتے ہیں جیسے کوئی میڈیکل ڈاکٹر علاج اور پرہیز بتاتا ہے۔تبھی ہمیں پتا چلتا ہے کہ ادریس آفتاب ایک صاحبِ مطالعہ شخص ہیں۔سیکڑوں لفظ پڑھتے ہیں تو ایک جملہ لکھتے ہیں اور ہزاروں مضامین دیکھتے ہیں تو ایک مضمون لکھتے ہیں اور ماشاءاللہ ان کا مضمون بہت بھرپور معلومات افزا ہوتا ہے۔جبکہ ڈاکٹر ادریس احمد کا اسلوب بالکل جدا اور الگ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد عاطش
صدر شعبہ اُردو
ڈین فیکلٹی آف آرٹس
دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور

''وسعت اور مشاہدہ''

ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی کتاب ''مشرق کا موتی حوروں کا مسکن'' کا عنوان پڑھنے والے کی جستجو کو اُبھارتا ہے۔ مندرجاتِ صاحب کتاب کے مطالعہ کی وسعت اور مشاہدے کی گہرائی کو اُجاگر کرتے ہیں۔ مشاہدے کی صفت سفر سے دوچند ہوتی ہے اور مصنف کی صحرانوردی نے بجا طور پر ان کے مشاہدے میں اضافہ کیا۔ سفرِ مشرق ہو اور ذکرِ حُسن سے عاری ہو ممکن ہی نہیں۔ مصنف کا ذوقِ حُسن توصیفِ حُسن مشرق سے ہویدا ہے لیکن کمال یہ ہے کہ اس بیاں میں تہذیب کا دامن نہیں چھوٹتا۔ زبان کی شیرینیِ حُسن کا احاطہ کرے اور حسن مشرق کا ہو تو نثر میں غزل کا سماں بندھ جاتا ہے۔ دیگر ابواب میں انسانی فطرت کا افسانوی بیان کتاب کے موضوع میں تنوع پیدا کرتا ہے اور بعض مقامات پر تو قاری اپنے خیالات کو الفاظ کے پیراہن میں دیکھ کر مصنف کے مطالعہ اور مشاہدے کا معترف ہو جاتا ہے۔ انسانی فطرت کی بھرپور عکاسی مشاہدے کے بنا نہیں ہو سکتی۔ بیان کا تسلسل اور حوالہ جات مصنف کے صاحبِ مطالعہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ زبان و بیان الفاظ کا انتخاب تحریر کو چاشنی اور قاری کو آسودگی فراہم کرتا ہے۔ مصنف نے بڑی چابک دستی سے قاری کو اپنے دام میں گرفتار کیا ہے توجہ کا مرتکب ہونا صاحبِ تصنیف کی کامیابی کا اعلان ہے۔ اچھی کتاب جہاں میسر ہو اس میں دوسروں کو شریک کر لینا چاہیے، تنہا مستفید ہونا کم ظرفی ہے، ''مشرق کا موتی حوروں کا مسکن'' بجا طور پر اس کسوٹی پر پورا اُترتی ہے۔ مصنف کی صحت اور بیان کی روانی کے لیے دُعائیں تاکہ یہ سلسلہ جاروساری رہے۔ آمین

پروفیسر ریاض احمد میاں
اسسٹنٹ پروفیسر
ہیلی کالج آف بینکنگ اینڈ فنانس، جامعہ پنجاب لاہور

پرورشِ لوح و قلم

شاعر، مصنف، سفرنامہ نگار، کالم نویس محترم ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی کتاب ''مشرق کا موتی حُوروں کا مسکن'' آپ بیتی، جگ بیتی، تحقیق اور رپورتاژ سے مزین وہ ہشت پہلو شاہکار ہیرا ہے جو نہ صرف مصنف کی ذہانت، تحقیق، صحرانوردی، انسانیت سے محبت، عشق کی بوقلمونیوں کے سوز و گداز سے بھرپور جذبات و احساسات کی روشن کرنیں ایسے بکھیرتا ہے کہ قاری کے خفتہ لطیف جذبات کی روحانی دنیا جگمگانے لگتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیاں انتہائی سادہ، دلکش اور رواں ہے جس میں خلوص، لگن، محنت، جذبہ حب الوطنی اور انسانیت سے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ واقعات کی تفصیل میں مبالغہ آرائی یا لفاظی سے کام نہیں لیا گیا بلکہ دردِ دل کا وہ سحر انگیز نشہ ہے جو قاری کے دل و دماغ کا احاطہ کر لیتا ہے اور اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ واقعی انسانیت کی اعلیٰ مذہبی اقدار جو ہماری روایت اور ثقافت کی امین ہیں ان میں ہم کس حد تک حصہ دار ہیں۔

محترم ادریس صاحب نے مجھ ناچیز طالبہ کی رائے پوچھ کر مجھے بھی معتبر کر دیا ہے۔ اللہ پاک صحت و تندرستی کے ساتھ آپ کو اپنے رحمتوں اور عنائیتوں سے سرفراز فرمائے اور آپ اسی طرح پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں۔ آمین ثم آمین!

پروفیسر نگہت ارشاد
وائس پرنسپل (صدر شعبہ اُردو)
گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین مرغزار کالونی۔ لاہور

شفیق مصنف

ڈاکٹر صاحب سے شناسائی ان کی پہلی تصنیف ''فرشتے کی ایف آئی آر'' کے توسط سے ہوئی۔اس کا اشتہار ایک پرانے رسالے میں نظر آیا، جو راقم نے فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے سفر میں پڑھنے کے لیے خریدا۔

کوئی بھی نئی خودنوشت نظر میں آئے تو پڑھے بغیر نہیں رہا جاتا۔ان کی کتاب منگوائی اور پڑھنے کے بعد کچھ دوستوں کی خدمت میں پیش کی۔ان میں سے اکبر خان کوئٹہ نے ان کو فیس بک پر ڈھونڈا اور اُن کا نمبر مجھے عنایت کیا۔کتاب پڑھتے وقت مجھے مطلق اندازہ نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے یوں تعلق کی شروعات ہوگی اور ان کا سایہ عاطفت ہمارے اذہان واجسام پر قائم ہو جائے گا۔ڈاکٹر صاحب کی نثر کی سب سے بڑی خوبی اس کی اپنے آپ کو پڑھوانے کی صلاحیت ہے۔ان کی شخصیت کی راست گوئی اور خطرناک حد تک ایمانداری، ان کی تحریر پر حاوی ہو جاتی ہے۔ان کی کتاب میں وہ مواد زیادہ موثر نظر آتا ہے جس میں ان کے تجربات ومشاہدات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کی باقی تحاریر پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وقائع نگاری کا فسوں تو موجود ہے مگر اپنی خود نوشت کو لے کر ڈاکٹر صاحب اُردو ادب کی شاہکار خودنوشتوں میں براجمان نظر آتے ہیں۔راقم کی ناقص رائے میں آنے والے وقت میں ان کی خودنوشت اردو میں شاہکار خودنوشتوں میں شامل نظر آئے گی۔

ڈاکٹر صاحب کی نثری فطانت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت بھی مہربانی اور مہارت کا مجموعہ ہے۔اس کی وضاحت راقم آگے کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے کچھ سال کی ٹیلی فونک رفاقت بالکل ایسے محسوس ہوئی جیسے انسان اپنے کسی قریبی سے تعلق میں رہتا ہے۔انہوں نے اپنے وقت سے ہمیشہ راقم کے لیے لمحے مخصوص کیے۔دنیا جہاں کے معاملات زیرگفتگو رہے۔مگر بالمشافہ ملاقات کی اشتہا قائم رہی۔یکے بعد دیگرے میں نے اپنے دو قریبی پیاروں کو کھونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی علالت کے بارے میں سنا، دل کافی پریشان رہا۔ہمت کی اور ان کے دولت خانہ پر حاضری دی اور تین یوم قیام کیا۔انہوں نے مثلِ پسر شفقت فرمائی۔

ان کی نرم طبیعت کا یہ عالم ہے کہ اپنے ملازمین کو بھی یہ ''صاحب'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ان کا دولت خانہ بھی ان کے جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار ہے۔بے شمار خوبصورت درختوں کی چھاؤں اور ماربل کی میز پر اپنی کہنی

ٹکائے میں نے بے شمار گیان سمیٹا۔ جس موضوع پر بھی گفت وشنید ہوئی، انہوں نے معلومات میں اضافہ کیا۔ ان کی طب وحکمت کا تو مجھ سے بہتر کوئی شاہد نہیں۔ ان کی فرنیچر ورکشاپ دیکھی۔ ان کا بنایا ہوا فرنیچر نفاست میں اپنی مثال آپ تھا۔ شومئی قسمت کہ اب یہ کام چھوڑ چکے ہیں۔ بوقت رُخصت انھوں نے لکڑی کا بنایا ہوا دیدہ زیب لیمپ میری نذر کیا۔ اس کی خوبصورتی دیکھ کر دل میں سوال اُٹھا کہ نجانے میرا دارالمطالعہ اس کے قابل ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب بہت شفیق ہستی ہیں۔ جب تک ان کا قلم الفاظ اُگلتا رہے گا، جب تک ان کا ذہن واقعات سناتا رہے گا اور جب تک ان کی سانسیں سلامت رہیں گی۔ راقم ان کی دست بوسی کے لیے حاضر ہوتا رہے گا۔

سعد عباس عاجز
گاؤں سکھوال، تحصیل فتح جھنگ
ضلع اٹک

Drifting

My dear sir. AOA. I hope you are fine and happy. Your book is in my hand. When you handed over the book my first impression was , I may not read it but as it was being gifted I received it. Two days book remain in the car and yesterday my Servent brought it and said , it was laying in the car. I just opened it and started reading. I am well read person but the book written by Dr Idrees did not allow me to do any other jobs except reading the book. The narration of the experiences is so effective and original that at all the time reader feels as he is in the Writer and every occasion he is confronted with same feeling of the writer.Beautiful book and very lovely uses of words and narration. I apologise for my first impression about the book , it is a classic addition in the latrature and Biography. Best wishes.

Col. Amin budh

حیران کن شخصیت کی سحر انگیز تصانیف

ہمارے مہربان اور بہت ہی پیارے دوست جناب ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی تصانیف پر احباب کے تبصروں کا سلسلہ جاری ہے اور مذکورہ تبصروں میں چند باتیں ایسی مشترک ہیں کہ ہر ایک نے انہیں پوائنٹ آؤٹ کیا ہے مثال کے طور پر ڈاکٹر صاحب کو دیرینہ جاننے والے اس امر پر حیران ہیں کہ ہمیں کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اتنی کمال کی چیزیں لکھ سکتے ہیں۔بعض نئے واقف کاران کا کہنا ہے کہ انہیں کسی دوست کی معرفت ڈاکٹر صاحب کی کتاب فرشتے کی ایف آئی آر پڑھنے کا موقع ملا تو واقعات اوران کے بیان کی دلچسپی و دل پذیر انداز نے ایسا اثر کیا کہ وہ حیرت میں ڈوب گئے۔لیکن میں ان سب احباب کی خدمت میں فقط اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب صاحب سے اچھا تعارف رکھتا ہے تو اسے تو حیران نہیں ہونا چاہیئے اس لئے کہ طلسماتی صلاحیتوں کے مالک ڈاکٹر ادریس صاحب تو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت بہت ہی حیران کن ہے،کم ازکم میں نے اپنی زندگی میں ان کی ٹکر کا کوئی بندہ تا حال نہیں دیکھا جس میں اتنی متنوع خوبیاں ایک ساتھ موجود ہوں۔یہ میں ان کی کوئی بے جا تعریف نہیں کر رہا ہوں، مجھے بے جا تعریف کرنے کی عادت ہے اور نہ ہی ڈاکٹر صاحب کو ایسی باتیں پسند ہیں۔تھوڑا سا میرے ساتھ چلئے اور آپ بھی دیکھئے۔۔۔مثال کے طور پر ان کا لڑکپن اتنا نا آسودہ گزرا کہ وہ تلخیاں و غیر انسانی برتاؤ جسے ٹین ایج میں ان کے ساتھ روا رکھا گیا وہ یقیناً ان کی شخصیت کو ابنارمل بنا سکتا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے ہو کر وہ ایک متوازن شخص بنے۔اسی طرح ان کے حصولِ تعلیم میں جتنا خلل رہا توقع نہ کی جا سکتی تھی کہ وہ میٹرک بھی پاس کر سکیں گے،لیکن آگے چل کر انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔کیا یہ حیرت کی باتیں نہیں ہیں؟ ٹین ایج میں انہوں نے منجھے ہوئے تجربہ کار شخص کی طرح منصوبہ بندی کی اور درپیش مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا، بڑے بھائی کی قید سے ایسے طریقے سے رہائی حاصل کی جس پر یقین کرنا مشکل لگتا ہے لیکن صد شکر کہ ان حالات و واقعات کے ثبوت اور چشم دید گواہ ابھی موجود ہیں اور ہمارے بعض کرم فرماؤں نے ان کی تصدیق کر لینے کے بعد مذکورہ بیان کی سچائی بارے لکھ بھی دیا ہے۔

عمر کے جس حصے میں ہم انجانی بلاؤں، جنگلی درندوں اور ظالم ہتھیار بند لٹیروں سے گھر بیٹھے ہوئے بھی ڈرتے رہتے ہیں ڈاکٹر صاحب ان کے ساتھ کھیلتے دکھائی دیے ہیں۔اس کے باوجود کہ وہ اپنے اصولوں اور نظریات پر بھی سختی کے ساتھ کاربند رہے۔میں یہاں پر ڈاکٹر صاحب کی محض چند ایک خوبیوں کی جانب فقط اشارہ کر سکا ہوں یہ ان کی خوبیوں کا بیان نہیں، ان کی شخصیت میں ایک بات بہت نمایاں دیکھی جا سکتی ہے اور وہ ہے ان کے خاندانی جینز کی کارفرمائی اور گھریلو پرورش، انہی کی بدولت بطور ایک فرد ہم واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ اپنی انا کو ہر حال میں قائم رکھنا، مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا، پست ہمت نہ ہونا، مہمان نوازی، کمزور کی حاجت روائی اور کسی کے احسان کو ہمیشہ کے لئے یاد رکھنے جیسی اعلیٰ انسانی صفات نکھر کر سامنے آئی ہیں۔سچ کے ساتھ کھڑے ہونا اور سچائی کا پالن کرتے ہوئے اس پر قائم رہنا بھی ان کی زندگی کے واقعات میں جا بجا نظر آتا ہے۔تعلقات کو نبھانے کے صرف ان کے بیان کئے گئے ایک واقعہ پر ہی غور فرمائیں۔ایک سیانی عمر کے شخص جن کو انہوں نے سنبھالا، ان کی مدد کی اس کے بعد انہوں نے اس شخص کو اپنے باپ کا مقام دے کر زندگی بھر ان کو ساتھ رکھ کر ان کی خدمت کی، انکی آخری رسومات بھی خود ادا کیں۔

ایک پوشیدہ امر جس کا ان کی تحریر میں تو کہیں ذکر نہیں لیکن ان کے دولت خانہ پر جا کر مجھے شاعر کے اس شعر کا مفہوم کھلا کہ شاعر نے یہ کیوں کہا ہوگا۔

لکھا ہوا ہے گھر کی تختی پہ میرا نام
میں کون ہوں کیا ہوں کبھی آ کر بھی دیکھئے

ہوا یوں کہ ایک دفعہ مجھے ڈاکٹر صاحب کے گھر پر حاضری دینے کا موقع ملا، وہاں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان کے گھر کی چار دیواری کے اندر کچھ مشینیں اور لکڑی چیرنے والا چھوٹا آرا نصب ہے دائیں بائیں مختلف اقسام کی لکڑی پڑی ہے جسے کمائی ہوئی یعنی سیزنڈ وڈ کہہ سکتے ہیں، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب شغل اور شوق کے طور پر ورلڈ کلاس فرنیچر بناتے ہیں جو اندرون ملک نہیں بلکہ تمام کا تمام برآمد ہو جاتا ہے، زیادہ تر انگلینڈ میں۔باہر کے ممالک سے کئی لوگ وڈ بھی اپنی بھیجتے ہیں اور ڈیزائن بھی۔اب آپ قارئین کرام مجھے بتائیں کہ ڈاکٹر صاحب کے یہ کام بلکہ کارنامے کتاب لکھنے سے کیا کم ہیں؟

مجھے ان کی زندگی کے ان تمام حالات و واقعات نے بے حد متاثر کیا ہے اور سب سے بڑھ کر اس بات نے کہ وہ ایک پکے اور سچے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ذہن والے ہیومنسٹ ہیں۔یہ بات ان کے بیان کردہ

ہر واقعہ سے ثابت ہوتی ہے کہ کمزور اور غریب لوگوں کے ساتھ بھی انہوں نے وہ بہترین برتاؤ کیا جس کی ہمارے دین میں بہت تلقین کی گئی ہے۔ لالچ، حسد، جھوٹ ظلم، زیادتی اور حق تلفی جیسی عام بیماریاں جو ہمارے معاشرے کا وصفِ خاص بن چکی ہیں ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالی نے ان سے بہت محفوظ رکھا۔

تھوڑا ذکر فرشتے کی ایف آئی آر کا

ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب ان کی اولین تصنیف تھی۔ گو کہ محدود حلقہ میں زیر گردش رہی لیکن اس کتاب کی ہلچل کی مماثلت مہدی حسن کی گائی ہوئی فیض احمد فیض صاحب کی غزل گلوں میں رنگ بھرے جیسی تھی کہ شائقین ان کی اگلی گائیکی کا شدت کے ساتھ انتظار کرنے لگے، بالکل اسی کے مصداق ایک تو فرشتے کی ایف آئی آر پڑھنے والا حیران ہے کہ وہ سچے واقعات پڑھ رہا ہے یا کوئی ناول یا افسانہ۔ دوسرا مذکورہ کتاب کا ہر قاری ڈاکٹر صاحب کی اگلی کتاب کا بے چینی کے ساتھ انتظار کرتا نظر آتا ہے۔ یہ سعادت ہر لکھنے والے کو کہاں نصیب ہوتی ہے اور وہ بھی سنجیدہ اور فقط سچ لکھنے والے کو؟ مذکورہ کتاب اور اس کے مصنف کو اپنے محدود حلقہ میں کم و بیش وہی پذیرائی ملی جو برسوں پہلے پاکستان میں تہلکہ مچانے والی کتاب 'سفر نصیب' اور اس کے خالق جناب مختار مسعود کو ملی تھی۔ یہ میری ذاتی اوبزرویشن ہے ۔

اس کتاب کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا گیا وہ ہے سو فیصد حقیقت لیکن دل پر اثر کرنے میں وہ کسی بھی اعلی ناول یا افسانے سے کم نہیں، تحریر ایسی شستہ و شگفتہ کہ ہر صنف، عمر اور تعلیمی قابلیت والا پڑھ کر پورا حظ اٹھا سکتا ہے۔ اس کتاب کی جاذبیت و پسندیدگی کا اس امر سے بھی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں نے زیر بحث کتاب کی چند ایک لائنیں اپنے ایک قریبی دوست کو سنائیں تو انہوں نے فرمائش کر دی کہ جب کتاب پڑھ لیں تو پھر مجھے بھی دینا حالانکہ پڑھا لکھا ہونے کے باوصف انہیں کتاب بینی کبھی شوق نہیں رہا اور یوں بھی معمری میں وہ جلد سونے اور صبح جلدی بیداری کے عادی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کتاب نے ان کو یوں پکڑا کہ وہ رات کو دو دو بجے تک جاگ کر پڑھتے رہے اور دو تین دن میں کتاب ختم کر لی اس کے بعد اپنے اور دوستوں کو ریکمنڈ کیا کہ یہ پڑھو اور کتاب ان کے حوالے کرتے گئے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی اگلی تصنیف کا شدت سے انتظار کرتے رہے اور جب میں نے انہیں آگاہ کیا کہ ''مشرق کا موتی حوروں کا مسکن'' چھپ کر آ گئی ہے تو انہوں نے تقاضا شروع کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب کو فون کریں اور انہیں کتاب کے لئے درخواست کریں۔ جب یہ کتاب آئی تو سب سے پہلے وہ ہی مطالعہ کے لئے لے گئے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی تحریر کا اثر ہے کہ زندگی بھر کتاب بینی سے اجتناب برتنے والے

ہمارے یہ محترم دوست عام کتب کے نہ سہی لیکن ڈاکٹر صاحب کے زورِ قلم کے قائل ہو گئے ہیں ایک مداح کے طور پر۔ ڈاکٹر صاحب کی اس تصنیف کا راقم تحریر نے ابھی مطالعہ نہیں کیا لیکن توقع رکھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے قلم کا سفر خوب سے خوب تر کی جانب ہی ہوگا اور میں اسے مزید بہتر و عمدہ ہی پاؤں گا تاہم ابھی کوئی مزید رائے نہیں دے سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کو بہت بہت مبارک اور اللہ پاک انہیں پورے خاندان سمیت ہر دکھ بیماری اور مشکل سے محفوظ رکھے آمین۔

نذیر خالد
سابق ڈائریکٹر انفرمیشن بہاول پور و ریذیڈنٹ
ڈائریکٹر بہاول پور آرٹس کونسل، حال مقیم لاہور

خیال اور تعارف

''فرشتے کی ایف آئی آر'' کتاب کے مصنف جناب ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی
شخصیت کا تعارف بصورت منظوم آپ کی نذر

دانڑاں نایاب

کوئی عرصہ دی گال یادے دانڑاں نایاب ڈٹھے
الماس موتی ہیرا ادریس آفتاب ڈٹھے

میکوں نی گال بُھلدی اوہ ویلہ وقت یادے ڈینہہ چڑھدا ویلہ ہوسی جمیلہ وقت یادے
میں سورج اُبھردے ویلے ڈینہہ اُبھردا آفتاب ڈٹھے الماس موتی ہیرا ڈینہہ اُبھردا آفتاب ڈٹھے

کوئی عرصہ دی گال یادے دانڑاں نایاب ڈٹھے

میں خان مسعود آکھیا، آ دانڑاں میں ڈکھانواں میں انپڑیں اکھیں ڈٹھے اوہ موتی میں ڈکھانواں
توں نہ منسیں خاناں محبوب شباب ڈٹھے الماس موتی ہیرا ڈینہہ اُبھردا آفتاب ڈٹھے

کوئی عرصہ دی گال یادے دانڑاں نایاب ڈٹھے

کیا پھُل گلاب اکھے لکھ لہاندی اُوندی اکھے میں اپڑیں اکھی ڈٹھے من بھاندی اوندی اکھے
اتنی حسین اکھے کیا جادو مہتاب اکھے الماس موتی ہیرا ڈینہہ اُبھردا آفتاب ڈٹھے

کوئی عرصہ دی گال یادے دانڑاں نایاب ڈٹھے

خان میڈی گال من تے، ادریس کوں کھڑتے ڈٹھا اس ڈوہیں رلے لتے ادریس کو کھڑ تے ڈٹھا
اساں تاں نال ونج تے کیا خوب شباب ڈٹھے الماس موتی ہیرا ڈینہہ اُبھردا آفتاب ڈٹھے

کوئی عرصہ دی گال یادے دانڑاں نایاب ڈٹھے

ادریس دے سامنڑیں آتے کوئی گال میں نہ کیتی بہوں سوہنڑا گھبرو نینگر بلقیس دی محبت جیتی
میں کہیں کوں محبت کریندا میں خود بے حجاب ڈٹھے الماس موتی ہیرا ڈینہہ اُبھردا آفتاب ڈٹھے

کوئی عرصہ دی گال یادے دانڑاں نایاب ڈٹھے

اساں ڈوہیں خود ڈٹھا، آفتاب نرگس اکھیں اساں ڈوہیں رلے رلتے ڈٹھا مہتاب نرگس اکھیں
کیا خوش نما اوہ اکھ ہئی، کیا اکھ تے آداب ڈٹھے الماس موتی ہیرا ڈینہہ اُبھردا آفتاب ڈٹھے

کوئی عرصہ دی گال یادے دانڑاں نایاب ڈٹھے

پنوں رزادہ رب گواہ ہے، کھڑی جانڑدی ذات خدا ہے ساڈے دل دی ہوک اُوں کوں رب ڈتی زندگی ودھا ہے
ہنڑ جڈانوی اساں ڈٹھے آفتاب شباب ڈٹھے الماس موتی ہیرا ڈینہہ اُبھردا آفتاب ڈٹھے

(بزم شاد کے صدر) روح ادب **پنوں زادہ شاد**

باب1: نائیجیریا(1981ء)

بقول شاعرؔ:

یہ شہر سحر زدہ ہے سحر کسی کی نہیں
یہاں خود اپنے لیے بھی دعا کسی کی نہیں
میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گماں نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

نائیجیریا

(1981ء)

روم (اٹلی) کے بہت ہی پُر رونق ائرپورٹ سے کانو (نائجیریا) کے لیے اطالیہ ائرلائن کا جمبو جیٹ پرواز کے لیے تیار تھا۔ مجھ سمیت تمام مسافر لاؤنج میں بیٹھے وسیع وعریض شیشوں کے اُس پار دنیا جہاں کی فلائٹس کو لینڈ اور ٹیک آف کرتے دیکھ دیکھ کر اُکتا چکے تھے۔ لاؤنج میں بھی دنیا کے مختلف ممالک کے لوگ موجود تھے۔ زبان، کلچر، لباس، رنگ ونسل اور منزل سب کی اپنی اپنی تھی۔ بس اپنی اپنی فلائٹس کے انتظار کا کرب سب کا مشترکہ تھا۔

لاؤنج صاف ستھرا، تمام سہولیات سے مزین اور خوبصورت سٹاف سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ حسن و جمال کا ایک جنگل تھا۔ ہرنیاں، مورنیاں، شیرنیاں، چکوریاں، بلبلیں، ناگنیں، خرگوش، ریچھنیاں، ہتھنیاں، بطخیں، کونجیں اور مرغابی ٹائپ حسینائیں موجود تھیں۔ لباس مختصر، حسن بے حجاب و بے نقاب، آنکھوں میں سرور و مستی کی سی کیفیت۔ اپنی اپنی فلائٹس کا اعلان ہوتے ہی اپنے ہینڈ بیگز اور ٹرالی بیگ کھینچتے ہوئے بھاگم بھاگ گیٹ نمبروں پر نظر ڈال کر اپنا گیٹ تلاش کرنا اور تن من کا ہوش نہ رکھنا، دیدبانی کرنے والے پردیسیوں کے لیے ایک مشکل لمحہ اور سماں پیدا کر رہا تھا۔ جارج آرویل نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف The animal farm میں کچھ ممالک اور چند لیڈروں کے لیے جانوروں کے نام symbolically استعمال کیے ہیں۔ میں نے ملٹی نیشنل خواتین کی جسمانی ساخت کو اجاگر کرنے کے لیے چرند پرند اور درند کو symbolically استعمال کیا ہے۔

اسی اثناء میں کانو (نائجیریا) کے لیے فلائٹ کا اعلان ہوا۔ میں اپنے متعلقہ گیٹ کے سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اُٹھا اور نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا قطار میں کھڑا ہو گیا۔ اپنی باری آنے پر بسم اللہ کا وِرد کرتا جہاز میں سوار ہو گیا۔ ایک عمر رسیدہ ائرہوسٹس کی مدد سے اپنی سیٹ کی نشاندہی کروا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں جہاز ٹیکسی کرتا ہوا رن وے پر آیا اور پرواز کر گیا۔ میری منزل کانو تھی۔ میں پہلی بار افریقہ جا رہا تھا۔ اس سے پہلے مجھے افریقہ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ دل میں کوئی خوف وخدشہ نہیں تھا۔ بس لندن میں گزرے دنوں کی کثافت اور تلخی ذہن میں باقی تھی جس کا تفصیلی ذکر میری تصنیف ''فرشتے کی ایف آئی آر'' حصہ اول میں موجود ہے۔

فلائٹ smooth as silk تھی۔ جہاز کے اندر کا ماحول رنگین کے بجائے سنگین تھا۔ لوگ حسبِ ہمت

مفت کی شراب اُڑا رہے تھے جس کی وجہ سے ایک ناگوار سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی بھی ائر ہوسٹس چونکا دینے والی نہ تھی۔ میں نے پانی اور soft drinks پر گزارہ کیا۔ کیونکہ کھانا بھی pork اور دیگر حرام چیزوں پر مشتمل تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خود سے عہد کیا کہ آئندہ کبھی اطالیہ ائر لائن پر سفر نہیں کروں گا اور یہ عزم آج تک قائم ودائم ہے۔ فلائٹ میں تمام وقت بے چینی میں گزرا جس کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار رہا۔ مزاج بھی برہم ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ منزل پر پہنچنے کا اعلان ہوتے ہی میں نے سکھ کا سانس لیا۔ مقامی وقت کے مطابق رات کے دس بجے تھے اور درجہ حرارت 32 تھا۔ تیز بارش ہو رہی تھی۔ جہاز سے اُتر کر بھاگم بھاگ بس میں سوار ہوا جو ساتھی مسافروں سے بھر چکی تھی۔ لاؤنج پہنچے تو اسے بھی مایوس کن پایا۔ کہاں لندن اور روم کی چکاچوند اور کہاں کا نوائر پورٹ کا لاؤنج۔ رات کالی اور بارش والی، کڑکتی بجلی ایسا معلوم پڑتا کہ ابھی اوپر آ گرے گی۔ امریکن، انگلش، اٹالین اور دیگر دنیا جہاں سے ہر رنگ اور نسل کے لوگ ہاتھوں میں اپنا اپنا پاسپورٹ لیے لائن میں کھڑے اور ان کے بیچوں بیچ ایک پاکستانی، ادریس احمد آفتاب، اپنے ملک کا سبز پاسپورٹ تھامے اپنی باری کے انتظار میں کھڑا تھا۔

امیگریشن والوں کا رویہ بہت نازیبا تھا۔ خاص طور پر سفید چمڑی والوں سے وہ توہین آمیز لہجے میں بات کر رہے تھے۔ میں اُن کو observe کرتا رہا اور آخر لائن سے باہر آ گیا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اُن کا سپروائزر آفیسر ایک طرف کھڑا سب پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ ایک انڈین میاں بیوی بمعہ ایک بچے کے اُن کے پاس گئے اور اپنا پاسپورٹ اُس کو دیا۔ اس نے پاسپورٹ کھولا تو اس میں امریکن کرنسی موجود تھی۔ وہ مسکرایا اور اُن کو لے کر اپنے کیبن میں چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ کسٹم ہال کی طرف جا رہے تھے۔ میں بھی بلا تکلف اُسی آفیسر کی طرف چلا گیا۔ ہیلو! کہتے ہوئے میں نے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ گرم جوشی سے ملا اور بولا How can I help you? میں نے اسے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ you are the only person who can help me وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا You are welcome! میں نے اسے اپنا پاسپورٹ دیا جس میں 10 ڈالر والا نوٹ بھی تھا۔ نوٹ پا کر وہ بچوں کی طرح خوش ہوا۔ میرے پاسپورٹ پر مہریں لگائیں، دستخط کیے اور پاسپورٹ مجھے تھما دیا۔ میں نے اسے ایک نوٹ اور دیا اور بتایا کہ میں لندن سے آ رہا ہوں اس لیے yellow fever, cholera, small pox ودیگر وبائی امراض کی ویکسینیشن نہیں کروا سکا۔ مجھے ویکسینیشن کارڈ بنوا دیں تاکہ مجھے نائجیریا میں سفر کرتے اور واپسی پر تکلیف نہ ہو۔ وہ پھر مسکرایا اور بولا My friend no problem! اُس نے گنٹی بجا کر ایک باوردی شخص کو بلایا اسے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ وہ سیلوٹ کر کے بھاگم بھاگ ایک لیڈی ڈاکٹر کو بلا لایا جو بھاری بھرکم تھی اور پھولے ہوئے سانس کے ساتھ آ کر دھڑام سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ آفیسر نے اُس سے اپنی زبان میں مدعا بیان کیا۔ وہ میری طرف مہربان نظروں سے دیکھ کر مسکرائی۔ آفیسر نے مجھ سے پوچھا کہ

vaccination card انجکشن لگوا کر بنوانا ہے یا بغیر انجکشن کے؟ اور ساتھ ہی دونوں صورتوں میں الگ الگ فیس بھی بتا دی۔ میں نے سوچا کہ افریقہ میں yellow fever and malaria دونوں جان لیوا امراض کا بہت خطرہ ہے اس لیے vaccination کروالینی چاہئے۔ میں نے آفیسر کو اپنی چوائس بتائی تو وہ اور ڈاکٹر دونوں خوش ہوئے اور بولے "Your are a gentleman!"۔ وہ اُٹھتے ہوئے بولی Please follow me! میں اس کے ساتھ اس کے آفس میں آ گیا۔ غالباً وہ یہاں کی انچارج تھی۔ آتے ہی اس نے آرڈر پاس کرنے شروع کر دیے۔ دیگر سٹاف اس کے حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ ایک نرس آ گئی۔ اس نے مجھے انجکشن لگائے اور کارڈ بنا کر لیڈی ڈاکٹر کے سامنے رکھا تو اُس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے جیب سے ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا کہ یہ آپ کے لیے گفٹ ہے۔ وہ انجان بن کر مجھ سے پوچھنے لگی کہ آپ مجھے گفٹ کیوں دینا چاہتے ہیں۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا As a gesture of friendship and for your kind cooperation وہ بولی Is it bribe? میں نے کہا No! Not bribe وہ خوش ہو کر بولی کہ مجھے bribe لینا پسند نہیں اور یہ جرم ہے۔ اُس نے جھٹ پٹ میرے کارڈ پر مہریں لگا کر دستخط کیے اور کھڑے ہو کر مجھے پیش کیا۔ سامنے ہی کسٹم ہال تھا۔ میں نے وہاں کا سرسری جائزہ لیا تو وہاں لوگوں کے بیگز کھلے اور سامان بکھرا دیکھ کر افسوس ہوا۔ میں ایک بار پھر اُسی آفیسر کے پاس گیا اور تعاون کرنے پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرے پاس میرے کپڑوں اور ضرورت کی کچھ اشیاء کے علاوہ کچھ نہیں مگر اس طرح سامان کا بکھرنا اور دوبارہ پیک ہونا مجھے پسند نہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چل کر مجھے کلیر کروا دے۔ ساتھ ہی میں نے ایک اور نوٹ اس کی طرف لہرایا۔ وہ بے قابو ہو کر مجھ سے لپٹ گیا اور بولا OhMy friend you are great!

ہم دونوں بڑے طمطراق کے ساتھ کسٹم ہال میں داخل ہوئے۔ اس نے جاتے ہی کسٹم آفیسر سے میرا تعارف بطور دوست کروایا اور مجھے کہا کہ اپنا سامان ٹرالی پر رکھ کر لے آئیں۔ میں نے فوراً سامان پہچان کر ٹرالی پر رکھ لیا۔ کسٹم آفیسر نے کلیر کر دیا۔ آفیسر مجھے باہر گیٹ تک چھوڑنے آیا اور ہاتھ ملا کر واپس چلا گیا۔ رات کے 12:30 بج چکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میرے ہم زلف ایف اے ناصر مجھے لینے آئے ہوں گے مگر یہ حسرت ناتمام ہی رہی۔ بارش بہت زور و شور سے جاری تھی۔ بجلی کی کڑکڑاہٹ لرزا کر رکھ دیتی تھی۔ باہر آنے پر ٹیکسی والوں نے گھیرنا شروع کر دیا۔ خطرناک موسم، خوفناک چہرے، نشے میں دھت، مسافروں سے زور زبردستی، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی، شور شرابہ۔۔۔ یہ تھا پورے ائرپورٹ کے اندر اور باہر کا ماحول۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے ساری رات یہاں کھڑا رہنا پڑے میں ان ٹیکسی ڈرائیوروں کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ ایک ڈرائیور تقریباً 20 بار میرے پاس آیا۔ نشے میں دھت اپنی مقامی زبان میں نہ جانے کیا بکتا رہا۔

اسی اثناء میں Prince hotel کی وین اپنے کسٹمرز کو لینے کے لیے آ کر رکی۔ میں بھاگ کر وین میں سامان سمیت سوار ہو گیا۔ چند منٹ بعد ہی میں ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھا خود کو محفوظ محسوس کر رہا تھا۔ کاؤنٹر پر جا کر کمرہ بُک کرنے کا کہا تو اُس نے آنکھیں گھما کر لمبا سا NO کہہ دیا۔ خیر میں نے لاؤنج کا واش روم استعمال کرتے ہوئے خود کو فریش کیا اور لاؤنج میں گھوم پھر کر ماحول کا جائزہ لیا۔ زیادہ تر سٹاف مقامی ہی تھا۔ اکثریت خواتین کی تھی۔ میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ میں نے اپنے پاسپورٹ میں دس ڈالر کا نوٹ رکھا اور سیدھا کاؤنٹر کے بائیں طرف بنے سپروائزر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچتے ہی میں نے اُسے کہا Hello my friend! اس نے بھی برملا کہا How are you? Thankyou sir! I am fine. What can I do for you? میں نے ڈالر سے لبریز اپنا پاسپورٹ اس کو دیا اور کہا کہ میں گذشتہ چوبیس گھنٹوں سے بے آرام ہوں، مہربانی فرما کر مجھے accomodate کریں۔ اُس نے پاسپورٹ کھولا تو نوٹ دیکھ کر بولا کہ یہ یہاں کیوں ہے۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کے لیے گفٹ ہے کیونکہ میں آپ کو اپنا دوست کہہ چکا ہوں۔ وہ خوشی سے اُٹھا اور جھک کر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں نے شیشے کے دوسری طرف دیکھا تو وہ booking chart پر جھکا ہوا تھا اور میرے پاسپورٹ کو دیکھتے ہوئے رجسٹر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کام بن گیا ہے۔ وہ میرے پاس واپس آیا اور بولا کہ میرے دوست میں نے تمھاری خاطر بہت بڑا رسک لیا ہے۔ اس وقت صبح کے پانچ بجے ہیں۔ کل صبح سات بجے تک آپ کو ہر حالت میں کمرہ خالی کرنا پڑے گا ورنہ میری نوکری ختم ہو جائے گی کیونکہ اس کمرے کی ایڈوانس بکنگ میامی (امریکہ) سے کی گئی ہے۔ آٹھ بجے گیسٹ تشریف لے آئیں گے۔ میں نے اس کی تسلی کروائی کہ میرا کانو میں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں، میں اپنی نیند پوری کر کے Jos (Plateau state) روانہ ہو جاؤں گا۔ وہ یہ سن کر مطمئن ہو گیا اور ایک بار پھر جھک کر میرا شکریہ ادا کیا۔ اتنی دیر میں سروس بوائے میرا سامان ٹرالی میں رکھ چکا تھا۔ ہم لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر موجود کمرے میں آ گئے۔ سروس بوائے نے میرا سامان رکھا اور کہنے لگا Sir any service for me? میں نے نفی میں جواب دیا تو دوبارہ اپنی آنکھ دبا کر بولا Sir any more service for me? میں نے اس کا بازو پکڑا اور کمرے سے باہر نکال کر دروازہ لاک کر لیا۔ کمرہ آرام دہ تھا۔ واش روم بھی ماڈرن سٹائل کا تھا۔ کمرے کے دروازے کے باہر Donot disturb کا ٹیگ لگا کر بستر پر لیٹا تو پھر کچھ ہوش نہ رہا۔ اتنی گہری نیند آئی کہ شام 6 بجے تک سوتا رہا۔ اُٹھتے ہی واش روم کی راہ لی اور شاور لے کر تازہ دم ہوا۔ گذشتہ تمام واقعات ایک فلم کی طرح ذہن میں گھومنے لگے تو اپنے ذہن کو جھٹک کر لاؤنج میں آ گیا۔ وہاں ہر رنگ و نسل کے لوگ اور گہما گہمی تھی۔

نائجیر یا 36 ریاستوں کی فیڈریشن کا نام ہے۔ ہر قوم و قبیلہ اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ بعض قبیلوں کی

شناخت تو ان کے چہروں پر خنجر سے کھدی ہوتی ہے۔جس سے چہرہ مزید خوفناک ہو جاتا ہے۔ ہر قبیلے کی اپنی زبان ہے۔اس لیے مقامی طور پر بہت سی زبانیں رائج ہیں اور سرکاری زبان انگلش ہے۔خواتین میں ہر سطح پر آرائش و زیبائش کا رواج ہے۔سب خواتین اپنی اپنی بساط کے مطابق سجی سجائی سکرٹ اور بلاؤز، جینز اور کُرتی، کوٹ پینٹ میں موجود تھیں۔فیشن ایبل، نیم فیشن ایبل، کچھ معقول لباس میں سکارف لپیٹے ہوئے تھیں۔خواتین کی ایک اور نسل جو میں نے پہلی بار دیکھی جن کو یہ لوگ ایبو (Eebo) لیڈیز کے نام سے پکار رہے تھے۔ایبو لیڈیز کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

اُونچا لمبا قد، گورا چٹا رنگ، خوبصورت گول مٹول آنکھیں، سر کے بال آدمیوں کی طرح نہ ہونے کے برابر مگر سخت گھنگھریالے۔دیگر نشیب و فراز بھی کسی آفت کی پرکالہ سے کم نہ تھے۔ہاتھ پاؤں بھی بڑے بڑے۔میک اپ کی بہتات ایک عجیب سا نظارہ دے رہی تھی۔کچھ نے مصنوعی بال لگا رکھے تھے۔دراصل یہ breed انہوں نے خود پیدا کی ہے۔اگر والد یورپ سے تو والدہ مقامی کالی (افریقن) اور اگر والدہ یورپ سے تو والد مقامی کالے (افریقن)۔نتیجہ ایبو کی شکل میں ہی آئے گا۔اگر ایبو لیڈی فُل میک اپ میں تشریف فرما ہو اور اس نے مصنوعی وِگ نہ لگائی ہو، وہ ایک سرخ تربوز کی مانند لگتی ہے جس کو دکاندار دو حصوں میں کاٹ کر گاہک کو متوجہ کرنے کے لیے دکان پر سجا لیتا ہے۔باقی ہر رنگ و نسل کے مرد و خواتین کی biological حالتِ زاران کے اعمال، ماحول اور قبائل کے مطابق تھی۔

میں نے اطمینان سے لاؤنج میں موجود لوگوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈائننگ ہال کا رخ کیا۔لیکن وہاں حرام ہی حرام دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔حالانکہ نائجیریا میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور اُس وقت وہاں الحاج شیخو شنگاری کی حکومت تھی جو یعقوبو گوان کے بعد حکومت میں آئے تھے۔اُن کے ایک گورنر جنہیں Lion of Juda کہا جاتا تھا ان گنت بار بغیر کسی پروٹوکول کے پاکستان تشریف لائے۔وہ پاکستان کو اپنا گھر بتایا کرتے تھے۔انہیں بعد میں شہید کر دیا گیا تھا۔

بڑی مشکل سے مچھلی، سلاد اور سوفٹ ڈرنکس سے گزارہ کیا مگر تسلی نہ ہوئی کیونکہ گذشتہ دو دن سے بھوکا تھا۔میں نے زندگی میں کبھی غیر مسلم کھانا نہیں کھایا چاہے جتنے دن بھوکا رہنا پڑے۔فروٹ، ڈرائی فروٹ، کھجور اور شہد میرے بہترین ساتھی ہوتے تھے۔ایک شعر از راہِ تفنن بہ زبانِ شاعر لکھ رہا ہوں کیونکہ بظاہر کچھ مسلمان لوگ پوچھ رہے تھے کے چکن اور بیف حلال ہے یا حرام جبکہ بیشتر نے ہاتھوں میں جام پکڑے ہوئے تھے۔

تمھاری دعوت بس قبول مجھ کو
پر اس بات کا خیال رکھنا

بیئر چاہے کسی بھی برانڈ کی ہو
چکن فرائیڈ حلال رکھنا

رات دس بجے تک لاؤنج، ڈائننگ ہال، بار روم اور نائٹ کلب کے نظارے دیکھتا رہا۔ مرد وخواتین شراب میں دھت ناچ ناچ کر اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ میں بھی اکتا چکا تھا لہٰذا اپنے کمرے میں آ کر صبح کا شیڈول سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ صبح کانو کی مسجد سے آذان کی آواز سن کر دل خوش ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف کا وِرد کرتے ہوئے اٹھا، تیار ہو کر نمازِ فجر ادا کی۔ سامان پیک کیا اور نیچے ڈائننگ ہال کا رخ کیا۔ اُبلے ہوئے انڈے، شہد اور کھجوروں پر ہی اکتفا کیا۔ دیگر مشکوک چیزوں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ آج طبعیت تر و تازہ تھی۔ تھکاوٹ نام کو نہ تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سروس بوائے کو کہا کہ میرا سامان لے آئے۔ اتنے میں میرا دوست سپروائزر بھی آ گیا۔ مجھے اور میرے سامان کو تیار دیکھ کر اُس نے اطمنیان کا سانس لیا اور کئی بار میرا شکریہ ادا کیا۔ بل وغیرہ ادا کرنے کے بعد پانچ ڈالر کا الوداعی نوٹ میں نے اس کی جیب میں ٹھونس دیا۔ وہ بے حد خوش ہوا اور اسی خوشی میں جب وہ دو چار ٹھمکے لگا چکا تو میں نے اسے کہا کہ مجھے کرایے پر ایک کار چاہئے جو مجھے کانو شہر کا ایک چکر لگوائے اور پھر Jos چھوڑ آئے۔ ڈرائیور جب تک میرے ساتھ ہو نہ سگریٹ پیئے نہ شراب۔ اوور سپیڈنگ اور جلد بازی بھی نہ کرے۔ کرایہ آپ اپنے سامنے طے کروا دیں۔ اگر ڈرائیور نے میری تابعداری کی تو میں اسے بھی خوش کر دوں گا۔ وہ بولا میرا بھائی یہ بزنس کرتا ہے۔ اس کی اپنی گاڑی ہے جو صرف اسی ہوٹل کے لیے کام آتی ہے۔ وہ باہر موجود ہے، میں اُسے بلاتا ہوں۔ اُس نے ایک سروس بوائے سے اپنی زبان میں کچھ کہا تو وہ بھاگتا ہوا گیا اور ایک نوجوان لڑکے کے ہمراہ واپس آیا۔ وہ دونوں کچھ دیر آپس میں بات کرتے رہے۔ آخر میرا ان سے کرایہ اور ڈسپلن کا معاملہ طے پا گیا۔ ڈرائیور کا نام حاجی موسلے کونڈا تھا۔ اس کے پاس اچھی حالت کی فرنچ گاڑی Peugeot تھی۔ میرا سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا اور سب مجھے سی آف کرنے ہوٹل کی پارکنگ تک میرے ساتھ آئے۔ میں اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ایک نئی دنیا کی دریافت پر نکل کھڑا ہوا۔ کانو ریاست کا دارالخلافہ کانو شہر ہے۔ دیگر جو کچھ میرے علم میں آیا بلا کم و کاست لکھ رہا ہوں۔

کانو عرصہ دراز سے چمڑے کی مصنوعات کے لیے مشہور ہے۔ زیادہ تر نارتھ افریقہ کو ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ لندن میں جو لیدر مرا کو لیدر کے نام سے مشہور ہے وہ دراصل کانو میں ہی تیار کر کے لندن ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ دوسرا بڑا آئٹم افریقن آرٹ اینڈ کرافٹ ہے جو یورپ اور دیگر ممالک میں ایکسپورٹ کیا جاتا ہے۔ کانو میں ایک بہت خاص artistic کام ہوتا ہے جو پوری دنیا میں مقبول ہے جو Weaving and dyeing of Indigo cloth ہے۔ کانو شہر Sahara desert کے جنوبی کنارے پر واقع ہے اور Hausa قبائل کی آماجگاہ

ہے۔آبادی کے لحاظ سے یہ نائجیریا کا دوسرا بڑا شہر ہے۔اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن اب احمدی مذہب کے لوگوں نے اپنی مسجدیں، کمیونٹی سنٹر اور شفاخانے تعمیر کر کے مقامی آبادی کو احمدی بنالیا ہے اور وہ خود کو مسلمان کہتے ہیں جو کہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔مسلمان تنظیموں کو اس پر خصوصی توجہ دینی چاہئے تاکہ افریقن لوگوں کی سادگی اور کم علمی کا یہ لوگ ناجائز فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔

ڈرائیور نے مجھے کانو شہر کا چکر بڑی تفصیل سے لگوایا۔کُرمی مارکیٹ (Kurmi market)، عظیم مسجد، Gidan Makama Museum اور کچھ گرجا گھر وزٹ کیے۔ہمارا سفر کافی لمبا تھا اس لیے ایک مسلم ہوٹل میں کھانا کھا کر Jos کی راہ لی۔سڑک نئی تعمیر شدہ تھی اس لیے کار ہموار اور تیز جا رہی تھی۔Jos جو J.Town کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے کانو سے تقریباً 315 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ہم آرام سے سفر کرتے رات 8 بجے خیریت سے Jos پہنچ گئے۔میرے پاس ایف اے ناصر صاحب کا صرف فون نمبر تھا۔ان کی رہائش کی لوکیشن مجھے معلوم نہ تھی۔ان کے ساتھ میری خط و کتابت منسٹری آف ایگریکلچر کے ایڈریس پر ہوتی تھی۔میں نے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے کسی بھی اچھے سے ہوٹل لے چلو۔وہ بولا کہ ہمارے ہوٹل کی برانچ Jos میں بھی ہے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔وہ مجھے سامان سمیت ہوٹل کے لاؤنج میں چھوڑ کر اپنا کرایہ اور ٹپ لے کر خوشی خوشی چلا گیا۔

میں نے ہوٹل سے کچھ ڈالر مقامی کرنسی میں تبدیل کروائے۔مقامی کرنسی کا نام نیارا تھا۔پاکستانی کرنسی کے مطابق ایک نیارا 17 روپے کے برابر تھا۔ فون کرنے پر فوراً ہی میرا رابطہ F.A.Nasir سے ہو گیا جو میرے ہم زلف تھے۔وہ کافی حیران ہوئے مگر بھاگم بھاگ میرے ہوٹل چلے آئے اور مجھے اپنے ساتھ ٹوڈو۔واڈا لے گئے جہاں ان کی رہائش تھی۔یہ ٹوڈو۔واڈا ایک رہائشی علاقہ تھا جہاں صرف غیر ملکی رہائش پذیر تھے۔

رات کو گپ شپ ہوتی رہی۔کھانے کھا کر فرحت محسوس ہوئی کیونکہ کافی دن بعد گھر کا کھانا نصیب ہوا تھا۔ رات گیارہ بجے ناصر صاحب بولے آپ آرام کریں۔سفر کی وجہ سے آپ کے چہرے پر تھکاوٹ ہے۔مجھے بھی صبح آٹھ بجے دفتر جانا ہوگا لہٰذا شب بخیر! میں اپنے کمرے میں جا کر سو گیا اور صبح دیر تک سویا رہا۔جب ناصر صاحب دفتر سے فارغ ہو کر گھر آئے تو میں چاق و چوبند تیار بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔کھانا کھانے کے بعد وہ بولے کہ چلو تمھیں شہر کی سیر کروا آؤں، مجھے ایک کام بھی ہے لہٰذا چلتے ہیں۔Jos ایک صاف ستھرا شہر تھا۔صوبائی دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے تمام سہولیات سے آراستہ تھا۔نیم پہاڑی علاقہ تھا۔ناصر صاحب مجھے کئی جگہوں پر لے گئے۔شاپنگ سنٹرز، پارکس اور دیگر کئی قابلِ ذکر بلڈنگز دکھائیں۔آخر میں اپنے ایک عراقی دوست کی طرف لے گئے جو Jos یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ان کا نامِ گرامی پروفیسر الجبوری تھا اور اپنے فلیٹ میں اکیلے رہتے تھے۔مگر ان کی سٹوڈنٹس سے ان کا فلیٹ شاد و آباد اور پررونق تھا۔گھر کا کام کاج بھی ہو رہا تھا، پکوان بھی بن رہے تھے، علمی و ادبی

گفتگو بھی جاری تھی۔

Jos کی مقامی زبان میں 'آپ کا کیا حال ہے' کہنا ہو تو ''نا گوڈے ڈے یا وا'' بولا جاتا ہے۔اس کے جواب میں کہا جاتا ہے ''صنو صنو'' یعنی میرا حال اچھا ہے۔اسی طرح گھومتے پھرتے ایک ہفتہ گزر گیا اور میں کچھ راستوں کا واقف بھی ہو گیا۔ پروفیسر الجبوری کے فلیٹ تک اکیلا جانے لگا۔Jos یونیورسٹی بھی جانے لگا۔ٹوڈو۔واڈا کے رہائشی علاقے میں بھی جان پہچان ہونے لگی۔تمام رہائشی فلیٹس تین منزلہ اور ایک دائرے کی شکل میں تھے۔میں اس علاقے میں نیا تھا اس لئے سب کو معلوم تھا کہ میں پاکستان سے آیا ہوا مہمان ہوں۔ناصر صاحب سے اوپر والے فلیٹ میں ایک مصری لیڈی ڈاکٹر اپنے شوہر اور ایک بچے کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔خاوند سول انجینئر تھا۔خود وہ المرتلا محمد ہسپتال میں فزیشن تھی۔میاں بیوی دونوں ڈیوٹی پر چلے جاتے۔بچہ ایک مقامی کالی لڑکی کی تحویل میں ہوتا۔جو اُس کو صبح سے شام 4 بجے تک فلیٹ کی سیڑھیوں پر لے کر بیٹھی رہتی۔اکثر بچے کے رونے کی آواز آتی رہتی۔۔چار بجے جب ماں اپنی ڈیوٹی سے واپس آتی تو بچے کے رونے کی آواز بند ہوتی۔بالکل سامنے والے فلیٹ میں ایک خوش مزاج فلپائنی لیڈی ڈاکٹر اکیلی رہتی تھی جو ابھی تک سنگل تھی۔اکثر فلیٹس میں پوری فیملیز قیام پذیر تھیں۔ناصر صاحب سمیت کسی بھی شوہر نامدار کو اس بیچاری قسمت کی ماری لیڈی ڈاکٹر کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔تمام شوہر چاہے وہ کسی بھی عہدے پر فائز تھے، خاموشی سے کار کے دروازے بند کر کے، سامان اور بچوں کو سنبھالتے اپنے فلیٹس کی طرف رواں دواں رہتے جبکہ بیگمات خونخوار نظروں سے چاروں طرف دیدے گھماتی رہتیں۔فلپائنی لیڈی ڈاکٹر صبح ہسپتال جاتے ہوئے سب کے ساتھ ہیلو ہائے کرتی اور واپس آ کر شارٹس پہن کر فلیٹ کی بالکونی میں سامنے رکھی کرسی پر ٹانگیں لمبی کر کے بیٹھ جاتی اور قدرت کے عطا کردہ نظاروں سے لطف اندوز ہوتی رہتی۔اکثر لوگ اپنی بیویوں کی نظر بچا کر جلدی جلدی ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے مسکراہٹ نچھاور کر دیتے۔جس کی وجہ سے اکثر فلیٹوں کی بالکونیاں نہ صرف ویران ہو گئیں بلکہ ان کے دروازے بھی مستقل بند ہو گئے۔

میں آتے جاتے اس کی طرف صرف مسکراہٹ نہیں بلکہ بتیسی کا پورا گول گپہ اچھال دیتا۔اگر کبھی اکیلا سڑک پر پیدل جاتے مل جاتا تو وہ گاڑی روک کر شیشہ نیچے کرتی اور کہتی Aftab please come in میرے تکلف کرنے پر گاڑی سے نیچے اترتی اور کہتی !O come on plz میں جہاں کہتا مجھے چھوڑ آتی یا لے کر سڑکوں پر گھومتی۔میں نے Jos کے تمام پارکس، میوزیم اور سٹار ہوٹلز اس کے ساتھ گھومے۔میں اکثر اس کے پاس فلیٹ کی بالکونی میں جا کر بیٹھ جاتا۔میرے میزبانوں اور محلے داروں کو سخت اعتراض ہوتا۔وہ دبے دبے الفاظ میں اظہار بھی کر چکے تھے۔میں نے اپنے میزبان کو جواب دیا کہ ''اگر آپ لوگوں میں برداشت اور پازیٹیو سوچ کی صلاحیت

نہیں تو میں اپنا سامان لے کر اُسی کے پاس شفٹ ہو جاتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے آپ لوگوں سے ملنے جلنے سے نہیں روکے گی۔ اس بیچاری لیڈی ڈاکٹر کا کوئی قصور نہیں ہے وہ اپنے کلچر اور ماحول کے مطابق زندگی بسر کر رہی ہے جبکہ آپ کی بیویوں کو آپ لوگوں پر ذرا برابر بھی اعتبار نہیں ہے اور نہ ہی آپ لوگ یوسفِ ثانی ہیں کہ وہ آپ پر مر مٹے۔ اگر میں آپ کی بیگمات کو آپ کی دن بھر کی رپورٹ دے دوں اور صرف اتنا بتا دوں کہ میں نے کس کس کو پارکس، سٹار ہوٹلز اور شاپنگ مالز میں کن کن خواتین کے ساتھ خوش گپیاں کرتے دیکھا ہے تو پھر آپ کا کیا بنے گا جنابِ عالی!''؟ ناصر صاحب تو ویسے ہی قدیم روح تھے (Archaic soul) اور نفسیاتی کیفیت (Stockholm syndrome) میں مبتلا رہتے تھے۔ میرے صرف ایک رَگ دبانے سے امن اور سکون ہو گیا۔

لیڈی ڈاکٹر جس کا نام کرسٹینا تھا منیلا کے مضافات کی رہنے والی تھی۔ ماں فوت ہو چکی تھی۔ باپ کا پتہ نہیں تھا۔ نانا نے پالا پوسا اور اچھی تعلیم دلوائی۔ میڈیکل سپیشلسٹ تھی اور المرتلا محمد ہسپتال میں فزیشن کے عہدے پر فائز تھی۔ سوشل لائف میں قاتل حسینہ تھی یعنی (glowing, such as lethal moisture) اور ساتھ ساتھ شیمپین (ڈیکوری مارگریٹا) (Dom Paerignon) کی رسیا تھی۔ وہ ایک ناکام عاشق تھی۔ نرم دل، سچ بولنے والی، منافقت سے پاک، متاثر کن شخصیت تھی۔ بلکہ مجھے تو وہ Alpha Animal (اکسانے والی) لگتی تھی۔ البتہ جب بھی لکھنے، پڑھنے یا بات چیت میں والد کا ذکر آتا تو اس کی کیفیت عجیب سی ہو جاتی۔ آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ مجھے بھی دکھ ہوتا۔ میں اکثر اس کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ غیر اسلامی دنیا میں صرف ماں ہی سب کچھ ہوتی ہے:

Maternity is certainity but paternity is any body guess

غیر اسلامی نظام جس میں ماں کا ہونا یقینی ہے اور باپ کا ہونا اندازوں اور اندیشوں کا ہونا ہے۔ جبکہ اسلامی نظام میں ماں کے ساتھ ساتھ باپ کا ہونا بھی بہت اہم ہے۔ اگر جنت ماں کے قدموں تلے ہے تو باپ بابِ جنت ہے۔ وہ کہتی کاش میں بھی اسلامی دنیا میں پیدا ہوتی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اسلامی دنیا میں پیدا ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا ماخذ ہے لیکن تم اپنی اسلامی دنیا خود بنا سکتی ہو اور یہ صرف خوش قسمت لوگ ہی کر سکتے ہیں اور اللہ کے نزدیک افضل ہوتے ہیں۔ وہ بولی'' کیسے؟'' میں نے کہا کہ اس موضوع پر پھر بات کریں گے آج کے لیے صرف اتنا ہی۔ اُس نے کہا کہ تمہارا اور تمہارے موضوع کا انتظار رہے گا۔ میں بے خودی میں انشاءاللہ بول گیا۔ وہ بے چینی سے بولی کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے بتایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا۔ اور اسے سمجھ آ گئی۔

ہماری دوستی پورے ٹوڈو۔ واڈا کے فلیٹس کے مکینوں کے لیے ناپسندیدہ عمل تھی۔ جس کی ہمیں کوئی پرواہ نہ تھی۔ گھومنے پھرنے سے مجھے ملیریا بخار نے آ لیا جبکہ کرسٹینا شہر سے باہر سرکاری ڈیوٹی پر گئی ہوئی تھی۔ بخار کی

شدت بہت زیادہ تھی۔ میں اکیلا ہی فلیٹ پر پڑا رہتا۔ ایک دن مصری لیڈی ڈاکٹر کا بیٹا جس کا نام تامر تھا کچھ زیادہ ہی رو رہا تھا۔ مجھ میں بخار کی وجہ سے ہمت نہیں تھی، چکر بھی آ رہے تھے پھر بھی میں ہمت کر کے سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ خوبصورت سا بچہ بہت رو رہا تھا۔ میں نے اس کی maid سے بچے کے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ لاتعلقی سے بولی! I don't know میرا دل پریشان ہو گیا۔ ہمارے ہاں بچہ روئے تو ماں باپ قربان ہو جاتے ہیں۔ میں نے بچے کی طرف بازو پھیلائے تو وہ میری گود میں آ گیا۔ میں اُسے اور اسکی maid کو لے کر اپنے فلیٹ کے لاؤنج میں آ گیا۔ بچہ روتے روتے ایک لفظ بار بار بول رہا تھا ''کُو کُو سمیا''۔ میں نے فرج کھول کر پہلے اسے دودھ کی بوتل دکھائی۔ اس نے ہاتھ سے پیچھے کر دی۔ پھر میں نے اسے پانی کی بوتل دکھائی تو وہ مجھ سے بوتل کھینچنے لگا۔ میں نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر اُسے پلایا۔ بچہ بہت پیاسا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بچے کے جسم سے بدبو آ رہی ہے۔ میں اُسے باتھ روم لے گیا اور صابن سے اچھی طرح نہلایا۔ اُس کی maid کو واپس فلیٹ میں جا کر اُس کے کپڑے لانے کو کہا۔ وہ جب تک کپڑے لائی میں بچے کو تولیے میں لپیٹ کر ٹالکم پاؤڈر بھی لگا چکا تھا۔ بچہ خوبصورت تھا، نہا کر تو اور چاند کا ٹکڑا لگنے لگا۔ میں نے اُسے چاکلیٹ دیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ پھر میری گود میں ہی سو گیا۔

چار بجے بچے کے والدین آ گئے۔ Maid کو سیڑھیوں پر اکیلا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ استفسار کرنے پر maid نے میرے فلیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتے اوپر آ گئے۔ بچہ بے خبر صوفے پر سو رہا تھا اور اس کا سر میری گود میں تھا۔ انہیں تسلی ہوئی۔ میں نے انہیں ساری روداد سنائی۔ بچے کی ماں شکراً شکراً کا وِرد کرتی گئی۔ میں نے بچے کو اس طرح maid کے حوالے کرنے پر ناراضگی کا اظہار کیا تو ماں بولی کہ میں پانی، دودھ اور دیگر چیزیں maid کے حوالے کر کی جاتی ہوں مگر شائد بچے کو دینے کی بجائے وہ خود کھا پی جاتی ہے۔ یہ سب باتیں کرتے وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا کہ کیا آپ بیمار ہیں؟ کیونکہ آج آپ مجھے کمزور لگ رہے ہیں حالانکہ روز میں آپ کو دیکھتی ہوں آپ اچھی صحت کے مالک ہیں۔ میں نے اسے ملیریا اور بخار کی شدت کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ چونکہ میں خود بھی بچوں کا باپ ہوں اس لیے مجھ سے آپ کے بچے کا رونا دیکھا نہیں گیا اور کسی طرح اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ اُس نے دوائی کا پوچھا تو میں نے بتایا کہ ناصر صاحب مجھے ڈاکٹر عبدالغفور غنی کے کلینک لے گئے تھے۔ وہاں پہنچنے تک طبعیت زیادہ بگڑ گئی تو میں اُن کے صوفے پر ہی لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے میری نظر دیوار پر لٹکی ایک تصویر پر پڑی جس کے نیچے مرزا غلام احمد اور نہ جانے کیا کیا لکھا تھا اور آخر میں لکھا تھا Ahmadiyat is true Islam میں سمجھ گیا کہ یہ احمدیوں کا کلینک ہے۔ میں نے ناصر صاحب سے کہا کہ فوراً یہاں سے چلیں۔ اتنے میں ڈاکٹر غنی بھی کچھ دوائیاں لیے آ گیا مگر میں کوئی بات سنے بغیر باہر کھڑی گاڑی

میں آ کر بیٹھ گیا اور ہم واپس آ گئے۔اس لیے میں نے اب تک کوئی دوائی نہیں لی۔

اُس نے اپنے خاوند سے کہا کہ تامر کو گھر لے جائیں، میں ابھی آتی ہوں۔وہ اپنے ہسپتال گئی۔ادویات اور انجکشنز وغیرہ لے کر واپس آ گئی۔ مجھے اچھی طرح چیک کیا، ادویات دیں اور انجکشن لگایا۔دوسرے روز اپنے بیٹے تامر کو میرے پاس چھوڑ گئی۔اسی طرح ادویات وانجکشنز کا سلسلہ چلتا رہا۔میں تیزی سے بہتری کی طرف جا رہا تھا۔اسی دوران میری اپنی لیڈی ڈاکٹر کرسٹینا بھی واپس آ گئی۔ مجھے بیمار دیکھ کر بہت پریشان ہوئی۔اپنے ساتھ ہسپتال لے گئی۔ Chest x-ray, malaria test, BP monitoring سب کروایا اور سارا دن اپنے ہسپتال کے (ICU (intensive care unit میں لٹائے رکھا۔اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں تیزی سے روبہ صحت ہوتا گیا۔

ڈاکٹر عبدالغفور غنی کے بارے میں بتاتا چلوں کہ یہ دو بھائی ہیں۔عبدالغفور غنی اور عبدالشکور غنی۔کسی زمانے میں ان کے والد اُس وقت کی تحصیل لودھراں میں ایس ڈی او ہوا کرتے تھے۔دونوں کی بیویاں بھی ڈاکٹر ہیں۔ احمدیہ تحریک کے اہم لوگوں میں شامل ہیں۔افریقن لوگ بنیادی طور پر بھولے بھالے ہوتے ہیں۔یہ دونوں اُن کو سہولیات دے کر گمراہ کرنے میں پیش پیش تھے۔اس لیے افریقہ میں احمدیت تیزی سے پھیلانے میں ان کا کردار قابلِ نفرت اور مسلمان علماء اور مسلم تحریکوں کی لاپرواہی لمحۂ فکریہ ہے۔

ایک اور کردار جس سے مجھے ملوایا گیا وہ Jos کی مشہور و معزز ٹال آنٹی تھی۔کراچی کی رہنے والی تھی۔خاوند سرکاری محکمے میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔بال بچے دار اور مہمان نواز تھیں۔ہر ویک اینڈ پر رات آٹھ بجے کے بعد ایک فلم شو کرتیں اور چیدہ چیدہ پاکستانی اور انڈین سول سرونٹس کو دعوت پر بلاتیں۔مجھے خاص طور پر دعوت دی گئی۔میں نے نوری نامی فلم ٹال آنٹی کے گھر پر ہی دیکھی۔ٹال آنٹی ایک باخبر خاتون تھیں جنہیں ہر گھر کی خبر ہوتی تھی۔کون چھٹی جا رہا، کون چھٹی گزار کر آ رہا ہے۔کس کے ہاں اولاد ہوئی یا ہونے والی ہے، ہر خوشی وغمی کی انہیں خبر ہوتی۔خود وہ عمرِ عزیز کے پچاس سال گزار چکی تھیں۔ بچے جوان تھے، خوشحالی اور بے فکری تھی اس لیے صحت مند خاتون تھیں۔گورا رنگ، لمبا قد، کٹورا آنکھیں، نستعلیق اُردو، تند و تیز گفتگو، خوبصورت لباس ٹال آنٹی کا خاصا تھا۔بس کوئی بات منہ سے نکلی اور پورے Jos کی پاکستانی اور انڈین کمیونٹی میں نشر ہوگئی۔میں کئی بار اپنے میزبانوں کے ساتھ آنٹی کے دولت خانے گیا۔

ایک اور کریکٹر پروفیسر A.K.Toteja کا تھا جو ریاضی کے پروفیسر تھے۔کیرالہ انڈیا کے رہنے والے تھے۔لمبا قد، توند بڑھی ہوئی، سانولا رنگ، پسینے سے بھرے رہتے۔پاس بیٹھو تو عجیب سی بدبو آتی۔مزاج اور چال کے حساب سے Feminist معلوم پڑتے تھے۔ان کی اہلیہ پروفیسر آبھا دیوی یونیورسٹی میں بائیولوجی پڑھاتی

تھیں۔ پروفیسر ٹوٹیجا کے پاس ایک پرانے ماڈل کی فاکسی کار تھی جبکہ اُن کی بیگم کے پاس نئے ماڈل کی Peugeot کار تھی۔ ٹوٹیجا بہت Talkative تھا۔ بولنا شروع کرتا تو سر کھا جاتا۔ اس کا دل پسند کام ڈالر خریدنا تھا۔ وہ مقامی کرنسی نیارا دے کر ڈالر خرید لیتا۔ نیارا ایک False کرنسی تھی۔ آبھا دیوی قہقہے اچھالتی، خوش مزاجی سے ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتی، لہراتی ہوئی تشریف لاتیں۔ سیڑھیاں چڑھنے سے سانس چڑھ جاتا تو آتے ہی صوفے پر دھم سے بیٹھ جاتیں۔ اُن کی کوئی اولاد نہ تھی۔ میرے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ کبھی کبھی Long drive پر لے جاتیں، کبھی یونیورسٹی، کبھی گھر کھانے پر بلالیتیں۔ کھانے لذیذ بناتیں۔ کیرالہ کے کھانے میں نے انھی کے گھر کھائے۔ پروفیس ٹوٹیجا ان کے سامنے بھیگی بلی بنا رہتا۔

اب کافی لوگوں سے میرے مراسم استوار ہو چکے تھے۔ جدہ جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ میرا پاسپورٹ پروفیسر الجبوری کی مہربانی سے لاگوس کے سعودی سفارت خانے گیا ہوا تھا۔ جدہ کی تفصیل میں اپنی تصنیف فرشتے کی ایف آئی آر میں لکھ چکا ہوں۔ ایک روز ناصر صاحب کہنے لگے میں نے کیفی سرکاری وزٹ پر جانا ہے۔ آپ پروفیسر جمشید کا پوچھ رہے تھے وہ کیفی کے گورنمنٹ کالج میں کیمسٹری پڑھاتے ہیں۔ میں آپ کو اُن کے پاس چھوڑ دوں گا۔ اپنا سرکاری کام کر کے ہم اکھٹے واپس آ جائیں گے۔ میں کیفی شہر دیکھنے اور پروفیسر جمشید سے ملنے کے شوق میں تیار ہو گیا۔ صبح پانچ بجے ہم لوگ سرکاری گاڑی میں بمعہ ڈرائیور کیفی کے لیے روانہ ہو گئے۔

Jos سے کیفی کا زمینی فاصلہ تقریباً 280 کلومیٹر ہے۔ سڑک اچھی تھی مگر بھول بھلیوں والے پہاڑی راستے، افریقن ڈرائیور جس کے ہاتھ میں بیئر کا ٹن تھا اور لال لال آنکھوں سے دیدے پھاڑ کر راستہ دیکھ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا صد شکر کہ ہم خیریت سے کیفی پہنچ گئے۔ ناصر صاحب نے مجھے جمشید صاحب کے پاس کالج پہنچا دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ میں نے از راہِ تفنن کہا کہ میں بُرے کے گھر تک ایسے پہنچتا ہوں۔ وہ جھٹ سے بولے 'ابے گھر کہاں یہ تو کالج ہے'۔ کالج سے چھٹی لے کر مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پر تکلف کھانا کھلایا۔ ناصر صاحب سے میرے بارے میں پوچھا کہ ''یہ سنکی انسان آپ کے قابو کیسے آ گیا؟''۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ میرے ہم زلف ہیں۔ میں حیران تھا کہ ایچی سن کالج چھوڑ کر جمشید صاحب یہاں کیفی میں کیا جھک مار رہے ہیں۔ چار بجے ناصر صاحب نے مجھے واپس pick کیا اور ہم jos کی طرف محوِ سفر ہو گئے۔

کرسٹینا سے ملاقاتیں اور اسلامی شعائر پر گفتگو جاری رہتی۔ میں نے محسوس کیا کہ اسلام کو زیادہ سے زیادہ جاننے کے لیے اس کا شوق، بے چینی اور تجسس بڑھتا جا رہا ہے۔ اُس نے نیم برہنہ رہنا چھوڑ دیا۔ سر پر سکارف لینا شروع کر دیا۔ شیمپین کی چسکیاں لیتے بھی نہیں دکھائی دی اور دیگر اہم تبدیلیاں بھی اس میں آتی جا رہی تھیں۔ میں جب اسکے پاس ہوتا تو بسم اللہ۔ ماشاء اللہ۔ الحمد اللہ۔ سبحان اللہ موقع محل کے حساب سے کہتا رہتا اور اس کو مطلب

بھی سمجھا تا۔ایک روز میں پروفیسر الجبو ری کے پاس گیا اور انہیں ساری داستان سنائی۔ وہ خوش ہوئے اور مجھے شاباش دی۔اگلی صبح یونیورسٹی آنے کا بھی کہا۔ بولے کہ میں آپ کو انگریزی ترجمے والا قرآن پاک اور دیگر اسلامی لٹریچر دوں گا۔میں نے کہا کہ میں اور کرسٹینا اکٹھے آئیں گے۔

دوسرے روز وہ اپنے آفس سے جلدی فارغ ہوگئی اور ہم یونیورسٹی میں پروفیسر الجبو ری کے آفس میں جا بیٹھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تشریف لے آئے۔انہوں نے اسلام و اسلامی شعائر اور نبی کریم ﷺ کے فرامین پر مدلل اور سیر حاصل گفتگو کی۔تمام اسلامی لٹریچر کرسٹینا کے حوالے کیا اور فرمایا کہ دوبارہ جب آپ میرے پاس تشریف لائیں تو معزز لباس میں خود کو پوری طرح ڈھانپ کر آئیں۔اُس نے جواب دیا کہ میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔ پروفیسر نے جزاک اللہ خیر کہا۔ہم دونوں دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس آ گئے۔

میں نے کرسٹینا سے کہا کہ میں ین کاری ریزارٹ جانا چاہتا ہوں۔ وہ بولی کہ ریزارٹ تو باؤچی سٹیٹ میں ہے اور یہاں سے کافی دور ہے۔آپ اکیلے نہ جانا۔لانگ ویک اینڈ آ رہا ہے پروگرام بناتے ہیں۔لیکن کسی کو بتانا نہیں ورنہ لوگوں اور خاص طور پر خواتین کو مختلف تکالیف میں مبتلا پاؤ گے۔ میں نے ایک لمبا قہقہہ لگایا اور بے ساختہ کہا I damn care۔اُس نے کہا کہ آپ حوصلے والے اور straight forward انسان ہو۔میں نے کہا کہ جب بھی موقع ملے ان books کو ضرور پڑھنا پھر ہم آپس میں ڈسکس کریں گے۔وہ اٹک اٹک کر بولی ''انشاءاللہ''۔

Jos میں ایک پاکستانی خاتون نے نائجیرین آرمی کے میجر سے شادی کی ہوئی تھی اور بچے بھی تھے۔ ہماری مایہ ناز اور شہرہ آفاق پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں اکثر ممالک کے کیڈٹ کوٹہ اور میرٹ کی بنیاد پر کمیشنڈ آفیسر بننے کے لیے سلیکٹ ہو کر آتے ہیں۔ یہ میجر صاحب بھی پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے تعلیم یافتہ تھے۔دورانِ ٹریننگ ان کی آپس میں ملاقات ہوگئی۔ کیوپڈ دیوتا کے تیر نے ایسا نشانہ مارا کہ دونوں ہی اس کا شکار ہو گئے اور نتیجہ شادی اور بچوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ بات یہاں پر ختم ہونے کی بجائے شروع ہوئی۔قسمت کی ماری خاتون کو جو سنہرے خواب دکھائے گئے وہ صرف خواب ہی تھے اور حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔میجر صاحب رات کو شراب کے نشے میں دھت آتے یا اپنی کسی گرل فرینڈ کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تو جلی کٹی سننی پڑتی اور بات صرف گالم گلوچ اور مار پیٹ تک نہ رہتی بلکہ اکثر اہلِ علاقہ اکٹھے ہو جاتے اور پولیس بھی آ جاتی۔ یہ روزمرہ کا معمول تھا۔جب خاتون کی زندگی کو خطرہ لاحق ہونے لگا تو پاکستانی کمیونٹی نے ائیر ٹکٹ کے لیے رقم اکٹھی کر کے اس خاتون کو پاکستان بھجوا دیا۔

براعظم افریقہ کے کسی بھی ملک کا باسی کوئی بھی افریقن چاہے جتنا تعلیم یافتہ اور بڑے عہدے پر فائز ہو، امیر یا غریب ہو، مسلمان ہو یا کسی اور مذہب کا پیروکار ہو سب کی عادات مشترک ہیں۔ مذکر و مونث کی کوئی تفریق

نہیں۔ پیسہ، شراب، لالچ، خواب وہ بھی سہانے، جنگلی پن ان کے خون میں صدیوں سے موجو ہے۔ بظاہر بھولا بھالا شریفانہ اطوار کا مالک اگر کسی بات پر خفا ہو جائے تو دشمنی میں ہر حد پار کر جاتا ہے۔ ہر افریقن کو پاگل پن کا دورہ ضرور پڑتا ہے چاہے ہفتہ وار، مہینہ وار یا سال بعد اور اس کا اظہار وہ اپنے قبائلی رسم ورواج کے مطابق کرتا ہے۔ کوٹ پینٹ ٹائی اتار کر ایک لنگوٹی پر مشتمل اپنا جنگلی لباس پہن کر اپنے قبیلے میں چلا جائے گا۔ قبیلہ جنگل میں مقیم ہوتا ہے جس کو یہ لوگ Bushes کہتے ہیں۔ اپنی گاڑی ایک خاص مقام پر چھوڑ دے گا۔ اس سے آگے اُس کے لوگ لینے آئے ہوتے ہیں۔ وہاں سے ہاتھ میں نیزہ اور گلے میں تیر کمان ڈالے اپنے لوگوں میں اکڑ کے چلتا جھونپڑیوں تک جا کر ان کے ساتھ جنگلی انداز میں جنگلی کھانا کھاتا ہے جو شکار کے گوشت پر مشتمل ہوتا ہے اور دیگر لوازمات انجوائے کرتا ہے جس میں ان کی اپنی بنائی نشہ آور چیزیں بھی شامل ہیں۔ پھر اپنے جانوروں گائے، بھیڑ، بکری وغیرہ کا حساب کتاب کرتا ہے۔ ان کا کھانا پینا، تعداد، صحت سب چیک کیا جاتا ہے۔ رات کو آگ کے الاؤ کی روشنی میں دعوت اور رقص وموسیقی کا انتظام ہوتا ہے۔ آدمی عورت کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ اپنے پاس میسر وقت کے مطابق اپنے قبیلے میں قیام کرنے کے بعد وہ افریقن فریش ہو کر، واپس آ کر پھر سے انسانوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ میں نے ویسٹ، ایسٹ اور ساؤدرن افریقہ میں ایسا ہی دیکھا۔ افریقن کا جنگلی پن اگر عود کر آ جائے تو وہ بہت خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ ایک ایسا افریقن جو فوجی ہو، شراب کے نشے میں دھت، ہاتھ میں سروس ریوالور اور وہ دیوالیہ بھی ہو تو وہ دنیا کا خطرناک ترین جنگلی ثابت ہوگا۔

میں نے Jos میں پاکستانی، انڈین، اینگلو انڈین، عربی، افریقن سب کے ساتھ روابط رکھے اور ان میں گھل مل گیا۔ کرسٹینا کی وجہ سے میں مقبولِ عام ہو گیا تھا۔ دعوتیں، فلم شو، ڈانس پارٹیاں وغیرہ سب میں شرکت کی۔ ایک عرب کہاوت وحکایت میں مختلف خواتین کے اوصاف کچھ اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ انانہ — وہ عورت جو ہر وقت سر پر پٹی باندھے رکھے اور شکوہ شکایت اس کا معمول ہو۔

۲۔ منانہ — وہ عورت جو مرد پر احسان جتاتی رہے اور شکوہ کرے کہ مجھے کچھ حاصل نہ ہو۔

۳۔ کنانہ — وہ عورت جو ہمیشہ ماضی کو یاد کرے اور خاوند کو کوسے۔

۴۔ حنانہ — وہ عورت جو سابقہ خاوند کو یاد کر کے موجودہ کو برا بھلا کہے۔

۵۔ حداقہ — وہ عورت جو ہر وقت خاوند سے فرمائشیں کرے۔ جو چیز دیکھے اسی کی طلبگار رہو۔

۶۔ براقہ — وہ عورت جو ہر وقت چمک دمک میں لگی رہے۔

۷۔ شداقہ — وہ عورت جو تیز زبان ہو اور باتیں بناتی رہے۔

مندرجہ بالا خواص کی مالک خواتین نہ صرف ایشین کمیونٹی بلکہ افریقن کمیونٹی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ البتہ

افریقن مرد ہو یا خاتون اگر پیار سے بات کی جائے اور سہانے خواب دکھائے جائیں تو کافی خوش ہوتے ہیں اور ان پر یقین بھی کر لیتے ہیں۔ یہ ان کی سادگی کی انتہا ہے۔

لیڈی ڈاکٹر کرسٹینا سے ملاقاتیں جاری و ساری تھیں۔ ایک روز ہم سٹار ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھے افریقن بلیک کافی کی چسکیاں لے رہے تھے وہ بولی کہ میں نے پروفیسر الجبوری کا دیا ہوا تمام لٹریچر بہت غور سے پڑھا ہے۔ پھر فلپائن سے اپنی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ منگوا کر اس کو بھی بہت توجہ سے پڑھا ہے۔ میں حیران ہوں کہ جو پیغام اللہ کے پیغمبر نے صدیوں پہلے دنیا کو دیا آج کل کی ماڈرن دنیا اور خاص طور پر میڈیکل سائنس اس کی تصدیق کرتی ہے۔ میری اُس وقت کی فہم و فراست جتنا اجازت دیتی تھی میں اس کے سوالوں کے جوابات دیتا گیا۔ اس نے کہا کہ لونگ ویک اینڈ آ رہا ہے، لاسٹ ورکنگ ڈے کو آپ تیار ہو کر میرے پاس ہسپتال آ جانا ہم خاموشی سے وہاں سے باؤچی سٹیٹ کے ین کاری ریزارٹ چلیں گے۔ اس نے مزید بتایا کہ اس نے اپنے ہسپتال کی معرفت ایڈوانس بکنگ کروالی ہے۔ واپس آ کر ہم پروفیسر الجبوری کے پاس چلیں گے تا کہ ان سے تفصیلی لیکچر لیا جا سکے اور میرے کچھ سوالات بھی ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ اگر مناسب خیال کریں تو سوالات مجھے بھی بتا دیں تا کہ میرے علم میں اضافہ ہو سکے۔ وہ بولی کہ اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو میرا ایک سوال تو آپ سے ہی ہے۔ میں نے اسے سنجیدگی سے کہا کہ نائجیر یا میں ایک آپ ہی میری Best friend ہیں۔ آپ کو پورا حق حاصل ہے کہ مجھ سے کوئی بھی سوال کر سکیں اور میں اپنی عقل و دانش کے مطابق آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا اور بولی آپ کا Faith کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اپنی تمام تر برائیوں اور کوتاہیوں کے باوجود الحمدللہ مسلمان ہوں۔ وہ بولی یہ تو میرے علم میں ہے۔ میں روز دیکھتی ہوں کہ آپ شراب نہیں پیتے۔ مجھے بھی منع کرتے ہیں اور میں نے آپ کے کہنے پر چھوڑ بھی دی ہے۔ آپ pork بھی نہیں کھاتے، چکن کا بھی پوچھتے ہیں کہ It is Slaughtered by muslim way or chopped off? اگر ہوٹل والے آپ کو مطمئن نہ کر سکیں تو آپ مٹن، بیف اور چکن کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔ صرف سلاد وغیرہ پر گزارہ کرتے ہیں۔ میں بھی آپ کی وجہ سے بھوکی رہ جاتی ہوں۔ میرا سوال آپ سے یہ ہے کہ آپ کونسے مسلمان ہیں۔ شیعہ، سنی، وہابی، بریلوی، دیوبندی وغیرہ میں سے کس مسلک سے منسلک ہیں؟ آج کل نائجیر یا میں احمدی حضرات کا بہت چرچا ہے۔ یہاں پر ان کے کمیونٹی سنٹر، شفا خانے اور نہ جانے کیا کیا بن چکا ہے۔ لوگ اس مذہب کو قبول بھی کر رہے ہیں۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا اور اس کے مطالعے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے میں بولا کہ آپ نے دلچسپ اور نیچرل سوال کیا ہے۔ میں دقیانوسی مذہبی نہیں ہوں۔ اب میرا تفصیلاً جواب بہت غور سے سنو۔

(۱) احمدی لوگ خود کو مسلمان کہتے اور کہلواتے ہیں لیکن یہ مسلمان نہیں بلکہ مرتد ہیں کیونکہ یہ خاتم

النبین ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتے۔جبکہ میرے آقاؐ نے فرمایا کہ میرے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ میں پاکستان کی ایک ایسی ریاست بہاولپور کا رہنا والا ہوں جس کی سپریم کورٹ نے ایک مقدمہ کے فیصلے میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔پھر جوہانس برگ (ساؤتھ افریقہ) کی عدالت نے ان کو غیر مسلم قرار دیا۔پاکستان سے جناب شیخ غیاث الدین اٹارنی جنرل پاکستان جو میرے انکل ہیں اور ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی جو میرے ذاتی دوست ہیں اس مقدمے کی پیروی کے لیے گئے تھے۔ڈاکٹر صاحب تادم تحریر بقیدِ حیات ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کو لمبی عمر عطا فرمائے۔آمین!میں نے مزید بتایا کہ احمدی مذہب انگریزوں کی پیداوار ہے کیونکہ ان دنوں برصغیر میں آزادی کی تحریکیں پنپ رہی تھیں۔انگریزوں کا کہنا تھا کہ یہ لوگ مذہب کی بنیاد پر آزادی مانگ رہے ہیں ہم ان کو مذہب کی بنیاد پر ہی ختم کر دیں گے۔یہ سب فساد ان ہی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہے۔میری بات کی سچائی پر آپ کو مستند لٹریچر مل سکتا ہے۔قرآن پاک بھی ان کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔قرآن پاک میں وحی کی صرف دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ایک وہ جو نبی کریم ﷺ سے پہلے نبیوں کے ذریعے آئیں اور دوسری وہ جو نبی کریم ﷺ کے ذریعے آئیں۔ اب قیامت تک نہ کوئی نبی آئے گا نہ وحی۔نبی کریم ﷺ نے خود فرمایا ''انا خاتم النبین''۔میں نے مزید بتایا کہ پاکستان میں احمدی یا کوئی اور مرتد گروپ نہ خود کو مسلمان کہلوا سکتے ہیں، نہ اپنی الگ مسجد بنا سکتے ہیں۔اس لئے یہ افریقہ،کینیڈا اور دیگر ممالک میں مذہبی بنیاد پر سیاسی پناہ لے کر خود کو مسلمان ظاہر کر کے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔

(۲) جن دیگر مسالک کا آپ نے ذکر کیا ہے یہ تمام مسالک سوائے شیعہ ازم کے لوگوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔دین اسلام سے ان مسالک کا کوئی تعلق نہیں۔کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنی علیحدہ شناخت بنانے سے منع فرمایا ہے۔میرے آقاؐ نے فرمایا کہ میرے بعد لوگ تہتر مسالک بنالیں گے اور ہر مسلک خود کو سچا اور باقی سب کو جھوٹا قرار دے گا۔

یہ سب مسالک 1926 کے بعد عالمِ وجود میں آئے۔یہ یورپین اقوام کی چالاکی اور برٹش کی عیاری سے پھلے پھولے۔خفیہ طور پر ایک زمین دوز دنیا بسائی گئی جس میں ایشیا سے اخلاقی طور پر کمزور، لالچی، تنگ ذہن اور خبیث قسم کے لوگ بڑی لالچ کے تحت بھرتی کیے گئے جو بہترین حفاظ، اچھے عالم، مکمل طور پر ٹرینڈ، اسلامی شعار اچھی طرح بیان کرنے والے ہیں۔ان کو مختلف مساجد و مدارس میں پوسٹ کیا جاتا ہے بلکہ مساجد و مدارس بنا کر دیے جاتے ہیں تاکہ مذہبی رنگ دے کر لوگوں میں منافرت پھیلائی جا سکے۔ایک دوسرے کے مسلک کو خارج از اسلام قرار دے کر کافر کہا جائے۔خون خرابہ، قتل و غارت، لڑائی جھگڑا ان کا شیوہ ہے۔عسکری ونگ تیار کیے جاتے ہیں۔کوئی جیتے یا ہارے وطنِ عزیز ان جھوٹے علماء کی وجہ سے لہولہان ہوتا ہے۔اسی طرح فقہ جعفریہ جسے عام فہم زبان میں شیعہ یا شیعانِ علیؓ بھی کہا جاتا ہے۔جب حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت ہوئی تو ایک چالاک وعیار دشمنِ

اسلام یہودی نے اس مسلک کی بنیاد رکھی۔ بعد کے حالات و واقعات کے نتیجے میں یہ مسلک ایک مذہب کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ سب مسالک نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد وجود میں آئے۔ ایسا کرنے کا اختیار تو اللہ کے ولیوں اور قلندروں تک کو نہیں تو پھر ان کو یہ اختیار کس نے دیا؟

(۳) اب آپ کا یہ سوال کہ میرا مسلک کیا ہے تو غور سے سنیں میں مذہبی بھیڑیا نہیں ہوں۔ مذہبی رواداری اور برداشت پر یقین رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے محبوبؐ کے ذریعے جو فرمادیا اور نبی کریم ﷺ نے اپنے آخری خطبہ میں جو فرمایا وہ میرا ایمان اور میرا مذہب و مسلک ہے۔ یہی اسلام کی اصل روح ہے۔ ایک اور ضروری بات بیان کئے دیتا ہوں کہ پوری دنیا میں جو قوتیں اسلام کے خلاف سرگرمِ عمل ہیں جن میں یہودی لابی، یورپین لابی، برٹش لابی شامل ہے وہ کہتے ہیں مسلمانو اگر تم نے نمازیں پڑھنی ہیں تو پڑھو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ حج، زکوٰۃ، روزے، تراویح غرض جتنی چاہے عبادت کرو۔ مساجد و مدرسے بنانے کے لیے چاہے ہم سے امداد لو، بیواؤں، یتیموں کی مدد کرو مگر خبردار اگر تم لوگوں نے پاکستان اور باقی دنیا میں اسلام کو اس کی اصل روح کے مطابق اور نبی کریم ﷺ کے فرمان اور افکار کی روشنی میں نافذ العمل کرنے کی کوشش کی تمھارا نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔ یاد رکھو ایسی غلطی اور جرات کبھی نہ کرنا۔ غدارِ وطن و مذہب ٹائپ لوگوں کو نیک لوگوں کا بہروپ دے کر ہم پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔

میں نے ڈاکٹر کرسٹینا سے کہا کہ آپ پڑھی لکھی خاتون ہیں، میری کم علمی کی وجہ سے اگر آپ کے سوال میں کوئی تشنگی رہ گئی ہو تو پروفیسر الجبوری دور کریں گے۔ وہ بولی آپ نے میرے سوالوں کا مدلل اور عالمانہ جواب دیا ہے بلکہ جو سوالات میں نے سوچے بھی نہیں تھے آپ نے ان کا بھی جواب دیا ہے۔ آپ نے میری سوچوں کو جلا بخشی ہے۔ میں آپ کی ممنون ہوں۔ God Bless You۔ اس کے بعد ہم واپس اپنے اپنے ٹھکانے پر چلے گئے کیونکہ اگلے دن Last working day تھا اور ین کاری جانے کی تیاری بھی کرنی تھی۔ میرے میزبان نے دبے لفظوں میں میرے دیر سے آنے کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے کہا کہ میرے دوست اور کالج فیلو پروفیسر ملک خضر حیات جو آج کل باؤچی میں کیمسٹری پڑھاتے ہیں ان سے یونیورسٹی میں ملاقات ہو گئی تھی۔ میں ان کے ساتھ کل چلا جاؤں گا۔ ہم ین کاری بھی جائیں گے اور long weekend ان ہی کے ساتھ گزار کر آؤں گا۔ ناصر صاحب نے بے دلی سے یہ خبر سنی اور ہوں ہاں کر کے خاموش ہو گئے۔ میں نے اپنا چھوٹا سا ہینڈ بیگ تیار کر لیا۔ پاسپورٹ، کرنسی اور ضروری کاغذات اپنے ٹرالی بیگ میں بند کر کے لاک کر دیا اور ٹرالی بیگ کو گھر پر ہی چھوڑ دیا۔ صبح کی نماز پڑھ کر تیار ہوا اور مقررہ RV (مقرر کردہ جگہ) جا پہنچا۔ کچھ ہی دیر میں کرسٹینا بھی پہنچ گئی کیونکہ اس نے مجھے اپنی بالکونی سے سیڑھیاں اتر کر مین روڈ کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔ پہلے ہم نے ناشتہ کیا اور پھر

باؤچی کی طرف محوِ سفر ہوئے۔Milestone کے مطابق باؤچی Jos سے 125km تھا۔سڑک بھی اچھی تھی اور کرسٹینا ڈرائیور بھی اچھی تھی۔سفر کا پتہ ہی نہ چلا اور ہم باؤچی پہنچ گئے۔کرسٹینا نے باؤچی کو بائی پاس کرتے ہوئے کارکوین کاری ہائی وے کی طرف موڑ دیا۔

Milestone کے مطابق ین کاری گیم ریزروایئنڈ ریزارٹ مزید 115km تھا۔ہم باتیں کرتے، کھاتے پیتے تقریباً پانچ گھنٹے میں ین کاری ریزارٹ کی کار پارکنگ میں تھے۔کاؤنٹر سے اندراج کروانے کے بعد اپنی Hut کی چابی لی اور ایک کالی کلوٹی حسینہ کی رہنمائی میں اپنی Hut میں آ گئے۔ہم دونوں ہی رات دیر تک جاگنے، صبح سویرے اٹھنے اور سفر کی وجہ سے خمار آلود ہو چکے تھے۔اس لئے آرام کرنے لیٹ گئے اور گہری نیند سو گئے۔رات آٹھ بجے تک سوتے رہے۔اُٹھ کر شاور لے کر تازہ دم ہوئے۔میں باہر کا جائزہ لینے کے لیے نکلا۔کرسٹینا ابھی اپنی کاسمیٹک نوک پلک سنوار رہی تھی۔باہر روشنیوں کا ایک سمندر تھا۔یہ ایک بہت بڑا ریزارٹ تھا جس کے چاروں طرف سینکڑوں کی تعداد میں افریقن طرز کی خوبصورت اور لگژری huts بنی ہوئی تھیں۔سٹاف زیادہ تر مقامی لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ان کے چمکیلے بھڑکیلے تیز رنگوں کے مختصر لباس، عجیب وغریب میک اپ، تیزی طراری، خوبصورت مٹکتی آنکھیں جیسے صحرا میں نخلستان۔سیاہ مژگان گھنگھور گھٹاؤں کی طرح ان کی آنکھوں کو کبھی ڈھانپ لیتی تو موسم ابر آلود ہو جاتا اگر آنکھیں کھول لیتی تو ان کی کشش انسان کو زمینی کشش کی طرح خاک میں ملا سکتی تھی۔مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیں کہ یہ سب بے دین (P a g a n) ہیں اور ان کے درمیان (Neoplatonic) افلاطونی خیالات کا مالک میں اپنے دائیں بائیں پوری دنیا سے آئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا کہ میری نظر swines (سور کے بچوں) پر پڑی اور میں لاحول پڑھتا واپس اپنی Hut میں چلا گیا۔کرسٹینا اس دوران تیار ہو چکی تھی۔میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا Today you are mesmerizing وہ تھوڑا شرما کر بولی Only today,not before? میں نے اسے بتایا کہ باہر میں swines دیکھ کر آیا ہوں تو وہ بولی So what!۔ہم لوگ باہر نکل آئے اور چلتے پھرتے رہے۔یہ اتنا بڑا ریزارٹ تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔چلتے چلتے ہم ایک ایسی جگہ آ پہنچے جہاں ایک بہت بڑی چٹان سے آبشار کی شکل میں پانی شور مچاتا، جھاگ اڑاتا نیچے پتھروں پر گر رہا تھا اور نہر کی شکل میں نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھا۔تیز بہاؤ تھا۔کچھ مرد وخواتین اس پانی میں نہا رہے تھے اور شور مچاتے مستیاں کر رہے تھے۔روشنیوں کی وجہ سے دن کا سماں تھا۔صرف دو چار خواتین نے swimming costume پہنا ہوا تھا باقی لوگ نیچرل ڈریس میں تھے۔ہم بھی کنارے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ایک بورڈ پر لکھا تھا This waterfall is best for skin deseases due to sulphur اس لئے لوگ اپنی سکن کو فریش کرنے اور روح کو روحانی کثافت سے آلودہ کرنے یہاں آتے ہیں۔اس دوران ایک

افریقن ناری نے مجھے کہا کہ تم دونوں پانی میں کودتے کیوں نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ آج ہمارے پاس swimming costume نہیں ہے۔کل لے کر آؤں گا تو ضرور اس پانی کو انجوائے کروں گا۔ وہ بولی تم آج بھی اس پانی میں ہاتھ لے کر اپنی سکن کو فریش کر سکتے ہو۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ اس نے جھٹ اپنے کپڑے اتارے اور پانی میں چھلانگ لگا کر یہ جا وہ جا۔ میں حیران سا کھڑا تھا کہ کرسٹینا نے ہنستے ہوئے میری شرٹ کا کالر پکڑا اور کہا Lets move۔ ہم اپنی hut میں واپس آ گئے۔ رات کے دو بج چکے تھے اور چل چل کر ہم تھک چکے تھے۔ آتے ہی گہری نیند سو گئے۔

صبح حسبِ عادت میں جلدی اُٹھ گیا۔ کرسٹینا گہری نیند سو رہی تھی۔ باہر رات کی نسبت ویرانی تھی۔ جو حسینائیں رات کو حوریں لگ رہی تھیں اب لوگوں کے گناہوں کی سزا لگ رہی تھیں۔ میں ہلکی پھلکی سیر کر کے مسکراہٹوں کا جواب عاجزی سے دیتا ہوا واپس اپنی hut میں چلا گیا۔ آج swimming costume خریدنے کا ارادہ تھا جو ٹک شاپ سے مل گئے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر پیدل ہی گھومتے سیر کرتے ہم آبشار پر پہنچ گئے۔ لباس تبدیل کرتے ہی پانی میں دھڑام سے چھلانگ لگا دی۔ پانی کم گہرا لیکن غضب کا ٹھنڈا تھا۔ بہاؤ اتنا تیز تھا کہ پاؤں روک کر کھڑا ہونا مشکل تھا۔ بس بہتے چلو والی حالت تھی۔ کرسٹینا اچھی تیراک تھی۔ دیگر لوگوں میں آج خوبصورت نوجوان افریقن لڑکیاں زیادہ تھیں۔ برٹش، جرمن اور ہنگری کے جوڑے بھی تھے۔ ہنگری کی لڑکیاں اونچی، لمبی، سڈول جسم کی مالک تھیں۔ ماحول میں شور شرابہ، ہنسی مذاق، پانی کے چھینٹے ایک دوسرے کے ساتھ تیراکی کے مقابلے جاری تھے۔ لوگ اپنے آپ کو پانی کے بہاؤ پر بہنے دیتے اور دور تک نکل جاتے۔ آگے جنگل ہی جنگل تھا۔ پھر پانی سے نکل کر بھاگے آتے اور دوبارہ پانی میں چھلانگ لگا دیتے۔ افریقن لڑکیوں کے کہنے پر کہ آگے نیچرل بیوٹی زیادہ ہے آپ زیادہ انجوائے کر سکتے ہیں ہم نے اُن کے ساتھ ہی پانی میں چھلانگیں لگا دیں اور خود کو پانی کے تیز بہاؤ پر چھوڑ دیا۔ پانی کافی اونچائی سے آ رہا تھا۔ ہم اپ سٹریم سے ڈاؤن سٹریم کی طرف بہاؤ کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے جھرمٹ میں تیزی سے بہتے جا رہے تھے۔ بظاہر کوئی خطرہ نہ تھا۔ ہم سب ایک گروپ کی شکل میں تھے اور افریقن لڑکیاں رہنمائی کے لیے ہمارے ساتھ تھیں۔ کوئی غم و فکر نہ تھی۔

ہوش اس وقت آیا جب گھنا جنگل شروع ہو گیا۔ دل میں کچھ خوف اور وسوسہ سا محسوس ہوا۔ افریقن لڑکیاں مصر تھیں کہ ابھی اور آگے جانا چاہیے مگر سب پانی سے نکل آئے اور واپسی کی راہ لی۔ دو لڑکیاں چیختی چلاتی نہر کی دوسری سمت والے کنارے سے بھاگ کر جنگل میں چلی گئیں اور منہ کے اوپر دونوں ہاتھ رکھ کر عجیب و غریب آوازیں نکالنا شروع کر دیں۔ ہم سب تماشائی بنے یہ سب دیکھ رہے تھے کہ ان لڑکیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اچانک برٹش جوڑے نے چیخنا چلانا شروع کر دیا اور پھر وہ ہو گیا جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ہمارے چاروں

اطراف ننگ دھڑنگ، بن مانس سے مشابہ جنگلی، ہاتھوں میں عجیب وغریب نیزے، بھالے اور ٹیڑھے میڑھے خنجر لیے اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے گھورتے ہمیں گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وہ ہمارے گرد گھیرا تنگ کرتے گئے اور ہمیں ایک طرف ہانکنا شروع کر دیا۔ ایک برٹش آدمی ہم سب سے زیادہ مضبوط جسم کا مالک تھا۔ اس نے کچھ مزاحمت کی لیکن اس کے پیچھے کھڑے جنگلی نے اپنے نیزے کی اَنی اس کے جسم میں داخل کر دی اور وہ خاصا زخمی ہو گیا۔ اسی دوران اُن افریقن لڑکیوں نے شُستہ انگریزی میں ہمیں کہا کہ اگر آپ ہمارے کہنے پر عمل کریں گے تو نہ آپ کو کوئی تکلیف ہوگی نہ ہی آپ کی جان کو خطرہ ہوگا۔ بس صرف آپ کو ہمارے قبیلے کے سردار کے سامنے پیش ہونا ہوگا ورنہ لمبے آدمی کا حشر آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ ساتھ ہی ان سب جنگلیوں نے ہمیں جانوروں کی طرح ہانکنا شروع کر دیا۔ اسی دوران دو لڑکیاں پانی کے اندر سے برآمد ہوئیں۔ اُن کے پاس ہمارے کپڑے ایک گٹھڑی کی شکل میں موجود تھے۔ اس نے ہمیں کہا کہ ان کپڑوں کی آپ لوگوں کو ضرورت ہوگی اور اس طرح آپ کی گمشدگی کا بھی جلدی پتہ نہیں لگے گا۔ اب ہم سب اس بچھائے گئے جال کو سمجھ گئے تھے۔ لیکن اس اغوا کا مقصد سمجھ سے باہر تھا۔

ہم جنگل میں تقریباً دو اڑھائی کلومیٹر چلے ہوں گے کہ دور سے گول دائرے میں جھونپڑیاں نظر آنی شروع ہو گئیں۔ ہماری ذہنی حالت کافی خراب ہو چکی تھی۔ کبھی خیال آتا کہ ہم آدم خوروں میں پھنس گئے ہیں مگر ساتھ ہی دل کو تسلی دیتے کہ آج کل تو آدم خور قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ آخر کار ہم سب بہت بری حالت میں بھوکے پیاسے، ننگے پیر ہونے کی وجہ سے کانٹے دار جھاڑیوں سے لہولہان پیروں کے ساتھ اغوا کاروں کی خفیہ جگہ پر پہنچ گئے۔ ہمارا حلیہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ ہم سب بھی انہی کی طرح جنگلی نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہی ہم اس نامعلوم منزل پر پہنچے ہمیں ایک گھنے درخت کے نیچے بٹھا دیا گیا۔ تمام جنگلی ایک گول دائرے میں ہمارے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ ہمارا سامان اور کپڑے وغیرہ ایک گٹھڑی کی شکل میں زمین پر پڑے تھے۔ اسی اثناء میں تمام جنگلی اپنے دائرے میں دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور ایک کالا سیاہ بھاری بھرکم بن مانس نما انسان، گلے میں کوڑیوں کی مالا، سر پر کسی پرندے کا پر لگائے ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ صاف شُستہ انگریزی میں بولا میں آپ لوگوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ لوگ نہ گھبرائیں اور نہ ہی پریشان ہوں۔ جیسے آپ کو لائے ہیں ویسے ہی جلد واپس چھوڑ آئیں گے۔ آپ اپنا سامان کپڑے وغیرہ لے سکتے ہیں۔ ہمیں نہ آپ کے کپڑوں کی ضرورت ہے نہ کرنسی کی۔ لیکن اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی یا جھگڑا کیا تو پھر میں آپ کی زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اتنے میں برٹش بول پڑا کہ میرے قابلِ احترام چیف آف ٹرائب ہمیں اس طرح اس حالت میں دھوکے سے لڑکیوں کے ذریعے ٹریپ کر کے لانے کی کوئی تو وجہ ہوگی جو friendly طریقے سے حل نہیں ہو سکتی ہوگی۔ سردار بولا تم سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ وجہ یہ ہے کہ میں اور میرا قبیلہ آسمانی دیوتا کے غضب کا شکار ہیں۔ ہمارے قبیلے کی لڑکیاں شیطانی قوت کے قبضے میں ہیں اور

صرف تم اجنبی لوگ ہی ہمیں اس مصیبت سے نکال سکتے ہو۔کل ہمارا مقدس دن ہے اور کل صبح ہی میں تفصیل سے بتاؤں گا کہ تم لوگ ہمارے لیے کیا اور کیسے کر سکتے ہو۔ میں نے برٹش سے کہا کہ یہ لوگ قدیم ارواح کی توہم پرستی میں مبتلا ہیں۔

ہمیں ایک گندے سے دری نما ٹکڑے پر کھانا دیا گیا۔ میں صرف کیلوں کو ہی پہچان سکا۔ وہ جنگلی کیلے تھے۔ گوشت کی کسی بھی رکابی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کرسٹینا کافی بہادر ثابت ہوئی اور مجھے طفل تسلیاں دیتی رہی۔ میں اسے حوصلہ دیتا رہا۔ آج 43 سال بعد مجھے یاد نہیں کس نے کھایا کس نے نہیں کھایا۔ جس کو نیزے کی اَنی مار کر زخمی کیا گیا تھا وہ حوصلہ مند ثابت ہوا۔ بخار اور درد کی کیفیت میں بھی نہ صرف خود پر امید تھا بلکہ ہم سب کو بھی بہادری اور حوصلے کی تلقین کر رہا تھا۔ باقی تمام ساتھی بھی بہادر، سمجھدار اور حوصلہ مند تھے۔ جنگلی قبائلیوں نے نہ ہماری کسی چیز کو ہاتھ لگایا اور نہ ہی کسی خاتون کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا۔ بس ہمیں فرار ہونے کی کوشش کرنے پر جان سے مارنے کی دھمکی دیتے رہے۔ رات کا اندھیرا چھانے لگا۔ جنگل کا اندھیرا صرف وہی جان سکتا ہے جس نے اس اندھیرے میں رات بسر کی ہو۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ جنگلیوں کی گھورتی ہوئی خونخوار آنکھیں، شراب کی طرح کا self-made مشروب جس کی ناگوار بو چار سو پھیلی تھی۔ لکڑی کے ڈنڈوں پر کسی جانور کی چربی لگا کر اس کو روشنی کے لیے جلایا جا رہا تھا جس کی بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ ہمارے کپڑے اور دیگر سامان ہمیں دے دیا گیا تھا۔ سب لوگوں نے اپنے کپڑے پہن لیے تھے۔ ہم لوگ ایک دائرے کی شکل قیدی کی حیثیت سے بیٹھے تھے۔ ہمیں اسی جگہ پر بیٹھ یا لیٹ کر رات گزارنی تھی۔ صبح سردار کے ہر حکم کی تعمیل کرنی تھی ورنہ جنگل کا قانون حرکت میں آجاتا۔ ہمارے آس پاس نیم برہنہ جنگلی لڑکیاں اپنے چہروں پر عجیب وغریب نقش ونگار بنائے اور جسم پر کسی جانور کی چربی ملے دائرے میں رقص کر رہی تھیں۔ ان میں سے جانوروں سے بھی زیادہ غلیظ بدبو آ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وقت گزر رہا تھا۔ رات کا تیسرا پہر تھا کہ اچانک جنگلیوں کی چیخ وپکار شروع ہوگئی۔ ہم سب بھی پریشانی میں ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ معلوم ہوا کہ نائجیرین آرمی نے اس جنگلی کیمپ کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ اُن کے ساتھ کچھ انگریز لوگ بھی تھے۔ انہوں نے ہمیں بازیاب کیا۔ کاروائی پوری کرتے کرتے صبح کی پو پھٹنے لگی۔ آرمی والے ہمارے ساتھ عزت واحترام سے پیش آئے۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد ہم آرمی کی گاڑیوں تک پہنچ گئے۔ مجھے اور کرسٹینا کو ین کاری ریزارٹ چھوڑ دیا گیا۔ لیکن کرسٹینا کا سروس کارڈ آرمی والوں نے اپنے پاس رکھ لیا اور ہمیں پابند کیا گیا کہ ہم ان کے آفس آ کر اپنا میڈیکل کروائیں اور سفری کاغذات چیک کروائیں پھر کلیرنس ملے گی۔ ہم اپنی hut پہنچ گئے۔ سب سے پہلے خوب اچھی طرح نہائے، کھانا کھایا۔ کرسٹینا نے کچھ ادویات بطورِ احتیاط خود بھی لیں اور مجھے بھی دیں۔ پھر ہم بے خبر سو گئے۔ تمام دن سوتے رہے۔ شام کو اُٹھ کر تازہ دم ہو کر باہر

آئے۔ پر رونق جگہ پر مٹر گشت کرتے رہے، کھانا کھایا۔ کاؤنٹر پر جا کر اپنا بل کلیئر کروایا کیونکہ ہمیں صبح سویرے Jos کے لیے نکلنا تھا اور واپس hut میں آ گئے۔ بحث مباحثہ جاری رہا کہ ہمارے ساتھ یہ سب کیوں ہوا اور آرمی نے ہمیں کیوں rescue کیا؟ کرسٹینا نے کہا کہ Jos جا کر انکوائری کر کے ساری information مل جائے گی۔ نہ جانے کس وقت نیند آ گئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو کرسٹینا تقریباً تیار ہو چکی تھی۔ میں نے بھی باتھ روم کا رخ کیا۔ تیار ہو کر قبلہ رخ کا اندازہ کر کے اپنے مالک و خالق کا شکر ادا کیا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

واپسی کا سفر خاموشی سے جاری تھا۔ ہم اپنے پروگرام سے دو دن پہلے ہی واپس جا رہے تھے۔ کرسٹینا نے مجھے ہدایت کی کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کروں۔ مزید کہا کہ پاسپورٹ اور اس کی فوٹو کاپی لے کر دیئے گئے ایڈریس پر جانا ہوگا۔ میں نے کہا No Problem ضرور چلیں گے۔ رات تک ہم خیریت سے Jos پہنچ گئے۔ اگلے ہی دن ہم اپنے کاغذات لے کر بتائے گئے آفس پہنچ گئے۔ ہمارے کاغذات خاص طور پر Visa validity and entry stamp چیک کی گئی اور مجھے پاسپورٹ واپس کر دیا گیا جبکہ فوٹو کاپی خود رکھ لی۔ آفیسر انچارج نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے تمام واقعات و مشکلات کے لے معذرت کی اور یاد دہانی کروائی کہ 10 روز بعد آپ کا ویزا ختم ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے اور میں کل ہی اپنی Booking کے لیے ائر لائن کے آفس جاؤں گا۔ اس نے ایک بار پھر معذرت کرتے ہوئے ہمیں اجازت دی اور ہم واپس آ گئے۔

دوسرے روز ہمیں پروفیسر الجبوری کی طرف جانا تھا۔ ان کو ہم نے سارا واقعہ سنایا تو انہوں نے ہمیں تفصیلات بتا کر حیران و پریشان کر دیا۔ اُن کے مطابق جس برٹش کو نیزہ مار کر جنگلیوں نے زخمی کر دیا تھا وہ آرمی کا انسٹرکٹر ہے۔ اس کا ایک ساتھی آپ لوگوں کے پیچھے پانی کے اندر آ رہا تھا۔ جب جنگلیوں نے آپ لوگوں کو گھیرا تو وہ پانی کے اندر ہی واپس ریزارٹ آیا اور اپنی Embassy کے ذریعے وزارتِ خارجہ کو اطلاع کی۔ انہوں نے وزارتِ داخلہ سے رابطہ کر کے فوری ایکشن لیا اور آپ لوگ بچ گئے۔ میں نے حیرانگی سے پروفیسر سے پوچھا کہ آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا تو وہ بولے کہ یہ تو TV کی خبر ہے اور Top Brass لیول پر کافی شور مچا ہوا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ سیاسی حکومت ان قبائل کے ہاتھوں مجبور و بے کس ہے۔ ہر قبیلے کے سردار کے پاس گورنر کے اختیارات ہیں۔ میں نے کئی بار ذاتی طور پر دیکھا کہ Jos شہر کی رواں دواں ٹریفک کو پولیس بہت efficiency سے کنٹرول کر رہی ہے کہ یکا یک اس کو ٹریفک روکنی پڑی کیونکہ ایک ننگ دھڑنگ جنگلی آدمی گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار سر پر ایک رِنگ بندھا ہوا ہے جس میں کسی پرندے کا رنگین پَر لگایا ہوا تھا۔ ہاتھ میں نیزہ اور چمڑے کی لنگوٹی کی پشت پر خنجر اڑسا ہوا۔ اکڑ کر بیٹھا اپنی سرخ انگارہ آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ ٹریفک پولیس والے اس کو سلیوٹ کر کے پہلے گزرنے کا موقع فراہم کر رہے تھے۔ اس کی وجہ سے تمام ٹریفک رکا ہوا

تھا۔انہوں نے مزید بتایا کہ جہاں آپ تھے وہاں آس پاس 60 کے قریب قبائل بستے اور حکومت کرتے ہیں۔ ہر قبیلے کے اپنے رسم ورواج اور اپنا سردار حکمران ہے۔ان ساٹھ قبائل میں سے سب سے بڑا قبیلہ فلانی ہے۔ باقی کچھ کے نام مباداوہ، بویاوا، زولاوہ، ورجاوہ، سایاواہ، کاری کاوہ، کانوری بٹاواہ، جاراواہ وغیرہ ہیں۔ کچھ بھلے مانس اور کچھ خونخوار ہیں۔ہم غالباً بولیوا قبیلے کی قید میں تھے۔ یہ ایک چھوٹا مگر خونخوار اور شیطانی قوتوں پر ایمان رکھنے والا قبیلہ ہے۔وہ ہمیں اپنے قبیلے کی نوجوان لڑکیوں کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے جن پر جنوں بھوتوں اور بدارواح کا قبضہ تھا۔ ہمارے لیے جال بھی انہی لڑکیوں نے لگایا تھا۔

اکثر قبیلوں کے مزاج، رسم ورواج اور آپس کی دشمنیوں پر مختصراً عرض کرتا ہوں۔ بولیوا قبیلہ ایک جگہ قیام نہیں کرتا۔کم تعداد میں ہونے کی وجہ سے خانہ بدوش زندگی گزارتا ہے۔آرمی والوں نے اپنے برٹش انسٹرکٹر کو بتایا تھا کہ اگر یہ لوگ آپ کو گھنے جنگل میں لے جاتے تو ہمارے لیے آپ کو ڈھونڈنا بہت مشکل ہو جاتا۔افریقی قوم کے کردار کی تشکیل میں وہاں کی آب و ہوا، جغرافیہ، تاریخ، یورپی اقوام کا Colonial سسٹم اور اس کے اثرات، تجربات اور فلسفہ حیات بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔جنگلوں میں جنگلی جانوروں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ان ہی جیسی عادتیں اُن میں بدرجہ اتم موجود ہیں جن میں مذکر و مونث کی کوئی تمیز نہیں۔آبادی اور غربت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔میں اکثریت کی بات کر رہا ہوں (Elite کلاس ہمیشہ اقلیت میں ہوتی ہے)۔موسم بھی خاصا نا مہربان ہوتا ہے۔آسمان پر بادل دھاڑتے ہیں، جنگلی ہوائیں مست ہاتھیوں کی طرح چنگھاڑتی ہیں جو جنگل میں رہنے والوں کے مزاج پر اثر انداز ہوتی ہیں۔تو ہم پرستی کی وبا ان کو ترکے میں ملی ہے اور ان کی رگ رگ میں سمائی ہے جس کا ہم شکار بنے۔

قبائلی مرد اور ان کی بیویاں بمعہ بچے سب مل کر تلاشِ معاش، کام کاج، شکار اور دیگر گھریلو و معاشرتی کاموں میں برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔جس طرح ایک مرد ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے اسی طرح کچھ قبائل میں ایک عورت ایک سے زیادہ شوہر رکھ سکتی ہے۔اگر قبائل میں آپس میں جنگ چھڑ جائے تو آسانی سے ختم نہیں ہوتی۔ یہ جنگ عرصہ دراز تک چلتی ہے اور بے شمار ہلاکتوں کا باعث بنتی ہے۔معاشرتی لحاظ سے یہ لوگ مفلوک الحال ہیں۔زراعت اور صنعت و حرفت سے نا آشنا ہیں۔اب کچھ قبائل گلہ بانی کرنے لگے ہیں جس کی وجہ سے کچھ ضروریاتِ زندگی اُن کو میسر آنے لگی ہیں۔ ورنہ پہلے تو یہ ننگ دھڑنگ ہی رہتے تھے۔سانپ، کیڑے مکوڑے، دیمک اور جنگلی جانور جو بھی ہاتھ لگتا ہڑپ کر جاتے۔ یہاں تک کے حضرتِ انسان کو بھی کھا جاتے۔جنگلی زیورات، ہتھیار، شکارگاہ، پانی کا ذخیرہ اور درخت ان کی جائیداد تصور کیے جاتے ہیں۔ مذہبی رسومات، جادو، مخصوص ٹونے ٹوٹکے بھی ان کی جائیداد کا حصہ ہیں اور ان کی حفاظت کی جاتی ہے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ افریقن بندر بہت شوق سے کھاتے ہیں اس لیے ہر وقت ناچ ناچ کر چیختے چلاتے ہیں۔لیکن ناچ ان کے مذہب کا حصہ ہے۔رقص وموسیقی ان کی زندگی کا لازمی جزاور تفنن طبع کا ذریعہ ہے۔ان کے مذہبی رقص خطرناک ہوتے ہیں۔آگ کا ایک الاؤ روشن کیا جاتا ہے۔تمام مرد وزن اس کے گرد ناچتے ہیں اور ایک دوسرے کا خون نکالتے ہیں۔جیسے جیسے موسیقی میں تیزی آتی ہے رقص کی رفتار بھی بڑھتی جاتی ہے۔انسانی خون کے فوارے بھی واضح ہوتے جاتے ہیں۔اندھیری رات میں یہ رقص وموسیقی کوئی بہادر انسان ہی دیکھ سکتا ہے۔جنگل و صحراوں کی مٹی،ان کے جسموں سے رستا خون،خنجر سے چہرے اور جسم پر کھدے نقش ونگار، جانوروں کی چربی اور خون کی آمیزش سے بنے خاکے اُن کے حسن کی آرائش وزیبائش ہے۔

اتوار کا دن تھا۔میں گھر پر ہی تھا کہ آبھا دیوی تشریف لے آئیں۔ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے۔پلاؤ کے ساتھ کباب بھی تھے۔میں نے آبھا دیوی سے پوچھا کباب کھائیں گی،گاؤ ماتا کے ہیں؟ابھی وہ کوئی جواب نہ دینے پائی تھیں کہ میں نے جھٹ سے کباب ان کی پلیٹ میں رکھ دیا اور وہ بڑے آرام سے کھا گئیں۔پھر دوسرا، تیسرا اور چل سو چل۔میں نے باتوں باتوں میں انہیں بتایا کہ واپسی کی Reservation کروالی ہے اور کچھ دنوں میں جدہ چلا جاؤں گا۔وہ اداس لہجے میں بولیں کہ یہ تو کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔پھر آہستہ سے کہا کل لنچ اکٹھے کریں گے۔میں جلدی اپنے لیکچر سے فارغ ہو جاؤں گی۔تم ایک بجے تک ہوٹل پہنچ جانا۔میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہ چلی گئیں۔اگلے دن میں نے اُن کے ساتھ پر تکلف لنچ کیا۔لنچ کے بعد اٹھتے ہوئے میں نے کہا آبھا دیوی بظاہر یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔آپ نے میرے Jos میں قیام کے دوران مجھے بہت وقت دیا۔آپ کی پر تکلف دعوتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔میں ماشاءاللہ دس بچوں کا باپ ہوں جن کی یاد مجھے بہت شدت سے ستاتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ پَر لگ جائیں اور میں اُڑ کر اپنی فیملی میں پہنچ جاؤں۔اُنہوں نے مجھے کہا کہ اگر میں چاہوں تو وہ مجھے کانو تک ڈراپ کر سکتی ہیں۔میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا اور کہا کہ جاتے جاتے میں Jos کی پاکستانی اور انڈین کے دیدبان لوگوں کے لیے ایک اور سکینڈل نہیں چھوڑنا چاہتا۔وہ بے اختیار ہنستی چلی گئی۔دوسرے روز ڈاکٹر کرسٹینا نے مجھے فون کال کر کے ضروری کام سے بلایا۔میں اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر اس کے فلیٹ کی سیڑھیاں جا چڑھا۔وہ آفس جانے کے لیے تیار تھی۔میرے جاتے ہی کہنے لگی کہ میں نے تمام اسلامی لٹریچر اور مقدس کتاب کا انگریزی ترجمہ پڑھا ہے اور مجھے سب سمجھ بھی آ گیا ہے۔تم آج آفس ٹائم ختم ہوتے ہی میرے پاس آ جانا۔ہم پروفیسر الجبوری کے پاس چلیں گے۔میں آج کے بعد ایک مسلمان خاتون کے طور پر جانی پہچانی جاؤں گی۔میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔میں نے بے خودی میں اس کو گلے لگا کر مبارکباد دینی چاہی تو وہ پیچھے ہٹتے ہوئی بولی کہ اب میں ایک مسلمان خاتون ہوں اور میں کسی نامحرم کے گلے نہیں لگ سکتی۔یہ سب باتیں تم نے ہی

مجھے بتائی ہیں۔ میں اتنا خوش تھا کہ میں نے کئی بار اس کو سلیوٹ کیا اور جزاک اللہ کہا۔ ہم نیچے کار تک اکھٹے آئے۔ میں نے احتراماً اس کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔ وہ بیٹھ گئی تو دروازہ بند کر کے اسے سلام کیا۔ وہ ہنستی مسکراتی اپنے ہسپتال روانہ ہوگئی۔ یہ منظر ٹوڈو۔ واڈا کے تمام فلیٹس کے مکین دیکھ رہے تھے اور انگشت بداں تھے۔ دراصل انڈو پاک کی خواتین کی انگلیاں ذرا سی بات پر ہی دانتوں تلے آجاتی ہیں۔ شک وشبہ اور بال کی کھال اتارنے کے لیے پریشانی شروع ہوجاتی ہے۔ اصل میں یہ سب کے کام پر جانے اور بچوں کے سکول جانے کا وقت تھا اسی لیے یہ منظر مقبولِ عام ہوا۔ جب میں واپس اپنے فلیٹ پر پہنچا تو میرے میزبان طنزیہ بولے کہ آپ اس فلپائنی میں کچھ زیادہ ہی involve نہیں ہو رہے؟ میں نے کہا آپ شام تک صبر کریں۔ آپ سمیت دیگر تمام مسلمان عورتیں اس خاتون کو مبارکباد دینے بنفسِ نفیس اس کے فلیٹ پر جانے میں فخر محسوس کریں گی۔ دونوں مسٹر اور مسز فوراً بولے کہ اللہ نہ کرے ایسا ہو۔ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا کہ انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔

میں بھی جلد ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ سعودی ایئر لائن کے آفس سے اپنی ٹکٹ کنفرم کرواتا ہوا کرسٹینا کے پاس ہاسپٹل پہنچ گیا۔ وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے چہرہ پر نور تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ روشنی کا ایک ہالہ اس پر سایہ فگن ہے۔ آج اس نے مکمل لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر سکارف بھی تھا۔ اچھی، پاکیزہ اور مدبر لگ رہی تھی۔ پروفیسر الجبوری بھی بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی کرسٹینا نے انہیں کہا کہ میں نے آپ کا دیا لٹریچر اور قرآن پاک کا کئی بار مطالعہ کیا ہے اور ہر بات سمجھنے کے بعد میں اپنی مرضی سے مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔ پروفیسر نے پوچھا کہ اس کام کے لیے آپ کے دوست ادریس یا کسی بھی اور شخص نے آپ کو کوئی لالچ دے کر یا زبردستی مجبور تو نہیں کیا؟ اس نے فوراً کہا No No No۔ پروفیسر نے قرآن پاک کی ایک سورۃ تلاوت کی اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی سنایا۔ پھر کرسٹینا کو کلمہ پڑھوایا جو اس نے خوبصورتی سے پڑھا۔ مبارکباد دی گئی اور مٹھائی کے طور پر پروفیسر نے چاکلیٹ پیش کئے۔ کچھ اسلامی نام بھی تجویز کئے گئے۔ کرسٹینا نے جواب دیا کہ میں کل تک فیصلہ کروں گی کہ یہاں رہ کر اپنا کنٹریکٹ پورا کروں یا کچھ دنوں میں واپس فلپائن چلی جاؤں۔ پھر وہ میری طرف مڑی اور بولی مسٹر ادریس آپ ایک اچھے، مہذب اور توانائی سے بھرپور انسان ہیں۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اسلام سے روشناس کروایا اور میری مدد کی۔ میں آپ کو اس لئے بھی بہادر مانتی ہوں کہ پورے ٹوڈو۔ واڈا کے مکینوں کی مخالفت کے باوجود آپ نے مجھ سے ملنا جلنا نہیں چھوڑا اور میری راہنمائی کرتے رہے۔ جنگلیوں کے درمیان جب موت ہمارے ساتھ ساتھ تھی تو آپ مجھے تسلی وتشفی دیتے رہے اور آج الحمدللہ میں ایک مسلمان خاتون ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ آپ پاکستان میں کیا کرتے ہیں اور نا ئجیر یا کیوں آئے؟ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ۔ میں آپ کو آفر دیتی ہوں کہ اس نومسلم خاتون سے اگر آپ نکاح کرنا چاہیں تو

ابھی اسی وقت پروفیسر الجبوری نکاح پڑھوا سکتے ہیں اور صبح رجسٹریشن آفس سے رجسٹرڈ بھی ہو جائے گا۔ میں غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا?Are you finished وہ بولی Yes۔ میں نے جواب دیا کہ آپ ایک نفیس اور خوبصورت خاتون اور قابل ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے مجھے یہاں کافی وقت دیا اور آپ کی وجہ سے میرا قیام آرام دہ رہا۔ آپ نے میرے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے اپنی گذشتہ زندگی کی تمام عادات چھوڑ کر مسلمان ہونا قبول کیا۔ اس سب کا اجر صرف اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ ہم موت کے سفر میں بھی ہم سفر رہے جسے ہم کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نہ صرف شادی شدہ بلکہ ماشاءاللہ دس بچوں کا باپ بھی ہوں۔ آپ کی آفر کا شکریہ اور میں تمام عمر احسان مند رہوں گا لیکن میں اپنی اہلیہ اور بچوں سے بہت محبت کرتا ہوں۔ نہ میں اپنی اہلیہ کو دھوکا دے سکتا ہوں اور نہ ہی اپنے بچوں کو ignore کر سکتا ہوں۔ مزید یہ کہ آپ کی برداشت اور مہربانی کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ کمرے میں ایک سکوت طاری تھا۔ پروفیسر الجبوری نے کھڑے ہو کر کہا جزاک اللہ! .Idrees you are a very good person کرسٹینا خاموشی سے اٹھی اور بولی آؤ چلیں اور ہم ٹوڈو۔ واڈا واپس آ گئے۔ کچھ خواتین درخت کے نیچے اکھٹی ہو کر ہمیں ڈسکس کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولیں ہم تو آپ کو شادی کے لباس میں expect کر رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ میں تو پہلے سے شادی شدہ اور بال بچے دار ہوں لیکن کرسٹینا اب ایک مسلمان خاتون ہے۔ اپنی دقیانوسی سوچ اور شک وشبہ سے باہر نکلیں اور اسے عزت و احترام دیں۔ وہ سب اس کے فلیٹ میں جا گھسیں اور اسے گلے لگا کر مبارکبادیں دینے لگیں۔ رات کو ٹوڈو۔ واڈا کی خواتین مختلف قسم کے کھانے لئے فرداً فرداً کرسٹینا کے فلیٹ میں موجود رہیں۔

اب کرسٹینا صبح ہسپتال جاتے ہوئے مکمل اسلامی لباس میں ہوتی۔ اپنی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میرے فلیٹ کی بالکونی کی طرف ضرور دیکھتی جہاں میں اللہ حافظ کہنے کے لیے موجود ہوتا۔ وہ ہاتھ ہلا کر جواب دیتی۔ کبھی کبھی السلام علیکم کی باریک سے آواز بھی آ جاتی۔ اکثر آس پاس کی خواتین اس بات کی گواہی دیتیں کہ ہم جب بھی کرسٹینا سے ملنے اس کے فلیٹ میں جاتے ہیں تو وہ یا تو جائے نماز پر ہوتی ہے یا قرآن پاک پڑھ رہی ہوتی ہے۔ اس کے پاس عربی، انگریزی اور فلپائنی زبانوں میں قرآن پاک موجود تھے۔ اس کے فلیٹ کی دیواروں پر دیگر خرافات کے بجائے اسلامی قطعات آویزاں ہو چکے تھے۔ دن گزرتے گئے اور آخر ایک صبح نماز کے بعد میرے ہم زلف فاروق احمد ناصر اور ان کی اہلیہ مجھے کانوائیر پورٹ چھوڑنے جا رہے تھے۔ جب سامان گاڑی میں رکھا جا رہا تھا تو میری نظر اس کے فلیٹ کی طرف چلی گئی۔ وہ گم سم سی اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلا کر الواع کہا تو وہ یکا یک سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتری اور میرے سامنے آ کر خاموش کھڑی ہو گئی۔ دیگر لوگ بھی خاموش تھے۔ میں نے سکوت توڑتے ہوئے کہا کہ میں ایک مسلمان خاتون کی عظمت کو سلام کرتا ہوں اور امید

کرتا ہوں کہ آپ میرے لئے دعا گو رہیں گی۔ اُس نے بڑی مشکل سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں Good Bye کہا اور جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی۔ سامان رکھا جا چکا تھا۔ گاڑی سٹارٹ تھی۔ ناصر صاحب مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے بالکونی پر ایک الوداعی نظر ڈالی تو وہاں ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اس طرح ہم Jos کے سیٹلائٹ علاقے کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ہائی وے پر آ گئے اور کانو ائیر پورٹ کی جانب رواں دواں ہو گئے۔

کار کے اندر کا ماحول گھمبیر تھا جو آہستہ آہستہ موقع محل کے لحاظ سے ٹھیک ہونے لگا۔ سفر اور موسم دونوں خوشگوار تھے اور ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بخیریت تمام کانو ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ ناصر صاحب اور ان کی اہلیہ مجھے ائیر پورٹ پر ڈراپ کر کے اسی وقت واپس روانہ ہو گئے کیونکہ وہ مغرب سے پہلے واپس Jos پہنچنا چاہتے تھے۔ مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ آزادی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے۔ میں تو اپنے بچپن سے ہی ایک شیطان صفت اور درندہ خصلت انسان سے اپنی آزادی کے لیے لڑتا چلا آ رہا ہوں۔ تفصیل کے لیے میری تصنیف ''فرشتے کی ایف آئی آر'' سے استفادہ فرمائیں۔

لاؤنج کا ماحول بہت خراب تھا۔ ایسا معلوم پڑتا تھا کہ کسی تھرڈ کلاس بس اسٹینڈ کے ویٹنگ روم میں آ گیا ہوں ۔ بہت مشکل سے وقت گزارہ۔ ناصر صاحب پراٹھے، انڈوں کا آملیٹ اور اچار کا تحفہ زبردستی دے گئے تھے۔ میرے انکار پر بولے رکھ لو یہ بہت کام آئے گا۔ یہ فلائیٹ تو سعودی ائیر لائن کی ہے لیکن جہاز PIA کا آئے گا اور کب آئے گا یہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے۔ اول تو ائیر پورٹ سے کچھ کھانے کو نہیں ملے گا اگر ملا بھی تو صرف حرام ملے گا۔ اور پھر تمہارے نخرے کون اٹھائے گا اس لئے تم بھوکے رہ جاؤ گے۔ ہم خاص طور پر تمہارے لیے بنا کر لائے ہیں۔ کھا کر برتن ایک طرف رکھ دینا کوئی ضرورت مند خود ہی لے جائے گا۔ انہوں نے یہ تقریر کتنی درست کی تھی اس کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا۔ جہاز رات دو بجے آیا۔ تمام وقت ائیر پورٹ پر چوراچکوں اور بلیک میلرز کے درمیان گزرا۔ ناصر صاحب کی دعوتِ شیراز بہت کام آئی۔ فلائٹ اناؤنس ہوتے ہی میں نے سکھ کا سانس لیا اور ڈپارچر لاؤنج میں آ گیا۔ وہاں بھی کئی پرچون فروش موقعے کی تاک میں کھڑے تھے۔ میں نے خود ہی اپنا سامان اٹھا کر وزن کروایا، خود conveyer بیلٹ پر رکھا، خود ٹیگ لگائے اور بورڈنگ پاس لیا۔ جب سب کر چکا تو ایک لنگور نما آدمی آ کر ٹپ مانگنے لگا۔ میں سنی ان سنی کرتا Immigration والوں کی طرف بڑھا۔ ابھی کاؤنٹر تک پہنچا ہی تھا کہ Hello my friend کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو میرا پرانا مہربان امیگریشن آفیسر مجھ سے بغلگیر ہونے کے لیے سامنے کھڑا تھا۔ یہ وہی تھا جس کو میں نے Arrival lounge میں چند ڈالروں کے عوض ہائر کیا تھا۔ میں نے بھی خوش خلقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا حال احوال پوچھا اور اپنا

پاسپورٹ اس کے حوالے کر دیا۔اس نے عبادت کی طرح میرے سب کام کیے۔ دوسرے لوگ لائنوں میں لگے تھے جن میں اکثریت پاکستانی اور انڈین مسلمانوں کی تھی اور وہ مختلف وجوہات اور کہیں بغیر وجہ کے ہی بلیک میل ہو رہے تھے۔ ہر طرح سے کلیر ہونے کے بعد ہم ویٹنگ لاؤنج میں آ گئے۔ وہاں کا ماحول کچھ بہتر تھا۔ میرا دوست کہنے لگا کہ تمہارے پاس پرفیوم ہوگا؟ میں نے اپنی گرل فرینڈ سے وعدہ کیا ہے کہ اس ویک اینڈ اسے پرفیوم کا تحفہ دوں گا۔ ہماری ڈیوٹی فری شاپس پر اور ریجنل پرفیوم نہیں ہوتے اس لیے آپ سے مانگ رہا ہوں۔ میں نے اسے اس کی سروسز اور پروٹوکول کی عوض 20 ڈالر کا نوٹ دیا جو اس نے خوشی سے قبول کر لیا۔ میں نے مزید کہا کہ میں عمرے کی ادائیگی کے بعد دوبارہ پندرہ روز میں واپس یہیں آ رہا ہوں۔ آپ مجھے اپنی اور اپنی گرل فرینڈ کی جوائس لکھ دیں میں لیتا آؤں گا۔ وہ بہت خوش ہوا اور میرا شکریہ ادا کیا۔ فلائیٹ کے لیے گیٹ تک مجھے چھوڑنے آیا اور ایک لکھا ہوا کاغذ میری جیب میں ٹھونس دیا۔ میں جہاز پر سوار ہو گیا۔ جہاز ٹیکسی کرتا ہوا رن وے پر آیا اور جدہ کی طرف پرواز کر گیا۔

PIA کا جہاز تھا جس میں تمام سٹاف پاکستانی تھا صرف نام SA تھا۔ پاکستانی ایئر ہوسٹس دیکھ کر بہت اچھا محسوس ہوا جیسے گھپ اندھیرے سے دن کے اجالے میں آ گیا ہوں۔ جہاز صبح 6 بجے جدہ پہنچا۔ نیند نے پاگل کیا ہوا تھا۔ ہوٹل جا کر گہری نیند سو گیا۔

جدہ، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور عمرہ ادا کر کے واپس پاکستان پہنچ جانے تک کے تمام حالات و واقعات میں اپنی تصنیف ''فرشتے کی ایف آئی آر'' میں لکھ چکا ہوں۔

میں نائیجیریا کیوں گیا؟

''سیروا فی الارض'' زمین میں سیاحت کرو

سیاحت کے علاوہ میں اپنا درآمد و برآمد کا انٹرپرائز قائم کرنے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ جب ناصر صاحب پاکستان آتے تو مجھے سہانے خواب دکھاتے اور زبانی کلامی مجھے کچھ اس طرح سے بزنس کے طور طریقے بتاتے کہ میں بے چین ہو جاتا۔ دراصل میں اپنا ذاتی Liaison آفس دوسرے ملک میں قائم کر کے پاکستان سے ایکسپورٹ کے بزنس کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ جب میں نائیجیریا پہنچا اور دو چار دن بعد ناصر صاحب سے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں تفصیلاً بات ہوئی تو میں نے ان کو Razzla dazzle پایا یعنی صرف شور شرابہ اور دکھاوا مگر عملی طور پر کچھ نہیں۔ میں ناامید ہو گیا۔ میرے پاس ملتان چیمبر آف کامرس کا تعارفی لیٹر بھی تھا کیونکہ ان دنوں بہاولپور میں یہ سہولت موجود نہیں تھی اور میں ملتان چیمبر آف کامرس کا Bonafide ممبر تھا۔ میں نے اس لیٹر کی

وساطت سے وہاں کے مقامی چیمبر کو اپروچ کیا۔ انہوں نے مقامی تاجروں کی ایک میٹنگ کال کی اور میرا تعارف کرواتے ہوئے مجھے بولنے کی دعوت دی گئی۔ میں نے تفصیل سے اپنے آنے کے مقصد اور باہمی بزنس کیے طریقہ کار پر روشنی ڈالی۔ انہیں بتایا کہ کوالٹی پر No compromise کی پالیسی ہوگی اور دیگر تمام صورت احوال بھی واضح کی۔ خاص طور پر Letter of credit امریکن بینک سے Counter-sign ہونے کے طریقہ کار پر زور دیا۔ کیونکہ میں نے پاکستان سے اپنا سفر شروع کرنے سے پہلے بینک کے فارن ایکسچینج کے شعبے سے میٹنگ کی تھی جس میں انہوں نے مجھے واضح طور پر بتایا تھا کہ اکثر افریقن بینکوں کی LCs جعلی ہوتی ہیں اور اگر اصل بھی ہوں تو وہ payment سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس لیے City bank of America سے تمام LCs کا کاؤنٹر سائن ہونا ضروری ہے ورنہ ہم تو کیا کوئی بھی بینک entertain نہیں کرے گا۔ میں اپنا ہوم ورک کر کے گیا تھا۔ میری اس بات سے کوئی بزنس مین متفق نہیں تھا۔ اکثر ادھار پر بزنس کرنا چاہتے تھے اور سنہرے خواب نہ صرف خود دیکھ رہے تھے بلکہ مجھے بھی دکھا رہے تھے۔ LC تو وہ millions میں کھولنے کو تیار تھے لیکن جب counter sign کی بات آتی تو گھوڑے کی طرح بدک جاتے۔

میں ایک پرامید انسان ہوں اور سمجھتا ہوں کہ Nothing is end of the world۔ ناصر صاحب کا رویہ بزنس کے سلسلے میں بیوقوفانہ تھا۔ میں متاثر کن رویوں کا عادی اور امین ہوں۔ وہاں کے بزنس مین اور ٹھگ میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے ''شریف آدمی تم مال بھیجو اور ادائیگی کی پروا مت کرو''۔ مگر مجھے اس قسم کی گفتگو پر بالکل یقین نہیں تھا۔ میرے لیے یہ الفاظ بے معنی اور crap تھے۔ ان رویوں کی وجہ سے مجھے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ میں بہت determination سے گیا تھا اور بین الاقوامی معیار کے cosmopolitan standards پر ایمان کی حد تک یقین رکھتا تھا اور رکھتا ہوں۔ اس لئے نہ تو میں نے ادھار دیا نہ معیار کم کیا اور نہ ہی ہار مانی۔ حضرتِ انسان کی ہر چیز مالک و خالق کے اختیار اور حکم کی تابع ہے۔ میں نے دوسرے ممالک میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا اور عمرہ ادائیگی کے بعد واپس پاکستان آ گیا۔

بقول فیض احمد فیض:

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

خاموش رہا ہماری نیکی پر زمانہ
عیبوں کی بات آئی تو گونگے بھی بولنے لگے

باب2: نیروبی۔کینیا(1990ء)

روح کی گرد سے پہلے محسنؔ
داغ دامن کا تو دھو کے دیکھوں
(محسنؔ نقوی)

نیروبی (کینیا)

آج سے تقریباً 35 سال پہلے ماہنامہ حکایت میں جنوبی افریقہ کے ایک ملک بوٹسوانہ (Botswana) کے متعلق ایک مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مضمون پڑھنے کے بعد میرا تجسس بوٹسوانہ کے حوالے سے بہت حد تک بڑھ گیا۔ اس سے پیشتر میں یورپ، مڈل ایسٹ اور ایشیا کے مختلف ممالک کے علاوہ لیبیا اور نائیجیریا کی سیاحت کر چکا تھا اور افریقہ کے متعلق میرا تجربہ زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔ سب سے پہلے میں نے صاحبِ مضمون سے ان کے دیئے گئے پوسٹل ایڈریس پر ان سے بذریعہ خط رابطہ کیا۔ جس کا جواب تقریباً ایک ماہ بعد مجھے موصول ہو گیا۔ صاحبِ مضمون نے اپنے لیٹر پیڈ پر مجھ سے خیر سگالی کے جذبے کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اپنے خط میں اُن سے پوچھا تھا کہ پاکستان سے کوئی بھی خدمت ہو تو مجھے حکم کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے لکھا کہ اُن کے ہاتھوں بڑی تعداد میں مقامی لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور بہت سے لوگوں پر کام جاری ہے۔ جن کے لیے قرآن پاک کے عربی اور انگلش نسخوں کی اشد ضرورت ہے۔ اس طرح آپ بھی اس کارِ خیر میں ثواب کے حصے دار ہو جائیں گے۔

اُن کا خط بے حد عزت اور احترام سے لکھا ہوا تھا اور ان کا لیٹر ہیڈ پیڈ بھی کافی متاثر کن تھا۔ انکے لیٹر ہیڈ پیڈ کے مطابق وہ دنیا کے بہت زیادہ پڑھے لکھے افراد میں سے ایک تھے۔ ان صاحب کو کوئی بھی جواب دینے سے قبل میں نے قرآن پاک ارسال کرنے کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ ایئر لائن کے آفس سے پتہ چلا کہ قرآن پاک کی consignment بُک کرتے وقت منسٹری حج اوقاف کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا لازم ہے کہ قرآن پاک کی تمام جلدیں کسی بھی غلطی سے پاک ہیں۔ میں فوراً اسلام آباد کے لیے عازمِ سفر ہوا۔ اُن دنوں نواب آف بہاولپور بریگیڈیئر محمد عباس خان عباسی وزیر حج اوقاف تھے اور اُن کے پرائیویٹ سیکرٹری سیّد ناصر الدین میرے ذاتی دوست تھے۔ میں جب بھی اسلام آباد جاتا میرا قیام و طعام اُن کے بنگلے واقع سیکٹر F7/1 بالمقابل جناح سُپر مارکیٹ میں ہوتا۔ وہ ہی مجھے ائیر پورٹ یا ریلوے اسٹیشن سے پک اور ڈراپ کرتے۔ جب میں نے انہیں اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ فرمانے لگے کہ یہ تو ممکن ہی نہیں کیونکہ جن ممالک کو بھی قرآن پاک ارسال کرنے ہوتے ہیں، وزارتِ حج اوقاف خود کرتی ہے۔ البتہ بوٹسوانہ کے حوالے سے آپ قرآن پاک کی اپنی ضرورت کے بارے میں وزارت کو تحریری آگاہ کر دیں۔ میں سیکرٹری حج اوقاف سے بات کر کے بذریعہ پاکستان ہائی کمیشن زمبابوے

کوشش کروں گا۔اُن دنوں بوٹسوانہ میں پاکستان کا ہائی کمیشن نہیں تھا اور زمبابوے کا پاکستانی ہائی کمیشن ہی اس خطے میں پاکستانی مفادات کا خیال رکھتا تھا۔

میں نے سیّد ناصر الدین کی رہنمائی میں ایک درخواست جمع کروا دی اور واپس بہاولپور لوٹ آیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد مجھے وزارت حج اوقاف کی طرف سے ایک جواب بذریعہ خط مل گیا کہ آپ کی درخواست زیرِ غور ہے جیسے ہی اس پر فیصلہ ہوا آپ کو مطلع کیا جائے گا جو تادم تحریر تو موصول نہیں ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد بوٹسوانہ سے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے ایک اور خط موصول ہوا جس میں طنزیہ طور پر یہ شعر لکھا ہوا تھا:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
چیرا تو ایک قطرہ خون نکلا

میں نے جوابی خط میں اُن کو تمام تفصیل لکھی جو ازراہِ شفقت انہوں نے سچ مان لی اور معذرت خواہ بھی ہوئے۔اس طرح ہمارا رابطہ ایک دوسرے سے ہو گیا اور جلد ہی ایک احترام کے رشتے میں بدل گیا۔اب مجھے بھی بے چینی سے اُن کے خط کا انتظار رہتا۔ وہ بھی سخت احتجاج کرتے اگر مجھ سے خط لکھنے میں کوتاہی ہو جاتی۔اس طرح وقت گزرتا گیا۔5/6 ماہ بعد ان کا خط موصول ہوا کہ وہ بمعہ اہل وعیال پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے انہیں بہاولپور آنے کی دعوت دی جو انہوں نے بصد خوشی قبول کر لی۔ وہ پہلے لاہور اپنے بھائی صاحب کے گھر تشریف لائے اور مجھے مطلع کیا کہ ایک ہفتے بعد وہ اپنی فیملی جو اُن کی اہلیہ محترمہ، ایک دختر نیک اختر اور تین پسران پر مشتمل ہے، بہاولپور تشریف لا کر مجھے اور میری فیملی کو اعزاز بخشیں گے۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق تشریف لے آئے۔ ہم سب بے حد خوش تھے کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا first impression بے حد اچھا تھا۔ وہ ایک درمیانے قد کے باریش شخص تھے۔ مسکراتا چہرہ، طبیعت میں سادگی، خوش مزاجی، بظاہر مولوی مگر کوٹ پینٹ ٹائی کے ساتھ، اپنا وزیٹنگ کارڈ دینے میں بھی سخی تھے۔نماز اکثر Miss کر جاتے اور خود کلامی میں یہ بھی کہتے کہ سفر میں ہوں، رات کو تمام قضا نمازیں اکٹھی پڑھوں گا۔

اُن کا تعلق ضلع قصور کے ایک گاؤں کنگن پور سے تھا۔وہ خود مجھے بتاتے تھے کہ وہ گلیوں میں چنے فروخت کیا کرتے تھے۔ایک روز مشرق اخبار کا سپیشل ایڈیشن انہوں نے مجھے دکھایا جس کی سُرخی تھی کہ ''گلیوں میں چنے فروخت کرنے والا لڑکا UNO میں پہنچ گیا۔'' میں نے اخبار پڑھ کر کہا کہ یہ بہت اعزاز کی بات ہے۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ UNDVP میں بھی کام کرتے رہے ہیں اور بوٹسوانہ گورنمنٹ نے انہیں وہیں سے ہائر کیا تھا۔

UNDVP (United Nation Development Voluntary Program)

اپنی تمام تر سادگی کے باوجود وہ بے حد باتونی اور تعریف پسند بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب بمعہ اپنی فیملی کے چند روز میرے گھر قیام کرنے کے بعد لاہور واپس چلے گئے۔ اپنے قیام کے دوران انہوں نے بوٹسوانہ کے کلچر، تاریخ، اکانومی، معدنیات وغیرہ کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا جو کافی پرکشش تھا۔ دینی لحاظ سے ان کا دعویٰ تھا کہ ہزاروں مقامی لوگ ان کے ہاتھ پر یا ان کی رہنمائی میں مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں اور انڈین نژاد مسلمان ہی 90% بزنس پر قابض ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو واپس لاہور چلے گئے مگر اپنا بہت ہی گہرا اثر چھوڑ گئے۔

کچھ دنوں کے بعد مجھے ذاتی کام سے لاہور جانا پڑا۔ وہاں بھی ڈاکٹر صاحب سے ملاقاتیں رہیں۔ یا وہ میرے پاس ہوتے یا میں ان کے ہاں ہوتا۔ اس دوران میرے ایک دوست میجر عتیق بھی میرے ہمراہ ہوتے تھے اور وہ بھی میری طرح ڈاکٹر صاحب کے عقیدت مندوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ بوٹسوانہ میں کاروباری مواقعوں کی تصویر کشی ڈاکٹر صاحب نے کچھ اس طرح کی کہ نہ صرف میں خود بلکہ میجر صاحب نے بھی فیصلہ کیا کہ ایک وزٹ بوٹسوانہ کا ضرور کرنا چاہیے۔ بہاولپور واپسی پر میں نے ڈاکٹر صاحب سے الوداعی ملاقات کی اور ازراہِ مذاق انہیں بتایا کہ میں ایک فقیر منش آدمی ہوں۔ کئی ممالک کی آوارہ گردی کر چکا ہوں لیکن افریقن ریجن میں نہیں جا سکا۔ اب پختہ ارادہ ہے۔ ایک روز صبح سویرے بوٹسوانہ میں آپ کے بنگلے کی کال بیل بجے گی، آپ گیٹ کھولیں گے تو آپ کے سامنے آپ کا یہ خادم کھڑا نظر آئے گا۔ میجر عتیق بھی پھڑک اُٹھے اور بولے کہ یہ اکیلا نہیں ہوگا، میں بھی اس کے ساتھ ہی آؤں گا اور آپ کی کال بیل پر میرا بھی ہاتھ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب مسکراتے رہے اور Most Welcome کہتے رہے۔ مسکراہٹ اُن کے چہرے کا لازمی جزو تھی اور اُن کے چہرے پر بھلی بھی معلوم ہوتی تھی۔ اب تک اُن کی شخصیت کے متعلق میرے تاثرات کچھ اس طرح تھے:

وہ ایک سادہ طبیعت، مسکراتے چہرے، پڑھے لکھے اور جلد باز انسان تھے۔ بے حد باتونی تھے۔ ان کا مدِ مقابل سوچتا ہی رہ جاتا کہ ڈاکٹر صاحب کب خاموش ہوں اور وہ اپنا مدعا بیان کر سکے۔ تعریف پسندی ان کی کمزوری تھی جس کی وجہ سے ان کی شخصیت کافی کمزور تھی۔ میں نے اپنے دوست ڈاکٹر نصیر الدین آغا خانی کی جیولری شاپ سے ان کو بڑی مالیت کے زیور اُدھار لے کر دیئے تھے جس کی ادائیگی انہوں نے وعدہ کے مطابق بروقت کر دی تھی اسلئے مجھے یہ لکھنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ وہ ایماندار بھی تھے۔ البتہ وہ انتہائی درجے کے لائی لگ (ہر کسی کی بات پر یقین کر لینا اور اس کے ساتھ ہو لینا) بھی تھے۔ اُن کی انہی کمزوریوں نے اُن کی اچھائیوں پر گہرے سیاہ رنگ کے بادل تان دیے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے رابطہ ہونے سے لے کر اب تک اُن کی اور میری مراسلاتی، سمعی و بصری جتنی بھی ملاقاتیں ہوئیں اُس کے نتیجے کے طور پر میں نے اُن کا یہ تجزیہ کیا:

IQ-average, EQ-below average and SQ-not found

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش

بدقسمتی سے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود وہ اپنی سابقہ زندگی سے نہ تجربہ حاصل کر سکے نہ ہی معیار قائم کر سکے۔ وہ طبیعت کے لحاظ سے ایک سوڈا واٹر بوتل کی طرح تھے۔ جو گلاس میں ڈالتے ہی شوشاں کرتے ہوئے اُبلنا شروع کر دیتی ہے، نتیجے کے طور پر میز اور میز پوش دونوں خراب ہو جاتے ہیں اور مشروب بھی پینے کے قابل نہیں رہتا کیونکہ وہ بدذائقہ اور بدمزہ ہو چکا ہوتا ہے۔

آخر ڈاکٹر صاحب مجھے اور میجر عتیق کو اداس کر کے واپس بوٹسوانہ چلے گئے۔ ہم نے حتمی فیصلہ کر لیا کہ افریقہ کی سیاحت ضرور کی جائے۔ اس دوران ہم دونوں کا ڈاکٹر صاحب سے رابطہ رہا۔ کبھی فون پر کبھی خطوط کے ذریعے۔ 3/4 ماہ پروگرام بنانے اور سمجھنے سمجھانے میں گزر گئے۔ بوٹسوانہ کا سفارت خانہ ان دنوں پاکستان میں نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نے کراچی۔ دوبئ PIA، دوبئ۔ نیروبی (کینیا) کینیا ائیر لائن، اور نیروبی۔ ہرارے (زمبابوے) کینیا ائیر لائن کی Booking فائنل کر لی۔ اُس وقت ہرارے (زمبابوے) کا ویزہ ائیر پورٹ پر مل جاتا تھا۔ میں بہاولپور سے ملتان اور وہاں سے بذریعہ PIA کراچی کے لیے عازمِ سفر ہوا۔ جبکہ میجر عتیق لاہور سے کراچی بذریعہ PIA تشریف لائے۔

بیوی بچوں سے بچھڑ کر ہزاروں میل دور جانا ایک اذیت ناک مرحلہ تو ہے ہی مگر روحانی طور پر بھی انسان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ بچے آنکھوں کا تارا ہونے کے ساتھ ساتھ جذباتی اور روحانی طور پر بھی ماں باپ کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان سے عارضی طور پر بچھڑنا بھی انسان کو اندر سے تیز دھار آلے کی طرح کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ میں اسی کیفیت میں سے گذرتا ہوا زخمی زخمی کراچی ائیر پورٹ جا پہنچا جہاں جناب فاروق احمد شیخ صاحب مجھے بہ نفسِ نفیس لینے آئے ہوئے تھے۔ فاروق بھائی کو سب پیار سے کالُو جی کہتے تھے۔ کالُو جی کا تعارف آپ سے کرواتا ہوں۔

جھیل جیسی آنکھوں کے مالک کالُو جی نے کلرک کی حیثیت سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی کو جوائن کیا اور ترقی کرتے جنرل منیجر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ کالُو جی اُس وقت اندازاً 50/55 کے پیٹے میں ہوں گے۔ گورا رنگ، گرے چھوٹی چھوٹی مونچھیں، صحت ماشاءاللہ بے حد اچھی حالانکہ اُس وقت اُن کے دل کا ایک بائی پاس آپریشن ہو چکا تھا۔ چہرے پر لالی اور اس کے ساتھ مسکراہٹ بھی۔ خوش لباس، خوش خوراک، مہمان نواز اور زبردست قوتِ برداشت کے مالک تھے۔ ہر کس و ناکس کی مدد کے لیے ہر دم تیار رہتے تھے۔ اُن سے اُدھار لے کر شیرِ مادر سمجھ کر رقم ڈکار جانے والوں میں بڑے بڑے نام آتے ہیں۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہے تو کالُو جی بیٹی کے باپ کی حیثیت سے

تمام اخراجات کر رہے ہیں، کسی کی دعوتِ ولیمہ کا خرچہ کر رہے ہیں، کوئی بیمار ہے تو اس کے لیے ادویات اور رقم جا رہی ہے، کئی دینی مدرسے و مساجد ان کے خرچے پر چل رہے ہیں۔ دوست احباب، رشتے دار، نئے پرانے محلے دار، ماتحت، منہ بولے بھائی سب اپنی اپنی اوقات کے مطابق قرض کے نام پر لاکھوں لیتے رہے ہیں۔ ملازموں کے خاندانوں کی کفالت کرتے۔ غرض یہ کہ کالُو جی سب کے لیے ایک نخلستان تھے۔ ہر پیاسا مسافر جو صحرا میں بھٹکتا، پیاس سے بلبلاتا اس نخلستان تک پہنچ جاتا یا پکارتا تو یہ انسانی شکل میں نخلستان اس کو اپنے سینے سے لگاتا اور پیاسا خوب جی بھر کے اپنی پیاس بجھاتا۔ کئی طالب علم بھی اس نخلستان سے علم کی پیاس بجھا کر سیراب ہوئے اور اچھے عہدوں پر فائز ہوئے۔ کالُو جی کی طرح کا انسان صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے۔ وہ انسانوں میں انسان تو تھے ہی مگر افسروں میں بھی انسان تھے۔ کروڑ پتی ہونے کے باوجود پھل دار پودے کی طرح جُھکے ہوئے تھے۔ انتھک محنتی تھے اور اُن پر اللہ کا خاص الخاص کرم تھا۔ کلرک سے جنرل منیجر بننا بہت اعزاز کی بات ہے۔

کالو جی!

آپ کی یاد دل کو بے قرار کرتی ہے
نظر تلاش آپ کو بار بار کرتی ہے

یہ میری خوش نصیبی تھی کہ کالُو جی جیسا فرشتہ صفت انسان مجھے ائیر پورٹ پر خود لینے آیا تھا۔ میں پھولے نہیں سما رہا تھا۔ بہت پیار سے انہوں نے مجھے گلے لگایا اور حال احوال پوچھا۔ ان کے ڈرائیور نے آگے بڑھ کر میرا سامان لے کر گاڑی میں رکھا اور ہم PECHS ان کی رہائش گاہ کی طرف گامزن ہوئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے مجھے میرا کمرہ دکھایا اور خود نماز پڑھنے چلے گئے۔ اس دوران اُن کی اہلیہ محترمہ فرزانہ فاروق صاحبہ جن کو سب اپنے پرائے بہن جی کہہ کر پکارتے ہیں، تشریف لے آئیں۔ وہ بھی بہت پیار اور احترام سے ملیں۔ افریقہ جانے کی وجہ پوچھی، اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ دوسرے روز میں اور کالُو جی دوبارہ ائیر پورٹ گئے اور میجر عتیق کو ریسیو کیا۔ ہم دونوں کا قیام ایک ہی کمرے میں تھا۔ دوسرے روز کالُو جی اور بہن جی نے بہ نفسِ نفیس اپنی دعاؤں کے ساتھ ہمیں رخصت کیا۔

ہماری فلائٹ دوبئ تک تھی جہاں دو روز ہمارا قیام تھا۔ 1966 کے بعد میں اب 1990 میں دوبئ جا رہا تھا۔ بہت ذوق وشوق سے ہم نے PIA کی فلائٹ جوائن کی۔ موسم بہت اچھا تھا اور فلائٹ as smooth as silk تھی۔ Air hostess سمیت تمام کریو ہی خوبصورت اور سمارٹ تھا اور مسافروں پر مصنوعی مسکراہٹیں نچھاور کر رہا تھا۔ سٹاف کی صرف ایک خاتون جو کریو کی ہیڈ معلوم ہوتی تھی پیرانہ سالی کی طرف گامزن تھی لیکن کھنڈر بتا رہے تھے عمارت عظیم تھی۔ تمام کریو کی مہمان داری اچھی تھی۔ میجر صاحب نے بھی بہت enjoy کیا۔ سفر کا پتہ ہی نہ

چلا اور جہاز دوبئ کے انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔ 20/25 منٹ امیگریشن اور کسٹم سے فراغت میں لگے۔ باہر نکلے تو ہوٹل ڈیرہ پاک کا نمائندہ پلے کارڈ اٹھائے کھڑا تھا۔ جس پر ہم دونوں کے نام لکھے تھے۔ ائیر پورٹ سے پچیس منٹ کی ڈرائیو پر ہوٹل واقع تھا۔ ہوٹل خوبصورت تھا اور وہاں کا چاق و چوبند عملہ مسکراہٹیں بکھیرتا رہنمائی کے لیے موجود تھا۔ زیادہ تعداد ہندو ناریوں کی تھی جو اپنی تمام تر حشر سامانیوں سے لیس تھیں۔ میجر صاحب روزِ محشر سے پہلے ہی اس جہنم میں کودنے کو تیار تھے۔ میں اُن کو پکڑ کر بچے کی طرح بہلاتا بمشکل کمرے تک لایا اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ شام 6 بجے تک خوب آرام کیا۔ رات کو دوبئ بائی نائٹ کا پروگرام تھا جس کی ایڈوانس بکنگ کرائی جا چکی تھی۔ ہمارے پاس صرف دو دن تھے جس کے بعد ہماری فلائٹ نیروبی (کینیا) کے لیے تھی۔

میں نے میجر صاحب کو بتایا کہ میں پہلی بار 1966 میں دوبئ آیا تھا۔ اس وقت کے دوبئ اور آج 1990 کے دوبئ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کیا فرق ہے؟ انہوں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔ میں نے میجر صاحب سے کہا کہ کل ہم مُرشد بازار کے آخری کونے پر دوبئ کی قدیم ترین گرینڈ مارکیٹ چلیں گے اور وہاں بیٹھ کر آپ کو تفصیل سے فرق بتاؤں گا۔ آج دوبئ بائی نائٹ کا پروگرام ہے۔ وہ بولے چیف وعدہ یاد رکھنا۔ میرے اکثر فوجی دوست مجھے چیف کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ میں نے کہا کہ سر آپ فکر نہ کریں۔ انشاءاللہ آپ کو میری کہانی اور زندگی کی تگ و دو حیران کر دے گی۔

ہم نے مختلف مارکیٹیں گھومنے، کھانا کھانے میں اپنا وقت گزارا اور یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ پورے عرب امارات میں کسی چیز میں بھی ملاوٹ کا عنصر نہیں ہے۔ کھانے پینے کی ہر چیز معیاری اور ملاوٹ سے پاک ہے۔ ادویات کی کوالٹی بہت اچھی ہے، کرائم نہ ہونے کے برابر ہے۔ سانس لینے سے لے کر خرافات تک آزادی ہی آزادی ہے۔ صرف سرِ عام ہلہ گلہ نہیں کر سکتے، ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے ورنہ قانون حرکت میں آ جائے گا۔ بھارت ماتا سے بھارتی سپُتریاں سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں دوبئ کھانے کمانے کے لیے تشریف لاتی ہیں۔ دوسرا نمبر فلپائن اور تیسرا نمبر بنگلہ دیش کا ہے۔ اب اس دوڑ میں سینٹرل ایشین اسٹیٹس کی خواتین بھی شامل ہو گئی ہیں۔ پاکستان سے بھی اِکا دُکا خواتین حیلے بہانوں سے وہاں پہنچ جاتی ہیں اور حصہ بقدرِ جُسا وصول کرتی ہیں۔ ان خواتین کا زیادہ تعلق شوبز سے ہوتا ہے جو کلچر کے نام پر اس کھیل میں شامل ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہم نے کلچر کے معنی کو اپنے مطلب کے تحت ڈھال لیا ہے۔ لباس پہلے مختصر ہوا پھر مختصر ترین ہو گیا اور مختصر ترین ہونے کی وجہ سے جو کچھ دکھائی دیتا ہے اسے ہم کلچرل شو کہہ دیتے ہیں۔ مختصر ترین لباس میں ہم جو اعضاء کی شاعری دیکھتے رہتے ہیں، یہ ہمارا کلچر ہرگز نہیں ہے۔

بدقسمتی سے ہم بھارت سے کلچرل وار بری طرح ہار چکے ہیں۔ سرحد پار سے فحاشی، فلموں اور ٹی وی کے

ذریعے اس تیزی سے ہمارے ملک میں داخل ہوئیں کہ ہم سنبھل بھی نہ سکے بلکہ اس فحاشی کا حصہ بنتے گئے۔ نتیجے کے طور پر نوجوان نسل بری طرح متاثر ہوئی۔ ان کے ڈراموں اور فلموں میں جو کچھ دکھایا جا رہا ہے ہماری نوجوان نسل نے اس کو اپنانے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ لڑکیوں کا پینٹ اور کُرتی کو بطور لباس استعمال کرنا ان کو بے لباس کرنے کے مترادف ہے۔ اب تو ہمارے ملک میں بھی خاتون TV اینکرز اپنی گفتگو کو اپنی باڈی ٹاک سے سجاتی ہیں اور اپنی خوبصورت آنکھوں کو معنی خیز انداز میں گھماتی رہتی ہیں۔ وہ ایک جگہ رُک کر یا بیٹھ کر اپنا ٹاک شو مکمل نہیں کرتیں بلکہ متحرک رہتی ہیں تا کہ کوئی بھی فِگر نمائش سے محروم نہ رہ جائے۔ کسی زمانے میں ہمارے ملک کے سینماؤں میں انڈین اور پاکستانی فلمیں ایک ہی روز نمائش کے لیے پیش کی جاتی تھیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ مقابلے کے طور ان کی نمائش ہوتی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ اکثر پاکستانی فلم، انڈین فلم کے مقابلے میں گولڈن جوبلی یا سلور جوبلی کر جاتی تھی۔ کہانی، ڈائیلاگ، موسیقی اور گانوں کے الفاظ اتنے طاقتور ہوتے تھے کہ سینے میں دل اُچھلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ڈپریشن کا مریض بھی صحت یاب ہو جاتا۔ فلم کے آخر میں نیکوکاری کا سبق دیا جاتا۔ برائی کو برائی کو طور پر دکھایا جاتا۔ جبکہ اچھائی ہمیشہ برائی پر غالب آتی۔ گانے میں پوری زندگی کا پروگرام واضح کر دیا جاتا۔ اس کے مقابلے میں آج کی انڈین فلم دیکھ کر نامرد بھی مرد بن جاتا ہے۔ اس کے جسم کی کیمسٹری اور بائیو اپنا اثر دکھانا شروع کر دیتی ہے۔ اس لیے ہماری فلم انڈسٹری فلاپ ہوگئی۔ سینما گھر، پلازوں اور مارکیٹ کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ کوئی اگر ایک آدھ فلم بن بھی گئی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سکول کے بچے سٹیج ڈرامہ کر رہے ہوں۔

ہماری آرٹسٹ خواتین امریکہ، بھارت اور مڈل ایسٹ کا رُخ کر چکی ہیں جس میں دوبئ سرِ فہرست ہے۔ باقی کُھلے گلے کی شرٹس پہن کر سٹیج پر آ گئی ہیں اور کلچر کے نام پر اپنا آپ کچے پکے ذہنوں کو دکھا رہی ہیں۔ چند سینما گھر باقی بچے ہیں جن میں انڈین فلموں کی نمائش بہت زور و شور سے جاری ہے۔ ہمارے اخباروں میں انڈین فلموں کے اشتہارات کی بھرمار ہوتی ہے۔ حب الوطنی کی انتہا دیکھیں کہ اب انڈین ماڈل گرلز بھی ہماری پروڈکٹس کے لیے اشتہاری ذریعہ ہیں۔ کیا ہماری ماڈل گرلز کسی سے کم ہیں یا ساری قوم ہی کمپلکس کا شکار ہے۔ بھارتی ناریاں دوبئ کے نائٹ کلبوں میں تھوک کے حساب سے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر کورس ڈانس میں بیک وقت 35/40 لڑکیاں ناچ رہی ہوتی ہیں اور ان سب کا تعلق کسب کرنے والے قبیلے سے ہے۔ نام کلچرل پروگرام کا ہوتا ہے۔ عرب لوگ بھی دل و جان سے انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ میں یہاں صرف ایک قصہ اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

یہ واقعہ ایک (ز) نامی خاتون کا ہے جو پوسٹ گریجوایٹ ہونے کے علاوہ لاء گریجوایٹ بھی تھی اور گورنمنٹ کے ایک محکمے میں آفیسر بھی تھی۔ (ز) کی والدہ ایک کلچر زدہ سرائیکی خاتون تھی۔ (ز) کے والد ایک شریف اور اچھے

خاندان کے فرد تھے۔ جنہوں نے اپنی غلطی کا ازالہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر کیا لیکن اس دوران (ز) پیدا ہو چکی تھی۔ (ز) ابھی 6/7 سال کی ہی تھی کہ اس کی والدہ نے دوسری شادی کر لی۔ دوسرا آدمی (ز) کی والدہ کی امنگوں پر پورا اترتا تھا اور اپنی آنکھیں بند رکھتا تھا۔ (ز) کی تربیت اس قسم کی والدہ کے زیر اثر ہوئی تھی لیکن لاہور میں رہنے کا اثر تھا کہ (ز) سکول، کالج اور پھر پنجاب یونیورسٹی میں بھی کامیابیاں حاصل کرتی گئی۔ اس کا شمار پڑھی لکھی، فیشن ایبل اور well spoken خواتین میں ہونے لگا۔ اس کی شادی ایک زمیندار گھرانے کے لڑکے سے ہوگئی لیکن دونوں خاندانوں کے کلچر میں زمیں آسمان کا فرق تھا۔ نتیجتاً بہت جلد طلاق ہوگئی اور (ز) ایک بیٹی لے کر واپس والدہ کے پاس آ گئی۔ پہلے بھی زیادہ تر وہ اپنی والدہ کے پاس ہی رہتی تھی لیکن اب کشتیاں جلا کر آ گئی تھی۔ اس دوران اس کا رابطہ شوبز کے لوگوں سے ہو گیا اور وہ سٹیج پر پرفارم کرنے لگی۔ جس کی وجہ سے اس کو گورنمنٹ کی جاب چھوڑنی پڑی۔ کیونکہ وہ شوبز کی طرف زیادہ راغب تھی اس لیے اس نے پہلا نوٹس ملتے ہی اپنا استعفیٰ بھیج دیا اور محکمے نے بھی شکریے کے ساتھ قبول کر لیا۔ اب اُس نے مزید ترقی کی اور ٹی وی ڈراموں میں بھی آنے لگی۔ شکاری اپنے اپنے جال ڈالے انتظار میں تھے۔ آخر کار ایک خوبصورت کلاس ون باوردی آفیسر کی لاٹری نکل آئی اور (ز) بھی ایک باعزت اور گلیمرس لائف کے چکر میں اس کے جال میں پھنس گئی۔ مگر شکاری تو صرف اپنے Aquarium میں چند دن مچھلی رکھ کر، اس کی چال ڈھال اور خوبصورتی، اس کا پانی میں اچھلنا کودنا اور چٹکی بجاتے ہی پانی کی سطح پر آ کر اٹھکیلیاں کرنا دیکھ کر اپنے Aquarium کا پانی تبدیل کر دیتا ہے اور پھر نئی مچھلی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اس کلچر زدہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ مگر اس دوران اس نے اپنے پروفیشن میں مزید ترقی کی اور اس کو فلموں میں بھی کام ملنا شروع ہو گیا۔ وہ Casting couch بنی رہی۔ پھر کسی نے اُس کو مشورہ دیا کہ 5/10 لاکھ کے لیے بھاگتے پھرنے سے بہتر ہے کہ دوبئ کا چکر لگا آؤ، وارے نیارے ہو جائیں گے۔ وہ کسی نہ کسی طرح دوبئ پہنچ گئی لیکن دوبئ میں بھی اس کا ٹارگٹ پورا نہ ہو سکا۔ ابھی وہ مایوسی کے عالم میں تھی کہ کیا کرے کیا نہ کرے کہ وہ ایک اور جال میں پھنس گئی۔

جس ہوٹل میں وہ ٹھہری ہوئی تھی وہاں ایک پاکستانی بطور منیجر کام کرتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو (ز) سے ہوٹل کے مالک کے طور پر متعارف کروایا اور ہر قسم کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ وہ تاڑ چکا تھا کہ پنچھی آوارہ ہے اور جال میں پھنس سکتا ہے۔ کوشش کرنے سے چند دنوں میں ہی دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ اکٹھے کھانا، سیر و تفریح، ہر قسم کے سبز باغ دکھائے گئے اور آخر کار دونوں نے شادی کر لی۔ چند دنوں بعد جب یہ راز کھلا کہ موصوف ہوٹل کے مالک نہیں بلکہ ایک ادنیٰ سے ملازم ہیں اور ہوٹل کا کمرہ بھی خالی کرنے کا حکم مل گیا۔ دونوں کو ہوٹل سے ایک بوسیدہ سے کمرے میں جانا پڑا۔ جہاں منیجر صاحب اپنے دیگر دو ماتحتوں کے ساتھ رہتے تھے تو قیامت آ گئی۔

راہگیروں نے بھی تماشا دیکھا۔اس سے پہلے کہ معاملہ پولیس تک جاتا، چند پاکستانیوں خاص طور پر لکھویرا صاحب جو زاہد لکھویرا مرحوم کے بھائی ہیں، نے مل کر یہ قصہ حل کرایا۔طلاق کا کاغذ سنبھالے یہ خاتون دوبئ سے واپس پاکستان تشریف لے آئیں اور زور وشور سے اپنے شوبز میں مصروف ہوگئیں۔

دوبئ کے کامیاب دورے اور اُن کی کلچرل مصروفیت کا TV پر بہت چرچا رہا۔آخرکار یہ ساحرہ ایک اور خاوند حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی اور آج کل آسودہ حال زندگی گذار رہی ہے۔اس کا شمار ثقافت کی دلدادہ اور ذمہ دار خواتین میں ہوتا ہے۔ یہ ایک مثال پیش کی ہے۔ایسی ان گنت مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔اس قسم کی پراگندگی کو ہم نے اپنی ثقافت سمجھ لیا ہے۔میں اور میجر صاحب دوبئ بائی نائٹ شو کے کافی مشتاق تھے۔رات کو دیکھنے چلے گئے۔کیا دیکھا؟اس کے تین جواب ہیں باری باری پیش کرتا ہوں۔

پہلا جواب: بقول شاعر کچھ اس طرح کا منظر تھا:

رات کی زُلفیں برہم برہم
درد کی لُو ہے مدھم مدھم
تیرا چرچا عالم عالم
عشق کی راتیں پتھر پتھر
حُسن کی راہیں ریشم ریشم
اک جزا ہے جنت جنت
اک خطا ہے آدم آدم
اک عذاب ہے بستی بستی
اک صدا ہے ماتم ماتم
ساری لاشیں ٹکڑے ٹکڑے
ساری آنکھیں پُرنم پُرنم
ہجر کے لمحے زخمی زخمی
اس کی یادیں مدھم مدھم

اپنے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لیے عرض ہے کہ مصری بیلے ڈانسرز مصر سے صحرائے دوبئ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لیے آئی ہوئی تھیں اور پوری حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھیں۔

دوسرا جواب: اے بنی آدم ہم نے تمھارے لیے لباس ایجاد کیا ہے جو تمھارے پردہ دار جسم کو ڈھانپتا بھی ہے

اور تمھارے لئے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہے۔ اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔
یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ اس سے سبق لیں۔ (ترجمہ: سورۃ الاعراف ۷، آیت ۲۶)

تیسرا جواب:

ابونواس خلیفہ ہارون رشید کے دربار کا خاص الخاص شاعر تھا۔ اس نے نشے کی حالت میں ملکہ زبیدہ کی شان میں نہایت غلیظ اشعار بکے۔ چراغ حسن حسرت نے اس کے اشعار کا ترجمہ کچھ یوں کر کے بات کو ختم کر دیا۔

رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑیئے رات گئی بات گئی

میری اپنی کیفیت بقول شاعر کچھ اس طرح تھی:

آگ ہے مٹی ہے پانی ہے ہوا ہے مجھ میں
پھر بھی دیکھنا پڑے گا کہ کیا ہے مجھ میں
آئینہ یہ تو بتاتا ہے کہ کون ہوں میں
آئینہ اس پر ہے خاموش کہ کیا ہے مجھ میں

دوبئ کچھ اس تیزی سے وقت گزرا کہ پتہ ہی نہ چلا اور ہم کینیا جانے کے لیے واپس دوبئ ائرپورٹ پہنچ گئے۔ میجر صاحب نے یاد دلایا کہ آپ نے 1966 کا دوبئ بھی مجھے زبانی کلامی دکھانا تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ واپسی پر ہمارا قیام دوبئ میں دو روز کے لیے ہوگا تو موقع پر بیٹھ کر تمام داستان آپ کو گوش گذار کروں گا۔ وہ ازراہِ کرم مان گئے۔ ہم دنیا جہاں کے لوگوں کو لاؤنج میں دیکھتے رہے جو اپنی اپنی فلائٹس کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر ہماری فلائیٹ بھی اناؤنس ہوگئی اور ہم کینیا ائیرلائن کے بوئنگ 767 میں سوار ہو گئے جو ایک بڑا اور کشادہ ائیر کرافٹ تھا۔ ائرہوسٹس نے حسبِ روایت کاروباری مسکراہٹ سے ہمارا استقبال کیا اور ہماری رہنمائی کی۔

جہاز کا تمام کریو اور مسافر افریقن تھے۔ پورے جہاز میں صرف ہم ہی دو ایشیائی تھے۔ جہاز نے اپنے مقررہ وقت پر ٹیک آف کیا اور فضاؤں کو چیرتا ہوا آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ جیسے ہی جہاز نے اپنی مطلوبہ بلندی حاصل کرنے کے بعد اپنی منزل کا تعین کیا، جہاز کے کریو نے اپنی اپنی بارٹرالی سے مسافروں کو ان کی پسند کے مشروب آفر کرنا شروع کر دیئے۔ خواتین وحضرات نے مالِ مفت دلِ بے رحم سمجھ کر پی۔ میرا ہمسایہ 19 بوتل Shandy پی گیا۔ اس کے بعد جہاز کی Lights مدھم کر دی گئیں اور ایرہوسٹسیں sleep well کہتی ہوئی اپنا سامان سمیٹنے لگیں۔ میں حیران پریشان سوچتا رہا کہ کیا کھانے وغیرہ سے ان کا جواب ہے؟ کچھ لوگ آنکھیں بند کئے اپنی اپنی سیٹ پر کیف وسرور کی مستی میں غرق تھے۔ کچھ اُول فول بک رہے تھے۔ اکا دُکا واش روم کی طرف آ جا

رہے تھے۔ کچھ خراٹے لے رہے تھے۔ کچھ خواتین کانوں پر ہیڈ فونز چڑھائے ادائے دلربائی سے ٹھمکے لگانے کی کوشش کر رہی تھیں اور میرا ہمسایہ اُن سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُن کے ایک ٹھمکے کے جواب میں کئی ٹھمکے لگا کر انہیں محظوظ کر رہا تھا۔ اس دوران فلائٹ ذرا ناہموار ہوئی تو کچھ لوگ جو اپنی اوقات سے زیادہ پی گئے تھے، قے کرنے لگے۔ جس کی وجہ سے جہاز میں بہت ناگوار بو پھیل گئی جو میرے لیے اذیت ناک تھی۔ افریقی لوگوں کا اپنا کلچر بھی بہت Rich ہے لیکن زیادہ تر شہری اور پڑھے لکھے افریقیوں نے مغربی کلچر اپنا رکھا ہے۔ جو غلامی کے دور کی یادگار ہے لیکن وہ اس سے جان نہیں چھڑانا چاہتے۔ اس لیے جہاز میں بھی مغربی کلچر کی کراہت انگیز حرکتیں جاری رکھے ہوئے تھے اور مذکر و مونث کی کوئی تمیز نہ تھی۔

آخر کار جہاز کی لائٹیں جگمگا اُٹھیں۔ ٹرالیاں پھر سے آ گئیں۔ بلیک بیوٹی ائر ہوسٹسز پرانے چہروں پر نیا میک اپ کرنے کے بعد ناشتے کی ٹرے مسافروں کے سامنے سجانے میں مصروف تھیں۔ ساری رات جاگنے اور مسافروں کے لللے تللے برداشت کرنے کے بعد جب نیا میک اپ کر کے دوبارہ مسافروں کو serve کرنے کے لیے آئیں تو چہرے باسی آملیٹ پر نئی گارنش لگی پلیٹ کی طرح تھے۔ ناشتے کی ٹرے سمیٹ لی گئیں اور کچھ ہی دیر کے بعد جہاز نیروبی (کینیا) کے Jomo Kenyatta International Airport پر لینڈ کر گیا۔ یہ ایک سہانی صبح تھی۔ ایئر پورٹ پر امیگریشن کی لائن کافی لمبی تھی اور کام کرنے والے سست تھے۔ امیگریشن آفیسر ویزا فیس لینے کے علاوہ اپنی جیب کے لیے بھی پیسے مانگتا تھا اور وہ بھی US Dollars میں۔ میں que میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اگر یہ لوگ اسی طرح سست رفتار رہے تو بہت دیر کے بعد باری آئے گی۔ میجر صاحب بھی جُز بز ہو رہے تھے۔ اتنے میں ایک لمبا تڑنگا سوٹڈ بوٹڈ آدمی میرے پاس آ کر ٹھہر گیا اور مسکراہٹ کے تبادلے کے بعد بولا How are you, sir? میں نے اخلاقاً کہا I am fine۔ وہ رازداری سے پھر مخاطب ہوا :

I am officer Incharge here, please show me your passport

میں نے اپنا پاسپورٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ آہستہ سے بولا Please follow me! میں اور میجر صاحب اس کی رہنمائی میں چل پڑے۔ جب اس کی نظر میجر صاحب پر پڑی تو وہ ایک آنکھ دبا کر بولا Oh! You are together اور ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے میجر صاحب سے بھی پاسپورٹ لے کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ ہمیں ایک کیبن میں لے گیا۔ دونوں پاسپورٹس پر ویزے لگائے اور ہمیں واپس لے کر que والے کیبن میں آ گیا۔ ہمارے پاسپورٹس پر entry کی مہریں لگائیں۔ کیبن میں ہی وردی پوش سے دستخط کروا کر عزت سے ہمیں پاسپورٹس پیش کئے اور 60 US Dollars کا خوہش مند ہوا۔ میں کیبن سے باہر لگے ہوئے نوٹس پڑھ چکا تھا جس پر ٹرانزٹ ویزا فیس 15 USDollar لکھی ہوئی تھی۔ میں نے جیب سے 40

USDollars نکال کر اس کی خدمت میں پیش کئے اور اس کو بتایا کہ 30 US Dollars دو ویزوں کی فیس اور 10 USDollars بطور دوست آپ کے لیے تحفہ ہیں۔ وہ خوش ہوا اور بولا کہ آپ ایک اچھے دوست ہیں۔ پھر اس نے ہمیں باری باری ہاتھ ملا کر رخصت کیا۔ اس کے بعد ہمیں ایک لیڈی ڈاکٹر نے گھیر لیا اور ویکسینیشن کارڈ دکھانے کو کہا۔ کارڈز دکھانے پر مایوس ہوئی اور بیزاری سے کہنے لگی کہ آپ دونوں جا سکتے ہیں۔ اسی طرح کسٹم حکام سے جان چھڑاتے ہوئے ہم کینیا ائر لائن کے کاؤنٹر پر آ گئے۔ جہاں سے ہم نے ہوٹل کے لیے کاغذات لئے اور ائر پورٹ بلڈنگ سے باہر آ گئے۔

کچھ ایجنٹ حضرات جن کا تعلق چائے کے ایکسپورٹرز سے تھا، اپنی چائے ایکسپورٹ کرنا چاہتے تھے اور کچھ سفاری ٹورز آپریٹ کرنے والوں کے نمائندے تھے۔ دونوں قسم کے لوگ اپنی سیلز مین شپ کے کرشمے دکھا رہے تھے۔ اتنے میں جس ہوٹل میں ہم نے ٹھہرنا تھا اس کا نمائندہ آ گیا۔ کینیا ایئر لائن کی طرف سے دیئے گئے ہوٹل کا وارنٹ دیکھا تو ہمیں ہوٹل کی کوچ کی طرف اشارہ کر کے خود دوسرے لوگوں کی تلاش میں چلا گیا۔ ہم کوچ میں بیٹھ گئے۔ 15/20 منٹ کے بعد وہ بھی آ گیا اور اپنے ہمراہ کچھ اور لوگوں کو بھی لے آیا۔ کوچ اپنے ہوٹل کی طرف گامزن ہوگئی۔ ہمارے علاوہ برٹش، جرمن اور ڈچ لوگ تھے۔ کچھ ہندو اور سکھ بھی تھے۔ 35 منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم نیروبی کی سنٹرل لوکیشن پر اپنے ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ کاؤنٹر پر اندراج کروانے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچ گئے اور گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ میں صبح سویرے حسبِ عادت اٹھ گیا۔ نماز ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اپنے کمرے کی طرزِ تعمیر کا جائزہ لیا اور نیچے لاؤنج میں آ گیا۔ پورا ہوٹل ہی متاثر کن تھا۔

یہ New Stanley Hotel تھا جو Kimathi Street, Kenyatta Avenue پر واقع تھا اور 1907 میں تعمیر ہوا تھا۔ غلامی کے دور کی یادگار تھا مگر اپنے اصل رنگ روپ میں آج تک جگمگ کر رہا تھا۔ لکڑی کے نفیس کام سے اس کو سجایا گیا تھا۔ 1907 سے لے کر آج 1990 تک اس کو اصلی حالت میں ورثہ کی طرح سنبھال کر رکھنا قابلِ قدر ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کی تلخ یادیں بھی اس جگہ سے منسوب ہیں۔ اُس وقت یہاں آقا قوم کے افراد ہی قیام کر سکتے تھے۔ جو اصل مالک تھے وہ لُٹیروں اور تمام غاصب آقاؤں کے جوتے پالش کیا کرتے تھے۔ میں نے ہوٹل کے Popular Thorn Tree Cafe میں ناشتہ کیا۔ کمرے میں واپس آیا تو میجر صاحب غسل فرما رہے تھے۔ میں نے اپنی تمام روداد پیش کی تو خوش ہوئے۔ ہم دونوں تیار ہو کر نیچے لابی میں آ گئے۔ میجر صاحب نے ناشتہ کیا اور ہم نیروبی گھومنے کے لیے ٹورسٹ کاؤنٹر پر محکمہ ٹورازم کے بروشرز اکھٹے کرنے لگے۔

ایک ایسا واقعہ تحریر کرنا چاہتا ہوں جو دردناک، شرمناک اور ممکن ہے قارئینِ کرام کے لیے حیرت ناک بھی ہو۔ میں ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھا اپنی عادت کے مطابق عوام الناس کی دید بانی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ لاؤنج

اس وقت نہ صرف کینیا کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں سے مزین تھا بلکہ انٹرنیشنل مسافر بھی اس کی زیبائش میں شامل تھے۔میجر صاحب ٹورسٹ کاؤنٹر سے سیاحتی پمفلٹ اکھٹے کر رہے تھے۔ایک ایشین نژاد خاتون میرے پاس آ کر کھڑی ہوگئی اور بولی کہ کیا میں آپ کے پاس بیٹھ کر کچھ باتیں کرسکتی ہوں؟ میں نے کہا why not اور سمٹ کر ایک طرف ہوتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔وہ اعتماد سے بیٹھ گئی۔میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔میں نے دھیمے سے پوچھا کہ میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟ وہ بولی میرا نام جولی ہے۔میری والدہ کا نام ہاجرہ تھا اور ان کی دوستی ایک پاکستانی بزنس مین سے تھی۔وہ عارضی طور پر نیروبی میں مقیم تھا اور اپنا بزنس آفس ڈویلپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔اس نے میری والدہ کو میری صورت میں تحفہ دیا اور واپس پاکستان چلا گیا۔پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔میری والدہ اس کے انتظار میں روتی تھی اور پھر کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہوگئی۔میں زمانے کی ٹھوکروں میں پل کر موجودہ حالات تک پہنچی ہوں اور اسی ہوٹل میں جاب کرتی ہوں۔میں نے کاؤنٹر پر آپ دونوں حضرات کے پاکستانی پاسپورٹ دیکھے تو میرا دل بھر آیا اور میں بے اختیار آپ سے ملنے آ گئی۔میں کچھ کہنے لگا تو اس نے ایک لمبا سانس لیا اور بولی کہ ٹھہریں ابھی مجھے کچھ اور کہنا ہے۔۔میں نے کہا Please carry on!۔وہ اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے بولی آج سے چار سال پہلے صلاح الدین نامی ایک خوبصورت پاکستانی سے میری ملاقات ہوئی۔آہستہ آہستہ یہ ملاقاتیں دوستی میں بدل گئیں۔صلاح الدین یہاں کے مقامی بینک میں منیجر کے عہدے پر فائز تھا۔مجھے اس سے محبت تھی۔ہم اکثر ویک اینڈ اکھٹے گزارتے۔اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ مجھے پاکستان لے جائے گا اور اخبار میں میرے والد کی تصویر اور اشتہار دے کر انہیں تلاش کرنے میں میری مدد کرے گا۔ایک روز جب میں بینک گئی تو معلوم ہوا کہ صلاح الدین نوکری چھوڑ کر پاکستان واپس جا چکا ہے۔میری آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا گیا اور میں بینک میں ہی چکرا کر گر گئی۔جب مجھے ہسپتال میں ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔میں نے اپنی بیٹی کو بہت ناز و نعم سے پالا ہے اور وہ مجھے بہت عزیز ہے۔وہ خاموش ہوگئی اور آنکھوں پر اپنا رومال رکھ کر روتی رہی۔میں گم صم بیٹھا تھا۔کچھ دیر بعد میں نے پوچھا کہ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟ وہ روتے ہوئے بولی کہ میں بلڈ کینسر کی مریضہ ہوں اور چند ماہ کی مہمان ہوں۔میری بیٹی صرف چار سال کی ہے۔میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آپ میری بیٹی کو پاکستان لے جائیں۔اس کے والد کی تصویر اور کچھ کاغذات میں آپ کو دے سکتی ہوں جس کی مدد سے آپ صلاح الدین کو تلاش کر کے بچی اس کے حوالے کر سکتے ہیں۔میں نے اس کو قانونی پیچیدگیاں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ میں اتنا بڑا اقدم نہیں اٹھا سکتا۔میں نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے یہ ممکن نہیں، آپ پاکستانی ہائی کمیشن سے رابطہ کر کے انہیں سب تفصیلات بتائیں اور کاغذات دکھائیں۔وہ

بولی میں وہاں کئی بار گئی ہوں لیکن وہ میری بات نہیں سنتے اور مجھے زبردستی آفس سے باہر نکال دیا۔ یہ واقعہ مقامِ عبرت ہے۔ایسے لوگوں کی شان میں یہ قصیدہ ہی پیش کرسکتا ہوں:

کام اگر کرتے تھے کچھ تو حجرہ در بند میں
ویسے لگتا تھا حضرت فارغ الاوقات ہیں
شیخ کے بارے میں بس اتنی ہی معلومات ہیں
آٹھ بچے زندہ دو مرحوم چھ اسقاط میں

کینیا کے مشرق میں صومالیہ اور بحیرہ ہند، مغرب میں یوگنڈا اور جھیل وکٹوریہ، شمال میں بش لینڈ، ایتھوپیا اور سوڈان کا صحرا اور جنوب میں تنزانیہ ہیں۔ کرنسی کا نام شلنگ ہے۔ لوگ انگلش کے علاوہ Swahili زبان بولتے ہیں، سرکاری زبان بھی یہی ہے۔اس کے علاوہ قبائل Kikuyu, Luo, Kikama, Maasai and Sambru زبانیں بولتے ہیں۔ نیروبی میں مندرجہ ذیل مقامات قابلِ دید ہیں:

۱۔کلچر سینٹر	۲۔نیشنل میوزیم	۳۔نیشنل آرچیو
۴۔ریلوے میوزیم	۵۔آرٹ گیلری	۶۔پارلیمنٹ ہاؤس
۷۔کینیاٹا کانفرنس سنٹر	۸۔فلوریڈا2000 نائٹ کلب	۹۔خیبر ریسٹورنٹ
۱۰۔سفاری کلب	۱۱۔زم زم ریسٹورنٹ	

ہم دونوں سارا دن نیروبی کی سیر کرتے رہے۔شام چار بجے کے قریب تھکے ہارے واپس ہوٹل آئے اور آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں آ گئے۔ 3/4 گھنٹے خوب سوئے۔ 8 بجے کے قریب پھر تیار ہو کر فلوریڈا 2000 جانے کے لیے تیار ہو گئے۔فلوریڈا2000 نیروبی کا مشہور نائٹ کلب تھا اور ہمارے ہوٹل سے walking distance پر تھا۔ہم دونوں پیدل چلتے ہوئے اس کے گیٹ تک جا پہنچے۔ دروازے پر ہی کلب کے نمائندے نے مسکراتے ہوئے ہمیں welcome کہا اور ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ہم سیڑھیاں اترتے ہوئے اندر مین ہال میں جا پہنچے۔ ہال اندر سے خوبصورت اور کافی بڑا تھا۔فرنیچر بھی نفاست سے سجایا گیا تھا۔تمام حاضرینِ محفل مہذب اور موقع محل کے مطابق قیمتی اور فیشن ایبل لباس زیبِ تن کئے ہوئے تھے۔صنفِ نازک خاص طور پر قابلِ دید تھیں۔ کچھ زرق برق لباس میں تھیں۔ کچھ نے برائے نام لباس پہنا ہوا تھا۔ اکثریت بلیک بیوٹی تھی۔ کچھ خواتین امریکہ اور یورپ کے ممالک کی معلوم ہوتی تھیں۔آج پہلی بار مجھے بلیک بیوٹی کے مقابلے میں وائٹ لیڈیز بُری ہی نہیں بلکہ بہت بُری لگیں۔ میرے تجسس میں اضافہ ہوتا گیا کیونکہ اس طرح کی بلیک بیوٹی میں نے شاید پہلی بار دیکھی تھی۔اونچا لمبا قد کاٹھ، بڑی بڑی کٹورہ آنکھیں جن سے ذہانت ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ بات چیت

کرنے میں محتاط لیکن مہذب انداز اپنائے ، انگ انگ سے کیف وسرور کی مستی اور بھینی بھینی خوشبو کے جھونکے صاف محسوس کئے جاسکتے تھے۔جسمانی زاویے کچھ لباس سے باہر کچھ اندر۔خدوخال نمایاں اور ہر طرح کی منافقت سے بے بہرہ۔صاف پتہ چلتا تھا کہ صحرا کی غزال گروہ در گروہ آ رہی ہیں۔آپس میں کھلکھلاتی ،ٹکراتی، بولتی، آواز ایسی جیسے پکے فرش پر سونے کے گرتے سکوں کی آواز ہو۔ہم دونوں ہونقوں کی طرح انہیں دیکھ رہے تھے۔

ہمارے خیالوں کو تیز آرکسٹرا کی آوازوں نے چکنا چور کر دیا اور ڈانس کا پہلا راؤنڈ شروع ہو گیا۔جس کے ساتھ اپنا ساتھی تھا وہ اُس کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔جس کے ساتھ نہیں تھا اُس نے ہال میں بیٹھے لوگوں میں سے پسند کر کے اُس کو ڈانس کی درخواست کی اور اُسے لے کر ڈانس فلور پر آ گئی۔کچھ نے کسی کا تکلف نہ کیا اور اکیلی ہی ڈانس فلور پر آ گئی یا اُس کو کسی کا انتظار تھا جو ابھی تک نہیں آیا تھا۔میجر صاحب بھی اُٹھ کر ڈانس فلور پر چلے گئے اور اکیلے ہی تھرکنا شروع کر دیا۔جلد ہی اُن کو بھی ساتھی مل گئی۔ایک لڑکی اکیلے ہی ناچ رہی تھی۔میجر صاحب نے موقع ملتے ہی درخواست پیش کر دی جو منظور کر لی گئی اور وہ ایک سے دو ہو کر ڈانس فلور کے couple بن گئے۔اسی اثناء میں ڈانس کا پہلا راؤنڈ ختم ہو گیا۔میجر صاحب لڑکی کو اپنی ٹیبل پر لانا چاہتے تھے مگر اُس نے صاف انکار کر دیا اور بولی کہ آپ کا اور میرا ساتھ صرف ڈانس فلور تک ہی تھا۔مجھے اُس کی صاف گوئی بہت پسند آئی اور وہ ہمیں Best of Luck کہتی تیز تیز قدموں سے اپنی ٹیبل کی طرف چلی گئی۔

آرکسٹرا نے دوبارہ نئے دم خم کے ساتھ اپنی دھنوں کو بکھیرنا شروع کیا۔اب ہال زیادہ بھر چکا تھا اور پہلے سے زیادہ لوگ اپنے اپنے ساتھی کے ساتھ اُٹھ کر ڈانس فلور پر جانا شروع ہو گئے۔ہال میں جہاں تک نظر کام کرتی تھی لوگ ہی لوگ نظر آتے تھے۔ڈانس فلور کا بھی یہی حال تھا۔میری نظریں جگہ جگہ پھسلتی ، اِدھر اُدھر کا طواف کرتی، حالات اور واقعات کا جائزہ لے رہی تھیں۔میجر صاحب ایک اور کوئل کے ساتھ ناچ رہے تھے جو ایک خوبصورت لڑکی تھی۔اس کی غزالی آنکھیں دائیں بائیں گھوم کر دور تک دیکھ رہی تھیں۔بھرے بھرے گال، درمیانہ نوک دار ناک، موٹے ہونٹ، سفید موتیوں کی طرح چمکتے دانت، لمبی گردن۔ڈانس کرتے کرتے پنسل ہیل پر ایسے گھومتی جیسے مقناطیس اپنے محور پر گھومتا ہے۔میں اپنی ٹیبل پر بیٹھا بہت غور سے اُس کو اور میجر صاحب کی مدہوشی کو دیکھ رہا تھا۔مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دونوں میرے بارے میں گفتگو کر رہے ہوں کیونکہ دونوں میری طرف دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔پھر اس لڑکی نے اپنے ساتھ ناچتی ایک اور لڑکی کو میری طرف اشارہ کر کے کچھ کہا اور وہ لڑکی تیر کی طرح میری طرف آئی اور مجھے اپنے ساتھ ڈانسنگ فلور پر چلنے کی دعوت دی۔میرے تذبذب کو دیکھ کر اُس نے میری کلائی کھینچی اور بولی Oh! Come on وہ مجھے کھینچتی ہوئی ڈانسنگ فلور پر لے گئی۔کچھ دیر بعد یہ راؤنڈ بھی ختم ہو گیا۔پھر فرمائشی پروگرام شروع ہو گیا۔اکثر لڑکیاں اپنی اپنی پسند کے افریقی میوزک کی

کیسٹیں اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں جو وہ آرکسٹرا انچارج کو دیتیں۔ جیسے ہی وہ میوزک چلتا تو لڑکیوں کے گروپ اُٹھ کر ناچنا شروع کر دیتے۔ مجھے اس دن پتہ چلا کہ افریقن میوزک کیا ہوتا ہے اور ان کا کلچر کتنا Rich ہے۔ میوزک تو کمال کا تھا ہی ڈانس بھی لاجواب تھا۔ دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو رقص میں نہ ہو۔ گویا رقص اندر کی مستی اور خوشی ہے جو متحرک ہو کر جسم سے باہر آجاتی ہے۔ بقول علامہ اقبال:

شعر سے روشن ہے جان جبرئیل داہر من
رقص ، موسیقی سے ہے سوز و سرور انجمن
فاش یوں کرتا ہے اک چینی حکیم اسرارِ فن
شعر گویا روحِ موسیقی ہے رقص اس کا بدن

یہ کائنات ایک ردھم میں چل رہی ہے۔ ذرا بھی ردھم ٹوٹے تو توازن بگڑنے لگتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ رقص کائنات میں کسی بھی جاندار کی متناسب حرکات کا نام ہے۔ اگر کسی کو بھی اس ضمن میں شک ہو تو سعودی وزیرِ محنت انجینئر عادل اور یمنی سے پوچھ لیں جو رقص کے ماہر ہیں۔ جب وہ رقص فرماتے ہیں تو ایک عالَم دیکھتا رہ جاتا ہے۔ دونوں وزیر صاحبان نہ صرف رقص و موسیقی کو سمجھتے ہیں بلکہ مہارت بھی رکھتے ہیں۔ بقول فلاسفر زدنیا کا کوئی مکتبِ فکر ایسا نہیں جس میں فلسفہ تناسخ کا ذکر نہ ہو۔ بقول فراز احمد فراز رقص اعضاء کی شاعری کا نام ہے۔ یہاں میں اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں عرض کرتا چلوں کہ اکثر بھارتی فلموں کے گانوں کی دھنیں افریقن دھنوں کا چربہ ہوتی ہیں۔

تین بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر ہم ہوٹل آ کر سو گئے کیونکہ اگلے دن ۱۰ بجے ہماری فلائٹ ہرارے (زمبابوے) کے لیے تھی۔ صبح ہم سات بجے ہی ہوٹل کی لابی میں آ گئے۔ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ائیر لائن کی کوچ آ گئی اور ہم ائیر پورٹ پر آ گئے۔ امیگریشن والے اپنے اپنے شکار کی تلاش میں تھے۔ Foreigners کو ائیر پورٹ ٹیکس کی شکل میں 20 یو ایس ڈالرز پھر دینے تھے۔ اور دس یو ایس ڈالرز امیگریشن آفیسر کو بھی دینے تھے جس کے لیے انہوں نے کئی حیلے بہانے تراشے ہوئے تھے۔ عام مسافروں کو ڈرا دھمکا کر اور پڑھے لکھے well to do مسافروں سے دوست بن کر اور انہیں que سے نکال کر، VIP کے طور پر، پہلے پاسپورٹ stamp کر کے اور سامان کی تلاشی لیے بغیر، لاؤنج میں جانے کی اجازت دے کر US ڈالرز بٹورے جاتے۔ میں چار بار کینیا گیا ہوں۔ وہاں ایک عام چپڑاسی سے لے کر ٹاپ مین تک سب کو رشوت خور دیکھا۔ پیسہ اور شراب ان کی کمزوری ہے۔

آخر کار ہم دونوں تمام مراحل طے کرتے ہوئے جہاز میں سوار ہو گئے اور کینیا ائیر لائن کا بوئنگ 767 دھاڑتا چنگھاڑتا ہوا اپنی منزل ہرارے کی طرف گامزن ہوا۔

باب3: ہرارے (زمبابوے 1990ء)

اس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

ہرارے

(زمبابوے1990)

یہ ایک پرسکون پرواز تھی۔اس سیکٹر میں کینیا ائیر لائن کی سروس قابلِ تعریف ہے۔ بکنگ کرواتے ہوئے مسلم کھانے کی ڈیمانڈ کر دی تھی جو غالباً Gulf Air سے لیا گیا تھا۔ کھانے کے وقت سب سے پہلے ہمیں ہی serve کیا گیا تھا۔اس لئے نہیں کہ اس فلائیٹ پر صرف ہم دو ہی مسلمان تھے بلکہ اس لئے کہ باقی غیر مسلم تھے یا لبرل تھے۔ جہاز پہلے دارالسلام (Tanzania) گیا پھر Lilongwe (Malawi) اور آخرکار ہرارے (Zimbabwe) کی طرف محوِ پرواز ہو گیا۔ جہاز کے اندر کا ماحول بھی پرسکون تھا ماسوائے اُم الخبائث کی بدبو کے جو بہت ناگوار تھی۔ائیر ہوسٹس نہ ہونے کے برابر تھیں۔ان کی ادائیں، مسکراہٹیں، سر کے بال ہر چیز مصنوعی تھی۔البتہ رویہ بہتر تھا۔ ہنسنے ہنسانے اور فنونِ لطیفہ میں خاصی آزاد خیال تھیں۔

آخر جہاز Robert Gabriel Mugabe International Airport پر لینڈ کر گیا۔ یہاں پر کانو (نائیجیریا) اور نیروبی (کینیا) جیسی اندھیر نگری نہیں تھی۔ نہ ہی کسی نے سخت کلامی کی، نہ ہی لائن سے نکال کر امریکی ڈالر لے کر ویزا لگایا۔ان دنوں زمبابوے کا ویزا پاکستانیوں کو ائیر پورٹ پر ہی مل جاتا تھا۔یعنی Entry and Visa system جو آج کل نہیں ہے۔اب ان کے سفارت خانے سے پیشگی ویزا لے کر جانا پڑتا ہے۔ میں اور میجر عتیق مقصود عبداللہ تمام مراحل طے کرتے ہوئے جلد ہی کسٹمز ہال سے باہر آ گئے۔ جیسے ہی ہم اپنا سامان ٹرالیوں پر رکھ کر باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ایک صحت مند، خوش لباس مسکراتا چہرہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر میری تصویر جمائے کبھی مجھے دیکھ رہا تھا اور کبھی میری تصویر کو۔سلام دعا کے بعد بولے Where is the other one? میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو میجر صاحب اپنی ٹرالی لیے ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ یہ عارف حسین صاحب تھے جو سمن آباد لاہور کے رہنے والے، خوش اخلاق، مہمان نواز، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور شریف النفس انسان تھے۔ڈاکٹر مکرم شیخ کی نمائندگی کرتے ہوئے ہمیں لینے آئے تھے۔

یہ ایک خوبصورت اور سہانی شام تھی۔ مغرب کا وقت ہوا ہی چاہتا تھا۔ عارف حسین صاحب ہمیں ایک پوش

علاقے میں اپنے چھوٹے سے خوبصورت گھر لے گئے جہاں وہ اپنی اہلیہ اور دو بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ پُرتکلف کھانا کھلایا۔ ان کے دو پیارے اور شریر بیٹے بعمر 6 اور 8 سال تھے۔ اہلیہ محترمہ باپردہ خاتون تھیں۔ عارف حسین صاحب نے بتایا کہ اُن کے ایک دوست اپنی فیملی کے ساتھ عمرہ کرنے گئے ہوئے ہیں اور اُن کی اجازت سے اُن کے گھر پر ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔ پھر بولے کہ کھانا وغیرہ آپ کو گھر سے مہیا کیا جائے گا۔ آپ بالکل تکلف نہ کریں۔ آپ میرے پاکستانی بھائی ہیں اور ڈاکٹر مکرم صاحب کی وساطت سے میرے مہمان ہیں۔ رات دس بجے کے قریب وہ ہمیں ایک خوبصورت بنگلے میں رہائش کے لیے چھوڑ گئے۔ ہم جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے کیونکہ سفر کی تھکن اور بے آرامی بھی تھی۔ صبح ہم دونوں تازہ دم تھے۔ عارف صاحب جلدی میں آئے اور ایک بڑا سا ٹفن مجھے تھماتے ہوئے بولے یہ آپ کا ناشتہ ہے مجھے آفس پہنچنے کی جلدی ہے۔ اب دوپہر کو کھانے پر ملاقات ہو گی۔ ناشتہ کافی پُرتکلف تھا۔ ناشتے کے بعد ہم دونوں تیار ہو کر اور گھر کو لاک کر کے باہر نکل آئے۔ ہرارے شہر کا گشت شروع کر دیا۔ یہ ایک خوبصورت شہر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم یورپ کے کسی شہر میں گھوم رہے ہیں۔ ہرارے ایک Organised اور خوبصورت مناظر والا شہر ہے۔ اس کا پرانا نام سالسبری تھا۔ میرے بچپن میں گھر پر کوہستان نامی اخبار آیا کرتا تھا۔ اکثر اس کی ہیڈ لائن کچھ اس طرح ہوتی تھی۔ ''رہوڈوشیا خون میں ڈوبا ہوا ہے''۔ اس وقت رہوڈوشیا میں آزادی کے متوالے اپنے وطن کی آزادی کے لیے اپنا خون اور زندگیاں بطور نذرانہ پیش کر رہے تھے۔ اُن کی بے لوث قربانیوں کی وجہ سے آج رہوڈوشیا کو زمبابوے اور سالسبری کو ہرارے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سالسبری ایک سفید چمڑی والا غاصب تھا جس نے اپنے نام پر اس شہر کا نام سالسبری رکھا تھا۔

ہم خوب گھومے پھرے اور شہر کے اکثر مقامات دیکھ لیے۔ دوپہر کو عارف صاحب آ گئے اور اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ پُرتکلف کھانا ہم نے اکھٹے کھایا۔ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کے عارف صاحب Colgate زمبابوے میں ڈپٹی منیجر ہیں اور پاکستان کی شہریت چھوڑ کر زمبابوے کی شہریت اپنا چکے ہیں۔ زمبابوے کے قانون کے مطابق دوہری شہریت نہیں رکھی جا سکتی، ایک چھوڑنی پڑتی ہے۔ یہ سن کر میرا دل برا ہوا کیونکہ میں مر تو سکتا ہوں لیکن پاکستان کی شہریت نہیں چھوڑ سکتا۔ کھانے کے بعد عارف صاحب ہمیں ہماری رہائش گاہ پر چھوڑ کر رات آٹھ بجے آنے کا عندیہ دے گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ہمارے ان داتا ہیں اور آپ کی مہمان نوازی ہم تاحیات یاد رکھیں گے۔ آپ ہمارے عارف موگابے ہیں (اُن دنوں موگابے زمبابوے کے صدر تھے)۔ وہ یہ سن کر خوش ہوئے لیکن ساتھ ہی بولے کہ یہاں پر کسی کو موگابے کہنا جرم ہے اس لیے کسی کے سامنے یہ الفاظ نہ دہرانا۔ ہم نے عارف صاحب کو US ڈالر دے کر مقامی کرنسی لے لی جسے عرفِ عام میں Zim

Dollar کہتے تھے۔ یہ ایک False یونٹ تھا۔ زمبابوے کی اکانومی کا برا حال تھا۔ صدر موگابے نے غیر ملکیوں کی پراپرٹیز جن میں زرعی فارم، فارم ہاؤسز اور دیگر کئی قسم کی جائیدادیں شامل تھیں قومیالی تھیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ ان لٹیروں نے حکمران لٹیروں سے مفت حاصل کیا تھا۔ موگابے کے اس جرم کی پاداش میں ان آقاؤں نے معاشی پابندیاں عائد کی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے زمبابوے کی معیشت دگرگوں تھی۔ Zim dollar دنیا کی واحد کرنسی تھی جس پر This is legal Tender نہیں لکھا ہوا تھا۔ بس رنگین کاغذ تھے جنہیں نوٹوں کا نام دیا گیا تھا۔ مقامی طور پر دکاندار، ٹیکسی ڈرائیور غرض جہاں بھی آپ ادائیگی کرنا چاہیں وہ امریکی ڈالر مانگتے تھے۔

زمبابوے ایک Land locked ملک ہے۔ اس کو کوئی سمندر نہیں لگتا۔ یہ دریائے Zambezi اور دریائے Limpopo کے درمیان ہے۔ زمبابوے کے بارڈر مندرجہ ذیل ملکوں کے ساتھ لگتے ہیں:

۱۔ جنوب کی طرف ساؤتھ افریقہ (South Africa)

۲۔ مغرب کی طرف بوٹسوانہ (Botswana) (پرانا نام: بچوانالینڈ)

۳۔ شمال مغرب کی طرف زیمبیا (Zambia)

۴۔ مغرب اور انتہائی شمال میں موزمبیق (Mozambique)

زبان کی بات کی جائے تو زمبابوے کی 16 سرکاری Languages ہیں۔ کچھ اکثریت اور تواتر سے بولی جاتی ہیں جن میں انگریزی، Shona, Ndebele وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ مشرق کی طرف یہ ملک خوبصورت قدرتی پہاڑی سلسلے سے مزین ہے۔ جس میں Mount Nyangani کی طرف سے اونچائی سطح سمندر سے 2300 میٹر ہے۔ یہ علاقہ اپنی خوبصورتی میں بے مثال اور سیاحوں میں مقبول ہے۔

سیاحوں میں مقبول مقامات میں Nyanga,Troutbeck,Chimanimani,Vumba,Chirinda اور 900 میٹر کی وکٹوریہ فال جو دنیا کی سب سے بڑی واٹر فال ہے شامل ہیں۔ یہ سب معلومات ہمیں نکی اور کیتھرائن نے دیں جو ہماری ہمسایہ لڑکیاں تھیں اور Namibia کی رہنے والی تھیں۔ اُن سے پہلی ملاقات کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز گھر کی Door bell کے بار بار شور مچانے پر میں باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دراز قد، خوبصورت خدوخال، جیٹ بلیک رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، شارٹس پہنے ہوئے دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ دونوں نے تھوڑا جھک کر مجھے تعظیم دی۔ خوبصورت لہجے کی انگریزی میں مجھے بتایا کہ وہ ساتھ والے گھر میں رہتی ہیں اور 4/5 روز سے ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اس گھر کے پرانے مکین کہاں گئے؟ وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے اپنے تابڑ توڑ سوالات کے لیے نرم اور محتاط الفاظ کا چناؤ کیا اور ان سوالات کے لیے کئی بار معذرت بھی کی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ دونوں مہذب اور تعلیم یافتہ ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے

پوچھا کہ آپ کے ان تمام سوالات کے جوابات یہیں کھڑے کھڑے دے ڈالوں یا اندر ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر چائے یا سوفٹ ڈرنکس جو بھی آپ پسند کریں وہ پیش کرنے کے بعد دوں۔ دونوں نے پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر آرام سے اندر ڈرائینگ روم میں آ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے کہا کہ پہلے اپنا مکمل تعارف کروائیں اور آنے کی وجہ بھی بیان کریں۔ نکی بولی کہ ہم دونوں سگی بہنیں ہیں اور ہمارے یونیورسٹی میں International Religious Knowledge کی سٹوڈنٹس ہیں۔ ہمارے والد Envoy at large to Zimbabwe for Namibia ہیں۔ نہ صرف ہم بلکہ ہمارے والد بھی سابقہ مکینوں کے اچانک غائب ہونے اور آپ لوگوں کے نمودار ہونے پر حیران ہیں۔ میں نے اپنا اور اپنے دوست میجر عتیق کا تفصیلاً تعارف کروایا اور بتایا کہ ہم عارف حسین صاحب کے مہمان ہیں جنہوں نے ہمیں یہاں عارضی طور پر ٹھہرایا ہے کیونکہ یہاں کے مکین عمرہ کرنے سعودی عرب گئے ہوئے ہیں۔ ہماری منزل بوٹسوانہ اور پھر ساؤتھ افریقہ ہے۔ جیسے ہی گیبرون، بوٹسوانہ سے ویزا آئے گا ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ دونوں نے !Oh I see کا نعرہ لگایا اور سوفٹ ڈرنکس کے مزے لینے لگیں۔ اتنی دیر میں میجر صاحب جو شاور لے رہے تھے تیار ہو کر آ گئے۔ اب تک میں اکیلا ہی بلیک بیوٹیز کے اندازِ بیان اور body talk کی gravity میں پھنسا ہوا تھا۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ نائیجیریا اور کینیا کی نسبت زمبابوے ایک خوبصورت ملک ہے۔ یہاں کرائم ریٹ بہت کم ہے۔ لوگ ملنسار، خوش مزاج اور مہمان نواز ہیں۔ یہ Namibia کی حسینائیں بھی کمال کی تہذیب یافتہ اور خوش مزاج تھیں۔ جلد ہی انہوں نے جانے کی اجازت مانگی اور ایک بار پھر اچانک آ کر سوال جواب کرنے پر معذرت کی۔ میں نے کہا کہ آپ جب چاہیں تشریف لا سکتی ہیں۔ ہم دونوں سارا دن سڑکوں، مارکیٹوں، پارکوں میں اکیلے گھوم کر بور ہو چکے ہیں۔ آپ دونوں کا آنا ہمیں اچھا لگا۔ نکی بولی کہ میں پاکستان کے متعلق بہت کم جانتی ہوں۔ پاکستانی ائیر فورس، زمبابوے ائیر فورس کو تربیت دے رہی ہے اور ایک پاکستانی داؤد پوتہ زمبابوے ائیر فورس کے چیف ہیں۔ ہمارے والد ایک سفارت کار ہیں اس لیے سوشل gatherings اور ڈنرز پر ان کی اکثر پاکستانیوں سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ آئندہ ملاقات میں چند سوالات کے جوابات چاہوں گی۔ دونوں جیسے آئی تھیں ویسے ہی چلی گئیں۔ ہم دونوں بھی اپنی روزمرہ کی گشت پر نکل پڑے۔

رات کو ہمارا پروگرام ہلٹن (Hilton) ہرارے جانے کا تھا۔ جیسے ہی ہم تیار ہو کر باہر سڑک پر آئے تو ساتھ والے گھر سے دو کاریں نکلیں۔ ایک سفارت خانے کی گاڑی تھی جس پر Namibia کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے دوسری گاڑی میں یہ دونوں بہنیں سوار تھیں۔ ہمیں سڑک پر دیکھ کر دونوں گاڑیاں رک گئیں۔ پوچھا گیا کہ کس طرف جانا ہے؟ ہلٹن کا نام سن کر دونوں بہنوں نے قہقہہ لگایا اور اپنی زبان میں اپنے والدین سے کچھ کہا۔ وہ ہاتھ

ہلاتے ہوئے چلے گئے۔ یہ دونوں بہنیں گاڑی سے اتریں اور دروازہ کھول کر ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بولیں کہ ہم بھی ہلٹن ہی جا رہے ہیں کیونکہ وہاں سفارت خانے کی طرف سے ڈنر ہے۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ ڈنر بھی ہم اکٹھے کریں گے۔ میں نے اپنے والد سے اجازت لے لی ہے۔ میں آپ کو اپنے والد سے بھی ملواؤں گی۔ وہ آپ دونوں سے مل کر خوش ہوں گے۔ کچھ ہی دیر میں ہم ہلٹن کے لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ ہم دونوں ہی ڈپلومیٹک ڈنر پر جانے سے کترا رہے تھے۔ لیکن وہ ہمیں ہاتھ پکڑے سیدھا اپنے والد کے پاس لے گئیں۔ اپنی زبان میں وہ نہ جانے کیا کہے جا رہی تھیں۔ ان کے والد ہنستے رہے اور ہمیں Most welcome کہا۔ یہ ایک خوبصورت فنکشن تھا۔ تمام سفارت کار بمعہ بیگمات اور آل اولاد موجود تھے۔ کمال کے میک اپ، لباس، زیورات اور قہقہے تھے۔ جام سے جام ٹکرا رہے تھے۔ مرد و خواتین بے خوف و خطر پی رہے تھے جیسے اس رات کے بعد کبھی پینا نصیب نہیں ہوگا۔ ہارڈ ڈرنکس کی کمال ورائٹی دستیاب تھی۔ عتیق صاحب بھی اپنا حصہ ثواب کی طرح وصول کر رہے تھے۔ نکی نے استفسار کیا آپ کیوں ڈرنکس نہیں لے رہے، میں یہیں ٹیبل پر لا دیتی ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں شراب نہیں پیتا۔ وہ حیرانگی سے بولی ?How come پھر بولی کہ یہ تو معیوب بات ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک گلاس سافٹ ڈرنک لا دیں تا کہ میں آپ کا ساتھ دے سکوں۔ وہ ایک گلاس میں کوکا کولا لے آئی اور مجھے Cheers کہتے ہوئے اپنا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ ڈنر زبردست مگر حرام تھا۔ میں نے سلاد، چاول اور مچھلی پر گزارہ کیا۔ اس دوران مجھے عارف حسین صاحب کے گھریلو کھانے بہت یاد آئے اور میں ان کے اور ان کے اہلِ خانہ کے لیے دعا گو رہا۔

باتوں باتوں میں اس نے بوٹسوانہ کے ویزے کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ ابھی نہیں آیا اور ہم پروگرام بنا رہے ہیں کہ ویزا آنے سے پہلے وکٹوریہ فال دیکھ آئیں۔ یہ سن کر وہ یک دم اچھلی اور بولی ہمیں ہرارے آئے ایک سال ہو گیا لیکن ہم اب تک وکٹوریہ فال نہیں دیکھ سکے، کیوں نہ ہم اکٹھے چلیں۔ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہوئے سفر اور مناظر کو بھی انجوئے کریں گے۔ کل اتوار ہے میں پاپا سے بات کروں گی۔ ابھی تم لوگ اپنا پروگرام فائنل نہ کرنا۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔ پینے پلانے والے Tipsy ہو چکے تھے۔ اس لئے دونوں لڑکیاں اور ہم واپس آ گئے۔ وہ ہمیں ہمارے گیٹ پر ڈراپ کر کے اپنے گھر چلی گئیں۔ بقول شاعر:

مے خانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

اگلے دن ناشتے پر میں اور میجر صاحب وکٹوریا فال وزٹ کو آپس میں discuss کر رہے تھے کہ دونوں بہنیں تشریف لے آئیں۔ وہ خوش تھیں کیونکہ ان کے والد نے انہیں اجازت بھی دے دی تھی اور سفارت خانے کی

گاڑی لے جانے کے علاوہ پٹرول وغیرہ کی سہولت بھی ازراہِ کرم عنایت کی تھی۔ڈرائیور کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ ہم چاروں ہی ڈرائیور تھے۔طے پایا کہ کل صبح ہم سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔کھانے کی کچھ چیزیں اور سوفٹ ڈرنکس ساتھ رکھ لیں گے۔ ہمارا پروگرام آہستہ آہستہ اوسط سطح سے ترقی کرتے ایک Grand programبن گیا۔میجر صاحب خوش تھے کہ برانڈ نیو گاڑی ڈرائیو کرنے کے لیے مل گئی وہ بھی وکٹوریہ فال کے لیے۔دوسرے روز صبح سویرے ہماری کال بیل بجتی چلی گئی۔میں بھاگم بھاگ گیٹ پر پہنچا تو دونوں بہنیں سجی سنوری بمعہ کار کھڑی تھیں۔میجر صاحب تیار ہو کر مختصر سا رختِ سفر باندھ رہے تھے۔سامان رکھنے کے لیے کار کا بوٹ کھولا تو انواع واقسام کے فروٹ ڈرنکس اور ٹن فوڈ کو موجود پایا۔پاپا اور ماما بھی Good Bye کہنے اپنے سلیپنگ لباس میں کار تک تشریف لا چکے تھے۔ہمیں Good wishes کے ساتھ رخصت کیا گیا۔

ہرارے شہر کو پیچھے چھوڑتے ہوئے جلد ہی ہم ہائی وے پر آ گئے۔سڑک عمدہ اور صاف ستھری تھی۔سحر خیزی کے ساتھ دونوں بہنوں کا جوش و جذبہ،خوشی کا اظہار اور نکی کی سٹائلش ڈرائیونگ نے اس سفر کو یادگار بنا دیا۔آج دونوں بہنیں جینز اور کرتی سے بنی سجی تھیں۔ان کی خوش مزاجی،تہذیب اور تعلیم ان کے خاندانی وقار کا پتا دے رہی تھی۔ پاکستان کے بارے میں ان کا علم نہ ہونے کے برابر تھا۔میں اور میجر صاحب پاکستان کے بارے میں ان کے سوالات کا اپنی بساط کے مطابق تفصیل سے جواب دیتے رہے جو ان کے لیے حیرانی کا باعث تو تھا ہی مگر بقول ان کے ہمارے علم میں اضافہ ہوا۔

وکٹوریہ فال کے بارے میں جو کچھ ان دونوں بہنوں نے ہمیں بتایا اور ہم نے ٹورسٹ گائیڈ میں پڑھا وہ کچھ اس طرح ہے۔زمبابوے کا دوسرا بڑا شہر Bulawyo ہے جو ہرارے سے تقریباً 440km کی دوری پر ہے۔ وکٹوریہ فال Bulawyo سے تقریباً 445km کے فاصلے پر ہے۔ہرارے سے وکٹوریہ فال تک بستیاں، فارم ہاؤسز،چھوٹے گاؤں،Gweru نامی شہر اور Bulawyo قابلِ ذکر ہیں۔وکٹوریہ فال کی چوڑائی 5604 فٹ اور بلندی تقریباً 360 فٹ ہے۔یہ قدرت کا ایک عجوبہ ہے۔یہ آبشار دریائے Zambezi پر زمبابوے اور زیمبیا کے درمیان واقع دنیا کی سب سے بڑی آبشار ہے۔اس کو دریافت کرنے کا سہرا سکاٹ لینڈ کے David Livingstone کے سر ہے جو اپنے مذہب کی نسبت سے مشنری سرگرمیوں کے سلسلے میں افریقہ میں سرگرمِ عمل تھے۔یہ پہلا یورپی سیاح تھا جو اس آبشار تک پہنچا۔اُس نے سوچ بچار کے بعد اس آبشار کا نام ملکہ وکٹوریا کے نام پر رکھا جو پوری دنیا میں جانا اور پکارا جاتا ہے۔اس آبشار کو بلندی سے گرنے،آبی بخارات کو بادلوں کی طرح اڑانے اور 25/30 میل کی دوری تک پانی گرنے کی آواز سنائی دینے کی وجہ سے Smoke and thunder کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔میں حیران ہوں کہ قوم پرست گوریلوں اور آزادی کے متوالوں نے مقامی طور پر اپنے ہیروز

کے نام پر اس کا نام ابھی تک کیوں نہیں تبدیل کیا۔ اس کے لیے بہادری اور جرات کی ضرورت ہے جو زمبابوے کے شہیدوں کے وارثوں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ مگر ہائے یہ مجبوریاں! جو بہت ظالم نتائج کی حامل ہیں اور ان ممالک کے اصل وارثوں کو جکڑے رکھتی ہیں۔ طاقت ور غاصبوں، بحری قزاقوں اور کاؤبوائز لٹیروں کے نرغے میں آج بھی دنیا کے ممالک اتنے مجبور و بے بس ہیں کہ اپنی میراث کو اپنا نام بھی نہیں دے سکتے۔

مقامی روایات اور آثارِ قدیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے بھی شکاری لوگ پتھر اور لوہے کی ہتھیاروں سے لیس اس علاقے میں موجود تھے۔ جانوروں اور پرندوں کا شکار کر کے گزر بسر کرتے تھے۔ ہم اس کو پتھر کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ پھر قدرتی آفات اور تغیر و تبدل کے نتیجے میں Bantu قبائل کی اکثریت اس علاقے میں آباد ہوئی اور آج تک آباد ہے۔ اس کے علاوہ Metabala قبائل اس علاقے میں آباد ہوئے۔ یہ قبائل لوزی زبان بولتے تھے۔ اپنی اسی زبان میں یہ لوگ آج کی وکٹوریہ فال کو Amazana Thunqayo پکارتے تھے جسکو انگریزی میں Smoke and thuder کہیں گے اور اردو میں دھواں اور گرج کہتے ہیں۔ دیگر اقوام کی طرح عربوں نے اس علاقے کو End of the world بھی پکارا ہے۔

17 نومبر 1855 میں David Livingstone کی اس اتفاقیہ دریافت کے بعد 1860 میں John Kirk اور Emil Holub جیسے مشہور مہم جو اس عجوبے کی طرف روانہ ہوئے۔ 1880 میں اس آبشار اور افریقہ کے جنگلات کے بارے میں تمام تر تفصیلات دنیا کے لیے شائع کی گئیں۔ ایک برطانوی آرٹسٹ Thomas Baines نے 1880 میں اس آبشار کی پینٹنگز کی نمائش کی تو لوگوں نے اس کو تصوراتی طور پر حسین رنگوں کی آمیزش میں دیکھا۔ 1905 میں انگریزوں نے اس علاقے تک لوگوں کی رسائی کے لیے ریلوے کا نظام متحرک کیا۔ برٹش افریقہ کمپنی نے زمبابوے کے اطراف سے مختلف پروجیکٹس شروع کئے تا کہ اس ملک کی معدنیات، جنگلات اور دیگر وسائل کو لوٹ کر اپنے ملک لے جا سکیں۔ اس سلسلے میں ریلوے کا نظام ان کا مددگار ثابت ہوا۔ ان پروجیکٹس میں شامل تھے لوٹ مار پروجیکٹس۔ معدنیات سے شروع کر کے ہاتھی دانت کی سمگلنگ، جنگلات کی عمارتی لکڑی، جانوروں کی کھالیں وغیرہ۔ مالِ مفت دلِ بے رحم کی طرح یہ لوٹ مار عروج پا گئی۔ افریقی غریب سے غریب تر ہوتے گئے اور یہ غاصب ڈاکو امیر ترین ہوتے بادشاہ بن گئے۔ اگر ان کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو آج کے ناروے سے ان کا خمیر اٹھا۔ جہاں کے جنگلوں میں اعلیٰ کوالٹی کی قیمتی لکڑی پائی جاتی تھی۔ ان کے آباؤ اجداد چھوٹی چھوٹی کشتیاں (ڈنکی) بنایا کرتے اور سمندر سے مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔ کشتیاں بنانے میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ آہستہ آہستہ وہ بڑی اور پھر بہت بڑی کشتیاں بنانے لگے اور سمند میں دور تک جانے لگے۔ سمندر میں کبھی کوئی اکیلی کشتی نظر آتی تو یہ اس کو لوٹ لیتے۔ یہ لوٹ مار بڑھتی گئی۔ یہ لوگ بحری قزاقی میں ماہر ہو کر امیر ہوتے

گئے۔قزاقی کے دوران ان کے ہاتھ سونا اور دیگر قیمتی خزانے بھی لگے۔یہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے اور پھر خزانے بھی ہاتھ لگ گئے تو سمندر پر ان کی حکمرانی قائم ہوگئی۔اس طرح ان کے کئی گروپ بنتے گئے۔یہ اتنے طاقتور اور امیر ہوتے گئے کہ ہر گروپ کسی نہ کسی خطہ زمین پر قابض ہو کر حکومت بنانے میں نہ صرف کامیاب ہوا بلکہ ترقی میں باقی دنیا کو پیچھے چھوڑ دیا۔خالص خاندانی اور اصلی خون (Pure blood) کے طور پر پرکھا جائے تو روسی خالص خاندانی لوگ ہیں جنہیں اپنے جدِ امجد کی معلومات ہیں۔اس کے علاوہ جرمن بھی pure blood ہیں۔باقی پورے مشرقی اور مغربی یورپ کو صرف اپنی ماؤں کا معلوم ہے، باپ کا کسی کو علم نہیں۔بعض حالات میں ماں کو بھی بچے کی اصل ولدیت کا نہیں معلوم ہوتا۔اگر کوئی گروپ طاقت، ظلم و بربریت، عددی برتری کی بنیاد پر بادشاہ بن بھی جائے تو اس سے حقیقت نہیں بدلی جاسکتی۔جیسے جیسے یہ لوگ ترقی کرتے گئے انہوں نے نہ صرف سونے کی چڑیا (برصغیر) بلکہ افریقہ اور دنیا کے دوسرے خطوں پر مختلف حیلے بہانوں سے قبضہ کرلیا۔

اس قدرتی عجوبے (وکٹوریہ فال) کو دیکھنے کے لیے آنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا اور 1990 کے اعداد و شمار کے مطابق سالانہ 10 لاکھ لوگ اس آبشار کو دیکھنے آتے ہیں۔لہٰذا ویزے کی سہولت کے ساتھ دونوں ممالک کے سیاحوں کی سہولت کے لیے بہت سے راست اقدامات کیے ہیں۔Zambia نے Living stone Island کے دہانے پر ایک بہت بڑا سوئمنگ پول بنایا جسے Devil's Pool کا نام دیا گیا۔یہاں دریا کا پانی متوازن انداز میں بہتا ہے جو تالاب میں نہانے والوں کے لیے خطرے کا باعث نہیں۔اس کے نزدیک ہی Mosi-oa-Tunya Park ہے۔جس کا رقبہ تقریباً 70 کلومیٹر ہے۔اس کے دوسری طرف Victoria Falls National Park ہے جس کا رقبہ تقریباً 25 مربع کلومیٹر ہے۔اس کے ساتھ ہی Zambezi نیشنل پارک ہے جو تقریباً 45 مربع کلومیٹر پر محیط ہے۔فروری اور اپریل تک سیلابی موسم ہوتا ہے جس کی وجہ سے آبشار کی بلندی 1300 فٹ سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔اس موسم میں آبشار کا نظارہ قریب سے ممکن نہیں ہوتا کیونکہ پانی کے قطرے تیز بارش کے پانی کی طرح طوفانی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔جبکہ پانی کے انتہائی شور میں کان پڑی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔دریائے زیمبیا میں 40 سے زائد اقسام کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جو لذت میں پوری دنیا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔آبشار کے اوپر کے حصے میں 90 سے زیادہ اقسام کی آبی مخلوق پائی جاتی ہے۔آبشار کے نزدیک ہی وکٹوریہ ٹاؤن بھی آباد ہے۔زیادہ تر لوگ مقامی ہیں جن کا روزگار سیاحوں کے رحم و کرم پر ہے۔آبشار سے 20 کلومیٹر دور ایک ہوائی اڈا بھی ہے جہاں سے جوہانسبرگ اور نمیبیا کے لیے پروازیں جاتی ہیں۔آپ لوگوں کے علم اور آئندہ آنے والے سیاحوں کے لیے میں نے دنیا کے اس عجوبے کے بارے میں تفصیلات فراہم کرنے کوشش کی ہے۔

ہمارے ہمسفر کمال درجے کے خوشگوار موڈ کے ساتھ ہمارے لیے باعثِ مسرت رہے۔آخر سفر کرتے ہم وکٹوریہ فال پہنچ گئے۔وہاں کا گیسٹ روم نمیبیا کے سفارت خانے کی طرف سے ہمارے لیے تیار تھا۔میجر صاحب خوش بھی تھے اور پرجوش بھی۔

بقول شاعر:

محبتوں کے اساس لہجے
حقیقتوں کے عکاس لہجے
اے بنتِ حوا سنبھل کر رہنا
فریب ہیں یہ مٹھاس لہجے

رات آرام کرنے کے بعد ہم سب فریش اور پرجوش تھے۔قدرت اس جگہ پر خاص طور پر مہربان تھی۔اتنے خوبصورت مناظر صرف قدرت ہی بنا سکتی ہے۔دنیا جہاں سے آئے لوگ اپنے رنگوں میں رنگے تھے۔قابلِ احترام انڈین نژاد مسلم خواتین مکمل کپڑوں میں سر پر سکارف لیے اپنی فیملیز کے ساتھ ہرارے اور دیگر افریقن ممالک سے وکٹوریہ فال دیکھنے آئی ہوئی تھیں۔یہ افریقہ کے پرانے آبادکار لوگ ہیں جو زیادہ تر بزنس سے منسلک ہیں اور بہت کم لوگ ملازمت پیشہ ہیں۔اس کمیونٹی میں کروڑ پتی بلکہ ارب پتی شخصیات بھی موجود ہیں۔افریقہ میں اسلام انھی لوگوں کی وجہ سے پھیلا۔افریقہ میں خوبصورت مساجد بنوانے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔کاروباری لین دین میں ظالمانہ حد تک طوطا چشم، عام زندگی میں نرم خو اور مہمان نواز، اوڑھنا بچھونا صرف کاروبار، مقامی زبانوں کے علاوہ انگلش اور ٹوٹی پھوٹی اردو خوب بولتے ہیں۔اسلام کے بارے میں جاننے کی جستجو رکھتے ہیں۔اکثریت صوم وصلوٰۃ کی پابند ہے اور خود کو مولانا نورانی کا مرید کہتی ہے۔

دیگر لوگوں میں انڈین ناریاں بھی تھیں۔سفید چمڑی والی مختصر لباس میں تھیں۔مقامی اور دیگر افریقن ممالک سے تشریف لائے خواتین اور حضرات بھی تھے۔بعض افریقن خواتین اپنے کالے رنگ کے باوجود اتنی جاذبِ نظر تھیں کہ خوبصورت مہ جبینوں کو بھی پیچھے چھوڑ گئی تھیں اور ان کے درمیان واضح نظر آ رہی تھیں۔آج ہماری ہمسفر خواتین نے تیز پیلے رنگ کی شارٹس پہن رکھی تھیں۔ان کا اپنا رنگ چمکتا ہوا بلیک تھا۔خواتین کے ہجوم میں وہ بھی خاصی جاذبِ نظر لگ رہی تھیں۔بے شک اللہ تعالیٰ جو پوری کائنات کا خالق و مالک ہے، اس کی مصلحتیں وہی جانے۔دو دن بعد ہمارا واپسی کا سفر شروع ہوا اور ہم جس طرح آئے تھے اسی طرح بغیر رکے خیریت سے واپس ہرارے پہنچ گئے۔

دوسرے روز عارف حسین صاحب تشریف لے آئے۔ان کے ہاتھ میں دو عدد کاغذ پکڑے ہوئے تھے۔

انہوں نے ہمیں خوشی سے بتایا کہ ہمارے بوٹسوانہ کے ویزے آ گئے ہیں۔ ہم بھی سن کر خوش ہوئے۔ رات کو تھکن کے باعث جلد ہی سو گئے۔ صبح ناشتے کے بعد آپس میں صلح مشورہ کر کے بوٹسوانہ جانے کے پروگرام کو حتمی شکل دی جس کے مطابق ہم نے پہلے بذریعہ جہاز Bulawayo اور پھر وہاں سے بذریعہ ٹرین گیبرون (بوٹسوانہ) جانا تھا۔ ہم تیار ہو کر زمبابوے ائیر لائن کے آفس چلے گئے اور دوسرے روز کے لیے اپنی ریزرویشن برائے Bulawayo کنفرم کروالی۔ جیسے ہی واپس گھر پہنچے دونوں بہنیں فرشتوں کی طرح نازل ہو گئیں۔ وہ کافی خوش نظر آ رہی تھیں جس کی وجہ نکی کی انیسویں سالگرہ تھی جو آج رات ہلٹن ہرارے میں منائی جانی تھی۔ میں یہ سنتے ہی صوفے سے اٹھ کر اُن کے سامنے جھکتے ہوئے کورنش بجالایا اور Happy Birthday کا نعرہ لگاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ میجر صاحب نے بھی مجھے follow کیا۔ دونوں نے خوش ہوتے ہوئے ہمیں Civilised gentlemen کا خطاب دیا۔ ہمیں پارٹی کی دعوت دینے آئی تھیں۔ جلد ہی چلی گئیں کیونکہ انہیں پارٹی کی تیاری کے سلسلے میں بیوٹی پارلر بھی جانا تھا اور ڈریسز وغیرہ کا بھی مسئلہ تھا۔ میں نے میجر صاحب کو مشورہ دیا کہ آج رات کی برتھ ڈے پارٹی کے بعد اپنا جانے کا تمام پروگرام انہیں بتا دیں گے۔ میجر صاحب کہنے لگے کیا یہ ضروری ہے؟ میں نے کہا کہ بے حد ضروری ہے۔ ان کو بتائے بغیر میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ مجھے سنجیدہ دیکھ کر میجر صاحب مان گئے۔ ہمارے پاس جیولری کے export samples تھے۔ ان میں سے نکی اور اس کی والدہ کے لیے ہم نے دو خوبصورت جیولری سیٹ منتخب کر لیے۔ میجر صاحب کیتھرین کو بھی سیٹ دینے کے لیے مچل گئے۔ ہم نے تین سیٹ الگ الگ پیک کیے اور میجر صاحب نے خوبصورت کیلی گرافی کرتے ہوئے ان پر تینوں کے نام لکھے۔

دوپہر میں عارف حسین صاحب کی طرف ہمارا الوداعی کھانا تھا۔ ہم دونوں ان کا جتنا شکریہ ادا کر سکتے تھے، ان کی خدمت میں بہت ساری دعاؤں کے ساتھ ہدیہ کرتے رہے۔ ہمیں گھر کا بنا، حلال کھانا کھلانے کے لیے ان کی گراں قدر خدمات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا اور ان کا احسان مند رہوں گا۔ لنچ حسبِ معمول عمدہ اور پرتکلف تھا۔ وہ ہمیں دوسرے روز ائیر پورٹ تک سی آف کرنے جانے پر مصر تھے۔ ہم نے انہیں کہا کہ آپ گھر کی چابی لے کر ہمیں خدا حافظ کہہ دینا مگر وہ نہ مانے اور کہا کہ میں آپ کو جیسے لے کر آیا تھا ویسے ہی چھوڑ کر بھی آؤں گا۔ لنچ کے بعد وہ ہمیں گھر چھوڑ کر چلے گئے اور ہم شام کی برتھ ڈے پارٹی کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ ابھی ہم مکمل تیار بھی نہیں ہوئے تھے کہ نکی اور کیتھرین آ دھمکیں۔ میں نے جب ان کے لباس پر نظر ڈالی تو بے اختیار پوچھ ہی لیا کہ اپنے اہم دن پر آپ یہ لباس پہنیں گی۔ کیتھرین بولی نہیں یہ لباس نہیں، آج ہم اپنے قبیلے کا روایتی لباس زیبِ تن کریں گے۔ بہت selected gathering ہو گی۔ اجنبی صرف آپ ہوں گے۔ وہ ہمیں لینے آئی تھیں جبکہ ان کے والدین ہال میں پہنچ چکے تھے۔ ہم ان کے ساتھ ہال میں داخل ہونے والے آخری مہمان تھے۔ سب لوگ آ چکے

تھے۔ ہال کو خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ صرف ہم دونوں اور ہوٹل کا سٹاف ہال میں موجود تھا۔ باقی تمام خواتین و حضرات غائب تھے۔

اچانک ہال کی چکاچوند میں اضافہ ہو گیا۔ ایک خاص مقام پر بار بار روشنی کے جھماکے ہو رہے تھے۔ پہلے دو ننگ دھڑنگ، کالے رنگ اور موٹے پیٹ کے لوگ، چہرے اور جسم پر عجیب و غریب نقش و نگار بنائے، ہاتھوں میں کسی جانور کے بڑے بڑے سینگ پکڑے برآمد ہوئے۔ دونوں ہال کے بغلی کمرے سے نکل کر اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اپنی سرخ آنکھیں چاروں طرف گھمائیں اور ہمیں اشارے سے کھڑے ہونے کا کہا۔ ہم دونوں فوراً اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔ پھر انھوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے سینگوں کو منہ سے لگا کر سنک کی طرح بجایا۔ غالباً یہ قبیلے کے سردار، اس کے خاندان اور شاہی مہمانوں کی آمد کا اعلان تھا۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ سفیر صاحب اپنے قبیلے کے سردار ہیں اور ان کی بیٹیاں شہزادیاں۔ جبکہ ان کی زوجہ بھی اپنے قبیلے کی شہزادی تھی۔ برتھ ڈے پارٹی ان کے قبیلے کے لباس اور رسم و رواج کے مطابق منائی جا رہی تھی۔ سفیر صاحب آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے تھے مگر اپنے قبیلے کی روایات کے پابند تھے۔ پھر جو ہم نے دیکھا وہ ہمارے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

تمام مرد صرف لنگوٹی زیبِ تن کئے، چہرے اور جسم پر نقش و نگار بنائے، ہاتھوں میں نیزے نما ہتھیار پکڑے ایک جلوس کی شکل میں برآمد ہوئے۔ سب سے آگے قبیلے کے سردار یعنی سفیر صاحب تھے جنہوں نے گلے میں کوڑیوں اور رنگین موتیوں کے ہار پہنے ہوئے تھے۔ سر پر عجیب سی ٹوپی تھی جس میں ایک رنگین پَر اڑسا ہوا تھا۔ پھر دوبارہ سنک بجا تو لڑکیاں جلوس کی شکل میں برآمد ہوئیں۔ اللہ کی پناہ! تمام کڑیل جوان لڑکیاں، زبردست میک اپ، صرف شارٹس پہنے اور Top less۔ صرف نکی اور کیتھرین کے سر پر رِنگ میں ایک ایک پَر اڑسا ہوا تھا جو انہیں شہزادیاں ظاہر کر رہا تھا۔ پھر سنک بجایا گیا تو زیادہ عمر کی خواتین برآمد ہوئیں جو پورے لباس میں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ سفیر صاحب بمعہ ایک قبائلی ہماری ہی طرف آ رہے ہیں۔ قبائلی نے ہاتھ میں کچھ اٹھا رکھا تھا۔ وہ ہمارے پاس آ کر کچھ بڑ بڑائے جو ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ شاید وہ Over drunk تھے۔ انہوں نے ہمارے سروں پر ایک ایک رِنگ رکھ دیا جس میں خوبصورت رنگین پر لگا ہوا تھا۔ میں نے میجر صاحب سے کہا کہ اب ہم شاہی مہمان کے زمرے میں آتے ہیں۔ ہم نے کورنش بجاتے ہوئے سردار کا شکریہ ادا کیا۔ وہ خوشی سے واپس اپنی جگہ چلا گیا۔ سنک پھر بجا اور لڑکیاں تھرکتی، مچلتی، پھسلتی، ایک گول دائرے کی شکل میں قبائلی رقص پیش کرتی رہیں۔ اس کے بعد کیک کاٹنے کی رسم ادا کی گئی اور تحائف پیش کئے گئے جس میں ہم دو بے چارے پاکستانیوں کے بھی تحفے تھے۔ اس کے بعد اُم الخبائث کا دور شروع ہو گیا۔ صرف میں ہی اکیلا گنہگار تھا باقی سب پارسا تھے۔

بقول عدم:

مے کدے سے جو بچ نکلتا ہے
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے

جب تک پی کر اور ناچ ناچ کر گر نہیں پڑے اس وقت تک وہ لوگ جوش وولولے سے اس کام پر لگے رہے۔ اب لڑکیاں اپنا لباس تبدیل کر چکی تھیں۔ ہال کے دروازے کھل چکے تھے۔ ہوٹل کا سٹاف فرش پر گرے مہمانوں کو اٹھا کر باہر ان کی گاڑیوں میں دھکیل رہا تھا۔ مفت شراب کا ایسا بے دریغ استعمال میں نے پہلی بار دیکھا۔ Namibia ہیروں کی کانوں کا مالک ہے لیکن اس کی معاشی حالت کیوں خراب ہے، اس کی وجہ آج سمجھ آئی۔

میرے ملکِ عزیز میں بھی لوٹ مار ہے جس کی وجہ سے ہماری اکانومی بھی ڈانواں ڈول رہتی ہے بس طریقہ کار مختلف ہے۔ یہاں ترقی کے نام پر، بڑے بڑے ترقیاتی منصوبوں کے نام پر خود اربوں، ماتحتوں کو کروڑوں اور چاپلوسوں کو لاکھوں کی کرپشن کرنے کی نہ صرف کھلی اجازت ہے بلکہ حکماً کروائی جاتی ہے تاکہ وفاداری، ہر غیر قانونی حکم کی تعمیل اور سب دیکھ کر بھی خاموش رہنے کی شرط کی تعمیل ہو سکے۔ ملک کو گِدھوں کی طرح نوچ نوچ کر کھایا جاتا ہے۔ لعنت ہے ایسے لوگوں پر۔۔۔ ''شرم تم کو مگر نہیں آتی''۔۔۔

میں نے نکی سے ان کے لباس کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ افریقہ کے سب قبائل میں یہ رواج ہے کہ غیر شادی شدہ لڑکیاں ایک خاص عمر تک یا شادی ہونے تک Topless ہی رہتی ہیں۔ ان کے لیے یہ صرف قبائلی رسم ورواج کا حصہ ہے۔ موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے نکی اور کیتھرین کو بتایا کہ صبح کی فلائٹ سے ہم Bulawayo اور وہاں سے گیبرون (بوٹسوانہ) چلے جائیں گے۔ وہ اس اچانک خبر سے پریشان ہو گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم ویزا دیر سے آنے کی وجہ سے کافی لیٹ ہو چکے ہیں۔ ابھی ہمارے بہت سے کام باقی ہیں۔ اس طرح ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ صبح عارف حسین صاحب تشریف لے آئے۔ ہم نے گھر ان کے حوالے کیا۔ ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ ہمیں ائیر پورٹ چھوڑ کر چلے گئے۔

بقول شاعر:

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

ہمارے سے Bulawayo ڈومیسٹک فلائٹ تھی۔ ائیر پورٹ پر کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ کاروباری مسکراہٹوں کے جھرمٹ میں ائیر کرافٹ تک پہنچ کر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ باقی لوگ یا مقامی تھے یا دیگر افریقن ملکوں کے تھے۔ جہاز نے اپنے وقت پر اڑان بھر لی۔ مسافروں کی مہمان نوازی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ فضائی

میزبان افریقن تھیں۔ میرے خیال میں جب ان کے شوہروں نے انہیں ریٹائرڈ کیا تو Zim Air نے انہیں بھرتی کرلیا (یہ میرا ذاتی خیال ہے جس سے کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں)۔ ائیر کرافٹ کی ظاہری حالت بھی کافی خستہ تھی۔ جہاز اور فضائی میزبان دونوں ہی پاکستان کے انٹرمیڈیٹ کے اُردو کے کورس میں پڑھائی جانی والی ایک کلاسک کہانی ''مرحوم کی یاد میں از پطرس بخاری'' سے مماثلت رکھتے تھے۔ جہاز میں سے بھی عجیب آوازیں آرہی تھیں۔ ہم کافی خوفزدہ سے بیٹھے تھے کہ ایک چھوٹا سا دھماکہ ہوا۔ تمام مسافر دہل گئے۔ معلوم ہوا کہ جہاز لینڈ کر گیا ہے۔ سب نے سُکھ کا سانس لیا۔ کسی نے تالی نہیں بجائی۔ حالانکہ عام روایت میں انٹرنیشنل سیکٹر پر جہاز جہاں بھی لینڈ کرتا ہے، تمام مسافر تالیاں بجا کر پائلٹ اور دیگر عملے کی مہارت کو داد دیتے ہیں۔ جہاز سے اترنے کے لیے مسافروں کی لائن لگی تھی۔ دروازے میں ایک فضائی میزبان Good bye کہنے کے لیے کھڑی تھی۔

ہر کوئی اپنا سامان اور بچوں کو لے کر جلد از جلد جہاز سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ کچھ لوگ زیادہ جلدی کر رہے تھے۔ قدرتی طور پر جہاز اتنا آرام دہ نہیں ہوتا It is not a place, It is space اس لیے ڈپریشن اور فرسٹریشن قدرتی چیز ہے۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ ہوتی ہے۔ ہم جہاز کے دروازے تک پہنچے تو وہاں موجود فضائی میزبان کی نقلی مسکراہٹ بھی غائب ہو چکی تھی۔ وہ Rocky face کے ساتھ اکتاہٹ کا اظہار کر رہی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ تو اس سے پوچھا کہ کیا آپ کی بیٹی بھی ائیر ہوسٹس ہے۔ اس نے حیرانی سے اس سوال کی وجہ پوچھی۔ میں نے جلدی سے کہا کہ میرے خیال میں آپ کی بیٹی Maternity leave پر ہے اور اس کی جگہ Reliever کے طور پر آپ کو بھیجا گیا ہے۔ یہ کہتے ہی میں جہاز کی سیڑھیاں پھلانگتا سامنے کھڑی بس میں سوار ہو گیا۔ جب میجر صاحب بس میں آئے تو مجھے بتایا کہ تمہارے جاتے ہی وہ اپنی مقامی زبان میں تمہیں برا بھلا کہہ رہی تھی۔ دیگر لوگوں نے حیرانی سے اس کو سنا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟ میں نے تمہاری کہی ہوئی باتیں دوہرا دیں۔ سب لوگ ہنسنے لگے اور فضائی میزبان پیر پٹختی وہاں سے ہٹ گئی۔

Bulaewayo میں ہمارا قیام Bulawayo Sun Hotel میں تھا جو لسن سٹریٹ پر واقع ہے۔ یہ دنیا جہاں کی آسائشوں سے مزین ایک خوبصورت ہوٹل تھا۔ ہم لوگ فریش ہو کر گیبرون کے لیے ریلوے ریزرویشن کروانے نکل کھڑے ہوئے۔ دوسرے روز رات دس بجے کی ٹرین میں ہمارے لیے AC کیبن ریزرو کر دیا گیا۔ Bulawayo اچھا اور صاف ستھرا شہر تھا۔ صوبائی دارالحکومت ہونے کی وجہ سے پر رونق تھا۔ ہم تمام دن گھومتے پھرتے رہے۔ بازار، شاپنگ مال، انٹرنیشنل اسٹیڈیم، نیشنل پارک دیکھتے رہے۔ Bulawayo نیشنل پارک بہت بڑا ہے اور اس میں ہمہ قسم کی wild life موجود ہے۔ اسے یہ لوگ Child of Africa بھی کہتے ہیں۔

ہوٹل کے لاؤنج میں فیروزہ نامی ایک قبول صورت خاتون سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران علم ہوا کہ اس کے والد صاحب پاکستان سے تشریف لائے تھے اور اس کی والدہ کی زلف کے اسیر ہو کر کچھ عرصہ یہاں قیام پذیر رہے۔ فیروزہ کی شکل میں تحفہ دے کر ایسے غائب ہوئے کہ پھر کبھی نہ لوٹے۔ اس کی والدہ انڈین نژاد تھیں اور رحلت فرما چکی تھیں۔ فیروزہ ہر پاکستانی میں اپنے باپ کو تلاش کرتی تھی۔

محبت درِ دل کہ وہ دوا ہے۔۔۔ مل جائے تو مرض ختم۔۔۔۔ نہ ملے تو مریض ختم

فیروزہ کی پیاسی آنکھوں میں جب غم و یاس کی ندیاں بہتیں اور وہ اپنے اَن دیکھے باپ کو یاد کرتی تو نہ صرف ہمارے سر ندامت سے جھک جاتے بلکہ آنکھیں بھی پرنم ہو جاتیں۔ ہمارے پاس سوائے جھوٹی تسلیوں کے کچھ نہ تھا۔

ہمارے کھلنے اور جھڑنے کے دن ایک ساتھ آئے ہیں
ہمیں چاٹا ہے دیمک کی طرح اپنوں نے
(تابش)

دوسرے روز ہمیں کچھ ڈالر مقامی کرنسی میں تبدیل کروانے تھے۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے معلوم کیا تو بہت کم ریٹ بتایا گیا۔ فیروزہ اسی ہوٹل میں سپروائزر تھی۔ اس نے ہمیں رازداری سے بتایا کہ مین مارکیٹ میں ہیروز کے نام سے الیکٹرانکس کی ایک بڑی دکان ہے۔ وہ کرنسی کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ آپ کو وہاں سے ڈالر کا اچھا ریٹ مل جائے گا۔ ہم اس کا شکریہ ادا کر کے پیدل ہی نکل پڑے اور جلد ہی ہیروز نامی ایک بہت بڑے الیکٹرانکس شوروم کے سامنے کھڑے تھے۔ اندر داخل ہونے پر کاؤنٹر پر موجود ایک بزرگ خاتون نے Welcome کیا۔ ڈالر کا ریٹ پوچھنے پر اس نے سامنے لگے ایک چارٹ کی طرف اشارہ کیا جس پر تمام کرنسیوں کے آج کے ریٹ لکھے تھے۔ ہم آپس میں اُردو میں بات کر رہے تھے۔ وہ ہمیں غور سے دیکھتی رہی۔ جب میجر صاحب نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ Please make good rate for us تو وہ نستعلیق اُردو لہجے میں بولی کہ آپ مجھ سے اُردو میں بات کر سکتے ہیں۔ ہم نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولی میں گرومندر کراچی کی رہنے والی ہوں۔ آپ کہاں کے ہیں؟ میں نے ترنت جواب دیا کہ ہم PECHS نرسری سٹاپ کے ساتھ والی لین میں رہتے ہیں۔ اس نے ہمیں خوشدلی سے کرسیوں پر بٹھایا اور خود بھی کاؤنٹر سے نکل کر ہمارے ساتھ والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ ڈالر کے ریٹ میں بھی اضافہ ہو گیا اور Coke کے ٹن بھی آ گئے۔ مزید بات چیت سے معلوم ہوا کہ کراچی کے ہندو خاندان کی سپتری ہیں اور ہندو ہیرو خاندان میں شادی کے بعد یہاں Bulawayo میں اپنے شوہر اور آل اولاد کے ساتھ مقیم ہیں۔ ہیروز نامی الیکٹرانکس چین سٹور کی مالک ہیں جو لندن اور دیگر یورپی ممالک سے بھی آپریٹ کرتی ہے۔ خوش مزاج خاتون تھیں۔ بات چیت کے دوران قہقہے لگ

رہے تھے۔فون کر کے شوہر کو بھی بلوالیا اور ہمارا تعارف کروایا۔ وہ بھی خوش شکل، خوش مزاج اور خوش لباس ثابت ہوا۔ہم ڈالرز مقامی کرنسی سے تبدیل کروا چکے تھے اس لیے اجازت چاہی۔دونوں میاں بیوی یک زبان ہو کر بولے No No ابھی لنچ ٹائم ہے۔ پہلے گھر چل کر کھانا کھائیں گے۔ پھر میں آپ کو Bulawayo کی سیر کرواؤں گا۔ڈنر کے بعد آپ کو ریلوے اسٹیشن تک الوداع کہنے جاؤں گا۔ مجھے خود پر رشک آ رہا تھا اور میں دل میں اپنے مالک وخالق کی حمد وثنا کرتا رہا کہ وہ اپنی رحمت کے دروازے ہم پر کبھی بند نہیں کرتا۔ یہ دونوں ہندو ہونے کے باوجود، ہم وطن اور ہم زبان ہونے کی وجہ سے ہم پر مہربان تھے۔ہم تکلفاً کچھ پس وپیش کے بعد ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ان کے گھر چلے گئے۔ یہ ایک ماڈرن ترین، ہر قسم کی آسائش وزیبائش سے مزین، ان کے دل کی طرح کشادہ، باغ وباغیچے سے آراستہ پیراستہ محل نما بنگلہ تھا۔ وہ ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر گھر کے اندر چلے گئے۔ہم وہاں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ نہ جانے کب ایک Doberman نسل کا لمبا تڑنگا کتا میرے صوفے کے بالکل سامنے خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔ جب میں نے اُٹھ کر واش روم جانے کی کوشش کی تو کتے نے ایک لمبی ہووو کی آواز نکالی اور جھٹکے سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔اپنی سرخ آنکھوں سے ہمیں گھورنے لگا۔اسی اثناء میں دیوی جی ڈرنکس لے کر کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔انھوں نے چلا کر مقامی زبان میں کتے کو کچھ کہا تو وہ تیزی سے گھر کے اندر چلا گیا اور پھر نظر نہ آیا۔

اسی دوران کھانے کے لیے ڈائننگ روم میں بلایا گیا۔ یہاں بھی خوبصورت کراکری اور کمال کی سجاوٹ تھی۔ کھانے میں ورائٹی تھی۔بچوں میں تین ہنس مکھ اور پیاری بیٹیاں تھیں۔تینوں مہذب اور خوش اخلاق تھیں۔اللہ تعالیٰ نے انہیں مہمان نوازی کا جذبہ اس قدر عطا کیا تھا کہ بڑے بڑے پارسا ان کے سامنے بونے نظر آتے تھے۔شائد یہی ان کی خوبصورتی اور خوش حالی کا راز تھا۔کھانا لذیذ تھا۔طنز ومزاح میں مسٹر ہیرو کی Asthetic sense کمال کی تھی۔دیوی جی بھی کچھ کم نہ تھیں۔کسی موضوع پر دونوں کے سینگ پھنسے تو ہماری پروا کیے بغیر آپس میں بحث و تکرار ہونے لگی۔آج کل کے ماحول کے مطابق یہ الفاظ ان پر فِٹ ہوتے تھے۔

بقول شاعر:

پردہ کیا کریں جو پڑے نہ بری نظر
شوہر نے ایک روز جو بیوی سے یہ کہا
بولی کہ دیکھتے ہیں سبھی آپ کی طرح
گر یہ بری نظر ہے تو اچھی نظر ہے کیا

ہم نے مسٹر ہیرو سے درخواست کی کہ ہم Bulawayo دوسری بار آئے ہیں اور سب ہمارا دیکھا بھالا ہے

اس لیے ہمیں ہوٹل چھوڑ دیں تا کہ ہم کچھ آرام کرلیں۔ چھ بجے چیک آؤٹ کرنا ہے۔آپ جب چاہیں ہمیں ہوٹل کے لاؤنج سے لے لینا۔کچھ پس وپیش کے بعد وہ مان گئے اور ہمیں ہوٹل چھوڑ گئے۔ہم کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ رات آٹھ بجے مسٹر ہیرو ہمیں لینے آ گئے۔ہم لاؤنج میں بیٹھے کافی انجوئے کر رہے تھے۔وہ ہمیں لے کر پھر اپنے گھر آ گئے اور دیوی جی سے بولے کہ ہمارا واسطہ سادھوسنتوں سے پڑ گیا ہے۔جس چیز کے پینے کا ٹائم ہے وہ پیتے نہیں کافی پر ٹائم ضائع کر رہے ہیں۔اس کے ساتھ ہی انہوں نے بغلی دروازہ کھولا تو اندر ایک مکمل بار روم موجود تھا۔میں حیرانی سے دیکھتا ہوا بار روم میں داخل ہو گیا۔میرے عقب میں میجر صاحب،مسٹر ہیرو اور دیوی جی بھی بار روم میں داخل ہو گئے۔خوبصورت کاؤنٹر،دنیا جہاں کے تمام برانڈز کی شراب سے سجی الماریاں،نفیس جام۔کمال کا معیار تھا۔میں اور میجر صاحب داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔مسٹر ہیرو اپنا پیگ بناتے اور Bottoms up یعنی غٹا غٹ پی جاتے۔کیونکہ شراب کی ذمہ داری میزبان پر تھی(Booze is on the house) لہٰذا میجر صاحب بھی مستفید ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔مسٹر ہیرو جلد ہی Hang over ہو گئے۔دیوی جی نے انہیں زبردستی بار روم سے نکال کر اسے مقفل کر دیا۔9:30 ہم سب ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔اب کی بار گاڑی دیوی جی نے چلائی۔مسٹر ہیرو بالکل خاموش بیٹھے تھے۔10 بجے ٹرین ہمیں لے کر بوٹسوانہ کی جانب روانہ ہو گئی۔مسٹر اینڈ مسز ہیرو نے ہمیں محبت سے روانہ کیا۔مسٹر ہیرو نے کنڈکٹر گارڈ سے ہمارا تعارف کرواتے ہوئے خاص خیال رکھنے کی تاکید بھی کر دی تھی۔

باب4: بوٹسوانہ اور ساؤتھ افریقہ (1991ء)

زندگی کے سرکس میں سب سے
خطرناک کرتب محبت ہے

بوٹسوانہ اور ساؤتھ افریقہ

(1991ء)

جب ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگئی تو ہم نے ٹرین کا جائزہ لینا شروع کیا۔ تمام ڈبے ایک دوسرے کے ساتھ انٹرلنک تھے۔ شروع سے آخر تک ہر ڈبے میں جایا جاسکتا تھا۔ ہر کلاس میں ہر طرح کے مسافر بھرے ہوئے تھے۔ ہمارا A.C. کمپارٹمنٹ صاف ستھرا تھا۔ باتھ روم میں گرم اور ٹھنڈا پانی، صابن اور ٹائلٹ رول وغیرہ کی سہولت بھی موجود تھی۔ پانی کی بوتلیں اور رات کا کھانا مسٹر اینڈ مسز ہیرو نے فراخدلی اور نفاست سے پیک کر کے بمعہ ڈسپوزایبل کراکری ہمارے ساتھ کر دیا تھا۔ یہ ان کی شفقت، دریا دلی اور مہمان نوازی کی اعلیٰ روایات کا عکاس تھا۔ ابھی ہم اپنے کمپارٹمنٹ میں سیٹ ہو رہے تھے کہ کنڈیکٹر گارڈ آ گیا۔ ہمارے ٹکٹ چیک کیے، اندراج کیا اور ہمارا حال احوال پوچھا۔ اُس نے ہمیں بتایا کہ مسٹر ہیرو اس کے دوست ہیں اور ہمارا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ صاحب جو کنڈیکٹر گارڈ کے یونیفارم میں تھے ان کا حلیہ کچھ یوں تھا۔ ہاتھوں میں Booking Chart پکڑا ہوا، کان میں بال پوائنٹ اڑسا ہوا، اونچا لمبا قد، سیاہ رنگ، بڑا سا سر، اسی سائز میں چہرہ، موٹی موٹی بھوویں، موٹا سا ناک، پیشانی کافی چوڑی، چھوٹی چھوٹی تیز طرار گہری سرخ آنکھیں، موٹے ہونٹ، منہ میں چمکتے سفید دانت۔ جب ذرا جذباتی ہو کر بات کرتا یا ہنستا تو اس کے منہ سے نکلی ہوئی جھاگ کی پھوار مدِ مقابل کے چہرے پر ڈائریکٹ وار کرتی۔ وہ کچھ نہ کچھ عذر بنا کر کئی بار آیا اور ہر بار بہت زور دیکر پوچھتا: ''سر کوئی بھی خدمت ہو تو مجھے ضرور بتائیں۔'' ہم ہر بار انکار کر دیتے۔

زمبابوے کا آخری ریلوے اسٹیشن Plumtree town ہے جو جنوب مغربی زمبابوے کا آخری شہر ہے۔

Plumtree Station آنے سے پہلے ہی دونوں طرف کے Immigration والے آ گئے اور ٹرین میں ہی ہمارے پاسپورٹس پر Exit اور Entry کی مہریں لگا دی گئیں۔ دونوں طرف کے لوگ آئے، خاموشی سے اپنا کام کیا اور چلے گئے۔ پتہ بھی نہیں چلا کہ ان میں زمبابوے والے کون ہیں اور بوٹسوانہ والے کون ہیں۔

اگر ہمسایہ ممالک میں عزت احترام کا رشتہ ہو اور ایک دوسرے کے غاصب نہ ہوں تو عوام کا اس طرح سے

بھلا ہوتا ہے۔ یورپی یونین، اکثر افریقی ممالک کے علاوہ سنگاپور، ملائشیا، تھائی لینڈ، ویت نام، کمبوڈیا سب ایک دوسرے کے مثالی ہمسائے ہیں۔ ''مگر ہنود ذہنیت! شرم تم کو مگر نہیں آتی''

ہمارا ٹرین کا سفر زمبابوے Bullawayo سے Gaborone بوٹسوانہ تک 18 گھنٹوں پر محیط تھا۔ یہ طویل وقفہ کیسے گزرا قارئین اکرام کی دلچسپی کے لیے لکھے دیتا ہوں۔

پہلے میں نے پوری ٹرین کا ایک چکر لگایا اور میجر صاحب بطور نگران کمپارٹمنٹ میں ہی رہے۔ غالباً A.C.C. First Class کے مسافر صرف ہم ہی تھے۔ ٹرین میں جتنے بھی درجے تھے ان سب میں کافی تعداد میں مسافر موجود تھے۔ تمام مسافر مقامی یعنی افریقن تھے۔ ایک تو رات اندھیری، چاند کی چاندنی نہ تھی دوسرا یہ کہ جب ٹرین کسی اسٹیشن پر رکتی تو ٹرین کی لائٹس بند ہو جاتیں۔ انتہا یہ کے تمام کے تمام مسافر اور ریلوے عملہ اندھیری رات سے زیادہ کالا۔ اس پر ٹیپ کا بند یہ کہ آپ ان کو کالا نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ لفظ ''کالا'' کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اگر کوئی بے خیالی میں یہ لفظ کہہ بھی دے تو مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ قانونی طور پر بھی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آپ کا یہ جرم تعصب (Discremenation) کے زمرے میں آتا ہے اور قابل تعزیر بھی ہے۔ میجر صاحب مجھے کہتے چیف! کالا کا لفظ تو منہ سے نکل ہی جاتا ہے (فیر ہن کی ہوئے گا) پھر اب کیا ہوگا۔ (میرے پرانے اور بے تکلف دوست مجھے چیف کہہ کر ہی پکارتے تھے کیونکہ پالیسی میکر میں ہوتا تھا) میں نے فی البدیہہ کہا کہ آپ نے کالا ضرور کہنا ہے آپ اندھیرا کہہ لیا کریں۔ دونوں کا مطلب ایک ہی ہے اور یہ لفظ اتنا پھیلا کے کئی لوگ تعصب کے جرم سے بچ گئے۔

اب میں سامان کا نگران تھا اور میجر صاحب ریکی پر گئے۔ کچھ زیادہ دیر ہوگئی مگر واپس نہ آئے۔ میں پریشان سوچوں میں غرق بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ آخر بے چینی ناقابل برداشت ہونے پر سامان کی پروا کئے بغیر تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ جیسے ہی میں اپنے ڈبے سے نکل کر دوڈبے آگے گیا تو گانے بجانے کا شور اتنا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم پڑا کہ میجر صاحب راجہ اندر بنے، کالی لڑکیوں میں گھرے، ایک بڑا سا ڈرم بہت سُر میں پیٹ رہے تھے۔ لڑکیاں اور دیگر لوگ انجوائے کر رہے تھے۔ مجھے پریشان اور غصے میں دیکھ کر ڈرم ایک طرف کیا اور میرے ساتھ اپنے ڈبے میں آگئے۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ مجھے بتا کر چلے جاتے کیونکہ آپ میری اور میں آپ کی ذمہ داری ہوں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی فیملیز کو جواب دہ ہیں۔ وہ Sorry کہتے ہوئے بولے چیف تم ٹھیک کہہ رہو مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اب ہم دونوں ہی سونے کے لیے آمادہ تھے۔ میجر صاحب نے اُوپر والی برتھ اور میں نے نیچے والی برتھ پر لیٹنے کی تیاری کی ہی تھی کہ دروازہ کھٹکا۔ میں نے دروازہ کھولا تو کنڈیکٹر گارڈ پھر نازل ہوگیا۔ میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا Boss Any Service? اب

میری قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ میں نے پورا دروازہ کھول دیا کیونکہ وہ جب بھی آتا تھا تو ایک ناگوار سی بدبو آنی شروع ہو جاتی تھی۔ اس نے شراب بھی پی ہوئی ہوتی تھی۔ میں نے اسے برتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا Please sit down۔ وہ Thanks boss کہتا ہوا بیٹھ گیا۔ میں نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ بھی نیچے آ جاؤ۔ وہ بھی جلدی سے نیچے آ گئے۔ اور مجھے کہنے لگے سخت رویہ اختیار نہ کرنا۔ ملک ان کا ہے اور وہ سرکاری ڈیوٹی پر ہے۔ ہماری کوئی سنے گا بھی نہیں۔ میں نے کہا آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اسے بہت نرم لہجے میں کہا

My friend what type of services you are rendring?

اس نے بے حد رازداری سے مجھے کہا: Do you like unfinished dimond?

یہ کہنا تھا کہ میجر صاحب نے فوراً کہا: If you have, please Show me

اس نے بڑے آرام سے اپنے کپڑوں میں چھپایا ہوا ایک Un-Cut بڑا سا ہیرا جس کا وزن ایک پاؤ سے زیادہ ہی معلوم ہوتا تھا نکال کر میجر صاحب کے ہاتھ میں دے دیا اور ساتھ میں کہا کہ رقم میں US-Dollars میں لوں گا۔ اس کے علاوہ بھی میرے پاس ڈائمنڈ ہیں۔ آپ جہاں کہیں گے میں پہنچا دونگا۔ میجر نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہیرا ان کے ہاتھ سے لے کر واپس کیا اور اسے کہا کہ آپ کی ہماری دوستی پکی۔ ہم ایک ہفتے بعد واپس آ رہے ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس معمولی سی رقم ہے۔ واپسی پر ہم تمہارے لئے ڈالرز لے کر آئیں گے۔ تم نے یہ ہیرا فروخت نہیں کرنا بلکہ ہمارا انتظار کرنا ہے۔ وہ خوشی سے بولا میں اپنے دوستوں کا انتظار کرونگا۔

میجر صاحب نے غلطی سے اس سے پوچھ لیا کہ کیا یہ ہیرا اصلی ہے۔ یہ سنتے ہی وہ جذباتی ہو گیا اور اپنا منہ پھلا کر اپنا سر دائیں بائیں تیزی سے گھماتے ہوئے بولا:

It is not artificial.The orignal one.The origanal one sir!

اور ساتھ ہی اس کے منہ کی جھاگ کی پھوار میجر صاحب کی طرف بارش کرتی گئی۔ میں نے اس کی تسلی تشفی کروا کر اس کو دروازے سے باہر کرتے ہوئے کہا کہ اب آپ نے نہیں آنا۔ ہم سونے لگے ہیں۔ صبح کو ملاقات ہوگی۔ اور دروازہ لاک کر لیا۔ میجر صاحب نے مجھے پوچھا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے کہا کہ میرا ذرا برابر بھی خیال نہیں ہے کیونکہ نہ تو یہ ہمارا Subject ہے اور نہ ہمیں اس کی پہچان ہے۔ ہم اس کی خرید و فروخت بھی نہیں کر سکتے۔ اگر یہ ہمیں مفت دے تو بھی اس کو نہ اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی پاکستان لے جا سکتے ہیں۔ یہ کسی ایجنسی کا ٹاؤٹ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے ملک میں اور کسی بھی دوسرے ملک میں کوئی غیر قانونی کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔

ہم تھک ہار کر سو گئے۔ صبح جلدی اٹھ گئے کیونکہ ہمیں زمبابوے میں بتایا گیا تھا کہ ڈاکٹر جاوا آف ملتان ہمارے لئے ناشتہ لے کر آئیں گے۔ جس اسٹیشن کا نام بتایا گیا وہ ہم بھول گئے تھے۔ سامان پیک کر کے رکھ دیا تھا۔ جو اسٹیشن آتا ہم دروازے میں کھڑے ہو جاتے۔ کچھ اسٹیشنز کے نام مجھے یاد ہیں۔ مثلاً فرانسس ٹاؤن، ملا پیا، پلا پیا، وغیرہ۔

آخر ایک اسٹیشن پر ایک نوجوان لڑکے نے پوچھا آپ کا نام ادریس آفتاب ہے؟ میں نے کہا جی آپ نے درست کہا، ڈاکٹر جاوا صاحب۔ وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ نام ان کا کچھ اور تھا جاوا ان کا فیملی نام تھا۔ ان کے ساتھ ایک اور ڈاکٹر صاحب بھی تھے۔ دونوں کا تعلق ملتان سے تھا۔ اتنے میں ٹرین کی وسل نے روانہ ہونے کا اعلان کر دیا اور ہم شکریہ ادا کرتے ہوئے ناشتہ کا ٹفن لے کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ماشا اللہ ناشتہ بہت اچھا تھا اور سب سے بڑی بات کہ پاکستانی سٹائل کا تھا۔ خوب سیر ہو کر تناول کیا۔ اس دوران کئی بار کنڈیکٹر گارڈ سے آمنا سامنا ہوا لیکن وہ نظریں چراتا ہوا ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتا۔ میں کچھ حیران سا بھی ہوا۔ جب ٹرین نے رفتار پکڑ لی تو وہ ایک لمحے کو ہمارے کمپارٹمنٹ میں آیا اور رازداری سے بولا ہر طرف surveillance کرنے والے لوگ پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں آپ سے میری کوئی شناسائی نہیں ہے۔ واپسی پر ہم Plumtree میں مل سکتے ہیں۔ میں نے اسے باہر کی طرف دھکیل کر دروازہ لاک کر لیا۔ دن کے 11 بجے بالآخر ہم گیبرون ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ مقامی لوگوں کے علاوہ ہم دونوں ہی غیر ملکی تھے۔ ڈاکٹر مکرم شیخ بہ نفس نفیس اسٹیشن پر موجود تھے۔ محبت اور چاہت سے ملے۔ خوش آمدید کہتے ہوئے ہمیں اپنی کار تک لے آئے۔ سامان رکھنے کے بعد ڈرائیو کرتے ہوئے ہمیں اپنے دولت کدہ پر لے آئے جو زیادہ دُور نہ تھا۔ انہوں نے اپنے گھر کا ایک کمرہ ہمارے لئے تیار کر رکھا تھا۔ جہاں آئندہ چند روز ہم نے ٹھہرنا تھا۔ شاور وغیرہ لینے کے بعد تازہ دم ہوئے۔ کھانا کھایا اور آرام کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اس گھر میں ڈاکٹر صاحب اپنی اہلیہ محترمہ، ایک بیٹی اور تین بیٹوں کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ گھر صاف ستھرا، سادگی اور شرافت کا مرقع تھا۔ اُس وقت ان کے سب بچے سکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ ہونہار بچے، اچھا تعلیمی ریکارڈ رکھتے تھے۔ ہنس مکھ اور سادہ طبیعت تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ محترمہ تصنع و بناوٹ سے پاک، سادہ، خدمت گزار اور شفیق خاتون تھیں ہم احتراماً ان کو آپا کہتے تھے۔

شام تک آرام کرنے کے بعد فریش ہو کر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گیبرون شہر دیکھنے گئے۔ وہ سب سے پہلے ہمیں حسن نانک کے گھر لے گئے جو ماریشس کے مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بھی ہنستے مسکراتے بہت اچھی طرح ملے اور جوس وغیرہ بھی آفر کیا۔ حسن نانک مناسب قد کاٹھ کے ایک صحت مند نوجوان تھے۔ رنگ گہرا سانولا، ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بول لیتے تھے۔ ماریشس کے تقریباً سبھی انڈین اوریجن لوگ ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے

ہیں۔ انہوں نے آسونا پینل بیٹر کے نام سے ایک گیراج کھول رکھا تھا۔ جس میں وہ ڈینٹنگ، پینٹنگ اور ایکسیڈنٹل کاروں کوری کنڈیشن کرنے کا کام کرتے تھے۔ کافی ذہین اور ماہر پیشہ ور تھے۔

ان کی اہلیہ محترمہ کا نام حوا بیگم تھا۔ مہمان نواز خاتون تھی۔ ان کی ایک پیاری سی بیٹی اور بیٹا تھے۔ دونوں سکول میں زیر تعلیم تھے۔ ہم کچھ دیر تو ان کے ہاں گپ شپ کرتے رہے پھر ڈاکٹر صاحب ہمیں افریقن مال لے گئے۔ وہاں ایک جنرل سٹور Timba Trading کے مالک اور مالکہ سے ملاقات ہوئی۔ ایوب خان اور ان کی اہلیہ محترمہ ہاجرہ بی بی اور ان کے بیٹے اس بزنس کے مالک تھے۔ وہ بوٹسوانہ کے قدیم سیٹلر تھے۔ ان کے آباؤ اجداد سورت انڈیا سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ محنت مزدوری کرتے آج بہت سے خاندان بڑے بڑے بزنسز کے مالک بن گئے تھے۔ بوٹسوانہ، ساؤتھ افریقہ، زمبابوے، کینیا اور دیگر افریقی ممالک میں ان سورت والوں کی بزنس میں اجارہ داری ہے۔

واپس آکر ہم لوگ Sitting Room میں بیٹھ کر دنیا جہاں کے بزنس پلان بناتے رہے۔ ہم دونوں To the Point بات کرتے لیکن ڈاکٹر صاحب بہت لمبی بات کرتے اور تواتر سے بولتے رہتے جس کی وجہ سے ہم بات چیت میں دلچسپی کھو بیٹھتے۔ ایک ہفتہ ہم خوب گھومے پھرے۔ گیبرون بہت بڑا شہر نہیں ہے۔ نئی نئی ترقیاتی سکیموں پر کام جاری تھا۔ بوٹسوانہ کو کویت آف افریقہ اور لیول آف افریقہ بھی کہتے ہیں کیونکہ ڈائمنڈ کی کانوں کا مالک ہے۔ آسودہ حال ہے۔ فارن ایکسچینج کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کرنسی بھی ڈالر کے مقابلے میں مضبوط ہے۔ جب تک ڈائمنڈ کی کانیں دریافت نہیں ہوئی تھیں۔ یہ ملک بچوانا لینڈ کے نام سے ساؤتھ افریقہ کی کالونی تھا۔ آزادی کے بعد کانیں دریافت ہوگئیں تو ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہوگیا اور دنیا کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ان کے اپنے پاس اس وقت سوائے ہیرے کی کانوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ ہر چیز ساؤتھ افریقہ سے آتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ ہوا بھی ساؤتھ افریقہ سے آرہی ہے۔ البتہ چھوٹی موٹی انڈسٹری لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ گیبرون شہر صاف ستھرا تھا۔ لوگ بھی بااخلاق تھے۔ کینیا اور نائجیریا کی طرح ہر شخص ٹھگ نہیں تھا۔ اس وقت مسٹر میسرے کی حکومت تھی جو بذات خود ایک شریف انسان تھا اور ملک کی ترقی کی خاطر ایسے غیر ملکیوں کو ویلکم کیا جاتا جو بوٹسوانہ کی ترقی میں معاون ہو سکتے تھے۔ شہر کے درمیان ایک خوبصورت بلڈنگ تھی جس کو Dimond Sorting Building کہا جاتا تھا۔ جیسے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر ہے آپ جس شاہراہ سے بھی آئیں۔ آپ اسی بلڈنگ کے پاس آکر رکیں گے۔ میرا ذاتی تجربہ تو نہیں ہے لیکن ڈاکٹر صاحب گفتگو فرماتے تو یہ حوالہ ضرور دیتے کہ پورے ملک سے کسی بھی مقامی یا غیر ملکی کو کسی بھی صورت میں ڈائمنڈ ملتا ہے تو وہ اس کو اس بلڈنگ کی Reception پر لا کر ڈکلیر کرے گا۔ اس کی قیمت کا تخمینہ لگایا جائے گا اور 50% ادائیگی اس شخص کو اسی وقت کر دی جائے گی۔ اگر کسی کو ڈائمنڈ مل جائے

اور وہ اس کو ڈکلیر نہ کرے تو پھر قانون حرکت میں آتا ہے۔ یہ ایک قابل تعزیر جرم ہے اور ہر حالت میں ڈائمنڈ گورنمنٹ کی پراپرٹی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی کاروں میں سے ایک کار ہمیں دے دیتے۔ جس پر ہم سارا شہر گھومتے رہتے۔ اب راستوں سے بھی کچھ جان پہچان ہوگئی تھی۔ ٹریفک پاکستان کی طرح Keep to Left تھی اور قانون کے مطابق آپ اپنے ملک کے ڈرائیونگ لائسنس پر چھ ہفتے تک ڈرائیونگ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس ورک پرمٹ اور Residence Permit ہے تو کسی بھی پوسٹ آفس میں جا کر اپنا ملکی لائسنس دکھا کر مقامی ڈرائیونگ لائسنس حاصل کر سکتے ہیں جو تمام عمر کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ ہر سال اس کی تجدید نہیں کرانی پڑتی۔

کاروباری بحث مباحثہ روز ہوتا تھا بڑے بڑے پروگرام بنتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ لوگ ایک چکر ساؤتھ افریقہ کا لگا کر بزنس Opportunity دیکھ لیں۔ ڈائریکٹر جنرل امیگریشن اینڈ پاسپورٹ Pretoria (ساؤتھ افریقہ) کو پاسپورٹ اور ویزا کی درخواستیں فیکس کر دی گئیں۔ تین دن بعد بذریعہ فیکس اطلاع آ گئی کہ تلوک ونگ بارڈر پر آپ کے ویزے موجود ہیں آپ جب چاہیں Visa Valdity تک ساؤتھ افریقہ آ سکتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پاسپورٹس پر اس وقت لکھا ہوا ہوتا تھا

Valid for all World except India, Israel and SouthAfrica.

ڈاکٹر صاحب نے اپنی بلو برڈ ٹویوٹا گاڑی ہمیں دے دی اور کچھ ہدایات برائے سفر بھی کیں۔ دوسرے روز عیدالضحیٰ تھی۔ ہم صبح تیار ہو کر سفر پر روانہ ہوگئے۔ بارڈر 8 بجے صبح سے رات 10 بجے تک کھلا ہوتا ہے۔ ہم 7:50 پر بارڈر پر موجود تھے اور انتظار میں تھے کہ جیسے ہی آفس کی کھڑکی کھلے تو ویزوں کا پوچھیں۔ ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے جس میں ڈاکٹر مکرم صاحب کا ذکر بار بار آ رہا تھا۔ دفتر کی ابھی صفائی ہو رہی تھی۔ اسی اثنا میں یونیفارم میں ملبوس ایک کالا، موٹا اور لمبا آدمی آیا اور کہنے لگا کیا آپ ڈاکٹر ہیں۔ میں کچھ سمجھا نہیں تھا میں نے سر کے اشارے سے پوچھنا چاہا کہ کیا بات ہے وہ سمجھا میں نے ڈاکٹر ہونے کا اقرار کیا ہے۔ وہ ادب سے بولا کہ آپ میرے پاس دفتر میں تشریف لائیں۔

ہم دونوں اس کے ساتھ اس کے دفتر میں داخل ہوگئے۔ میں نے میجر صاحب سے پنجابی میں کہا کہ آپ نے خاموش رہنا ہے، میں اس سے بات چیت کرونگا۔ دفتر میں اس نے ہمارے لئے کرسیاں کھینچ کر اپنے میز کے پاس رکھیں اور بڑی تکلیف سے بولا کے مجھے weakness بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ تمام جسم میں درد ہے۔ میں ڈاکٹروں کے انداز میں اس کی بات غور سے سنتا رہا کیونکہ میں افریقن لوگوں کے مشاغل اور عادات سے اب کافی حد تک واقف ہوگیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔ پسلیاں دبا کر دیکھیں اور پوچھا مسٹر آپکا نام کیا ہے۔ وہ

بولا سر میرا نام سیمول ہے۔ میں نے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہو۔ اس نے بتایا کہ وہ ویزا آفیسر ہے۔ میں بولا مائی ڈیئر مسٹر سیمول آپ نے شراب بہت پی ہے اور وہ بھی تھرڈ کلاس شراب۔ اگر آپ اسی طرح پیتے رہے تو آپ کی روانگی ہو جائے گی۔ آپ کے بیوی بچے تو آپ کے بغیر لاوارث ہونگے ہی لیکن آپ کی گرل فرینڈز کا کیا بنے گا جن کو آپ زیادہ سے زیادہ ٹائم دے رہے ہو۔ میرا تیر ایسا نشانے پر بیٹھا کہ وہ پھڑک اٹھا اور بولا: میں نے جوہانسبرگ کے ایک بہت مشہور اور ماہر فزیشن ڈاکٹر خان کو کنسلٹ کیا تھا۔ انہوں نے کئی قسم کے کلینکل ٹیسٹ کروائے اور جو کچھ آپ نے کہا ہے یہی Advise انہوں نے کی تھی۔ لیکن آپ نے تو مجھے صرف ہاتھ لگا کر ہی بتا دیا، انہوں نے تین دن کے بعد بتایا تھا۔ پھر وہ کچھ جذباتی ہو گیا اور بولا میری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسا ڈاکٹر مجھے مل گیا ہے۔

میں نے اس سے ہمارے ویزوں کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کاغذوں کا ایک پلندہ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور بولا کہ دیکھیں اس میں آپ کے ویزے ہیں۔ نہیں تو میں آپ کو ابھی ویزا گرانٹ کر دونگا۔ آپ جیسے بڑے ڈاکٹر کو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ میں نے اور میجر صاحب نے اس کاغذوں کے پلندے کی تلاشی لینی شروع کی تو ہم دونوں کے ویزے مل گئے۔ وہ ہم نے مسٹر سیمول کو دے دیے۔ اس نے ہمارے پاسپورٹ دیکھے اور ہم سے پوچھا کہ ویزے آپ کے پاسپورٹس پر لگا دوں یا الگ کاغذ پر۔ میں نے اور میجر صاحب نے بیک زبان کہا No! We need loose Visas۔ اس نے ایک کاغذ اٹھایا، اس پر ویزا ریفرنس نمبر لکھا، اپنے دستخط کئے، مہر اور سیل ثبت کی اور ہمیں Welcome to South Africa کہتے ہوئے تمام کاغذ اور پاسپورٹس ہمارے حوالے کر دیے۔ جب ہم نے کاغذ پر نظر ڈالی تو ایک ماہ کا Stay لکھا ہوا تھا۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بولا آپ نے واپس کب آنا ہے؟ ہم نے اندازاً کہا Any Time After One Week وہ خوشی سے بولا میں بہت کمزور ہو گیا ہوں آتے ہوئے میرے لئے ٹانک لیتے آنا۔ میں نے کہا تم فکر نہ کرو میں ضرور لے کر آؤنگا۔ وہ ہمیں ہماری کار تک چھوڑنے آیا اور جب تک ہم نے بارڈر کراس نہ کر لیا وہ کھڑا ہاتھ ہلاتا رہا۔ ہم ساؤتھ افریقہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی سڑکیں، ٹریفک سائن سب زبردست تھے۔ پہلا ٹاؤن Zeerust (زیرسٹ) 110 KM کے بعد آیا۔

بوٹسوانہ اور ساؤتھ افریقہ کے درمیان 1970 Kilometers لمبا بارڈر ہے جس کے ساتھ دریائے Nossob، دریائے Molopo، دریائے Marico اور دریائے Limpopo بہتے ہیں۔

بارڈر کراس کرنے کے لئے سرکاری طور پر پوائنٹ بنائے گئے ہیں جن کو مختلف نام دے کر گیٹ بنا دیے گئے ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

Important Border Crossing.

1) Twee Rivieren
2) Middelputs
3) Mc Carthy's Rest
4) Makopong
5) Bray.
6) Rematlabama.
7) Pioneer Gate.
8) Remaotswa.
9) Tlokweng.
10) Sikwane.
11) Parr's Halt.
12) Martin's Drift.
13) Skil Padshek.
14) Swartkopfontein.
15) kopfontein.
16) Derdepoort.
17) Stockpoort.
18) Groblersbrug.

ہم نے Tlokweng گیٹ سے بذریعہ کار بارڈر کراس کیا جو بوٹسوانہ کے دارالخلافہ گیبرون سے نزدیک ترین تھا۔ Tlokweng گیٹ سے پہلا ساؤتھ افریقن ٹاؤن Zeerust تھا جو 110 کلومیٹر پر تھا۔ آپس میں باتیں کرتے بڑے آرام سے ہم ڈیڑھ گھنٹے میں Zeerust پہنچ گئے۔

Zeerust ایک ٹاؤن کا درجہ رکھتا ہے۔ صاف ستھرا اور منصوبے کے تحت بسایا ہوا ٹاؤن ہے۔ ہم محسوس کر رہے تھے جیسے ہم کسی یورپین شہر میں آ گئے ہیں۔ میجر صاحب نے کہا کار میں ایندھن بھروانا ہے اور ہوا کا پریشر بھی چیک کرانا ہے۔ یہ پرانے ماڈل کی کار ہے اس لئے احتیاط ضروری ہے۔ ہم شہر کی مین روڈ پر تھے۔ جو پہلا پٹرول

پمپ آیا اس پر رک گئے۔کار کی تمام ضروریات پوری کی گئیں۔میجر صاحب کی نظر پٹرول پمپ سے ملحقہ ٹک شاپ پر جا ٹھہری تو وہ فوراً چائے کی طلب مٹانے کے لیے ٹک شاپ میں داخل ہو گئے۔میں بھی جیسے ہی ٹک شاپ میں داخل ہوا تو میری نظر سامنے دیوار پر لگے ہوئے ایک قطعے پر ٹھہر گئی جس پر لکھا تھا۔

"اَلصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ"

اس کے عین نیچے مولانا نورانی مرحوم کی تصویر لگی ہوئی تھی۔میں نے میجر سے کہا کہ یہ بزنس کسی مسلمان کا ہے۔وہ بولے تمہیں کیسے اندازہ ہوا۔تو میں نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ورد شروع کر دیا۔میجر صاحب نے روسٹیڈ فِش بسکٹ،کوک کے ٹن اور کچھ ڈرائی فروٹ پسند کیے۔اسی اثنا میں کاؤنٹر پر بیٹھے محمد بھائی سے السلام علیکم کے بعد میں مکمل تعارف حاصل کر کے اپنا اور میجر صاحب کا تعارف کرا چکا تھا۔جب میجر صاحب دونوں ہاتھوں میں اپنی پسند کا سامان لے کر کاؤنٹر پر آئے تو میں نے محمد بھائی کو بل بنانے کے لیے کہا۔وہ ہنسنے لگے اور بولے آپ کو معلوم ہے کہ آج کیا تہوار ہے؟ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو مجھے یاد آیا کے آج تو عیدالاضحیٰ کا دن ہے۔محمد بھائی بولے میں اس مقدس دن کے موقع پر اپنے مسلمان بھائیوں سے کھانے پینے کی چیزوں کا بل کیسے لے سکتا ہوں۔میں نے انہیں کہا کہ آپ ڈرنکس کا بل چاہے نہ لیں۔باقی تمام چیزیں من پسند شاپنگ کے زمرے میں آتی ہیں۔اس کا بل آپ ضرور لیں۔محمد بھائی بولے نہ تو میں بل لونگا اور نہ ہی ابھی آپ جا سکتے ہیں بلکہ انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کو فون کر کے ہمارے بارے میں تفصیل سے بتایا۔محمد بھائی نے جو افریقن زبان میں بات کر رہے تھے بعد میں ہمیں انگلش اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا کہ ان کی اہلیہ محترمہ فرما رہی ہیں کہ یہ ہمارے پاکستانی مسلمان بھائی ہیں انہیں گھر لے کر آؤ۔ہم تمام گھر والے اور دیگر مسلم کمیونٹی ان سے مل کر ان کی زیارت کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے من پسند خریداری کا بل لینے سے انکار کر دیا۔محمد بھائی سے دیر تک تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ان سے بات چیت کر کے ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ بھلے مانس انسان ہیں۔

ابھی بات چیت جاری تھی کہ محمد بھائی کی اہلیہ محترمہ بھی تشریف لے آئیں۔سکارف اور ایک مکمل لباس زیب تن کئے ہوئے،اپنی کار خود ڈرائیو کرتی ہوئی،مدبرانہ انداز،مسکراتا چہرہ۔دکان میں داخل ہوتے ہی السلام علیکم کہا۔نفیس اور پڑھی لکھی خاتون کی گفتگو بھی مدبرانہ اور شفقت آمیز تھی۔دکان انہوں نے اپنے ملازم کے حوالے کی۔اس کو تمام ہدایت افریقن زبان میں دیتے ہوئے ہم دونوں کو Come,Follow me کہتی ہوئی اپنی گاڑی میں جا بیٹھیں۔محمد بھائی بھی اپنی ڈھیلی پینٹ کو اوپر کھینچتے ہوئے بھاگے بھاگے آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔اس طرح ہم چند منٹوں میں محمد بھائی کے گھر بیٹھے تھے۔یہ ایک خوبصورت گھر تھا۔پوری بستی ہی مسلم گھرانوں کی تھی اور سب مختلف کاروبار سے وابستہ بزنس کمیونٹی تھی۔یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کے رشتے دار تھے۔مرد،خواتین

اور بچے آہستہ آہستہ جمع ہوتے گئے اور ایک رش سا لگ گیا۔ اکثر مردوں کے نام محمد تھے۔ کئی عورتوں اور لڑکیوں کا نام فاطمہ تھا۔ زلیخا بھی تھیں۔ یہ ان لوگوں کی اسلام ازم سے محبت کی وجہ سے تھا۔ تمام بات چیت، سوال جواب صرف اور صرف ضابطۂ اسلام اور افکار کے بارے میں تھے۔ ہم دونوں نہ تو عالم تھے اور نہ ہی اسلامی سکالرز پھر بھی ان کی سادگی اور اسلام کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کی لگن اور جستجو دیکھ کر اپنے ناقص علم وفہم کے مطابق ان کے سوالات کے جوابات دیتے رہے۔ جن کو وہ بے حد توجہ اور ذوق وشوق سے سنتے رہے۔ ایک موقع پر ایک خاتون نے جہیز کے بارے میں سوال کیا کہ اکثر لڑکے والوں کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ لڑکے کو بزنس کروائیں یا بزنس کو بڑھاوا دینے کے لیے مدد فراہم کی جائے اور دیگر مطالبات بھی کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم لوگ صرف مسلمانوں سے ہی رشتے ناتے جوڑتے ہیں۔ اچھے لڑکوں کی تعداد میں کمی بھی آڑے آتی ہے جبکہ لڑکیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے اس لئے ماں باپ اکثر بلیک میل ہوتے رہتے ہیں اور اکثر و بیشتر شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔ جہیز کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالیں۔

میجر صاحب نے مجھے کہا آپ جواب دینگے یا میں کچھ عرض کروں۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ مجھے کچھ عرض کرنے دیں۔ وہ بولے بسم اللہ۔

میں نے سب حاضرین سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ قرآن مجید کے پارہ 20، سورۃ القصص کی آیت 85/84 کے مطابق قرآن مجید کے ہر حکم کو تسلیم کرنا اور اس کی پیروی کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خمر اور میسر حرام ہے۔ خُمر تو نشہ آور چیزوں کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور میسر Easy Money کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جس میں جوئے سے حاصل کی گئی رقم یا دیگر اشیا، جہیز سے حاصل کی گئی دولت اور ہر قسم کی مراعات، سٹے، ریس، سٹاک مارکیٹس سے حاصل کی گئی یا جیتی گئی رقوم اور ہر طرح سے بغیر محنت سے حاصل کی گئی دولت جس کو عرف عام میں Easy Money کہتے ہیں۔ 100% حرام ہے۔ یاد رہے یہ قرآن مجید کا فرمان ہے جس کو نہ صرف ماننا بلکہ اس پر عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

تمام خواتین بہت خوش ہوئیں۔ پُر تکلف کھانا پیش کیا گیا۔ دیگر فیملیز کی طرف سے بھی دعوت دی گئی لیکن ہمارے پاس وقت صرف چند دن کا تھا۔ ہم نے واپس وطن عزیز پاکستان جانا تھا۔ اس لئے بہت ہی مخلصانہ، پُر جوش اور پُر خلوص دعوتیں ہم قبول نہ کر سکے۔ مسلمان بہن بھائیوں کی محبت ہماری زندگی کا سرمایۂ افتخار ہے اور انشاءاللہ تاحیات رہے گا۔ جب دیگر تمام لوگ چلے گئے اور صرف ہمارے میزبان رہ گئے تو باہم مشورے سے ہم نے اپنی کار سے کچھ لیڈیز سوٹ اور ہاتھ سے کی گئی ایمبرائڈری والے خوبصورت دوپٹے پیش کئے۔ یہ ان کے لیے بہت نایاب اور حیران کن چیزیں تھیں۔ افریقہ میں پاکستانی شلوار قمیض کو پنجابیز اور دوپٹے کو سکارف کہتے ہیں۔

تھوڑی سی پس وپیش اور تکلف کے بعد ہمارے تحائف قبول کئے گئے۔تحائف میں کچھ سنگاپوری جیولری بھی شامل تھی۔ یہ سب آرٹیکلز ہمارے Export Samples تھے۔دوران سفر یہ samples میں ہمیشہ وافر مقدار میں اپنے پاس رکھتا تھا۔سب خواتین وحضرات نے بہت دعاؤں کے ساتھ ہمیں رخصت کیا اور دوبارہ آنے کا وعدہ بھی لیا جو آج تک وفا نہ ہوسکا۔میزبانوں کی محبت وچاہت اور مسلمانیت ہر قسم کی تصنع وبناوٹ سے مبرا تھی۔وہاں اکثر خواتین نے اپنی اپنی بیٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے ناموں کا مطلب جاننا چاہا۔میری یادداشت کے مطابق جن ناموں کا مطلب میں بتاسکا وہ کچھ اس طرح تھے۔

فاطمہ۔ پرہیز کرنے والی یا بُری عادت چھوڑنے والی (بہت سی صحابیات کا نام)

عائشہ۔ خوشگوار زندگی گزارنے والی (اُم المومنین اور کئی صحابیات کا نام)

طاہرہ۔ پاک

سکینہ۔ پھرتیلی اور خوش مزاج (صحابیات کا نام)

خدیجہ۔ خاطر تواضع وعاجزی کرنے والی۔(اُم المومنین صحابیات کا نام)

حسن النساء۔ عورتوں کا حسن وجمال

حوا۔ گلابی یا سرخی مائل سیاہ (خوبصورتی) (اُم البشر اور کئی صحابیات کا نام)

سعیدہ۔ قابل تعریف۔بہت تعریف کئے جانے والی

جمیلہ۔ حسین خوب رُو (کئی صحابیات کا نام)

بدرالنساء۔ عورتوں کا کامل چاند

وہاں سے روانہ ہوکر ہم جلد ہی ہائی وے پر آگئے اور اپنی منزل جوہانسبرگ کی طرف بڑھنے لگے۔ہم جانتے تھے کہ ہم ایک ایسے ملک میں ہیں جس کو پاکستان تسلیم ہی نہیں کرتا اور ہمارے پاکستانی پاسپورٹ پر اس وقت صاف صاف لکھا ہوا تھا کہ یہ پاسپورٹ ساؤتھ افریقہ اور اسرائیل کے لیے کارآمد نہیں ہے۔ہمیں اجنبی راستوں سے گزر کر رات کو کسی وقت جوہانسبرگ پہنچنا تھا۔ہم آپس میں باتیں کرتے ہوئے چلتے رہے۔رات کے تقریباً آٹھ بجے کا ٹائم ہوگا کے کسی شہر کے مضافات نظر آنے شروع ہوئے۔خوبصورت شہر تھا۔روشنی ہی روشنی۔سڑک بالکل سیدھی۔دیگر کاریں بھی اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں اور ہم بھی اسی ہجوم میں گم ہوکر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔سڑک ایک طویل پٹی کی طرح بغیر کسی موڑ یا رکاوٹ کے رن وے کی مانند تھی۔شہر کی بے بہا روشنی کو ہم پیچھے چھوڑتے ہوئے پھر اندھیر گھپ میں آگئے۔گوکہ ہماری کار کی روشنی اندھیرے میں ہمیں دیدے پھاڑ کر دیکھنے میں مدد فراہم کررہی تھی۔لیکن جب کار کے دائیں بائیں سے دیکھنے کی کوشش کرتے تو نہ صرف ناکامی

ہوتی بلکہ گمان گزرتا کہ ہم کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے۔کافی سفر کرنے کے بعد روشنی کا ایک سمندر نظر آیا۔اتنی زیادہ روشنی کے بیان سے باہر۔میجر صاحب بھی پریشانی سے باہر نکلے اور بولے چیف کیا خیال ہے کیا ہم جوہانسبرگ پہنچ گئے ہیں؟ میں نے کافی سوچ کر جواب دیا کہ نہیں میرا خیال ہے کہ ہم راستہ بھول چکے ہیں۔اب کیا کریں؟ میجر صاحب کا دوسرا سوال تھا۔ میں بولا جس طرف سب کاریں جا رہی ہیں اسی طرف چلو اور کار کو بہت ساری کاروں کے درمیان رکھوتا کہ ہم بھی اسی قافلے کا حصہ نظر آئیں۔

اب ہم روشنی کے سمندر کے عین درمیان پہنچ گئے تھے۔ہر کار پارکنگ میں جا کر پارک ہو جاتی اور لوگ تیز تیز چلتے ہوئے ایک طرف جاتے نظر آتے۔ہم نے کار پارک کی اور نیچے اُتر آئے۔جس طرف بھی ہماری نظر جاتی کاریں ہی کاریں نظر آئیں۔اتنا بڑا کار پارک نہ ہم نے پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ آج تک دوبارہ دیکھا ہے۔جدھر لوگ جا رہے تھے ہم بھی چل پڑے۔ایک اسٹیشن نما جگہ بنی ہوئی تھی۔لوگ انتظار میں کھڑے تھے ہم بھی ان لوگوں میں جا کھڑے ہوئے۔ چند سیکنڈ میں ریلوے بوگی کی طرح ایک ڈبہ لشکارے مارتا ہوا اُوپر سے نیچے آیا۔غالباً ہائیڈرالک پر کھڑا تھا جس کو بہ وقت ضرورت اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کیا جا سکتا تھا۔لوگ جلدی جلدی اس پر سوار ہو گئے۔ہم بھی اسی تقلید میں دیگر لوگوں کے ساتھ اس میں سوار ہو گئے۔ڈبہ سیدھا پہلے اوپر اٹھا۔اپنی اونچائی حاصل کرنے کے بعد اوپر کے اسٹیشن سے connect ہو گیا اور پھر میٹرو ٹرین کی طرح بھاگنا شروع کر دیا۔ چند سیکنڈ کے بعد ہی وہ اپنے اسٹیشن پر رک گیا۔

لوگ اتر کر ادھر اُدھر جانے لگے۔ہم دونوں بھی لوگوں کے ساتھ ساتھ ایک عمارت کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔اندر کی چکا چوند دیدنی تھی۔اگر سوئی بھی زمین پر گر جائے تو صاف نظر آ جاتی۔ جوا خانے، تھیٹر، شراب خانے، نائٹ کلب، بینک، شاپنگ سینٹر، دنیا کے قدیم ترین بزنس کی اپنی ٹانگوں پر چلتی پھرتی دکانیں جو ہر رنگ و نسل کی قاتل حسینائیں تھیں اور اپنے Lethal Moisture Weapon سے مزین تھیں۔

ہم دونوں بہت صبر و تحمل اور بھول پن سے گھومتے رہے۔میجر صاحب نے کہا کچھ ڈالر مقامی کرنسی میں کیش کروا لیتے ہیں جس کا نام Rand تھا۔ہم بینک کے منی ایکسچینج کاؤنٹر پر کھڑی حسینہ کے حضور حاضر ہوئے اور ہیلو ہائے کرنے کے بعد ریٹ پوچھا۔جو ریٹ بتایا گیا وہ اوپن مارکیٹ سے بہت کم تھا۔ہم آپس میں ان کی سمارٹ نیس کی بابت بات کر رہے تھے۔بینک حسینہ قیافہ شناسی سے سمجھ گئی کہ ہم مارکیٹ ریٹ سے واقف ہیں۔وہ ادائے دلربائی سے بولی کہ میں آپ کو اوپن مارکیٹ کا ریٹ دے سکتی ہوں مگر یہ ڈالر میں آپ سے اپنی ذاتی ضرورت کے لیے خریدنا چاہتی ہوں جس کی آپ کو میں رسید نہیں دے سکتی کیونکہ یہ غیر سرکاری لین دین ہوگا۔میجر صاحب بولے All Right مجھے منظور ہے۔اس بات چیت کے دوران اس سفید لباس میں ملبوس لڑکی نے اپنے تمام جسمانی

زاویوں کا بھرپور استعمال کیا۔ میری نظر اِدھر اُدھر نہ جا سکی۔ میں نے سامنے دیکھا تو دیوار پر یونیفارم میں ملبوس ایک افریقن شخص کی تصویر لگی ہوئی۔ اس کی بائیں جانب تلوار لگی ہوئی تھی اور داہنا ہاتھ اس کے دستے پر تھا۔ آنکھیں جاہ وجلال سے بھرپور تھیں۔ میں سوچتا رہا کہ یہ ساؤتھ افریقہ کا صدر نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تو ایک سفید چمڑی والا شخص ہے راستہ بھول جانے والا شک ذہن میں ابھی تک مقیم تھا۔ میں نے میجر صاحب کو کہنی ماری اور اردو میں کہا کہ سامنے دیوار پر لٹکی تصویر کو دیکھو۔ میجر صاحب بھی مجھ سے متفق تھے۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس لڑکی سے پوچھ ہی لیا کہ یہ تصویر کس کی ہے؟ وہ بولی یہ ہمارے King ہیں۔

میں نے بے صبری سے پوچھا کہ یہ کس سٹیٹ کے King ہیں؟ وہ حیرانی سے بولی Bophuthatswana اور ایک کلینڈر پر ہمیں اس کا جھنڈا دکھانے لگی جو نیلے رنگ کا تھا اور پیلے رنگ کا ایک خط اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوا دکھایا گیا تھا۔ بائیں طرف ایک مونوگرام بھی بنا ہوا تھا جس پر ایک غصے سے بھرپور شیر کا چہرہ دکھایا گیا تھا۔ یہ ملک آج بھی۔ Republic of Bophuthatswana کہلاتا ہے۔ اس کا پرانا نام Bantustan تھا۔ Apartheid (نسلی تعصب) 1977ء کے دور میں اس کو ایک آزاد ملک قرار دیا گیا۔ ساؤتھ افریقہ کے علاوہ پوری دنیا نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اس کا دارالخلافہ Mmobatho City ہے۔ کرنسی South African Rand ہے۔ رقبہ تقریباً 44000km ، ڈائلنگ کوڈ 27 ہے۔ ہمیں اس بینکر لڑکی جوزفائین سے کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ اس کے مطابق ساؤتھ افریقہ ویزا ہولڈر نہ صرف Bophuthatswana کے لیے کارآمد ہے بلکہ Transkei، Ciskei، Gazankulce، Qwaqwa، Leboecea، Venda، Leboulo، Kwandebele (اور بھی نام اس نے بتائے جو آج 32 سال گزر جانے کے بعد ذہن میں نہیں آ رہے) کے لیے کارآمد ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ساؤتھ افریقہ کو غصب کرنے والی قوم نے بھولے بھولے افریقن قبائل کو غلام بنانے، ان پر حکومت کرنے، ان کے سونے، ہیرے اور دیگر قیمتی ترین وسائل کو ہڑپ کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے یونٹ بنا کر مقامی یا صوبائی سطح پر نام نہاد آزادی دیکر، ان کی حکومتیں بنا کر، کٹھ پتلی حکمران عوام کے سر پر مسلط کر دیے اور خود بڑے آرام سے اتنے بڑے ملک کے مالک بن کر لوٹ مار، قتل وغارت کا بازار گرم رکھا۔ دراصل یہ سب ممالک جن کو برائے نام ممالک کا صرف نام دیا گیا تھا، ساؤتھ افریقہ کی کالونی تھے۔ جب یہ بات ہمیں سمجھ آ گئی تو ہماری جان میں جان آئی۔ ہم دونوں ٹکٹ لے کر تھیٹر میں جا گھسے کیونکہ چل چل کر بہت تھک چکے تھے۔ تھیٹر کیا تھا۔ ایک الگ ہی دنیا تھی۔ جہاں تک ہماری آنکھیں دیکھ سکتی تھی ہمیں کرسیاں ہی کرسیاں اور اس پر بیٹھے خواتین وحضرات نظر آ رہے تھے۔ کرسیوں کی سیٹنگ کمال کی تھی۔ جس کرسی پر مرضی آپ تشریف رکھیں آپ محسوس کریں گے کہ Stage کے نزدیک ترین آپ ہی ہیں۔ کمال یہ تھا کہ تھیٹر کا ہر سین زمین کے اندر سے برآمد

ہوتا اور مکمل ہونے کے بعد واپس انڈر گراؤنڈ ہو جاتا اور دوسرا سین زمین سے باہر آ جاتا۔ اس تھیٹر کو اور اس کے ڈرامے کو آپ ترقی یافتہ، فحاشی یافتہ، نیچرل ڈریس یافتہ یا شیطان کی آکٹوپس کی طرح پھیلائی ہوئی شیطانیت کی گہرائی کہہ لیں جس کی پستی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں 20/25 منٹ ہی برداشت کر سکا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔ تھکاوٹ سے میرا برا حال تھا۔ مجھے نہ جوا کھیلنا تھا نہ شراب پینی تھی اور نہ ہی شاپنگ کرنی تھی۔ یہ چکا چوند میرے لئے نئی نہ تھی۔ ملکوں ملکوں گھوم چکا تھا۔ سفید چمڑی سے ہرگز متاثر نہ تھا۔ اس لئے تمام دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ میں جا کر اپنی کار کی بیک سیٹ پر لیٹ کر سونے ہی لگا تھا کہ ایک میم صاحبہ کہیں سے آئیں اور کار کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نکل کر باہر آ گیا۔ اس سے پیشتر کے میں اس میم صاحبہ سے کچھ پوچھتا، میجر صاحب ہانپتے کانپتے تشریف لے آئے۔ میں نے پوچھا خیریت ہے بولے تمہیں تھیٹر کی سیٹ پر نہ پا کر بہت فکر مند ہوا۔ پھر سوچا کے حسب سابق اور حسب عادت تم مجھے چھوڑ کر اکیلے ہی نہ چلے جاؤ اس لئے بھاگم بھاگ تم تک پہنچا ہوں۔ پھر میم کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔ میں نے میم کو خاطب کرتے ہوئے کہا آپ فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ وہ بولی کہ میرے بوائے فرینڈ نے بہت زیادہ شراب پی لی تھی۔ ہماری آپس میں لڑائی ہو گئی اور وہ مجھے چھوڑ کر میرا پرس بھی ساتھ لے کر چلا گیا ہے۔ آپ لوگ Rustenburg کی طرف جا رہے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لے لیں۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔ میجر نے میری طرف دیکھا میں نے کہا لے لیتے ہیں راستہ سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ ہمیں پتہ چلا کے راستہ بھول کر جو سڑک ہم نے اختیار کی وہ Rustenburg شہر کے لیے تھی اور جو شہر ہم نے راستے میں چھوڑا وہ Rustenburg تھا۔ روشنی کے سمندر کی وجہ سے جہاں ہم پہنچے وہ "Suncity" تھا۔ دنیا کا مشہور ترین ''جوا خانہ اور خرافات خانہ''

اب ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ راستہ میم صاحبہ بتاتی گئی اور ہم چلتے گئے۔ ایک شہر میں داخل ہونے سے پہلے بڑا سا گیٹ آیا جس پر لکھا تھا "Welcome to South Africa"۔ اس جگہ سے ہم نے بارڈر کراس کیا تھا۔ اب ہم Rustenburg میں داخل ہو رہے تھے۔ خاتون نے بتایا کہ یہ گوروں کا شہر ہے ہے۔ پتہ نہیں آپ Non-White ہو کر اس شہر میں کیونکر داخل ہوئے۔ حالانکہ ہائی وے کی entrance پر نوٹ لگا ہوا ہے۔ وہ بولی آپ لوگ اجنبی ہونے کے ساتھ ساتھ شریف اور کوآپریٹو بھی ہیں۔ میں نے آپ کی کار کا دروازہ بوٹسوانہ کا نمبر دیکھ کر کھٹکھٹایا تھا۔ اس نے ہمیں شارٹ کٹ راستہ سمجھایا جو سیدھا ہائی وے کی طرف جاتا تھا اور خود مین روڈ پر ہی اتر گئی۔ Good Bye کہتے ہوئے بولی دن کا اجالا پھیلنے ہی والا ہے اس سے پہلے آپ ہائی وے کو Join کر لیں اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ہم اس کے بتائے ہوئے راستے پر کار بھگاتے رہے اور جلد ہی ہائی وے پر پہنچ کر سکھ کا سانس لیا۔ اب ہم جوہانسبرگ کی طرف بڑھنے لگے۔ اب تک کار کے میٹر کے مطابق ہم گیبرون سے سن سٹی تک

318 کلومیٹر سفر کر چکے تھے۔سڑک پر لگے ہوئے Mile-Stone کے مطابق 205 کلومیٹر سفر ابھی باقی تھا۔تاؤ سورج اپنے چلمن سے کبھی کبھی جھانک لیتے اور جلوہ افروز ہونے کا اعلان کر کے پھر بادلوں کی چلمن میں چھپ جاتے۔آخر پروگرام رب تعالیٰ کے مطابق تاؤ سورج کو اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہونا ہی پڑا۔ یہ ایک روشن صبح کا آغاز تھا۔چھوٹے ٹاؤن،گیس اسٹیشن جن کو ہم پٹرول پمپ کہتے ہیں اور لبِ سڑک کہیں کہیں ٹک شاپس دیکھنے میں آئیں۔ان بزنس کے مالک یہودی یا مسلمان تھے۔وائٹ لوگ بھی خال خال تھے۔کالے یعنی کہ مقامی افریقن ملازم تھے جو صرف yes Master کہتے تھے۔اتنے لمبے سفر میں کسی بھی کالے کو باعزت کام یا بزنس کرتے نہیں دیکھا۔Mile-Stone کے مطابق Johannesburg جب 85km رہ گیا تو اس سے پہلے Magaliesburg آیا۔یہاں ہم ایک یہودی کی دکان پر رکے جو لب سڑک ہی تھی۔میجر صاحب نے وہاں سے ڈرنکس اور بسکٹ خریدے۔ڈرنکس تو ہم پی گئے بسکٹ نہ کھا سکے کیونکہ ان میں سے بُری Smell آ رہی تھی۔یا پرانے تھے یا حرام جانور کی چربی سے بنائے گئے تھے۔ہم بمشکل ہاف کلومیٹر ہی گئے تھے کہ اونچائی کی طرف جاتی سڑک کے عین درمیان گاڑی گرم ہو کر Boil ہونے لگی۔ایک طرف گاڑی کھڑی کر کے نیچے اترے۔گاڑی چیک کی تو ریڈی ایٹر پانی سے خالی تھا۔واٹر باڈی لیک ہونے سے سارا پانی ضائع ہو گیا تھا۔دھکا لگا کر گاڑی کو واپس کیا۔ اب ہم اونچائی سے نیچے کی طرف جا رہے تھے اس لئے جلد ہی یہودی کی ٹک شاپ پر پہنچ گئے۔وہاں سے پانی لے کر ریڈی ایٹر میں ڈالا مگر وہ فوراً لیک ہو کر سڑک پر پھیل گیا۔یہودی سے کار مکینک کا پوچھا تو اس نے کہا ہاف کلو میٹر پیچھے ایک گیس اسٹیشن ہے۔اس کے ساتھ ہی گیراج اور موٹر ورکشاپ ہے لیکن آج ہفتہ کا دن ہے۔ورکشاپ ہفتہ اتوار بند ہوتا ہے۔اب سوموار کو موٹر مکینک مل سکتا ہے۔میں نے میجر صاحب سے کہا گیس اسٹیشن تک کسی نہ کس طرح چلنا چاہئے،کوئی کام بھی نہ ہوا تو ہم اور گاڑی محفوظ جگہ پر تو ہونگے۔میجر صاحب بولے Yes آپ ٹھیک کہتے ہیں۔میں تو Disaster کا عادی تھا اور میجر صاحب فوجی تھے۔اس لئے دونوں کا حوصلہ بلند تھا۔ہنستے کھیلتے،باری باری گاڑی کو دھکا لگاتے،پہاڑ جیسا آدھا کلومیٹر سفر طے کر گئے اور پتہ بھی نہ چلا۔شاعر: میانداد خان سیاح نے اس موقع کے لیے کہا ہے۔

قیس جنگل میں اکیلا ہے مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

گیس اسٹیشن میں ایک طرف گاڑی پارک کرنے کے بعد میں گیس اسٹیشن کے چھوٹے سے کیبن میں داخل ہو گیا تا کہ ہوٹل اور مکینک کے بارے میں پوچھا جائے۔کیبن تو خالی تھا مگر دیوار سے لٹکے ہوئے قطعے پر میری نظر

ٹک چکی تھی جس پر ''الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ'' لکھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک مقامی افریقن بھاگتا ہوا آیا اور بولا Yes Boss۔ میں نے پوچھا اس گیس اسٹیشن کا مالک کون ہے اور کہاں ہے۔ اس نے کہا موسیٰ بھائی اور ان کی اہلیہ اس بزنس کے مالک ہیں۔ موسیٰ بھائی جوہانسبرگ گئے ہوئے ہیں جبکہ ان کی بیوی میمونہ وہ سامنے والے بنگلے میں ہیں۔ ابھی یہاں پر ہی تھیں صرف گھر کا چکر لگانے گئی ہیں۔ اسی دوران میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ غالباً میمونہ آپا شارٹ سرکٹ کیمرے کی وجہ سے ہمیں کار پارک کرنے سے لے کر بات چیت تک Observe کرتی رہی تھیں۔ لڑکا افریقن زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس نے فون مجھے تھماتے ہوئے کہا Boss آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے فون کان سے لگاتے ہی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا۔ جواب بھی اسی طرح کا آیا۔ میں نے میمونہ آپا کو بتایا کہ بہن ہم دونوں پاکستانی ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ بولی بھائی آپ میرے دفتر میں تشریف رکھیں میں آ رہی ہوں۔ میں نے شکریہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ دو تین منٹ بعد ہی ایک مسلم خاتون مکمل لباس اور سکارف میں ملبوس، اعتماد اور وقار کے ساتھ تشریف لے آئیں۔ ہم نے اٹھ کر عزت افزائی کی۔ انہوں نے نے اپنے ملازم سے افریقن زبان میں کچھ کہا۔ وہ جلدی سے ڈرنکس کے دو ٹن لے آیا۔ میں نے اُن کو تمام داستان سنائی۔ وہ بولیں آپ فکر نہ کریں۔ مکینک ایک یہودی ہے جو ہفتہ اتوار جوہانسبرگ میں گزارتا ہے۔ جس جگہ ورکشاپ ہے وہ میں نے ہی اس کو کرایہ پر دی ہوئی ہے لیکن وہ سوموار کو آئے گا۔ میرے خاوند محمد موسیٰ بھی جوہانسبرگ گئے ہوئے ہیں۔ اتوار کی رات کو وہ بھی آ جائیں گے۔ اب آپ میرے ساتھ گھر چلیں کھانا کھائیں اور آرام کریں۔

میمونہ آپا ہمیں اپنی گاڑی میں اپنے بنگلے پر لے گئیں۔ بہت مہربانی، مہمان نوازی اور مسلم تشخص سے بھرپور خاتون تھیں۔ پہلے اپنا پورا گھر دکھایا جو ایک خوبصورت گھر تھا۔ پھر اپنی اکلوتی بیٹی سے ملوایا جو 17/18 سال کی معلوم ہوتی تھی۔ بنگلے سے باہر ایک لڑکے کے ساتھ ایک بڑے پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے استفسار پر بتایا کہ یہ لڑکا اس کا دوست ہے اور میری بیٹی اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ میں خاموش ہو گیا۔ میمونہ آپا نے کھانا بہت اچھا کھلایا۔ ہم تمام رات کے جاگے ہوئے تھے۔ بے حد نیند آ رہی تھی۔ میں نے میجر صاحب سے کہا کہ ہوٹل یہاں ضرور ہوگا۔ کیونکہ یہ ایک ٹاؤن ہے اور ہم ابھی تک شہر میں داخل نہیں ہوئے بلکہ ہائی وے پر ہیں۔ میں نے میمونہ آپا سے درخواست کی کہ آپ نے کمال مہربانی سے ہماری مہمان نوازی کی ہے۔ آپ ہماری بہنوں کی طرح ہیں آپ دو خواتین گھر میں اکیلی ہیں۔ اور ہمارا مسلم تشخص ہمیں اجازت نہیں دیتا کہ یہاں قیام کیا جائے۔ آپ ہمیں ہوٹل تک پہنچا دیں۔ رات ہم وہاں قیام کرینگے۔ گاڑی آپ کے گیس اسٹیشن پر ہی پارک رہے گی۔ اور ہم آپ کے پاس آتے جاتے رہیں گے۔ گاڑی آپ نے اپنے کرایہ دار مکینک سے ٹھیک کروا کر دینی ہے۔ وہ بہت پس وپیش

کے بعد مان گئیں اور فون کر کے قریب ہی ایک لاج میں کمرہ بک کرا دیا جو ایک وائٹ لیڈی کا بزنس تھا۔ ہمارا قیام آرام دہ تھا۔ ہوٹل نہایت صاف ستھرا تھا اور دلفریب نظارے تھے۔ لیٹتے ہی ہوش نہ رہا۔ صبح 10 بجے میمونہ آپا نے فون کیا کہ رات کو محمد موسیٰ اور مکینک دونوں ہی واپس آ گئے ہیں۔ میں آپ کو لینے آ رہی ہوں۔ ناشتہ آپ لوگ ہمارے ساتھ ہی کرینگے۔ ہم جلدی جلدی تیار ہو گئے۔ میمونہ آپا اور موسیٰ بھائی دونوں ہی آئے تھے۔ موسیٰ بھائی درمیانی قد کے ایک صحت مند آدمی تھے۔ گٹھا ہوا کسرتی جسم، دل کے بہت اچھے، غصے کے تیز، چہرے پر چھوٹی داڑھی۔ اردو بھی بولتے تھے۔ بہت محبت اور چاہت سے ملے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کراچی کے مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں۔ جہاں سے انہوں نے حفظ قرآن کا میابی سے مکمل کیا تھا۔ مکینک نے گاڑی چیک کر کے بتایا کہ واٹر باڈی نئی لانی پڑے گی جو پریٹوریا سے ملے گی۔ گاڑی اس نے اپنی ورکشاپ میں لے جا کر واٹر باڈی کھول لی اور موسیٰ بھائی کے حوالے کر دی۔ موسیٰ بھائی اپنی کار میں فوراً ہی روانہ ہو گئے اور شام تک واٹر باڈی لے کر آ گئے۔ مکینک نے رات میں ہی واٹر باڈی فٹ کر کے ساری گاڑی چیک کر کے سفر کرنے کی اجازت دے دی۔ صبح ناشتے پر ہمیں کار سپرد کر دی گئی۔ محبت اور دعاؤں کے ساتھ مسلمان بھائی بہن نے اپنے دو بھائیوں کو رخصت کیا۔ میجر صاحب واش روم گئے ہوئے تھے۔ میں، موسیٰ بھائی اور میمونہ آپا باہر ہی کار کے پاس ٹھہرے باتیں کر رہے تھے کہ میں نے اپنے مہربان میزبانوں سے کہا میں کل آپ کے ہونے والے داماد سے باتیں کر رہا تھا اور اس کی شخصیت کو بھی پرکھ رہا تھا کیونکہ Personality Assessment میرا Subject ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ بیٹی کو سمجھائیں اور ہرگز اس کی شادی اس لڑکے کے ساتھ نہ کریں۔ موسیٰ بھائی بہت غور سے میری بات سن رہے تھے۔ بولے ادریس بھائی اگر شادی ہو جائے تو کیا ہوگا۔ میں نے کہا بہت جلد طلاق ہو سکتی ہے۔ وہ خاموش ہو گئے اور ان کی دعاؤں کے سائے میں ہم نے اپنا سفر جوہانسبرگ کی طرف شروع کر دیا۔ کار کی چال ڈھال اب پہلے سے بھی بہت بہتر تھی۔ ہمارا آج کا سفر صرف 80 to 100Km کا تھا۔ تازہ دم بھی تھے۔ زندگی کے نئے نئے تجربات بھی ہوئے تھے۔ اس لئے سفر کا پتہ ہی نہ چلا اور ہم جوہانسبرگ میں داخل ہو گئے۔

میں اپنے قارئین اکرام کی خدمت میں اپنی بھرپور زندگی کا تجربہ بیان کرتا ہوں۔

میں اپنی زندگی کا کوئی دن بھی نہیں بھولتا کیونکہ!

میرے اچھے دنوں نے مجھے خوشیاں عطا کیں۔

میرے بُرے دنوں نے مجھے تجربہ عطا کیا۔

میرے بہت برے دنوں نے مجھے سبق عطا کیے۔

میرے اچھے اور بہت اچھے دنوں نے مجھے خوشگوار یادداشتیں عطا کیں۔

اب آپ ہی فیصلہ کریں کیا میں نقصان میں رہا؟

ہر لمحہ، ہر دور، ہر کیفیت نے مجھے کچھ نہ کچھ دے کر ہی اپنی جان بچائی۔ یہ سب میرے مالک وخالق کا کرم و رحم حفظ امان نہیں تو اور کیا ہے۔ اور مزید بقول عرفان صدیقی:

اٹھو یہ منظر شب تاب دیکھنے کے لیے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لیے

اب ہم جوہانسبرگ کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ ہم جس طرف بھی جاتے ہمیں سڑکوں پر کچھ اس طرح کے بل بورڈ سٹون اور بورڈ لگے نظر آتے۔

1) Kruger Corner
2) Kruger Road
3) Kruger National park
4) Kruger park
5) Kruger .....?

میجر صاحب بھی میری طرح یہ نام پڑھ کر اکتا چکے تھے۔ مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے یار یہ Kruger کس چیز کا نام ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا پتہ نہیں۔ ابھی ہم جوہانسبرگ میں قیام کریں گے تو پتہ چل ہی جائے گا۔ چند دنوں کے بعد پتہ چل ہی گیا میں سب سے پہلے اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

Stephanus Johannes Paulus Kruger

Nick Named Qoom Paul (Unlce Paul)

افریکان زبان میں Qom انکل کو کہتے ہیں۔ اس لئے انکل پال عرف عام میں اسی طرح پکارے جاتے تھے 10 October 1825 کو پیدا ہوئے۔ وہ ایک سیاستدان تھے۔ مارچ 1877ء میں نائب صدر مقرر ہوئے۔ وہ قوم (Afrikaan) افریکان کے معمار تھے۔

مسٹر پال کروگر 1900 to 1883 ساؤتھ افریقہ کے صدر رہے۔ 1904 july 14 میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئے۔ اور اپنی بیوی Gezena Susanna Frederikaulilhelm کے پہلو میں Pretoria میں دفن ہوئے۔

وہ افریکان قوم کے معمار کے طور پر جانے جاتے ہیں اور کروگران کا فیملی نام ہے۔ مجھے اس وقت تو علم نہیں

تھا کہ مسٹر پال کروگر کی پڑپوتی میرے بیٹے کی بیوی بنے گی۔ میرا بیٹا نوید کاشف جب یونیورسٹی آف Pretoria میں زیر تعلیم تھا تو ڈورتھیا جو مسٹر پال کروگر کی پڑپوتی ہے وہ بھی یونیورسٹی آف پری ٹوریا میں زیر تعلیم تھی۔ دونوں بچوں نے مجھے اپروچ کیا اور اپنا اپنا عندیہ دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے صرف ایک جواب دیا۔ پہلے تعلیم مکمل کریں۔ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائیں۔ پری ٹوریا اسلامک سنٹر جا کر مسلمان ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیں اور اپنے بزرگوں کے ساتھ بہاولپور تشریف لے آئیں۔ میں دل و جان سے سب کی قدم بوسی کرونگا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت ایسا ہی ہوا۔ ان دونوں بچوں کی شادی بہاولپور کی تاریخی شادیوں میں سے ایک تھی جو ہمیشہ یاد رکھی جائیگی۔ ڈورتھیا کی والدہ مرحومہ اس وقت بقید حیات تھی وہ خود تشریف لائی تھیں۔ میں نے ان کا استقبال ملتان ائرپورٹ سے بہاولپور اپنے گھر تک ان کے شایان شان کیا تھا۔ وہ بے حد خوش ہوئیں اور مجھے انہوں نے خود نہ صرف اپنی زبانی بتایا بلکہ اپنا Family-Tree Map بھی دکھایا جس کو ہم شجرہ کہتے ہیں۔ جس کے مطابق اگر کچھ نسلیں پیچھے جائیں تو وہ نپولین بوناپارٹ کی نواسی بن جاتی تھیں۔

اپنے بیٹے نوید کاشف صاحب سے میں فرمائش کرتا ہوں کہ جب میں اس کو ساؤتھ افریقہ یونیورسٹی میں داخل کروا کر پاکستان واپس آ گیا تھا، اس دن سے آج تک کی داستان، تجربات وہ خود لکھے تو مجھے قوی امید ہے کہ یہ ایک بہت دلچسپ اور Informative کتاب ہوگی۔ نوجوان نسل اس سے رہنمائی حاصل کریں گے انشاءاللہ۔

اب میں ساؤتھ افریقہ کے نسلی تعصب (Apartheid) کے مطابق کچھ کہنا چاہوں گا۔

Aparthied ساؤتھ افریقہ کی Afrikaans زبان کا لفظ ہے۔ پرائم منسٹر نیشنل پارٹی کے لیڈر بھی تھے اور پارٹی کے 1958 to 1966ء صدر بھی رہے۔ وہ ہمیشہ Aparthied policy کو پوری طاقت سے رائج کرنے کی کوشش کرتے رہے اور کامیاب بھی ہوئے۔ 1948 to 1990ء تک یہ نسلی تعصب کا ظالمانہ نظام رنگ و نسل کی بنیاد پر وائیٹ اقلیت نے طاقت کے زور پر نان وائیٹ اکثریت پر جاری و ساری رکھا۔

کیونکہ یہ میرا موضوع نہیں ہے اس لئے میں اپنے جاری موضوع کی طرف واپس آتا ہوں۔ اپنی مڑگشت آف جوہانسبرگ کے دوران ہم جوہانسبرگ کی مشہور ترین و بدمعاش ترین وخطرناک ترین آبادی و مارکیٹ کلب و دنیا کے قدیم ترین بزنس کی مارکیٹ میں نہ چاہتے ہوئے بھی پہنچ گئے۔ دن کے دو بجے کا ٹائم تھا ایک انڈین نژاد مسلمان کے ہوٹل سے کھانا کھایا۔ کھانا اچھا تھا یا شائد ہمیں بھوک ستا رہی تھی۔ اسی ہوٹل والے سے ہم نے پوچھا کہ کوئی مناسب جگہ رہائش کے لیے رہنمائی فرمائیں۔ اس نے ایک ہوٹل کا پتہ دیا جو قریب ہی تھا۔ ہم وہاں چلے گئے۔ کمرہ مناسب ہی تھا۔ ماحول بھی بہت رنگین و سنگین تھا۔ پورے کا پورا عملہ نازنینوں سے مزین تھا۔ جنہوں نے ستر ڈھانپنے کی ناکام کوشش کی ہوئی تھی۔ ساؤتھ افریقہ آنے جانے والے سمجھ گئے ہونگے کہ میں Hillbrow

کے علاقے کا ذکر کر رہا ہوں۔

میرے قارئین اکرام Hillbrow جوہانسبرگ کے دل میں واقع ایک علاقے اور آبادی کا نام ہے جو پہلے صرف وائٹ لوگوں کے لیے تھا۔ 24 جولائی 1895ء کو اس گنجان آبادی والے علاقے کو بسایا گیا۔ ترقی کرتے کرتے 1978ء تک بے حد گنجان آباد ہو گیا۔ پہلے یہ صرف رہائشی علاقہ تھا، پھر کمرشل ہوتا گیا اور جوہانسبرگ کا کریمنل علاقہ بن گیا۔ آج بھی ہائی ریٹیڈ کرائم والا علاقہ مشہور ہے۔ یہ علاقہ غربت اور جرائم دونوں کے زیر اثر ہے اس لئے انسانی جان کی یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ظاہر ہے بنتِ حوا کا فروخت ہونا یہاں پر ایک معمولی سی بات ہے۔ ہم ایک ہفتہ اس علاقے کی رنگینی، سنگینی بزنس، بھاؤ تاؤ، پھرتیاں، کٹھاریاں، مسلح نگاہوں کی چاند ماریاں اور پھر شکار کو شکاری اور شکاری کو شکار ہو کر مُرغ بسمل کی طرح تڑپتا دیکھتا رہا۔ بہرحال Hillbrow جوہانسبرگ کا بدمعاش ترین علاقہ تھا اور آج تک ہے۔ بلکہ اب جرائم ریٹ بے حد زیادہ ہے اور بھی کئی حروف اس علاقے کی حالت زار کی عکاسی کر سکتے ہیں مگر اس وقت ذہن میں نہیں آ رہے۔

بقول شاعر:

پکارتا ہے مگر دھیان میں نہیں آتا
عجیب حرف ہے امکان میں نہیں آتا

صرف جوہانسبرگ ہی کیا پورے براعظم افریقہ کے اکثر ممالک میں ایشیائی تارکین بزنس پر قابض ہیں بلکہ اجارا دار ہیں۔ گجراتی جنہیں سورت کے رہنے والے بھی کہتے ہیں اور اکثر اپنے آپ کو خان کہلواتے ہیں۔ ماڑواڑی، پنجابی کی دوسری اور تیسری نسل تارک وطن کر کے آئی تھی تو چوتھی یا پانچویں نسل سے یہاں آباد ہیں۔ یہ لوگ بڑے بزنس، سپر سٹورز کی Branded Chains، فوڈ بزنس، ہارڈ ویئر سٹورز کے مالک ہیں۔ نیز یہ کہ مندرجہ بالا لوگ بزنس کو اجارہ داری کے تحت کمانڈ کر رہے ہیں اور مقامی افریقن لوگ ان کے نوکر چاکر خدمت گار وغیرہ ہیں۔ ہم لوگ اپنے Export Symples لے کر ان تمام بزنس انٹر پرائزز کے پاس گئے تو انہوں نے Millions میں بات کی اور Consignment Basis پر دلچسپی کا اظہار کیا۔ Consignment کا مطلب نوے دن یا زیادہ سے زیادہ 120 دن کا ادھار ہے۔ گورنمنٹ آف پاکستان Exporter کو اس کے اپنے رسک پر اس طریقہ کار کی اجازت دیتی ہے۔ مگر اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ لاکھوں کا مال اور دوسرے ملک کے شہری کی ڈسپوزل پر چلا گیا۔ اگر وہ مقررہ مدت کے بعد بھی ادائیگی نہ کرے تو نقصان تو ہو گا ہی اگر فارن ایکسچینج ایکٹ کے تحت کریمنل مقدمہ بھی قائم ہو سکتا ہے اور تمام تر قانونی ذمہ داری بھی عائد ہو جاتی ہے۔ میں نے یہ بات خاص

طور پر نہ صرف نوٹ کی بلکہ متعدد بار اس کا تجزیہ بھی کیا کہ یہ جو ایشیائی تارکین ہیں یہ سب Profit Margin 100% to 120% سے کم رکھنا گناہ تصور کرتے ہیں۔ عام افریقن کی عادت ہے اگر اس کو کوئی بھی آرٹیکل پسند آ گیا تو وہ اس نے ضرور خریدنا ہے چاہے اسے کسی قیمت پر بھی ملے۔ بزنس مین اور دیگر دکاندار مقامی لوگوں کی اس کمزوری کا نفسیاتی طور پر ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا استحصال کر رہے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ Multi-Millionersبن گئے اور اب تک یہ استحصال جاری ہے۔

جوہانسبرگ جنوبی افریقہ کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس شہر میں ڈچ کاشتکار اور برطانوی کان کن آپس میں معرکہ آرائی کرتے رہے۔ برطانوی سونا نکال کر ہضم کرتے رہے جبکہ ڈچ زمینوں پر قبضہ کر کے کاشت کرتے رہے اور مقامی لوگ ان کے غلام رہے۔ ڈچ ٹرنسوال کے علاقے پر قبضہ کر کے آباد ہو گئے۔ جبکہ برطانوی 1886ء میں وٹ واٹر رینڈ کے قریب سونا دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جوہانسبرگ آج تقریباً 350 مربع کلومیٹر پر پھیل چکا ہے اور مزید پھیلاؤ جاری ہے۔

بغیر کسی لگی لپٹی کے جوہانسبرگ ایک مشکل اور خوبصورت شہر ہے۔ مشکل سے میری مراد ہے کہ کوئی بھی اجنبی اس شہر میں ہر قسم کے خطرے سے دوچار ہو سکتا ہے اور آج کل تو خطرات اور بھی بڑھ گئے ہیں۔

مجھ میں رقصاں کوئی آسیب ہے آوازوں کا
میں کسی اُجڑے ہوئے شہر کا سناٹا ہوں

بس اتنا اور لکھنا چاہوں گا کہ جرائم پیشہ حضرات سے تو خطرہ ہے ہی مگر آپ "Alpha Female" اکسانے والیوں سے بھی نہیں بچ سکتے۔ اور یہ کام وائٹ کمیونٹی کر رہی تھی۔ جن کو اپنے اعلیٰ ہونے پر بہت ناز تھا۔ نسلی تعصب میں ڈوبے ہوئے یہ ظالم بظاہر جتنے بھی وائٹ تھے۔ نسلی طور پر اندر سے اتنے ہی کالے ثابت ہوئے۔ حالانکہ 1989 میں نسلی تعصب کا دور آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ آخر کار 1994 میں یہ دم توڑ گیا۔ نیلسن منڈیلا جیسے قوم پرست عظیم لیڈر نے ان کی جان چھڑوائی۔ جس کو بھرپور جوانی میں انہوں نے قید کیا اور بڑھاپے میں اپنے مطلب کی خاطر جیل سے نکالا۔ اگر ہم کسی وائٹ سے راستہ پوچھتے تو وہ منہ دوسری طرف کر لیتا۔ بعض لوگ تو افریقن زبان میں مذاق بھی اڑا لیتے۔ اب تک اس قماش کے جتنے بھی لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑا وہ سب بے حد لالچی، ضرورت سے زیادہ چالاک، عیار اور غیر مذہب ثابت ہوئے۔ صرف اپنے وائٹ ہونے پر نازاں تھے۔ اگر وائٹ خواتین کی تعریف اور رویہ لکھنے پر آمادہ ہو جاؤں تو آپ لوگ شرم سے سر جھکا لیں گے۔ ان کو "Ethnic Cleansing" یعنی کے نسلی صفائی کی سخت ضرورت ہے۔ Hillbrow جوہانسبرگ کا سب سے زیادہ بدنام

ترین علاقہ ہے۔اب ہم Hillbrow سے نکل کر جوہانسبرگ کی طرف چلتے ہیں۔

ساؤتھ افریقہ کی کرنسی کا نام Rand ہے اور اس وقت ایک Rand پاکستانی دس روپے کے برابر تھا۔ جوہانسبرگ میں ہم جو کچھ بھی کھاتے پیتے مندرجہ ذیل نرخوں کے مطابق ادائیگی کرتے۔ ہمارے دکاندار سب مسلم اور انڈین نژاد ہوتے جن کا پہلے صفحات پر تفصیل سے ذکر آ چکا ہے۔فوڈ بزنس میں زیادہ تر خواتین تھیں۔

1) Coffee Cup 3-5 Rand
2) Lunch Buffet 19-20 Rand
3) One Night at a Gamelodge Luxurious Accommodations 1800-3900 Rand (Including All Meals).
4) Taxi Ride 4 Rand per km
5) Rental Car 150 Rand Per day
6) Petrol 62.50 Rand per litre

سونے کی پیداوار میں ساؤتھ افریقہ دنیا کا نمبر ون ملک ہے اور اس کی سونے کی کان کی گہرائی زمین کی سطح سے اڑھائی میل اندر ہے۔کان کنی کی شافٹ کو Mine Shafts Forge کہتے ہیں۔یہ دنیا کی سب سے زیادہ گہرائی والی شافٹ اور کان ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس ملک کو چوبیس ہزار سے زائد پھول اور ہربل پلانٹس عطا کئے ہیں جو کہ دنیا بھر کے پلانٹس "Species Plants" کا 10% ہیں۔Stone Age Art کی Collection دنیا بھر میں سب سے زیادہ ساؤتھ افریقہ کی ہے۔افریقن ''نپولین شاکا''(Shaka) نے جنگ Isandlwana میں برطانوی فوج کو مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا تھا۔1300 سے زیادہ برطانوی فوجی ہلاک ہوئے۔بے شمار زخمی اور لاپتہ ہوئے۔برطانوی بادشاہت کے لیے یہ بہت بڑی شکست تھی جس کی وجہ سے دنیا میں ان کی بہت جگ ہنسائی ہوئی۔Sexual Orientation کا قانون ساؤتھ افریقہ کی اس وقت کی گورنمنٹ پر ایک سیاہ دھبہ تھا۔ پوری دنیا میں یہ واحد ملک تھا جہاں پر یہ کالا قانون رائج تھا۔اب یہ قانون اپنی موت آپ مر چکا ہے۔

نیلسن منڈیلا ''زندہ باد''۔ساؤتھ افریقہ میں مختلف رنگ و نسل کے قبائل، اقوام اور دیگر لوگ رہتے ہیں اس لئے ان کو The Rainbow Nation کہتے ہیں۔ساؤتھ افریقہ کے دوسرے راؤنڈ میں ان قبائل کا ذکر مع تصویر کیا جائے گا (انشاءاللہ)۔

میجر صاحب نے مجھے کہا کہ چھٹی ختم ہونے والی ہے۔اور Booking کا کوئی پتہ نہیں ہے۔واپس چلتے ہیں، تاکہ پاکستان واپس جانے کا پروگرام طے کیا جا سکے۔ہم دونوں نے صبح صبح دن کے اجالے میں سفر جاری

رکھنے کا فیصلہ کیا تا کہ بھول بھلیوں سے محفوظ ہو کر سفر کیا جا سکے۔ سابقہ تجربہ بھی ہمارے ذہنوں میں محفوظ تھا۔ ہم نے جوہانسبرنگ سے گیبرون None Stop جانے کا فیصلہ کیا۔ اپنے دوست ''امیگریشن آفیسر ساؤتھ افریقہ بوٹسوانہ بارڈر'' کے لیے تحائف اور میڈیسن لینا نہ بھولے۔ یہ Hillbrow کے نائٹ کلب میں ہماری آخری رات تھی اور صبح 7 بجے ہم دونوں ناشتہ کر کے گیبرون کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ ایک خوشگوار سفر تھا۔ شام 4 بجے تک ہم تلوک ونگ بارڈر پر ساؤتھ افریقہ امیگریشن آفس کے سامنے تھے۔

گاڑی پارک کرتے ہی کسٹم والے ہماری گاڑی کی طرف آئے۔ میں نے کار کا بوٹ کھول دیا۔ اب اس بوٹ کے بھی کئی نام ہیں جو موقع محل اور کلچر کے مطابق لئے جاتے ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

1) Dicky
2) The Trunk
3) Boot
4) Car Main Storage
5) Car Cargo Compartment.
6) Car tail Gate

اتنے میں ایک بڑی زوردار آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ Hello My Friends دائیں طرف دیکھا تو ہمارا دوست امیگریشن آفیسر ہماری طرف آ رہا تھا۔ اس نے کار کے بوٹ کا دروازہ آتے ہی بند کر دیا اور مقامی زبان میں اپنے کسٹم آفیسرز کو کچھ کہا۔ وہ خاموشی سے چلے گئے اور دوسری طرف سے آنے والی کاروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں جلدی سے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے Tab:Surbex-T کی بوتل اور پرفیوم نکال لایا جو میں نے اپنے دوست کو پیش کئے۔ وہ بے انتہا خوش ہوا۔ دو منٹ کے اندر اس نے نہ صرف ساؤتھ افریقہ کی طرف سے تمام مراحل سے کلیر کرا دیا بلکہ پاسپورٹ لے کر بوٹسوانہ کے دفتر میں چلا گیا اور پاسپورٹس پر Stamps لگوا لایا۔ ہمیں اشارہ کیا کہ کار لے کر آئیں۔ خود بیریئر (Barrier) کے پاس کھڑا ہو گیا اور ہاتھ نکل جانے کا اشارہ کیا۔ ہاتھ ہلا کر Good Bye بھی کہا۔ مزید آدھے گھنٹے کے بعد ہم گھر پہنچ گئے۔ فریش ہو کر ساؤتھ افریقن ائرلائن کے آفس گئے اور گیبرون، جوہانسبرگ دوبئی کے لیے Booking کی ڈیمانڈ دے دی۔

ہماری ٹکٹیں اوپن تھیں اور ہر سیکٹر بھی اوپن تھا اس لئے ہم جس طرف سے چاہتے سفر کر سکتے تھے۔ رات کو Gabrone Sun ہوٹل میں ہم نے ایک شو Attend کیا جب گھر آئے تو ایک فیکس مسیج کے ذریعے ہمیں مطلع کیا گیا کہ صبح 8 بجے کی فلائٹ سے ہم نے اپنا سفر شروع کرنا ہے۔ اسی وقت تمام پیکنگ شروع کر دی گئی۔ ابھی کچھ دیر

ہی آرام شروع کیا تھا کہ صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ بھاگم بھاگ تیاری شروع کر دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں ائرپورٹ پر ڈراپ کیا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آفس جانا تھا اس لئے وہ ہمیں ائرپورٹ پر پہنچا کر چلے گئے۔ گیبرون ائرپورٹ ایک چھوٹا لیکن صاف ستھرا ائرپورٹ ہے۔ تمام کام قانون کے مطابق، کرپشن، لالچ دھونس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ائرپورٹ کا نام Sir Seretse Khama International Airport تھا۔ جو غالباً ان کے پہلے صدر تھے اور اب وفات پا چکے تھے۔ ان دنوں ان کے صدر مسٹر میسرے تھے جو کے ایک بہت ہی شریف النفس انسان تھے۔ مجھے ایک بار ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان کا ذکر روانڈ نمبر 2 میں آئے گا۔ فلائیٹ اپنے شیڈول کے مطابق On Time تھی۔ اناؤنس ہوتے ہی پندرہ منٹ کے بعد ہم جہاز میں تھے۔ ائرپورٹ کے تمام مراحل 10 منٹ میں طے ہو گئے۔ جیسے ہی ہم لاؤنج میں پہنچے ایک وائیٹ لیڈی جو زندگی کے تمام مراحل طے کر چکی تھی۔ دیکھنے میں چلے ہوئے کارتوس کی مانند تھی، زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ہماری فلائیٹ کا نمبر بولتے ہوئے جوہانسبرگ۔ جوہانسبرگ پکار کر گیٹ نمبر 3 کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ جیسے پاکستان میں بسوں میں ہاکر شہروں کے نام بول کر مسافروں کو متوجہ کرتے ہیں۔ بالکل وہی ماحول تھا۔ یہ ایک چھوٹا پرائیویٹ جہاز تھا جو ساؤتھ افریقین ائرلائن کے فلیگ کے ساتھ سروس دے رہا تھا۔ جہاز میں سوار ہونے کے بعد پتہ چلا کہ جہاز اندر سے لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ 12/13 لوگ اس جہاز میں سوار ہوئے اور جہاز فُل ہو گیا جہاز کا کریو ایک پائلٹ اور ایک چلے ہوئے کارتوس پر مشتمل تھا جو میاں بیوی بھی تھے اور دونوں ساؤتھ افریقہ ائیر فورس سے ریٹائرڈ تھے۔ ائرفورس سے ہی انہوں نے پرانا جہاز نیلامی میں خرید کر اس قابل بنایا کہ پرواز کر سکے اور اس مختصر انٹرنیشنل روٹ پر سروس دے سکے۔ یہ سب وائیٹ ہونے کی وجہ سے ساؤتھ افریقن ائرلائن جسکا کوڈ (SA) ہے کی مہربانی کی وجہ سے تھا۔ قربانی کے بکرے ہم تھے۔ جہاز کا ٹیک آف بہت اچھا تھا نہ کوئی شور تھا اور نہ ہی جھٹکے وغیرہ تھے۔ کافی ہموار پرواز تھی۔ یک لخت ایک جھٹکا لگا اور ایسے معلوم ہوا کہ جہاز بہت تیزی سے نیچے گر رہا ہے۔ کچھ لوگ ڈرنکس پی رہے تھے جو دوران پرواز اس بوڑھی مائی نے On Payment مسافروں کو دیے تھے۔ جھٹکے لگنے کے باعث پچھلی سیٹ والوں کے گلاس یا جو کچھ بھی ان کی جھولیوں میں پڑا تھا وہ اڑ کر آگے والوں کے اوپر گرا اور آگے والوں کا اس سے آگے والوں پر۔ کوئی پتہ نہ چلا کہ کس کی چیز کس کے پاس گئی۔ اللہ سبحان تعالیٰ کا شکر ہے کہ جلد ہی جہاز ائر پاکٹ سے نکل کر ہموار ہو گیا۔ جب جان بچ جانے کے بعد ذرا ہوش آیا تو میں نے اپنی جھولی میں دیکھا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت پرس پڑا ہوا ہے۔ میں نے اور میجر صاحب نے ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی۔ اسی اثناء میں ایک Semi White lady تشریف لے آئی۔ اور بولی کیا میں یہ پرس لے سکتی ہوں۔ میں نے پہلو بدل کر اس کی طرف متوجہ ہونا چاہا تو پرس نیچے گر گیا اس نے اٹھایا اور چلی گئی لیکن اس کے تمام راز فاش ہو چکے تھے۔ کیونکہ

فیشن کی ماری وہ پہلے ہی مختصر لباس میں تھی۔ میجر صاحب بولے اب اٹھ بھی جاؤ۔ میں نے کہا کیا ہوا تو بولے جہاز لینڈ کر گیا ہے۔ میجر صاحب کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: یہ فلائیٹ بھی تاعمر یاد رہے گی۔

جوہانسبرگ John Smith ائرپورٹ اچھا بڑا یورپی طرز کا ائرپورٹ ہے مگر یورپی ائرپورٹس کی نسبت چھوٹا مگر کارکردگی یورپ جیسی ہے۔(Taxiderm) یعنی حنوط شدہ زیبرا انٹرنیشنل لاؤنج میں ایک جگہ Install کیا ہوا تھا اور لکھا تھا Child of Africa پورٹ کے واش روم سے اپنے آپ کو فریش کرنے کے بعد ہم لوگ ٹرانزٹ لاؤنج میں چلے گئے کیونکہ اب ہم نے کینیا ائروے سے نیروبی کے لیے سفر شروع کرنا تھا اور چھ گھنٹے ٹرانزٹ لاؤنج میں ہی گزارنے تھے۔ لاؤنج میں کبھی بھی اکتاہٹ نہیں ہوتی کیونکہ ملٹی نیشنل خواتین وحضرات ہر طرف بیٹھے، سوتے جاگتے، بھاگتے دوڑتے نظر آتے ہیں۔

مگر آج چھوٹے سے جہاز کے ائرپاکٹ میں پھنس کر زمین کی طرف تیزی سے گرنے کی وجہ سے ہمارا بہت بُرا حال ہوا تھا۔ تمام جسمانی اعضاء شاعری کرنے کی بجائے آہ وزاری کر رہے تھے اور ڈپریشن جان نہیں چھوڑ رہا تھا۔ حالانکہ لاؤنج میں سفید، کالی وانڈین نژاد خواتین کی بھرمار تھی اور سب خواتین اپنی اپنی زیبائش اپنی ہمت سے زیادہ کر کے آئیں تھیں۔ عجیب وغریب لباس جو جسم کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ خواتین کا خیال تھا کہ اس قسم کا لباس ان کے حُسن جمال میں اضافہ کر رہا ہے لیکن اضافہ تو کیا کرتا تھا، جمال غائب ہو کر حُسن ساکت ہو چکا تھا اور وہ نشیب وفراز ''جنہیں عرف عام میں فگرز'' کہا جاتا ہے اپنی اہمیت بمعہ تمام محسوسیات کھو چکے تھے۔

کچھ خواتین تو مردوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ نسوانیت نام کو نہ تھی۔ بس گوشت پوست کا بُت معلوم ہوتی تھیں۔ کچھ انڈین نژاد خواتین اچھی تھیں۔ جسم میں نزاکت، آواز میں لطافت، آنکھوں میں خمار لیکن چہرے پر شرم و حیا۔ اپنا آپ سنبھالتے ہوئے، چھپاتے ہوئے، نظریں جھکائے شرافت کا نمونہ اور قابل حترام تھیں۔

بڑی مشکل سے یہ وقت گزرا۔ طبیعت تھی کہ سنبھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر دل میں درود شریف کا ورد شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ سکون ملتا گیا اور طبیعت فریش ہونا شروع ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی ایسی رحمت ہے مجھ پر میں نے جب بھی اس کی مدد، رحمت اور حفظ وامان چاہی مجھے مل گئی۔ آخر میجر صاحب نے مجھے بازو سے پکڑا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ بولے آجاؤ فلائیٹ اناؤنس ہو گئی ہے۔ ہم دیگر مراحل طے کرتے ہوئے جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ بوئنگ 676 تھا۔ ایک بڑا جہاز ہونے کے باوجود مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ائرہوسٹس مایوس کن تھیں۔ میں نے بہت بار کینیا ائر میں سفر کیا ہے لیکن ڈھنگ کی ائرہوسٹس آج تک نظر نہیں آئی حالانکہ کینیا میں تو بلیک بیوٹی کمال کی ہے۔ اگر تفصیلاً بیان کروں تو کئی جلدیں تیار ہو جائیں۔ شائد کینیا ائر والے ائرہوسٹوں کی سلیکشن سینی ٹوریم سے کرتے ہیں۔ تاکہ ٹی بی کی مریضہ

کی ہواخوری بھی ہو جائے اور معاشی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ جہاز کے اندر کا ماحول ویسا ہی تھا جیسا میں نے دوبئ سے نیروبی آتے ہوئے بیان کیا تھا۔اس لئے دوبارہ بیان کرنا ضروری نہیں۔

جہاز پہلے Malawi کے دارالخلافہ Lilongwe میں رکا اور رن وے پر کھڑا رہا۔ پھر جہاز کے دروازے کھول کر سیڑھی لگائی گئی۔بس آئی اور مسافروں کو لے کر چلی گئی۔ جہاز میں شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں اور میجر صاحب دروازے کے ساتھ ہی جہاز کی سیڑھی پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔جس کی وجہ سے ہمارے بال دائیں بائیں ہوا میں اڑ رہے تھے۔میں ایک ماہ میں دو بار ہیئر کٹنگ کروانے کا عادی ہوں جبکہ فوجی حضرات بھی اپنا ایک خاص اسٹائل رکھتے ہیں۔ہم دونوں کے درمیان بات چیت جاری تھی کہ مجھے محسوس ہوا ہماری پشت پر دروازے میں کوئی کھڑا ہے میں نے مڑ کر دیکھا تو جہاز کا پائلٹ کھڑا ہماری طرف بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ہم سرک کر دائیں بائیں سیڑھی کی ریلنگ کے ساتھ لگ گئے تا کہ راستہ نہ رکے۔ٹھنڈی صاف ستھری ہوا سرسر چل رہی تھی اور ہم جہاز کے گھٹن زدہ ماحول میں بھی نہیں جانا چاہتے تھے۔میری نظر جب بھی پائلٹ سے ٹکراتی تو وہ مسکراتا۔میں نے بات چیت میں پہل کی اس کا حال احوال پوچھا اس کے ٹیک آف اور لینڈنگ کی تعریف کی اس نے میجر صاحب سے کہا کہ آپ دونوں کے بال بہت خوبصورت ہیں۔میں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں جب ہوا میں لہرا کر آپ کے ماتھے اور آنکھوں تک کو ڈھانپ لیتے ہیں تو بہت خوبصورت لگتے ہیں۔آپ نے کہاں سے بنوائے ہیں؟ افریقن مرد ہو یا عورت دونوں کے سر کے بال زیادہ سے زیادہ آدھ انچ لمبے ہو کر مُڑ جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی گولیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ملائم ہونے کی بجائے سخت ہو جاتے ہیں۔مرد و زن کی اکثریت نے مصنوعی بالوں کی وگ لگائی ہوئی ہوتی ہے۔

میں نے اپنے جہاز کے کپتان سے کھیلنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ شراب کی بدبو نے مجھے بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا۔میں نے کپتان کو بتایا کہ اس طرح کے بال ہم خود بناتے ہیں ہم دونوں پروفیشنل آرٹسٹ ہیں ہم نے کینیڈا سے مصنوعی بال بنانے اور چہرے کے مطابق ان کو قدرتی انداز سے انسٹال کرنے میں پی ایچ ڈی کی ہے (جی ہاں کینڈا ایک ایسا ملک ہے جہاں رومانس میں بھی پی۔ایچ۔ڈی ہوتی ہے) وہ بے صبری سے بولا آپ کا ہیلتھ سنٹر کون سے ملک میں ہے۔(افریقہ میں نائی کی دکان مساج وغیرہ کروانے کی جگہ کو ہیلتھ سنیٹر کہا جاتا ہے)۔میں نے بتایا کہ ہم صرف ٹاپ براس، ایلیٹ کلاس اور کئی ملکوں کے وزیراعظم، گورنر، منسٹرز وغیرہ کو یہ سروس فراہم کرتے ہیں۔ابھی بھی ہم رابرٹ موگابے آف زمبابوے اور ڈاکٹر میسرے آف بوٹسوانہ کو اٹینڈ کرنے کے بعد ان کے سر کے مختلف ٹیسٹ، بلڈ کے ٹیسٹ اور ناپ لے کر آ رہے ہیں۔آئندہ ماہ سے آپ ان دونوں کو ہماری طرح کے بالوں میں دیکھیں گے۔وہ بہت ہی توجہ سے میری بات سُن رہا تھا جبکہ میجر صاحب ہنس رہے تھے۔اس نے حیران

ہوکر پوچھا یہ جنٹلمین کیوں ہنس رہا ہے۔ میں نے کپتان کو بتایا کہ یہ ایک بہت ہی مہنگا طریقہ کار ہے۔ جو صرف چند لوگ ہی Afford کر سکتے ہیں۔ اس لئے یہ ہنس رہا ہے۔ کپتان کہنے لگا کے یہ بھی آپ کے ساتھ کام کرتے ہیں میں نے حیرانی سے کہا یہ ہی تو ہمارا پروفیسر ہے (یعنی کے نائیوں کا پروفیسر)۔ پائلٹ نے بہت گرم جوشی سے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ مجھے آپ دونوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے میں اتنے بڑے آرٹسٹوں سے نہیں مل سکا تھا۔

اس دوران جہاز کی کلیرنس آ گئی تھی۔ ہم لوگ اپنی سیٹوں پر واپس چلے گئے۔ جہاز بھی اب اپنی اگلی منزل دارالسلام تنزانیہ کی طرف پرواز کے لیے تیار تھا۔ تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جہاز فضا میں اپنی منزل کا تعین کرنے کے بعد بہت تیزی سے محو پرواز تھا کہ اچانک ایک ائر ہوسٹس نما عورت جو صرف یونیفارم سے ائر ہوسٹس نما تھی اور اپنی آواز کی وجہ سے عورت نما تھی تشریف لائی اور جہاز کے کپتان کی طرف سے دعوت کا پیغام دیا کہ ہم دونوں کاک پٹ میں آجائیں اور فری فلائنگ کے مزے لیں۔ میجر صاحب ہنستے ہوئے اور میری تعریف کرتے ہوئے اٹھے اور بولے آؤ انٹرنیشنل آرٹسٹ صاحب۔ ہم دونوں کاکاک پٹ میں خوش دلی اور خوش مزاجی سے استقبال کیا گیا۔ دونوں پائلٹ کینیا کے شہری تھے۔ فری فلائنگ کا مجھے پہلے بھی تجربہ تھا مگر افریقہ کے روٹ پر اور بڑے جہاز سے قدرت کے نظارے پکار پکار کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت قدرت اور عظیم تر مصوری کا اعلان کر رہے تھے دونوں کپتان ڈیکوزی مارگریٹا کی چُسکیاں لے رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں بلیک افریقن کافی کا ڈسپوزایبل گلاس تھا۔

باقی لوگوں نے ایک دوسرے کی صحت کے جام تجویز کر کے میرے کافی کے گلاس کے ساتھ ملا کر چیئرز کیا اور اس طرح ہماری دوستی پکی ہوگئی۔ ہم جتنی دیر بھی کاک پٹ میں رہے کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی ڈش/ ڈرنکس/ چاکلیٹ سے ہماری تواضع ہوتی گئی۔ کچھ دیر کے بعد ہم اپنی سیٹوں پر واپس آ گئے۔ کیونکہ جہاز تنزانیہ کی ائرسپیس میں داخل ہو چکا تھا جہاز تنزانیہ سے ہوتا ہوا مقامی وقت کے مطابق رات 8 بجے نیروبی لینڈ کر گیا۔ نیروبی میں تمام سابقہ مراحل پھر سے طے کیے گئے۔ جس کے اب ہم نہ صرف عادی ہو چکے تھے بلکہ بہت زیادہ واقف بھی ہو چکے تھے۔ نیروبی میں ہمارا قیام صرف ایک رات کا تھا۔ دوسرے روز شام چار بجے ہماری دوبئی کے لیے فلائٹ تھی۔ ہوٹل میں قیام ائرلائن کی طرف سے تھا۔ رات آرام کرنے کی وجہ سے صبح ہم لوگ تروتازہ تھے۔ 10 بجے کے قریب مارکیٹ میں گھوم رہے تھے کہ بوٹ پالش والے نظر پڑے۔ وہ بہت اہتمام سے بوٹ پالش کر رہے تھے۔ لکڑی کے سٹینڈ بنے ہوئے تھے جن پر بوٹ پالش کرانے والا اپنا پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ سب سے پہلے ایک کپڑے سے وہ دونوں بوٹوں کی باری باری مٹی صاف کرتا تھا۔ پھر بوٹ کے اوپر دائیں بائیں چمڑے کے پیس لگا

کر باندھ دیتا تھا۔ تا کہ پالش کرانے والے کے کپڑوں پر پالش یا پالش کرنے والے برش نہ لگے۔ پھر وہ باری باری دونوں بوٹ پالش کر کے خوب چمکا تا تھا۔ بوٹ نئے بوٹوں کی مانند ہو جاتے تھے۔ مگر قومی غیرت کا یہ عالم تھا کہ جب میجر صاحب بوٹ پالش کروا رہے تھے میں نے کیمرے سے تصویر بنانے کی کوشش کی تو پالش کرنے والے نے ہاتھ سے بُرش پھینک دیا اور کہا کہ بے شک میں ایک بوٹ پالش کرنے والا ہوں مگر میری قومی غیرت اجازت نہیں دیتی کہ تم لوگ میری بوٹ پالش کرتے ہوئے کی تصویر بنا کر اپنے ملک لے جاؤ اور اخباروں یا رسالوں کی زینت بناؤ۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی یہ قومی غیرت، انا اور "Self Respact" بہت پسند آئی۔ میں نے کئی بار اس سے معافی مانگی اور کہا کہ میرا قطعی ایسا ارادہ نہ تھا جیسا کہ آپ سوچ رہے ہیں۔ آپ مجھے محنت کرتے ، اچھے اور شریف آدمی لگے تو میں نے سوچا کہ آپ کی تصویر ہی بنالوں۔ جب آپ نے منع کر دیا تو میں فوراً رُک گیا۔ وہ مطمئن ہو کر اپنا کام کرنے لگ گیا۔ جب ہم نے اپنے اپنے بوٹ پالش کرا لئے تو میں نے اس کو 100 شلنگ کا نوٹ دیا۔ مجھے اس نے 60 شیلنگ واپس کرتے ہوئے Thank You کہا اور ٹپ لینے سے انکار کر دیا۔ یہ قومی غیرت کی ایک عظیم مثال ہے۔ میں اپنی حرکت پر شرمسار رہا۔ ایک بجے ہم ائرپورٹ چلے گئے۔ تمام مراحل سے گزرنے کے بعد اپنی فلائیٹ جوائن کی اور عازم دوبئ ہوئے۔

دوبئ میں جب لینڈ کیا تو صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ ہوٹل ڈیرہ پارک کی گاڑی ہمیں لینے آئی ہوئی تھی۔ جن کو ہم نے اپنا تمام شیڈول بذریعہ فیکس بوٹسوانہ سے ہی مطلع کر دیا تھا۔ کالے کالے لوگ دیکھ کر طبیعت بہت اکتا گئی تھی۔ اب ہر طرف بہار ہی بہار تھی۔ گلف ائر کی فلسطینی، لبنانی، مصری ائر ہوسٹیں پریوں کی مانند لگ رہی تھیں۔ میں لاؤنج میں کھڑا میجر صاحب کا انتظار کر رہا تھا جو واش روم گئے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ دو خوبصورت ائر ہوسٹیں قہقہے لگاتی ہوئیں لوٹ پوٹ ہوئے جا رہی تھیں۔ میں بے بس ہو کر ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ نے مجھے اپنے قہقہوں میں شامل نہ کیا تو میں ڈپریشن میں تو ہوں ہی بے ہوش ہو کر گر بھی سکتا ہوں۔ انہوں نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا: Gentleman What's wrong with you? میں نے ان کے سوال کا جواب دینے کی بجائے ان سے پوچھ لیا کہ آپ کس ملک سے ہیں وہ ترنت بولی کہ برونائی۔

میں نے انہیں بتایا کہ میرے ڈپریشن کی وجہ کالی کلوٹی ٹی بی کی مریضہ جیسی ائر ہوسٹیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پتھر کے بُت چل پھر رہے ہیں۔ وہ ہنستی ہوئی بڑی اداؤں کے ساتھ نیک خواہشات کا اظہار کرتی ہوئی چلی گئیں۔ اتنے میں میجر صاحب تشریف لے آئے۔ ائرپورٹ کے قاعدے قانون کے مطابق عمل کرتے ہوئے ہم ڈیرہ پارک ہوٹل کی گاڑی تک پہنچ گئے جو ہمیں لے کر فراٹے بھرتی ہوئی ہوٹل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ دوبئ میں ہمارا صرف ایک رات کا قیام تھا اور دوسرے روز کراچی کے لیے فلائیٹ تھی۔

رات کا بہت پُر تکلف ڈنر ڈاکٹر معین راجہ کی محبت اور احترام کا شاخسانہ تھا۔ اگلے روز ہم تمام مراحل طے کرتے ہوئے کراچی لینڈ کر گئے۔ کالو جی بذاتِ خود ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ میجر صاحب لاہور روانہ ہو گئے کیونکہ انہوں نے ڈیوٹی جوائن کرنی تھی۔ میرے دل میں جلد از جلد اپنے بیوی بچوں میں پہنچنے کا جذبہ سمندر کی لہروں کی طرح بے قابو تھا۔ اس لئے میں نے ملتان کے لیے فلائٹ لی اور بہاولپور اپنے گھر خیریت سے پہنچ گیا۔

یہ ہمارا سیر و سیاحت کے علاوہ بزنس ٹور بھی تھا۔ میں نے تمام زندگی ملکی اور غیر ملکی جتنے اسفار بھی کئے وہ ایک پکنک کی طرح کئے۔ سفر کی تمام مشکلات، خوبیاں، خامیاں اور رنگینیاں اپنے خاص مشاہدے میں رکھیں اور کسی بھی پریشانی کو خاطر میں نہ لایا۔

بوٹسوانہ سے روانگی سے پہلے ڈاکٹر مکرم شیخ سے جو آخری صلاح مشورہ ہوا وہ کچھ اس طرح تھا۔ بقول ان کے دو ماہ بعد چار روزہ بوٹسوانہ ٹریڈ فیئر منعقد ہوگا جس میں دوسرے ملکوں سے بھی بزنس مین تشریف لاتے ہیں اور ریجنل بزنس مین بھی تشریف لاتے ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے ملنے اور اپنی پروڈکٹ پیش کرنے کا بہترین موقع ہوتا ہے۔ اس لئے آپ اس ٹریڈ فیئر میں ضرور شرکت کریں۔ میں آپ کے لئے موقع محل کے حساب سے سٹال مختص کر دونگا۔ شیخ صاحب گورنمنٹ آف بوٹسوانہ کی طرف سے اس ٹریڈ فیئر کے انچارج آفیسر تھے۔ بعد میں اس ٹریڈ فیئر کا نام بدل کر گیبرون ٹریڈ فیئر رکھ دیا گیا۔

میں نے ان کے اس مشورے کو دل و جان سے قبول کیا اور پاکستان آتے ہی ٹریڈ فیئر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ میں اس سے پہلے فرینکفرٹ Exhibition میں اسلم خان (مرحوم) ڈائریکٹر ایکسپورٹ پروموشن بیورو کراچی کے ہمراہ گورنمنٹ آف پاکستان کی طرف سے شمولیت کر چکا تھا۔ مجھے ذرا سا بھی تامل نہ تھا۔

ہر شخص با اصول ہے..... ہر شخص با ضمیر
اپنی ذات تک ..... ذاتی مفاد تک

باب5: بوٹسوانہ (ٹریڈفیئر 1991ء)

ہر دور میں شیاطین تین ہی ہوتے ہیں

ہامان - فرعون - قارون

؟ سامراج ملٹی نیشنل کمپنیاں

بوٹسوانہ

ٹریڈفیئر (1991ء)

ابھی مجھے افریقہ سے واپس آئے دو ہفتے ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر مکرم کا فون آ گیا۔انہوں نے فرمایا کہ آپ کے لئے سٹال بک ہو چکا ہے اور ایک دو روز کے بعد Stall Booking کی منظوری کے کاغذات مع ویزا آپ کو FAX کر دیے جائینگے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ بزنس کی طرف قدم بڑھنا شروع ہو گئے ہیں۔اب تک بزنس کی ابتدا اور نئی مارکیٹ تلاش کرنے میں بہت بڑی رقم خرچ کر چکا تھا۔میں گورنمنٹ آف پاکستان سے رجسٹرڈ شدہ امپورٹر اینڈ ایکسپورٹر تھا۔جلدی تمام گھریلو امور طے کئے۔اس وقت میرے تمام بچے سکول و کالج میں زیر تعلیم تھے۔میری اہلیہ محترمہ میری طرح ہی بچوں کی معیاری اور اعلیٰ تعلیم پر یقین رکھتی ہیں اس لئے مجھے خاطر خواہ تسلی تھی کہ بچوں کی تعلیم متاثر نہ ہوگی۔ میں نے اس موقع کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزی کا وسیلہ جانتے ہوئے اس Event میں بھرپور شمولیت کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے اس پروجیکٹ کا میاں ظہیر احمد سے ذکر کیا اور اُن سے مشورے کا طالب ہوا۔انہوں نے اس منصوبے کو بے حد پسند کیا بلکہ مجھے مشورہ دیا کہ میں ان کے بڑے بیٹے عمران احمد کو ساتھ لے جاؤں تا کہ وہ بھی نہ صرف دنیا دیکھے اور تجربہ حاصل کرے اور اس طرح آپ اکیلا پن بھی محسوس نہ کرینگے۔ظاہر ہے دو آدمیوں کی کارکردگی ایک آدمی کی نسبت بہتر ہوتی ہے۔دوستی کے ناطے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔دوسرے روز ہی عمران احمد کو لے کر چودھری محمد شریف، پاسپورٹ آفیسر، بہاول پور کے پاس گیا جو کہ میرے بہت عزیز دوست تھے۔ان کو تمام حالات اور جلد از جلد پاسپورٹ حاصل کرنے کی خواہش کی وجہ بتائی۔وہ بہت توجہ سے میری بات سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔جب میں خاموش ہوا تو میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذات لیتے ہوئے انہوں نے پاسپورٹ بنانے کا آرڈر لکھ کر کلرک کو بلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبایا۔گھنٹی کے بجتے ہی متعلقہ کلرک آ گیا۔اس کو ہدایت دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ ارجنٹ پاسپورٹ ہے فوراً تمام عمل مکمل کر کے پاسپورٹ بنا دیا جائے۔کلرک کاغذات لے کر جب جانے لگا تو انہوں نے پُرتکلف چائے کا آرڈر بھی دے دیا۔چائے نوشی کے درمیان انہوں نے ازراہِ تفنن فرمایا: میرے دوست یہ جو آپ نے پاسپورٹ بنوانے کے

لیے تمہید باندھی تھی یہ پاسپورٹ بنوانے کے لیے ناکافی ہے۔ یہ ہمارے سرکاری طریقہ کار کے مطابق نہیں ہے ۔البتہ آپ کا ذاتی طور پر آنا اور اس لڑکے کی گارنٹی دینا مجھے منظور ہے۔ کیونکہ میں آپ کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور اس لئے میں نے اپنے دیے ہوئے نوٹ پر آپ کے دستخط اور شناختی کارڈ کی کاپی ساتھ لف کی ہے۔ میں چودھری محمد شریف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بمعہ عمران احمد جانے کے لیے اجازت کا طلب گار ہوا۔ وہ ہماری عزت افزائی کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور ہمیں دروازے تک الوداع کرنے آئے۔ دوسرے روز ہمیں پاسپورٹ مل گیا اور اسی وقت ڈاکٹر مکرم کو بوٹسوانہ پاسپورٹ کی کاپیاں اور تصاویر FAX کر دی گئیں۔ آئندہ ایک ہفتے کے بعد عمران احمد کا ویزا بھی بذریعہ FAX آ گیا۔ ویزا اسٹال منیجر کے نام پر جاری کیا گیا تھا۔ اس وقت بہاول پور میں FAX کی سہولت یا تو P.C.O یعنی پبلک کال آفس میں میسر تھی یا میرے گھر واقع ٹرسٹ کالونی میں میسر تھی۔ عام لوگ FAX کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔

عمران احمد کی شخصیت کے بارے میں جو 1989/90 میں جیسی بھی تھی عرض کرتا ہوں۔ عمران احمد نے 293 نمبر لے کر میٹرک پاس کیا تھا۔ سٹریٹ بوائز سے دوستی اور کھیل کود کی وجہ سے بات چیت، اندازِ گفتگو، چھوٹے کا لحاظ، بڑے کا ادب ولین دین اور دیگر نیک نام ہونے کی تمام خاصیتوں سے بے بہرہ تھا۔ اچھے کپڑے، زبانی کلامی بڑی بڑی باتیں اور انڈین فلموں نے ،جن کا اس زمانے میں بہت کریز پایا جاتا تھا، اس لڑکے کی ذہنی صلاحیتوں کو سلب کر رکھا تھا۔

اگر میں یہ لکھوں کہ یہ لڑکا اس وقت stooges، Man of Crap اور Blithering Idiot تھا تو بے وجہ نہ ہوگا۔ بعد کی سفری رفاقت، طعام وقیام، گفت وشنید نے اسے ثابت بھی کیا۔ نتیجتاً یہ ایک نالائق ترین اور خود غرض ترین ساتھی ثابت ہوا۔ دنیا کا صاف ستھرا، ترقی کرتا، سادہ رنگین ماحول نہ تو اس لڑکے کی تربیت کر سکا نہ ہی یہ لڑکا سیکھ سکا۔ سیکھنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم یہ لڑکا میرے لئے باعث ندامت ثابت ہوا۔ ویزا، پاسپورٹس اور دیگر سفری کاغذات ہر طرح سے مکمل کرنے کے بعد ہم دونوں کراچی جا کر کالوجی کے ہاں مقیم ہو گئے، جن کا ذکر تفصیلاً کینیا والے باب میں آ چکا ہے جب میں نے اپنا تمام بزنس پلان کالوجی کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ قیمتی مشوروں سے نوازا اور کراچی۔ نیروبی بذریعہ PIA، نیروبی۔ جوہانسبرگ برٹش ائرویز اور جوہانسبرگ۔ گیبرون ائر بوٹسوانہ سے ہماری ریزرویشن اپنی کمپنی میکنن سے کنفرم کروا کر ٹکٹیں ہمارے حوالے کر دیں۔ اب ہم نے ٹریڈ فیئر کے لیے سامان کی خریداری کرنی تھی۔ یہ ہمارے اس ٹور کی اہم ترین بلکہ میں کہوں گا کہ ریڑھ کی ہڈی جتنا کا مرحلہ تھا۔ کالوجی نے اپنی گھریلو کاروں کے fleet میں سے ایک کار، جس کی ٹینکی پٹرول سے ٹاپ آف تھی، ہمارے حوالے کر دی اور ہمیں کراچی ہول سیل مارکیٹس کے نام اور لوکیشنز کے بارے میں ایک لیکچر دے کر کہا

wish you Good Luck۔صبح سے ہم نے نہ صرف اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرنی تھی بلکہ مارکیٹس کے مگر مچھ نما تاجروں سے بھی خود ہی نمٹنا تھا۔دوسرے روز ہم سب سے پہلے بولٹن مارکیٹ گئے جہاں سے ہم نے کوریا، سنگاپور اور تائیوان کی بنی ہوئی مصنوعی جیولری اور خواتین کی آرائش کا دیگر سامان لیا۔تمام دن بولٹن مارکیٹ میں ہی گزر گیا۔جسمانی اور ذہنی طور پر تھک چکے تھے۔تمام سامان ہم نے چلٹن ہوٹل کے ایک کمرے میں جمع کرنا شروع کر دیا جو اسی مقصد کے لیے ہم پہلے ہی کرایہ پر لے چکے تھے۔رات گہری نیند بلکہ مدہوشی میں گزر گئی۔صبح زینب مارکیٹ کی باری تھی۔ٹھیک 10 بجے ہم دونوں زینب مارکیٹ کی سیڑھیوں میں کھڑے مختلف دکانداروں اور کمپنیوں کے بورڈ پڑھ رہے تھے۔حاجی منیر پر ہماری نظر پڑی تو ان کے پاس جا بیٹھے۔حاجی صاحب دلی کے مہاجر تھے۔ لمبی داڑھی، موٹی توند، قد کاٹھ بھی بہت اچھا، گفتگو میں بھی نرم خُو۔جب آہستہ آہستہ ہم نے اپنا مدعا ٹی شرٹس کی ڈیمانڈ کی صورت میں بیان کیا تو انہوں نے چابیاں ملازم کو دیتے ہوئے کہا کہ سٹور کھول کر پنکھے چلا دو۔بیٹھک کی صفائی کر کے، چادریں جھاڑ کر دوبارہ بچھا دو۔ہم ابھی اپنے مہمانوں سمیت آ رہے ہیں۔حاجی صاحب کے ایک بزنس پارٹنر میمن سراج بھی تھے جو مسکین سے شرافت کا پتلا نظر آتے تھے۔وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لئے۔حاجی صاحب کا سٹور ٹی شرٹس کی پیٹیوں سے چھت تک بھرا ہوا تھا۔ہم لوگ ایک صاف ستھرے کمرے میں گاؤ تکیوں کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔جس کو یہ لوگ اپنی بات چیت کے دوران بیٹھک کے نام سے پکارتے تھے۔بہر حال یہ ایک صاف ستھری جگہ تھی۔جہاں پر ہم نے بیٹھ کر بہت سی پیٹیاں کھلوا کر مختلف ٹی شرٹس کے نمونے و سائز اور رنگ دیکھے۔بھاؤ تاؤ کیا اور ایک بڑی کھیپ خرید لی۔کھانا بھی حاجی صاحب نے بڑا پر تکلف کھلایا جو ہم سب نے دعوت شیراز کی طرح فرشِ محمدی پر ہی بیٹھ کر کھایا۔نماز ظہر اور پھر نماز عصر بھی حاجی صاحب کے ساتھ مارکیٹ سے ملحقہ مسجد میں ادا کی۔حاجی صاحب کا تعلق تبلیغی جماعت سے تھا اس لئے وہ موقع محل کے حساب سے کوئی لمحہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ہم نے ان کو بتایا کہ یہ سب مال اور ہوٹل کے کمرے میں رکھا ہوا دیگر سامان، افریقہ کے ملک بوٹسوانہ جائے گا۔ان کی سمجھ میں افریقہ تو آ گیا مگر بوٹسوانہ کے لیے وہ لاچار نظر آئے۔انہوں نے کہا کہ اگر آپ کو فارورڈنگ ایجنٹ درکار ہو تو میں آپ کو ایک نوجوان لڑکے سے ملواتا ہوں۔جو بہت محنتی ہے اور ابھی موٹر سائیکل پر ہی کام کرتا ہے۔قابل لڑکا ہے۔میں ہر طرح سے اس کا ذمہ دار ہوں۔یہ جو بڑے بڑے فارورڈنگ ایجنٹ ہیں اپنے وعدے کا پاس نہیں کرتے۔آپ کا سامان کیونکہ ٹریڈ فیئر میں جا رہا ہے اس لئے اگر لیٹ ہو گیا تو آپ کے کس کام کا۔ان کی یہ بات میرے دل کو لگی کیونکہ میں پہلے ہی ذہنی طور پر اس قسم کے خدشات کا شکار تھا۔میں نے حاجی صاحب سے کہا کہ آپ اس نوجوان کو بلوائیں۔جب تک ہم نے ڈیل فائنل کی وہ صاحب بھی آ گئے۔بات چیت کے بعد انہوں نے کہا کہ جب آپ مجھے سامان اٹھانے کی اجازت دینگے اس کے تیسرے روز میں آپ کو

Air Way Bill دے دوں گا۔ یہ ایک اچھی آفر تھی۔ میں نے اسے کہا کہ کل ہمارا شاپنگ کا آخری دن ہے۔ پرسوں آپ اپنی ٹیم کے ساتھ آ جائیں۔ تمام پیکنگ انٹرنیشنل معیار پر ہمارے سامنے کریں۔ پیکنگ لسٹ بنا کر ہمارے حوالے کریں اور سامان لے جائیں۔ اس نے ہم سے ای فارم اور دیگر کاغذات کے بارے میں پوچھا جو ہم بہاول پور سے تیار کروا کر لے گئے تھے۔ وہ دیکھ کر بولا آپ کے تمام کاغذات مکمل ہیں اور اپنی ٹیم کے ساتھ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ حاجی صاحب کے ساتھ ہماری ڈیل بہت اچھی رہی۔ رات گئے ہم واپس گھر آ گئے۔ بے انتہا تھکاوٹ کی وجہ سے جلد ہی نیند کی آغوش سے ہوتے ہوئے پریوں کے دیس میں چلے گئے۔ صبح دیر سے اٹھے۔ تیار ہو کر مارکیٹس میں بقایا سامان کے لیے چلے گئے۔ آج ہم نے لیڈیز شلوار قمیض کی خریداری کیجیے افریقہ میں پنجابی سوٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہندو و مسلم خواتین زیب تن کرتی ہیں۔ دیگر تمام آئٹم بھی حاجی صاحب کے گودام میں پہنچا دیے تا کہ اگلے دن سب کی پیکنگ ہو کر سامان کلیرنس کے لیے ائرپورٹ چلا جائے۔

اگلے روز ہمارا کلیرنگ ایجنٹ ایک گھنٹے کی تاخیر سے اپنی ٹیم کے ساتھ آ گیا اور گورنمنٹ کے منظور شدہ طریقہ کار کے مطابق تمام سامان کی پیکنگ شروع کر دی گئی۔ جو سامان ہم نے پہلے دن خریدا تھا اور گھر میں رکھا تھا وہ بھی ہم اپنی کار میں بھر کر ساتھ لے آئے تھے تا کہ پیکنگ مکمل ہو جائے۔ شام تک پیکنگ مکمل ہو کر سامان کا (Consignment) کسٹم اتھارٹی کی نگرانی میں ائرپورٹ پر موجود تھا۔ اب ہم فارغ تھے اور تمام کاغذات دو دن کے بعد ہمیں ملنے تھے اس لئے کراچی گھومتے رہے۔ آئندہ کے بزنس کے لیے ہول سیل مارکیٹس اور کارخانہ داروں سے ملاقاتوں کا سروے جاری رکھا۔ جس طرف بھی گئے علم و تجربے کے موتی چُن چُن کر لائے۔ کراچی بزنس کا سمندر ہے۔ آپ جب بھی غوطہ زن ہونگے کوئی نہ کوئی نایاب موتی لے کر ہی آئینگے۔ ہم دونوں بھی اس سمندر میں ایک چھوٹی سی مچھلی کی مانند گھومتے رہے حالانکہ خوفناک مگرمچھوں نے ہمیں نگلنے کی بہت کوشش کی۔

آخر ہم اسی سمندر کے اوپر سے پرواز کرتے ہوئے عازم افریقہ ہو گئے۔ ہمارا کسٹم کلیرنگ ایجنٹ اچھا، محنتی اور وعدہ کے مطابق سچا ثابت ہوا۔ تمام کاغذات اس نے بروقت ہمیں لا کر دیے اور ہم پرواز کرنے کے اہل ہوئے۔ نیروبی تک ہم قومی ائرلائن کے مہمان تھے۔ ایک رات ہم نیروبی ٹرانزٹ میں قیام پذیر رہے اور دوسری صبح برٹش ائرویز سے جوہانسبرگ کے لیے روانہ ہوئے۔ نیروبی ائرپورٹ کے حالات اسی کتاب کے کینیا والے باب میں لکھ چکا ہوں اس لئے دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماسوائے یہ کہ عمران کے پاس ویکسی نیشن کارڈ نہیں تھا۔ اس کو لیڈی ڈاکٹر نے کلائی سے پکڑا ہوا تھا اور ایک طرف کو گھسیٹ رہی تھی۔ میں پاسپورٹوں پر مہریں اور ویزے لگوا کر فارغ ہوا تو میں نے یہ سین دیکھا۔ جبکہ دوسرے لوگ بھی یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ عمران صرف What,What کر رہا تھا کیونکہ اس وقت اس کو بس اتنی ہی انگریزی آتی تھی۔ میں نے لیڈی ڈاکٹر سے کہا کہ

لڑکے کی کلائی چھوڑ کر ہمیں اپنے آفس میں لے چلو اور اپنے طریقہ کار (Procedure) کے مطابق جو بھی ایکشن لینا چاہو آپ لے سکتی ہو مگر یہ تماشا مت کرو۔

وہ بولی Ok,Fine اور اس نے کلائی چھوڑ کر کہا Please Come to this side اور ہم آفس میں چلے گئے۔ وہ ہانپتی ہوئی اپنی کرسی میں پھنس کر بیٹھ گئی اور مجھے کہنے لگی کہ آپ اپنا کارڈ دکھائیں۔ میں نے جھٹ سے کارڈ نکالا اور اس کو دے دیا۔ کارڈ دیکھ کر وہ بہت مایوس ہوئی۔ اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ ایک شکار تو ہاتھ سے نکل گیا۔ ابھی وہ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ میں نے اس سے کہا کہ کیا آپ کو پتہ ہے آپ کے آفس میں کیوں آیا ہوں؟ وہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک نوٹ 10 ڈالر کا لہرایا اور اس کے آگے رکھ دیا کہ یہ تو آپ کا گفٹ ہے۔ اگر آپ اس لڑکے کو انجکشن لگا کر کارڈ بنا دیں تو میں آپ سے رسید مانگے بغیر آپ کی کارڈ فیس آپ کو ادا کر دونگا۔ اس طرح دوستی بھی پکی ہو جائے گی اور آتے جاتے آپ کے گفٹ بھی آیا کریں گے۔ وہ بولی مجھے آپ جیسے دوستوں پر فخر ہے اور جلدی سے نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ پھر عمران کو انجکشن لگا لیے گئے اور اس کی فیس بھی جیب میں رکھ لی گئی۔ انجکشن میں نے دانستاً لگوائے تا کہ زندگی پر خطرے کی تلوار نہ لٹکتی رہے۔ ورنہ ڈالر لے کر وہ بغیر انجکشن بھی کارڈ بنا کر دینے کو تیار تھی۔ بلکہ ہر حکم اور فرمائش بھی ماننے کو تیار تھی۔ ہم ابھی کسٹم ہال کے دروازے پر ہی تھے کہ ایک افریقن نوجوان بھاگا بھاگا آیا اور ہم سے کہنے لگا: آج ہمارا یوم آزادی ہے۔ ہمارے سابق مرحوم صدر کو انگریزوں نے آج کے دن جیل سے رہا کیا تھا اور یہ ائر پورٹ بھی اسی کے نام سے ہے۔ آج آپ نے اسی ائر پورٹ پر لینڈ کیا ہے۔ لہٰذا مجھے جشن منانے اور بیئر پینے کے لیے 10 ڈالر دیکر جائیں۔ میں اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے ہال میں داخل ہو کر اپنا سامان تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔

دوسرے روز پھر ہم تمام مراحل سے گزرتے ہوئے برٹش ائیر ویز کی پرواز سے جوہانسبرگ کے لیے عازم سفر ہو گئے، یہ ایک ہموار پرواز تھی۔ سروس بھی اچھی تھی۔ ائر ہوسٹس نارمل سی اور Rocky faces تھیں۔ میرا خیال ہے کہ افریقن پروازوں میں Superiority Complex کی وجہ سے اکثر یورپین ائر ہوسٹس کا لہجہ اور Face Expressions موقع محل کے حساب سے بدلتے رہتے ہیں۔ میں نے ان کو فلائٹس میں ڈانس کرتے، Kissing کرتے بھی دیکھا ہے۔ پتھر کے بت بنتے بھی دیکھا ہے اور ''صلائے عام ہے نکتہ یاران داں کے لیے'' پر عمل کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ صرف خوشنودی کی ضرورت ہے۔ پھر جام بھر بھر کر ساقی، بلکہ جام بھرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، ڈائریکٹ منہ لگا کر پی ساقی اور بنا دے متوالا ساقی! لیکن یہ ایک افریقن منزل کی طرف رواں دواں فلائٹ تھی اس لئے پتھر کے بت صنم خانے میں گھوم پھر رہے تھے۔ شام 5 بجے جہاز John Smith

پورٹ، جوہانسبرگ، ساؤتھ افریقہ لینڈ کر گیا۔ یہ ایک خوبصورت شام تھی۔ ہر طرف بہت پیارا منظر تھا۔ائر پورٹ کا ڈسپلن قابل دید تھا۔ ہر کام قانونی طریقہ کار کے مطابق جاری تھا۔ہم ٹرانزٹ میں تھے۔ پھر بھی لاؤنج کے ساتھ ملحقہ ڈائننگ روم میں کھانے پینے کا بہترین بندوبست تھا۔مگر ہمارے لئے بیکار تھا۔ نہ تو ہم نے حرام کھانا تھا اور نہ ہی اُم الخبائث کو ہاتھ لگانا تھا۔بس سوفٹ ڈرنکس، کافی اور فش وغیرہ سے گزارہ کیا۔ رات آٹھ بجے ائر بوٹسوانہ سے ہماری فلائٹ گیبرون کے لیے تھی۔فلائٹ اپنے شیڈول کے مطابق وقت مقررہ پر اناؤنس ہوگئی۔ ہم دونوں جہاز میں سواع ہو گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا جیٹ ائر کرافٹ تھا جو 15/20 لوگوں سے ہی بھر گیا تھا۔ 45 منٹ کی فلائٹ کے بعد گیبرون انٹرنیشنل ائر پورٹ پر اس خاموشی سے لینڈ کیا کہ کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ امیگریشن کاونٹر پر ہمارے اصل ویزے موجود تھے جو ڈاکٹر مکرم صاحب نے ہماری فلائٹ اناؤنس ہوتے ہی جمع کروائے تھے۔ نہ کوئی سوال جواب نہ کسی قسم کے لالچ کا اظہار۔ ہر کام ڈسپلن اور قانون کے مطابق کیا جا رہا تھا۔تمام سٹاف کا رویہ بھی نارمل تھا۔

Sir Serete Khama انٹرنیشنل ائر پورٹ، گیبرون (بوٹسوانہ) کے تمام قانونی عمل سے گزر کر ہم باہر آ گئے جہاں پر ڈاکٹر مکرم ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔ائر پورٹ سے 3/2 کلومیٹر کی دوری پر ماروبیلا روڈ سے ملحقہ آفیسر کالونی میں ڈاکٹر صاحب کی سرکاری رہائش گاہ تھی۔ وہاں پہنچ کر تھکاوٹ کی وجہ سے جلد ہی سو گئے۔صبح ڈاکٹر صاحب سے صلاح مشورے کے بعد طے پایا کہ جیسے ہی ہمارا کارگو گیبرون پہنچتا ہے اس کو کسٹم سے کلیرا کروا کر امتیاز بھائی کے گھر میں رکھا جائے گا۔

سید امتیاز علی ایک پاکستانی جو راولپنڈی کے رہنے والے اور U.N.D.V.P میں کام کرتے تھے۔آج کل وزٹ پر امریکہ گئے ہوئے تھے اس لئے ان کا گھر خالی تھا۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے تعلقات کی بنیاد پر ان سے عارضی طور پر ہمارے لئے وہ گھر استعمال کرنے کی اجازت لے رکھی تھی۔ یہ ایک بہت اچھا گھر تھا۔سرونٹ کوارٹر میں ایک افریقن لڑکی مقیم تھی جو گورنمنٹ کے کسی آفس میں ملازم تھی اور بوٹسوانہ کے کسی دوسرے شہر کی رہنے والی تھی۔ دوسرے روز ہی ہمیں گھر اور کار کی چابیاں مل گئی۔ یہ وہی کار تھی جس پر ہم ساؤتھ افریقہ گئے تھے۔ دراصل پردیس میں ہر فرد اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ایک دوسرے کو واجبی سا ہی ٹائم دے سکتا ہے۔اس لئے شروع دن سے ہی Independent ہونا پڑتا ہے۔ ذاتی طور پر میں بھی اسکے حق میں ہوں کیونکہ ترقی اور علم کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔کار ہمارے پاس تھی اور ٹائم بھی تھا اس لئے ہم نے مارکیٹس، شاپنگ مال اور بزنس مین وزٹ کرنا شروع کر دیے۔

جب ہم نے مسلم اور انڈین کمیونٹی کو پنجابی سوٹ (شلوار قمیض برائے خواتین) کے بارے میں بتایا تو وہ

Excited ہوکر بے چینی سے ہمارے کارگو کا گیبرون پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔

بوٹسوانہ کے قانون کے مطابق اگر آپ کے پاس اپنے ملک کا ڈرائیونگ لائسنس ہے تو آپ اس لائسنس پر چھ ہفتے تک گاڑی ڈرائیو کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد کسی بھی ڈاکخانے میں جا کر اپنا لائسنس دکھا کر مقامی لائسنس حاصل کر سکتے ہیں۔ فیس صرف ایک بار ادا کرنی ہوتی ہے جبکہ وہ لائسنس تاحیات کارآمد ہوتا ہے۔ خود ڈرائیو کرنے کی وجہ سے راستے خوب یاد رہتے ہیں۔

ٹریڈ فیئر شروع ہو چکا تھا۔ ہمارا کچھ سامان جو ہم پہلے ٹور پر ساتھ لائے تھے، ڈاکٹر صاحب کے گھر پڑا ہوا تھا۔ ہم نے وہی Display کر دیا تا کہ ہماری شمولیت ہمارے ملک کے نام سے کنفرم ہو جائے۔ میں پاکستان ٹورازم کے آفس سے ادائیگی کر کے بڑے سائز میں اپنے نادرن سیکٹر کے پوسٹر بھی لایا تھا۔ یہ قدرت کی صناعی اور خوبصورتی دکھانے کا خاموش ذریعہ بھی تھا اور خوبصورت پاکستان کا تعارف کروانے میں بہت مددگار تھے۔ جو بھی وزیٹر آتا دیکھتا ہی رہ جاتا کہ پاکستان اتنا خوبصورت ملک ہے۔ ماشااللہ! ہمارا بچا کچھا سامان بھی خوب سیل ہونے لگ گیا۔ جس سے ہمیں کافی حوصلہ ملا اور ہمارے محنت کرنے کے جذبے کو مزید جلا بخش گیا۔ پاکستان سے کچھ اور لوگ بھی دیگر سامان لے کر اس ٹریڈ فیر میں شمولیت کرنے آئے ہوئے تھے۔ جن میں ایک صاحب (نام یاد نہیں رہا) کراچی سے ہینڈی کرافٹ لے کر آئے تھے۔ ان کا سٹال کافی بڑا تھا۔ ایک اور صاحب جن کو سب عباسی صاحب کہہ کر پکارتے تھے، قالین لے کر آئے تھے۔ دیگر ممالک سے بھی مختلف سامان آرائش لے کر آنے والے اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کر رہے تھے۔ ٹریڈ فیئر میں گہما گہمی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ایک روز حسن نانک آف ماریشس بمعہ اپنے بیٹے اختر نانک کے تشریف لے آئے۔ محترمہ بھابھی حوا بیگم (حسن نانک کی زوجہ محترمہ) بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ انہوں نے آتے ہی ہمارے اسٹال کے سامنے اپنا مووی کیمرہ فٹ کر کے شوٹ کرنا شروع کر دیا۔ یہ ریکارڈنگ یادگار کے طور پر میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ ہمارے سٹال پر لوگ ذوق شوق سے آتے تھے، جن میں زیادہ تر خواتین تھیں۔ تواتر سے آنے والوں میں ائر بوٹسوانہ کی Imfo نامی ایک سمارٹ سی ائر ہوسٹس، حسن نانک اینڈ فیملی، ڈاکٹر مکرم اینڈ فیملی، مسٹر لونیل اینڈ فیملی، خان اینڈ فیملی شامل تھے۔ خان فیملی پشاور سے تھے اور انہوں نے گیبرون میں سکول کھولا ہوا تھا۔ دونوں میاں بیوی بمعہ بیٹی جب بھی تشریف لاتے ہماری ہمت اور حوصلے کی داد دیے بغیر نہ جاتے۔ بہت Sober لوگ تھے۔

ایک خاتون جو پچاس کے لگ بھگ عمر کی ہوگی، اپنے خاوند صدیقی صاحب سمیت جوائر پورٹ پر سول ایوی ایشن آفیسر تھے، تشریف لاتی تھیں۔ ان کا تعلق بھی کراچی سے تھا۔ ایک ٹھگ بھی اکثر آتا۔ اس کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا اور ایک مقامی عورت کا اکلوتا شوہر تھا۔ کچھ بچے بھی تھے۔ خود کو انٹیلیکچوئل Intellectual سمجھتا تھا اور تمام

سامان ادھار پر خریدنا چاہتا تھا۔اس کی اپنی ایک دیہاتی دکان تھی جس کو وہ اور اس کی بیوی اپنا بزنس انٹر پرائز بتایا کرتے تھے پر۔وہ یہ ادھار پر لیا گیا سامان اپنی دکان پر رکھ کر فروخت کرنے کا خواہشمند تھا۔بوٹسوانہ کے دوسرے شہروں مثلاً فرانسس ٹاؤن، ملا پیا پلا پیا، Lobatse Tlakweng, Ramotseua, Mochudi, Melepololee, Selibephkwe. میں جو بھی پاکستانی اور انڈین تھے، گاہے بگاہے آتے رہے۔خریداری کے علاوہ ایک دوسرے کا حال احوال ضرور شیئر کرتے جو ہم ایشین کا خاصہ ہے۔اس لئے ہمارا حلقۂ احباب وسیع ہوتا گیا۔ڈاکٹر مکرم اپنے حلقۂ احباب سے ہمارا تعارف اپنے بڑے بھائی کے طور پر کرواتے۔گیبرون اس وقت بہت بڑا شہر نہیں تھا۔ذرا سی بات بھی پوری ایشین کمیونٹی میں وبا کی طرح پھیل جاتی تھی۔کچھ خواتین وحضرات اپنا فارغ وقت اسی مشغلے میں گزارتے۔یہاں تک کہ لوگوں کی Privacy میں دخل انداز ہو جاتے۔

اس کی کچھ مثالیں اور تعارف آپ کی دلچسپی کے لیے پیش کرتا ہوں۔آنٹی ریڈیو بوٹسوانہ۔مجھے ڈاکٹر صاحب نے بتایا تھا کہ مسز صدیقی کسی بات کو بھی ہضم نہیں کر سکتی۔ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا کر نہ صرف گیبرون بلکہ پورے بوٹسوانہ میں نشر کر دیتی ہے۔اس لئے ہم سب نے اس کا نام آنٹی ریڈیو بوٹسوانہ رکھا ہوا ہے۔آپ ان سے بہت محتاط گفتگو کیا کریں۔میں ایسی باتیں سنی اَن سنی کر دیتا تھا کیونکہ نہ تو میرے پاس کچھ چھپانے کو تھا اور نہ ہی کچھ ظاہر کرنے کے لیے تھا۔یہ مردانہ وجاہت واطوار کے خلاف بھی تھا۔یہ پڑھے لکھے جاہل نہ جانے پردیس میں اپنا آپ سنوارنے اور اپنے خاندان کی بھوک مٹانے کے لیے آئے تھے یا اپنے آباؤاجداد کی اصلیت دکھانے اور اپنے "DNA" پر واپس جانے کے لیے۔خاندانی پیشے چھوڑ کر جو تعلیم انہوں نے حاصل کی، کیا اس تعلیم سے بھی انہوں نے کچھ صلہ نہیں پایا۔آنٹی سٹال پر کئی بار تشریف لائیں۔کبھی انہوں نے کسی کے متعلق کوئی خاص بات نہ کی ماسوائے سلام دعا یا حال احوال کے۔وہ ڈاکٹر صاحب کے گھر بھی اکثر آتی تھی۔کبھی ان کے شوہر صدیقی صاحب ان کے ساتھ ہوتے اور کبھی وہ Self Drive کرتی ہوئی اکیلی ہی آجاتی تھی۔ایک روز وہ سٹال پر تشریف لائی۔مجھے کہنے لگی بھائی ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں اگر آپ برا نہ منائیں تو؟ میں نے مسکرا کر کہا آپ بلاکم وکاست ہر سوال کر سکتی ہیں اور میں لگی لپٹی کے بغیر آپ کے ہر سوال کا جواب دونگا۔میرا جواب ہی آپ کو بتائے گا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔وہ بظاہر تو میری بات سے محظوظ ہوئی لیکن حیرانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔وہ بولی کیا آپ ڈاکٹر مکرم کے سگے بھائی ہیں؟ میں نے کہا نہیں! میرا تعلق ککے زئی قبیلے سے ہے اور بہاول پور پاکستان کا رہائشی ہوں۔ڈاکٹر صاحب میرے دوست اور بزنس پارٹنر ہیں۔یہ لڑکا عمران میرے ایک دوست کا بیٹا ہے۔وہ اور صدیقی صاحب ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہ گئے۔آنٹی نے کہا کہ آج رات میرے گھر پر ڈنر ہے جس میں آپ کی شمولیت سے مجھے خوشی ہوگی۔مزید انہوں نے بتایا کہ چیدہ چیدہ پاکستانی فیملیز مدعو ہیں ان سے بھی آپ کا

تعارف ہو جائے گا۔ میں نے ان کی دعوت بخوشی قبول کر لی ۔رات 8 بجے سٹال کلوز کرنے کے بعد بمعہ ڈاکٹر صاحب ،ہم آنٹی کے گھر موجود تھے ۔ڈاکٹر صاحب کی فیملی پہلے سے وہاں موجود تھی ۔کھانے کا معیار ومقدار اور Display بے حد اچھا تھا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب نے یہاں آنے سے پہلے ایک سے زیادہ بار مجبور کیا کہ میں آنٹی کے کسی ذاتی سوال کا جواب نہ دوں ۔ مجھے دوسرے کا کمانڈ اینڈ کنٹرول اپنی آزادی اور زندگی میں سخت ناپسند ہے۔ اپنی زندگی کی قیمت پر بھی میں نے دوسرے کی Supermacy کبھی قبول نہ کی ۔اس وقت بھی نہیں جب میں ایک بے بس بچہ تھا۔ایک نہایت ہی کمینے ، جاہل، بدخصلت اور بدمعاش شخص نے جو اپنے آپ کو میرا بھائی کہتا تھا مجھ پر بہت مظالم ڈھائے تھے۔مگر ہر بار مجھ سے شکست کھائی اور پاگل کتے کی طرح ہانپتا کانپتا رہا۔تفصیل کے لیے پڑھیے میری پہلی تصنیف:''فرشتے کی ایف ۔آئی۔آر (جلد اول) ۔ یہاں ایک حکایت قارئین کی نذر کرونگا۔ نوجوان نسل کے لیے یہ ایک پیغام ہوگا۔

ایک شکاری کتا ایک خرگوش کا تعاقب کر رہا تھا۔ کتے نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح خرگوش قابو آجائے ۔مگر خرگوش کی جان پر بنی ہوئی تھی ۔اس نے کتے کو زِگ زیگ کی شکل میں بھگا بھگا کر اس کا برا حال کر دیا۔خرگوش ایک کھوہ میں گھس کر ہانپنے لگا ۔کتا بھی اسی کھوہ کے باہر بیٹھ کر ہانپنے لگ گیا۔ جب ہانپنا کم ہوا تو کتے نے دیکھا کہ وہ خرگوش کو دیکھ تو سکتا ہے مگر منہ اور پنجے کھوہ میں ڈال کر خرگوش کو پکڑ نہیں سکتا۔ کتے نے خرگوش سے پوچھا کہ تم ایک چھوٹے سے جانور ہو مگر اتنا تیز کیسے بھاگ لیتے ہو۔خرگوش نے جواب دیا تم دوسروں کے لیے بھاگتے ہو اور میں اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا ہوں۔ دوسروں کے لیے کسی بھی لالچ کے تحت کتا بننے کی بجائے اپنے مالک و خالق پر بھروسہ کرنا چاہئے ۔اس لئے آنٹی نے جو سوال بھی مجھ سے پوچھا میں نے اس کا صحیح جواب دیا۔کھانے کے بعد اکثر مہمان چلے گئے ۔ڈاکٹر صاحب کی فیملی بھی چلی گئی ۔آنٹی نے بتایا کہ میں ایک بہت امیر فیملی میں بطور سیکرٹری ٹو بیگم صاحبہ کام کرتی رہی ہوں ۔اس بیگم صاحبہ کا تعلق بھی ککے زئی فیملی سے تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر آپ نام لیں تو میں جان پہچان نکال سکتا ہوں ۔انہوں نے نواب جی معین الدین کا نام لیا۔ میں بے اختیار ہنس پڑا۔ دونوں میاں بیوی نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور کہا کیا آپ اس فیملی کو جانتے ہیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ نواب جی معین الدین کی والدہ ماجدہ اور میری دادی جان سگی بہنیں ہیں ۔اس طرح نواب صاحب میرے والد صاحب کے خالہ زاد بھائی ہوئے اور ان کی اہلیہ محترمہ کا نام آپا مبارک ہے ۔میں نے ان کو مزید بتایا کہ جب 1970 میں میری والدہ محترمہ رحلت فرما گئیں تو آپا مبارک صاحبہ افسوس کے لیے مع مسز جسٹس حمید (آپا ثریا صاحبہ) اور دیگر خواتین کے ہمارے گھر پُرسا دینے تشریف لائی تھیں اور کافی دیر تک تشریف فرما رہیں ۔اس دوران آپا ثریا صاحبہ نے انہیں کہا کہ کھانا ہم لوگ گھر جا کر ہی کھائیں گے تو آپا مبارک صاحبہ نے ترنت جواب دیا

کیوں؟ جہاں ہم اپنے بھائی کے گھر آئے ہیں وہاں ہمیں کھانا نہیں ملے گا۔ وہ شام تک والد صاحب کے پاس بیٹھ کر میری محترمہ والدہ مرحومہ کے بارے میں باتیں اور دعائے مغفرت کرتی رہیں اور کھانا تناول فرما کر گئیں۔ آنٹی پھڑک اٹھی کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا، میں بطور سیکرٹری بیگم صاحبہ ان کے ساتھ تھی۔ مجھے سب یاد ہے۔ آپ کا گھر جسے کوتوال صاحب کی حویلی کہتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے شوہر صدیقی صاحب کی طرف رُخ کر کے کہا دیکھو میں نے آپ کو متعدد بار کہا تھا کہ یہ لڑکا تو پٹھانوں کا بیٹا معلوم ہوتا ہے۔ بات چیت، اُٹھنا بیٹھنا کھانا پینا غرض اس کی کوئی بھی عادت ڈاکٹر مکرم سے مماثلت نہیں رکھتی۔ اس کے بعد آنٹی جب بھی مجھے ملی بہت عزت احترام کے ساتھ ملی۔ ہمیشہ ان کے رویے میں محبت اور لحاظ ہوتا۔ میں نے ہمیشہ ان کو مہذب پایا اور وہ ایک معزز خاتون تھیں۔ اگر کبھی راہ چلتے سڑک یا کسی چوراہے پر ان کی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو فوراً کار کا شیشہ نیچے کر کے کہتیں Hello Relative اور میں مسکرا کر ہاتھ ہلا کر ان کو جواب دیتا۔ ان لوگوں نے آنٹی کے خلاف غلط افواہیں پھیلا رکھی تھیں۔

مسٹر اینڈ مسز لونیل اکثر ہمارے سٹال پر آتے۔ دونوں ٹھیٹ پنجابی بولتے تھے۔ مسز لونیل ہاؤس وائف تھی جبکہ مسٹر لونیل بوٹسوانہ پولیس میں DIG کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں جو لندن میں زیر تعلیم تھیں۔ مسٹر لونیل کا بھائی بوٹسوانہ سی آئی ڈی میں ASP تھا۔ اس کی بھی دو بیٹیاں تھیں اور کالج میں زیر تعلیم تھیں۔ ایک دن باپ بیٹیاں اکٹھے ہی خریداری کے لیے ہمارے سٹال پر تشریف لائے۔ ان کی بیٹیوں بہت موٹی تازی تھیں۔ over-weight ہونے کی وجہ سے بے ڈھبی سی لگ رہی تھیں۔ میں نے از راہِ مذاق کہا کہ بی بی آپ دونوں کی صحت بہت کمزور ہے اس پر بھی توجہ دیں۔ اس سے پیشتر کہ وہ لڑکیاں کچھ بولتیں لڑکیوں کے پتا جی بول پڑے ''بھائی صاحب یہ لڑکیاں کھاتے پیتے گھرانے کی ہیں''۔ ساتھ ہی ایک لمبا سا قہقہہ لگا، جس میں میرا کمزور سا قہقہہ بھی شامل تھا۔ اسی طرح جب مسٹر لونیل دیر سے آتے تو مسز لونیل مصنوعی ناراضگی سے پنجابی زبان میں ان سے پوچھتیں ہائے آپ کہاں رہ گئے تھے۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتیں کہ بھائی صاحب کئی بار آپ کا پوچھ چکے ہیں۔ وہ ہنستے ہوئے جواب دیتے کہ میری مرسڈیز کار کی جگہ پر آپ اپنی مرسڈیز کار کھڑی کر آئی ہیں۔ میں اپنی کار کو پارک کرنے کرنے کے لیے اس کی شان کے مطابق جگہ تلاش کر کے کھڑی کر کے آیا ہوں۔ اس لئے دیر ہوگئی۔ جتنی بار بھی وہ تشریف لاتے تو ایسی باتیں ضرور کرتے کیونکہ وہ خاصے شیخی خور تھے۔ بظاہر قابلیت کے لحاظ سے وہ ہماری پنجاب پولیس کے ہیڈ کانسٹیبل کے ہم پلہ بھی نہیں لگتے تھے۔ ان کی مسز سادہ، بھولی بھالی، مہمان نواز، پیار محبت والی تھیں۔ ایسٹ پنجاب کے کسی شہر کی رہنے والی یہ ہندو خاتون بہت اچھی اور نیک دل تھی بس ذرا تعریف پسند تھی۔ ان کا پورا خاندان ہی اس مرض میں مبتلا تھا۔ جب بھی یہ خاتون ہمارے سٹال پر آتی تو ہمیں اپنے

گھر آنے کی دعوت ضرور دیتی، جس کو سن سن کر ہم اکتا چکے تھے۔لیکن ہم کبھی اس کے گھر نہیں گئے۔ دراصل ہم زیادہ لوگوں میں گھل مل کر سوشل نہیں ہونا چاہتے تھے۔ مجھے زیادہ علم نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب اکثر بتایا کرتے تھے کہ آج فلاں ابن فلاں، تمیں مارخاں شکوہ کررہا تھا یا کررہی تھی کہ آج ادریس صاحب سے ملاقات ہوئی تھی لیکن ان کا تو نخرہ ہی بہت ہے۔کوئی لفٹ ہی نہیں کروائی وغیرہ۔

ایک روز رات کو جب ہم ٹریڈ فیئر سے فارغ ہوکر گھر واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ آج ائرفرانس کا جمبو جیٹ کارگو پہنچ گیا ہے۔آپ ائرپورٹ ویئر ہاؤس جا کر اپنا کارگو چیک کر آئیں شاید آ گیا ہو۔ میں اور عمران اسی وقت کار میں ائرپورٹ روانہ ہو گئے۔ ابھی ہم ویئر ہاؤس کے دروازے میں ہی تھے کہ ہمارے تمام کارٹن سلیقے سے ایک پلیٹ فارم پر لگے نظر آئے۔ہم خوشی سے نہال ہو گئے۔اُلٹے قدموں اپنی گاڑی کی طرف چلے آئے اور واپس گھر کی راہ لی۔ایک تو سامان پہنچنے کی خوشی بہت تھی دوسرا ہم آپس میں باتیں کررہے تھے۔رات کے اندھیرے نے بھی راستہ بھولنے میں اہم کردار ادا کیا۔ہمیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب ہم ائرپورٹ سے شہر جانے والی سڑک چھوڑ کر کسی گاؤں جانے والی سڑک پر گاڑی بھگاتے رہے۔روشنیاں غائب ہوگئیں اور سیاہ گھپ اندھیرے کو ہماری کار کی ہیڈ لائٹس کم کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ میں نے کار روک دی اور باہر نکل کر جائزہ لینا شروع کیا۔اللہ کی پناہ! جہاں ہم کھڑے تھے وہ ایک اونچی اور پتھریلی جگہ تھی۔سڑک بھی ختم ہوچکی تھی۔اگر ہم 100 فٹ بھی آگے جاتے تو گہری کھائی میں کار سمیت گر جاتے۔اس وقت بوٹسوانہ کے گاؤں میں بجلی کی سہولت نہیں تھی۔نہ جانے یہ سڑک کسی گاؤں کی طرف جاتی بھی تھی یا ابھی وہاں تک ہی بن پائی تھی۔مگر ہم تو سیدھے چلتے گئے اور اس نوبت تک جا پہنچے۔ میں نے واپس کار میں بیٹھتے ہوئے عمران سے کہا کہ ائرپورٹ کی روشنیاں دور کہیں نظر آرہی ہیں۔ہم ان روشنیوں کی طرف بڑھتے ہیں اور ائرپورٹ پر واپس چلتے ہیں۔عمران کی طرف سے جواب نہ آنے پر میں نے پریشانی کے عالم میں کار کے اندر کی لائیٹ جلائی تو عمران نے رو رو کر اپنا بُرا حال کیا ہوا تھا اور کانپے جارہا تھا۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ راستہ تلاش کرنے میں میری مدد کرو۔خواجہ سراؤں کی طرح رو کر برا حال کرنے سے کیا راستہ مل جائے گا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر بہت احتیاط سے کار کا رخ واپسی کے لیے ائرپورٹ کی روشنیوں کی طرف کیا اور اندازے سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سڑک تلاش کر لی۔واپس ائرپورٹ پر جا کر گھر کی راہ لی اور جلد ہی ماروبیلا روڈ پر پہنچ گئے۔رات کے دو بج چکے تھے۔

صبح میں نے تمام کاغذات مونیکا کلیرنگ ایجنٹ کے پاس جمع کروا دیے۔کچھ کاغذات برکلے بینک کے تھرو آئے تھے۔میں خود برکلے بینک گیا۔کاغذات کو بینک سے سیل لگوا کر واپس مونیکا کے پاس جمع کروائے۔انہوں نے وعدہ کیا کہ شام 4 بجے تک تمام کارگو آپ کے دیے گئے ایڈریس پر پہنچ جائے گا۔وہ وہی گھر تھا جو ڈاکٹر صاحب

نے سید امتیاز علی سے عاریتاً ہمارے لیے لیا تھا۔ بر کلے بینک میں چیک کیش کروانے کے لیے لوگوں کی ایک لائن لگی ہوئی تھی جس میں ڈاکٹر مکرم بھی شامل تھے۔ بینک آفیسر کے پاس بیٹھا میں اپنے کارگو کے کاغذات کلیئر کروا رہا تھا کہ میری نظر ڈاکٹر مکرم پر پڑی۔ وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ میں اخلاقاً اٹھ کر ان کے پاس چلا گیا۔ سلام دعا کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ مونیکا کلیئرنگ والوں نے آبزرویشن لگائی تھی کہ بینک سیل کاغذوں پر لازم ہے اس لئے آیا تھا۔ اس دوران ڈاکٹر صاحب نے اپنی پشت پر کھڑی ایک ادھیڑ عمر مگر باوقار عورت کی طرف اشارہ کر کے انگلش میں مجھے کہا: مہربانی فرما کر ان سے ملیں۔ یہ ہیں ڈاکٹر چیپے "Chepay" ہماری وزیر خارجہ۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بہت احترام سے ملی۔ میرا حال احوال پوچھا۔ میں نے اس کو بتایا کہ میں بوٹسوانہ ٹریڈ فیئر میں شمولیت کے لیے گزشتہ دو ہفتوں سے گیبرون میں مقیم ہوں اور بطور فارن انویسٹر یہاں اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہوں۔ وہ Most Welcome, Most Welcome کہتی رہی اور میرا ہاتھ اس نے پکڑے رکھا یہ۔ خاتون نرم خو، Well Learned، خوش لباس اور خوش اخلاق تھی۔ وزیر خارجہ کا اپنا ذاتی چیک کیش کروانے کے لیے خود بینک میں آنا اور ایک عام بینک کسٹمر کی طرح لائن میں لگ کر اپنی باری کا انتظار کرنا عین اسلامی طریقہ کار نہیں تھا تو اور کیا تھا۔ میں اپنے کاغذات لے کر بینک سے باہر نکلا تو وہ اپنی کار میں بیٹھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہاتھ ہلا کر الوداع کیا۔ یہ تھی ڈاکٹر Chepay وزیر خارجہ آف بوٹسوانہ۔ ڈاکٹر صاحبہ آکسفورڈ لندن سے .Ph.D تھیں۔

چار بجے ہمارا تمام کارگو کسٹم کلیئر ہو کر ہمارے گھر نما گودام میں پہنچ گیا۔ میں نے عمران سے کہا کہ تمام سامان نہیں کھولنا۔ باقی صرف ایک دن رہ گیا ہے اور سامان بہت زیادہ ہے۔ اس طرح سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم نے جیولری اور لیڈیز پنجابی سوٹ ڈسپلے کر دیے۔ آخری روز سب سے زیادہ رش ہمارے سٹال پر تھا۔ خوب سیل ہوئی۔ ہمارے سٹال پر بہت اچھے لوگ بھی آئے، بدنیت بھی آئے، چور بھی آئے۔ ادھار والے تو ایسے آئے جیسے ہمارے کزن ہوں۔ بے انتہا رش دیکھ کر مسز حسن نانک (حوا بیگم)، ان کی بیٹی اور بیٹا اختر بھی آ گئے تا کہ نگرانی کر سکیں اور چوروں سے محفوظ رہا جا سکے۔ حوا بیگم شریف طبع، مہمان نواز اور بہت اچھے کھانے پکانے والی خاتون تھی۔ ٹریڈ فیئر اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ تمام ہوا۔ ہم اپنا بقایا سامان سمیٹ کر اپنی رہائش گاہ پر واپس آ گئے۔

دوسرے روز میں نے عمران کو سمجھایا کہ ہم سامان کو اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ گھر کو تالا لگا کر اکٹھے کہیں نہیں جائیں گے۔ اگر کسی کام سے ایک جائے گا تو دوسرا گھر میں موجود رہے گا تا کہ تالا توڑ کر کوئی چوری نہ کر لے۔ یہ کام پورے افریقہ میں کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ دوسرے روز میں نے تمام بڑے دکانداروں سے ملاقاتیں کیں۔ کچھ نے تھوڑا بہت سامان لیا۔ کچھ نے اُدھار مانگا۔ جو بڑے سمارٹ بزنس مین تھے انہوں نے کہا اے پاکستانی تاجر کہاں

دھکے کھاتے پھرو گے۔تمام سامان ہماری قیمت پر یعنی آدھی قیمت پر ہمیں دو، اپنا پیسہ لو اور جہاز میں بیٹھ کر اپنے ملک پرواز کر جاؤ۔نہ خود خراب ہو اور نہ ہی ہمارا بزنس خراب کرو۔میں دیکھ چکا تھا کہ یہ سب افریقن لوگوں کا کس طرح استحصال کر رہے ہیں۔200-300% سے کم منافع لینا گناہ تصور کرتے ہیں۔خوبصورت بنگلے، بڑی بڑی گاڑیاں، ہر فیملی ممبر کی الگ گاڑی، بڑے بڑے ڈپارٹمنٹل سٹورز، پلازے، Business World, Licken, Chicken Inn. اور دیگر تمام بڑے چھوٹے انٹر پرائزز، سب کے سب ماڑواڑی۔سورت کے رہنے والے جو اکثر خان کہلاتے ہیں۔یہ سب لوگ مقامی افریقن زبان خوب بولتے ہیں۔کسی کا دادا، کسی کا پردادا محنت مزدوری کرنے آیا تھا۔یہ لوگ یہاں پر ہی پیدا ہوئے اور یہاں کے ہی ہو کر رہ گئے۔بزنس میں بہت ترقی کی۔اب ملٹی ملینئر ہیں۔میں 2/3 روز تک خوب گھوما بلکہ ان بزنس مینوں کے پاس گیا۔سب کی روش یہودیوں جیسی تھی۔

البتہ مسجدیں انہوں نے بہت خوبصورت بنائیں ہیں۔باقاعدہ مقدمہ لڑ کر پانچ وقت اذان کی اجازت بھی لی ہے۔مولوی صاحب اپنی مرسڈیز کار میں آتے ہیں۔انگلش میں خطبہ پڑھتے ہیں، نماز پڑھاتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔نہ وہ زکوۃ لیتے ہیں اور نہ ہی ادھر اُدھر کی ہانک کر ان پڑھ یا سادہ لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔بلکہ زکوۃ دیتے ہیں۔مساجد میں تمام مسلم کمیونٹی کا ہر سوشل پروگرام نوٹس بورڈ پر آویزاں ہوتا ہے۔نماز تقریباً سبھی لوگ پڑھتے ہیں۔شیعہ، سنی، وہابی، بریلوی، دیوبندی، جھگڑالوی نیز کسی بھی مسلک کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔

احمدیوں کو بوٹسوانہ اور ساؤتھ افریقہ میں غیر مسلم مانا جاتا ہے۔ساؤتھ افریقہ میں اعلیٰ عدالتیں ان کو غیر مسلم قرار دے چکی ہیں۔اس وقت شیخ غیاث الدین اٹارنی جنرل پاکستان تھے۔ڈاکٹر ریاض الحسن گیلانی ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف پاکستان تھے۔ان کے دیگر ٹیم ممبران اور ان تمام عاشق رسولؐ کی مساعی جمیلہ نے مسلمانوں کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔پوری امتِ محمدیہؐ اُن کی احسان مند ہے اور رہے گی۔

مجھے مقامی بزنس کمیونٹی کے ایک لفظ نے بہت تقویت دی۔وہ لفظ تھا ''تاجر''۔میں نے 100 سال اور اس سے بھی زیادہ پرانے کلچر کی جو تاریخ پڑھی تھی اس میں تاجروں کا بہت اہم مقام تھا۔ملکی معیشت تاجروں کے ہی دم سے قائم و دائم ہوتی تھی۔عرب تاجر، بن غازی کے تاجر، مراکش کے تاجر اور اسی طرح دیگر ممالک کے تاجر اپنے اپنے ملک کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔اگر ہم بادشاہی دور میں جائیں تو تاجروں کی رسائی شاہی دربار تک ہوتی تھی۔نہ صرف انہیں دربار میں کرسی ملتی تھی بلکہ ایک اہم مقام حاصل ہوتا تھا۔یہ سب باتیں میرے ذہن میں ایک فلم کی طرح محفوظ تھیں۔ہم نے تمام سامان پیٹیوں سے نکال کر بہت خوبصورت طریقے سے ایک بڑے کمرے میں ڈسپلے کر دیا۔چھوٹے بلب اتار کر بڑی پاور کے بلب لگا دیے۔یہ ایک خوبصورت منظر بن گیا۔

دوسرے روز ڈاکٹر صاحب کی مدد سے منسٹری آف کامرس میں سیکرٹری کامرس سے ملے اور اُنہیں ایک

درخواست کے ذریعے مطلع کیا کہ پاکستان سے بوٹسوانہ ٹریڈ فیئر میں شمولیت کے لیے مختلف قسم کا سامان لائے تھے لیکن کارگو ٹریڈ فیئر کے آخری دن پہنچا۔اس لئے ہمیں ایک ماہ کی اجازت دی جائے تا کہ ہم بزنس انٹر پرائزز سے مل کر اپنا سامان فروخت کر سکیں۔سیکرٹری صاحب نے کمال مہربانی سے اجازت دے دی۔اب ہماری حیثیت ایک سرکاری تاجر کی سی ہوگئی ۔کیونکہ جس ملک میں بھی آپ جائیں اس ملک کے قانون کی پابندی آپ کا فرض ہے۔ہم نے تمام ایشین کمیونٹی کو دعوت نامے ارسال کر دیے کہ وہ ہمارے عارضی ویئر ہاؤس کا وزٹ کر کے اپنی مرضی کا سامان خرید کر سکتی ہیں۔دو تین دن میں ہی رش لگ گیا۔سیل شروع ہوگئی۔سامان ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔جب ذرا رش کم ہونا شروع ہوا تو ہمیں ایک دعوت نامہ Lobatse شہر سے موصول ہوا۔یہ شہر گیبرون سے تقریباً 100 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور مری آف بوٹسوانہ کہلاتا ہے۔حسن نانک نے ہمیں ایک ویگن عاریتاً دے دی جس کو لوڈ کر کے ہم چیدہ چیدہ سامان لے کر ایک مسلم فیملی کی دعوت پر صبح 9 بجے وہاں پہنچ گئے۔ہماری بہت آؤ بھگت ہوئی۔کافی سے زیادہ سامان بک گیا اور لوگوں میں کافی مقبول بھی ہوئے۔Lobatse مین بازار کے اندر ایک پاکستان جنرل اسٹور بھی تھا جو کسی پاکستانی نے شروع کیا تھا۔یہ ایک اچھا خاصا بڑا اسٹور تھا۔پاکستانی نے یہ سٹور لوکل مسلم فیملی کے پاس فروخت کر دیا تھا۔مگر ایک شرط پر کہ آپ چاہے اس کو خود چلائیں یا آگے فروخت کریں مگر نام پاکستان جنرل سٹور ہی رہے گا اور اس کی پابندی ہر نیا خریدار بھی کریگا۔اس کی رجسٹریشن میں یہ شرط لکھ دی گئی تھی اس لئے آج بھی بوٹسوانہ کے شہر لوباسٹی کے مین بازار میں یہ پاکستان جنرل سٹور موجود ہے۔مالک چاہے بدل گیا ہو مگر نام یہ ہی ہے۔شام تک اپنا اچھا خاصا سامان فروخت کر لیا اور واپسی کا عزم کیا۔ہم نے صبح کی نماز کے بعد سفر شروع کیا تھا۔ویگن رات کو ہی لوڈ کر کے تیار کر لی تھی۔صبح نماز پڑھتے ہی روانگی ہوگئی۔راستے میں ایک واقعہ پیش آ گیا تھا وہ میں اپنے قارئین کرام کی نظر کرنا چاہتا ہوں۔

ابھی ہم نے 40/45 کلومیٹر ہی سفر کیا تھا کہ سڑک نیم پہاڑی علاقے کے جنگل میں داخل ہوگئی۔حالانکہ سڑک کے دونوں طرف اینٹی بار بڈ وائر لگی ہوئی تھی اور نوٹس بورڈ بھی جگہ جگہ لگے ہوئے تھے جن پر انگریزی میں جنگلی جانوروں سے احتیاط کی تلقین کی گئی تھی۔ہماری سپیڈ بھی زیادہ تھی۔مجھے کچھ دھندلا سا دکھائی دیا۔شک پڑا کہ سڑک پر کچھ ہے۔میں نے سپیڈ آہستہ کرنی شروع کر دی۔کیا دیکھتا ہوں کہ بندر باڑ پھلانگ کر سڑک عبور کر کے جنگل کے دوسری طرف جا رہے ہیں۔سب بندر سڑک کراس کر چکے تھے۔صرف ایک بندریا سڑک کراس کر رہی تھی جس کے ساتھ دو بچے تھے۔ایک اس کے پیٹ کے ساتھ چمٹا ہوا تھا دوسرے کا اس نے بازو پکڑا ہوا تھا۔میں نے ایک لمحے کے لیے بریک لگائی۔جب وہ بندریا سڑک کراس کر گئی تو میں نے بھی سپیڈ پکڑنے کے لیے ابھی پاؤں پر زور دیا ہی تھا کہ اچانک بندریا کا بچہ اپنی ماں کا ہاتھ چھوڑ کر واپس جدھر سے آیا تھا بڑی تیزی سے اس طرف

بھاگا۔ میں گاڑی چلا چکا تھا۔ جیسے ہی بندریا نے زور سے چیخ ماری میں نے پوری طاقت سے بریک لگائی۔ ویگن چیختی چلاتی، سڑک پر نشان ڈالتی ہوئی رک گئی۔ بندریا بھاگتی ہوئی آئی اور اپنے بچے کو گھسیٹتی ہوئی جنگل کی طرف سڑک کے پار لے گئی۔ وہ مڑ مڑ کر بہت مہربان نظروں سے مجھے دیکھتی، اپنے بچے کو لے کر جنگل میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے کئی بار مڑ کر میری طرف دیکھا جیسے میری ممنون و مشکور ہو۔ یہ ایک ماں کی محبت اور جذبات تھے جو قدرت نے ہر ماں کو عطا کئے ہیں، چاہے وہ بندریا ہی کیوں نہ ہو۔

رات 8 بجے تک ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مشورہ دیا کہ بوٹسوانہ کے دوسرے بڑے شہر Francis Town کا چکر بھی لگائیں۔ وہاں کی ایک مسلم فیملی ہماری میزبان بنی اور ہم ایک صبح اپنی اسی ویگن میں فرانس ٹاؤن جا پہنچے۔ گیبرون سے فرانس ٹاؤن 500 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں دیگر شہر آتے گئے جنہیں ہم چھوڑتے ہوئے فرانس ٹاؤن کی طرف رواں دواں رہے۔ اسی راستے میں ایک ٹاؤن آیا جس کا نام ملا پیا تھا۔ عمران اتر کر ایک شاپ سے ڈرنکس لے کر آیا تو ساتھ دو افریقن بھی تھے۔ میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا تو عمران بولا انکل ان کی بات بھی سنیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو اس نے دونوں ہاتھ میرے سامنے کر کے کھول دیے جس میں ہیرے چمک رہے تھے وہ افریقن بولا:

Master you must buy These Dimonds, Very Cheep.

میں عمران سے بھی ناراض ہوا اور انہیں کہا کہ اگر آپ مجھے مفت میں بھی یہ ہیرے دیں تو میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ میں نے عمران کو ڈانٹ کر کہا کار میں بیٹھتے کیوں نہیں۔ وہ جلدی میں دروازہ کھول کر بیٹھ گیا اور میں نے پھر سے سفر شروع کر دیا۔ وہ دونوں افریقن دیکھتے رہ گئے اور ہم یہ جا وہ جا۔ سفر جاری رہا اور شام 6 بجے تک ہم فرانس ٹاؤن پہنچ گئے۔

فرانس ٹاؤن، بوٹسوانہ کا جنوب مشرقی ڈسٹرکٹ ہے۔ اس شہر کی آبادی اس وقت تقریباً ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ شہر کے وسط میں ایک خوبصورت بازار بھی تھا جو انواع اقسام کی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے یہ بازار بہت ہی جاذب نظر محسوس ہوا۔ گیبرون میں تو شاپنگ مال ہی تھے۔ یہ بوٹسوانہ کا بارڈر سٹی تھا جس کی سرحدیں زمبابوے سے جا ملتی ہیں۔ ہم نے اپنے میزبان محمد بھائی کو ایک دکان سے فون کیا تو وہ فوراً ہی اپنی کار میں تشریف لے آئے۔ ہم ان کی کار کو Follow کرتے ہوئے ایک خوبصورت آبادی میں جا پہنچے۔ جہاں پر ایک خوبصورت گھر میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ جن کو ہم آپا کہتے تھے، بے حد مہمان نواز، سادہ، بے لوث اور نیک خاتون تھیں۔ انہوں نے ہمارا تمام سامان ایک کمرے میں ڈسپلے کر دیا اور بذریعہ فون ہر ایشیائی گھرانے کو اطلاع دے دی کہ ان کے گھر نہ صرف پاکستانی تاجر بلکہ مسلمان بھائی بطور مہمان تشریف

لائے ہوئے ہیں۔خوبصورت لیڈیز پنجابی سوٹ، جیولری، ٹی شرٹس اور دیگر سامان ان کے پاس ہے۔آپ آ کر دیکھیں۔دوروز کے بعدوہ واپس گیبرون سے ہوتے ہوئے پاکستان واپس چلے جائیں گے۔بس پھر کیا تھا فیملی کی صورت میں لوگ جوق در جوق آنا شروع ہوگئے اور سامان فروخت ہونا شروع ہوگیا۔دوروز تک خوب رونق رہی۔ اب تمام فرانس ٹاؤن ہمیں جاننے اور پہچاننے لگ گیا تھا۔کہیں سے ڈنر اور کہیں سے ناشتے کی دعوت آ رہی تھی۔دو روز کے بعد ایک یوسف بھائی تشریف لائے جن کی بازار کے وسط میں ایک سپر مارکیٹ تھی۔انہوں نے ہمارا تمام سامان خرید لیا۔تیسرے روز ناشتہ کے بعد ہم واپسی سفر کے لیے تیار تھے۔سب بار بار پوچھ رہے تھے کہ آپ پھر کب آؤ گے ؟میں ایک ہی جواب دیتا ''جب رب تعالیٰ کو منظور ہوگا''۔اس شہر کا Super Ngulao Museum بھی میں نے وزٹ کیا۔جس کے مطابق اس شہر کو 1897 میں بسایا گیا تھا۔جبکہ یہ Gold Resh Town. کہلاتا تھا اور Ralonga لوگوں کا مسکن تھا۔اس شہر کے جنوب کے جنگل Tachila Nature Reserve میں ہر قسم کے خطرناک جانور پائے جاتے ہیں۔خاص طور پر اولڈ سٹون وال اور Domboshaba Ruins. یہاں کے بہت مشہور ہیں۔

سارا دن سفر کر کے شام تک ہم بخیریت تمام گیبرون پہنچ گئے۔شکر الحمدللہ! سامان سے کافی حد تک فراغت مل گئی۔Opportunist قسم کے لوگوں سے نجات بھی۔بوٹسوانہ کی کرنسی کا نام پولا ہے۔اس وقت تقریباً پاکستانی دس روپے کے برابر تھا۔یہ افریقہ کی بہت Strong کرنسی ہے۔بوٹسوانہ کو کویت آف افریقہ بھی کہتے ہیں۔یہ Diamond Producing Country ہے۔اس لئے فارن ایکسچینج کوئی پرابلم نہیں ہے۔اپنی آمدنی کا قانونی جواز بتائیں اور زرمبادلہ بینک سے حاصل کریں۔ان دنوں گیبرون میں BCCI مشہور ترین بینک تھا اور پاکستانی ہونے کے ناطے میں نے ذاتی طور پر BCCI کو فوقیت دی۔جبکہ برکلے اور سٹینڈرچارٹرڈ جیسے بینک بھی موجود تھے۔BCCI میں ایک بینک آفیسر (نام یاد نہیں رہا) غالباً زیدی صاحب ان کے نام کا حصہ تھا۔موصوف کراچی کے رہنے والے تھے اور مع فیملی گیبرون میں قیام پذیر تھے۔ان کے بارے میں مشہور تھا کہ نہایت بدتمیزی سے پیش آتے ہیں۔کام بھی نہیں کرتے بلکہ اعتراض لگا کر واپس کر دیتے ہیں۔اس لئے آپ BCCI کی مین برانچ میں جانے کی بجائے کسی اور بینک سے زرمبادلہ حاصل کر لیں۔یہ بات کسی ایک پاکستانی نے نہیں بلکہ ہر پاکستانی نے مجھے بتائی۔مجھے تو عادت تھی اس قسم کے نقلی معزز اور Self Made سید، چودھری، رانا، میاں اور نہ جانے کیا کیا، بن جانے والے لوگوں سے ملنے کی۔میں نے انہیں کہا آپ فکر نہ کریں میں زرمبادلہ انشا اللہ تعالیٰ BCCI کی مین برانچ کے زیدی صاحب کے دست مبارک سے ہی حاصل کرونگا۔آپ فکر نہ کریں۔

دوسرے روز میں اور عمران بینک میں داخل ہونے والے دوسرے یا تیسرے شخص تھے۔میں نے عمران کو

تمام کیش کپڑے میں باندھ کر دیا اور اسے سمجھایا کہ جب تک میں خود تمہیں نہ بلواؤں تم نے میرے پاس نہیں آنا اور صوفے پر بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھتے رہنا ہے۔ وہ بینک کے دروازے میں کھڑا رہا اور میں بینک میں داخل ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں عمران بھی آ کر انتظار گاہ کے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کیش والی گٹھڑی اس کی گود میں رکھی تھی۔ ابھی میری نظریں ادھر اُدھر زیدی صاحب کو تلاش کر ہی رہی تھیں کہ ٹیبل پر ہاتھ مار کر پیدا ہونے والی آواز نے مجھے چونک کر ادھر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ جہاں ایک ادھیڑ عمر صاحب، سفید سفاری سوٹ زیب تن کئے، نظر کا چشمہ آنکھوں سے اوپر ماتھے پر چڑھائے، میری طرف بہت گہری نظروں سے گھور رہے تھے۔ اپنا سر اوپر چھت کی طرف کر کے اور ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر اشارے سے مجھے پوچھ رہے تھے کہ کیا بات ہے؟ میں نے میز پر ان کے نام کی پلیٹ دیکھ لی تھی۔ میں تیزی سے ان کی طرف لپکا اور زور سے کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا اور بہت برداشت اور تحمل سے زیدی صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ میز بجا کر مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش کر رہے تھے؟ انہوں نے پھر بندر کی طرح سر ہلا کر ہاں میں جواب دیا۔ میں نے کہا آپ پڑھ لکھ کر خیر سے بینک آفیسر بن چکے ہیں، کیا اب بھی آپ نے اپنے خاندانی پیشے کو خیر باد نہیں کہا۔ وہ غصے سے بولے کیا مطلب؟ میں نے کہا آپ بندر کی طرح منہ اوپر نیچے کر کے یا میراثیوں کی طرح میز بجا کر لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں؟ اللہ کے واسطے اور اس بینک کی شان کے واسطے یہ اپنا خاندانی کاروبار بند کر کے شریفانہ رویہ اپنائیں۔ تاکہ لوگ آپ کی عزت کریں ناں کہ بطور میراثی آپ سے خوف کھائیں۔ میرے جیسا کوئی بھی سر پھرا آپ کو جوتے بھی مار سکتا ہے۔ پہلے تو انہوں نے اکڑ دکھانے کی کوشش کی جب میں نے کھیلنے کے انداز میں ان کی ٹیبل سے پیپر ویٹ اٹھایا تو وہ جلدی سے بولے: حکم فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ میں نے پیپر ویٹ میز پر سجاتے ہوئے ان سے کہا کہ یہاں ہر آنے والا بینک کا کسٹمر ہے۔ آپ کا ماتحت نہیں ہے۔ اس بینک کو انہی کسٹمرز سے جو انکم ہوتی ہے اسی سے آپ کو تنخواہ ملتی ہے۔ آپ کی خاندانیت کا اظہار آپ کے رویے سے ہوتا ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کے منیجر سے مل کر آپ کی تحریری شکایت درج کروا کر جاؤنگا اور اس کی کاپی آپ کے ہیڈ آفس بھی بھجوا دونگا۔ پاکستان جا کر پاکستانیوں کو تنگ کرنے، ان کی بے عزتی کرنے اور پاکستان کو بدنام کرنے کے سلسلے میں جو رویہ آپ نے اپنایا ہوا ہے، اپنے قانونی مشیر سے مشورہ کر کے جو بھی Remedy حاصل کر سکا وہ ضرور کرونگا۔ یہ ساری کارروائی اور باتیں ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھے ساتھی آفیسر نے سنی بھی اور دیکھی بھی۔ آخر وہ اٹھ کر میرے ساتھ والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے کہنے لگا جو بات بھی آپ کو بُری لگی ہے میں بینک کی طرف معذرت خواہ ہوں۔ آپ جس کام سے بھی آئے ہیں وہ مجھے بتائیں تاکہ آپ کا غصہ کم ہو۔ میں نے عمران کو آواز دی اور تمام کیش اور دیگر کاغذات میز پر رکھ دیے۔ انہیں کہا کہ مجھے یو ایس ڈالر میں ایکسچینج چاہئے۔ انہوں نے اپنی بینک کی کارروائی شروع کر دی۔ زیدی صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے سر یہ کیش کتنا ہے۔

میں نے کہا آپ کے سامنے پڑا ہے گن لو۔اس نے ایک لمحے کوسوچا اور کیش گننا شروع کر دیا۔تمام کارروائی مکمل کرنے کے بعد انہوں نے مجھے ڈالر دے دیے۔میں نے کہا کہ مجھے ان کیشمنٹ سرٹیفکیٹ بھی دیں تا کہ اگر ائر پورٹ پر کوئی بھی ایجنسی مجھ سے سوال کرے کہ اتنے زیادہ ڈالرز کیش کی صورت میں آپ نے کہاں سے لئے ہیں تو میرے پاس ثبوت ہونا ضروری ہے۔زیدی صاحب خود اٹھ کر کمپیوٹر آپریٹر کے کمرے میں گئے اور لیٹر ٹائپ کروا کر لائے ،دستخط کئے ،سیل لگائی اور میرے حوالے کر دیا۔میں کیش گن کر سنبھال چکا تھا۔آفیسر نے ایک بار پھر معذرت کی اور کہا کہ زیدی صاحب اپنے آپ میں نہیں رہتے اس لئے اکثر پاکستانی دوسرے بینکوں میں چلے جاتے ہیں۔یہ آفیسر لاہور کے رہنے والے بٹ صاحب تھے۔میں نے ان سے کہا کہ میں یہ تمام رقم دوبئ سے ڈرافٹ کی شکل میں بطور .Foreign Investar واپس بھیجوں گا۔ Resident Permit, Work Permit, Company Registration کے لیے بینک اکاؤنٹ ہونا ضروری ہے۔لہٰذا میرا اکاؤنٹ کھول کر نمبر عنایت کریں۔وہ مختلف فارم لے آئے۔ان کی تکمیل کی ،میرے دستخط کروائے اور مجھے اکاؤنٹ نمبر الاٹ کر دیا گیا۔یہ ڈالرز اکاؤنٹ تھا۔اب ہم فارغ تھے۔دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔دونوں آفیسر اٹھ کر ملے۔ایک بار پھر معذرت خواہ ہوئے۔میں ہنستا رہا۔زیدی اپنی کرسی سے اٹھ کر میری طرف آئے اور بولے خان صاحب میں تو آپ سے گلے ملوں گا۔میں نے بھی بانہیں کھول دیں۔یہ ہمارا بینک میں پہلا دن تھا۔رات کو میں نے بقایا تمام سامان پیک کروا کر ڈاکٹر صاحب کے پاس رکھ دیا اور امتیاز صاحب کے گھر کی صفائی کروا کر اس کو بند کر دیا۔کیونکہ کل شام کی ائر تنزانیہ کی فلائٹ سے وہ واپس آ رہے تھے۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ میں سرکاری کام کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں۔آپ امتیاز بھائی کو ائر پورٹ سے گھر لے آئیں۔رات کا کھانا ان کے ساتھ ہوگا، پھر انہیں ان کے گھر چھوڑ آئیں گے۔میں رات 8 بجے ان کو لینے ائر پورٹ چلا گیا۔جب میں میجر عتیق مقصود عبداللہ کے ساتھ پہلی بار بوٹسوانہ آیا تھا تب امتیاز بھائی سے میری ایک ملاقات ہو چکی تھی۔ائر تنزانیہ کی فلائٹ لینڈ کی تو پتہ چلا کہ اکثر مسافر فوڈ پوائزننگ کا شکار ہیں کیونکہ کھانا باسی تھا یا اچھا نہیں تھا وغیرہ۔امتیاز بھائی ماشاءاللہ ٹھیک تھے کیونکہ انہوں نے کچھ بھی نہ کھایا تھا۔یہ میری امتیاز بھائی سے دوسری ملاقات تھی۔میں نے شکریے کے ساتھ ان کے گھر کی چابی انہیں واپس کی جو ہنستے ہوئے انہوں نے پکڑ لی۔کھانے پر ماحول بہت اچھا رہا۔ہنسی مذاق ،صلاح مشورے وغیرہ سب چلتا رہا۔پھر میں اور ڈاکٹر صاحب ان کو ان کے گھر تک چھوڑ آئے۔

دوسرے روز میں نے اپنی واپسی کی Ž £ Booking لائن کو دے دی۔جن سیکٹرز سے ہم آئے تھے اسی طرح واپسی ہونی تھی۔آج رات ڈاکٹر صاحب سے فائنل بزنس میٹنگ تھی۔جس میں طے پایا کہ ایک فرم بنائی

جائے جس کا نام Tifexo Botswana Pvt. Ltd. تجویز ہوا۔

وہ مجھے کمپنی سیکرٹری مسٹر مسّا لیلا کے پاس لے گئے۔ بہت سے کاغذات دستخط کروائے گئے جس میں کمپنی رجسٹریشن ورہائش کا اجازت نامہ، بزنس کرنے کا اجازت نامہ، انکم ٹیکس رجسٹریشن و دیگر مراعات جو گورنمنٹ آف بوٹسوانہ فارن انوسٹر کو گرانٹ کرتی ہے، سب شامل تھا۔ طے یہ پایا کہ جیسے ہی میرے بینک اکاؤنٹ میں ڈالرز جمع ہوئے تو پہلے سے تیار شدہ کاغذات پیش کر کے منظوری حاصل کر لی جائیگی۔ یہ مرحلہ بھی طے کر کے ہم فارغ ہوئے۔ میں نے حساب لگایا تو اس بزنس ٹور میں مجھے بیس ہزار ڈالر کی بچت ہوئی تھی۔ جبکہ کچھ سامان ابھی باقی تھا۔ ایک دن افریقن مال پر ٹمبا جنرل سٹور سے ہم لوگ اپنے دیے گئے سامان کی رقم لینے گئے تو وہاں مسز لونیل سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اپنی لندن پلٹ بیٹیوں کے ساتھ خریداری کر رہی تھیں۔ بہت پیار سے ملیں اور شکوہ کرنے لگیں کہ آپ لوگ ہمارے گھر نہیں آئے۔ دراصل وہ انبالے شہر کی پنجابی بولتی تھیں اور میں ان کے ساتھ متواتر اسی پنجابی میں ہی بات کرتا تھا اس لئے وہ اُنسیت محسوس کرتی تھیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ 3/4 روز تک ہم واپس جا رہے ہیں اور جلد ہی ایک کنٹینر سامان کے ساتھ واپس آئینگے تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ ان کی دونوں لڑکیاں بھی کاکنی انگلش میں گفتگو کرتی رہیں اور ہر فقرے کے بعد لندن کا ذکر ضرور کرتیں۔ دونوں کی زیبائش اور ظاہری حسن ملاحظہ فرمائیں۔ چاند چہروں پر ناگن زلفیں، ستارہ آنکھیں و کمان سی ناک، پنکھڑی سے ہونٹ، صراحی دار گردنیں، شاخ سی بانہیں اور چلنے میں غزالوں جیسی چال۔ جب ساون کے مہینے میں ہلکی ہلکی بارش برس رہی ہو اور غزال مستی میں جنگل کے اندر اچھل کود کر رہے ہوں تو اس وقت ان کی چال دیدنی ہوتی ہے۔ بالکل ویسی ہی چال ان دونوں لڑکیوں کی تھی۔ حسن و جمال سے نظر پھسل کر پھر حسن جمال پر ہی جاتی تھی۔ ان دونوں کو بھی احساس تھا کہ وہ ہر قسم کی جان لیوا اور قاتل اداؤں مہلک ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ اب میں اس ضدی دل و دماغ اور آنکھوں کا کیا کروں جو نت نئی Innovation کے ساتھ Henpecked ہونے کا ارادہ مصمم کیے جا رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایوب خان، مالک Timba Store نے رقم ایک لفافے میں ڈال کر مجھے تھما دی جو میں نے شکریہ کے ساتھ لے لی اور ایک فائنل، طائرانہ، حسرت بھری نظر ڈالتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا۔

اب ہم پاکستان واپسی کے لیے تیار تھے۔ صرف سیٹیں کنفرم ہونے کا انتظار تھا اور اپنے بیوی بچوں میں جانے کی شدید خواہش تھی۔ دل کرتا تھا کہ پَر لگ جائیں اور اپنے گھر کی چھت پر ہی لینڈ کیا جائے۔ مگر قدرت کی طرف سے یہ ممکن نہ تھا۔ لہٰذا انتظار اور صرف انتظار ہی علاج غم تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، ہمیشہ ہوتا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ دوسرے روز بذریعہ FAX سیٹ OK کی اطلاع بھی آ گئی۔ میں اور عمران کراچی، پاکستان کے لیے عازم سفر ہوئے۔ گیبرون، جوہانسبرگ اور نیروبی تک سفر مکمل خیریت سے گزرا۔ رات

نیروبی میں حسب سابق ٹرانزٹ میں گزاری۔ دوسرے روز رات کو بذریعہ PIA کراچی کے لیے ہماری کنفرم ٹکٹس تھیں۔ جب ہم نیروبی ائرپورٹ سے باہر لاؤنج میں آئے تو وہاں مختلف ائرلائنز کے کاؤنٹر بنے ہوئے تھے اور رنگ برنگی گراؤنڈ ہوسٹس اپنے جلوے، نازنخرے اور کمرشل مسکراہٹیں ''صلائے عام ہے یاران نکتہ دان کے لیے'' کیے ہوئے تھیں۔ گلف ائر کاؤنٹر کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ سورج اسی کاؤنٹر پر جلوہ افروز ہے ۔حالانکہ شام کے 6 بجے چکے تھے۔4 حور پریاں گلف ائر کی یونیفارم زیبِ تن کئے ہوئے، لال ٹوپی سر پر سجائے، اپنا آپ ظاہر کرتے ہوئے مسافروں سے ڈیل کررہی تھیں۔ میں چونکہ افریقہ سے آرہا تھا جہاں اگر کوئی چہرہ کالا نہ بھی ہوتو کالوں میں مل کر وہ بھی کالا ہی نظر آتا تھا۔ابھی تک میں افریقن سرزمین پر ہی کھڑا تھا اور اس کافرستان میں یہ حوریں اتنی Gorgeous اور Mesmerizeng تھیں کے بیان سے باہر۔جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے میں بےاختیار ان کی طرف چلتا چلا گیا جبکہ عمران کو میں نے سامان کے پاس کھڑا کردیا۔

بقولِ شاعر:

مست کر دیتی ہے پہلی ہی نگاہ ساقی
آنکھ کے سامنے پیمانے کی کہاں چلتی ہے

میں نے ان لبنانی اور فلسطینی گراؤنڈ ہوسٹس لڑکیوں کو اپنی ٹکٹ دکھا کر کہا کہ اگر آج آپ کی فلائیٹ دوبئ یا کراچی کے لیے ہواور میری ٹکٹ Mileage Cover کرتی ہوتو میں گلف ائر کے ساتھ سفر کرنے کے لیے تیار ہوں۔انہوں نے ٹکٹ دیکھ کر کمپیوٹر پر حساب لگایا اور مجھے بتایا کہ آج رات 10 بجے ہماری فلائٹ اومان کے لیے ہے۔ وہاں سے آپ کو دو گھنٹے بعد کراچی کے لیے فلائٹ مل جائے گی ۔ہم آپ کو کراچی تک Book کرلیتے ہیں۔Mileage کا کوئی فرق نہیں ہے۔آپ کے ٹکٹ کو پن اس سفر کے لیے کافی ہیں۔میں نے کہا OK آپ فائنل کردیں۔ وہ بولی سامان؟ میں نے عمران کو اشارہ کیا تو وہ سامان لے کر آ گیا۔سامان کو وزن کیا گیا، ٹیگ لگائے گئے اور ائرلائن کے حوالے کر کے ہم فارغ ہوگئے۔ میں نے ایک چلبلی سی گراؤنڈ ہوسٹس سے پوچھا آپ لبنانی ہیں؟ وہ پہلے تو ہنسی پھر بولی آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ میں بے دریغ بول اٹھا میرا دل کہتا ہے۔ایک لمبا سا Oh...اس کے منہ سے نکلا۔دوسری بولی میرے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ایک سیکنڈ کے بعد جب کھولیں تو فلسطین میرے منہ سے بےاختیار نکلا۔ وہ حیران ہوکر عربی زبان میں آپس میں گفتگو کرنے لگ گئیں۔ پھر مجھے کہنے لگیں ایک فلائٹ نیروبی-دوبئ کے لیے ابھی جارہی تھی۔آپ کے پاسپورٹ میں دوبئ کا ویزا بھی ہے۔ پھر آپ اُس فلائٹ سے کیوں نہیں گئے؟ میں نے جواب دیا کہ کینیا ائر سے میں نے کئی بار سفر کیا ہے، لیکن اب نہیں کرونگا۔ وہ حیرانی سے بولی: کیوں؟ میں نے کہا کہ کینیا ائر والے اپنی ائرہوسٹس سینی ٹوریم

سے بھرتی کرتے ہیں۔ جس کی طرف بھی دیکھو وہ نہ صرف پتھر کا بُت لگتی ہے بلکہ ٹی بی کی مریضہ بھی لگتی ہے ۔ چاروں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوئی جا رہی تھیں ۔ میری Frustration بھی ختم ہو چکی تھی ۔ ہم دونوں واپس لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے ۔

جب میں ان لڑکیوں سے بات چیت کر رہا تھا تو میری پشت سے عجیب وغریب پنجابی زبان میں گفتگو کرنے کی آواز آ رہی تھی ۔ اب میں ان کی طرف متوجہ ہوا۔ عجیب منظر تھا۔ ایک کالا نوجوان، شلوار قمیض میں ملبوس، ساتھ ایک عورت، اونچی لمبی، ذرا کم کالی، دونوں کے سر کے بال مقامی افریقن سے قدرے بڑے مگر سخت گھونگریالے، آپس میں پنجابی وہ بھی لفظ بگاڑ کر بول رہے تھے ۔ مقامی افریقن زبان بہت روانی سے بولتے تھے ۔ میرے ہاتھ میں پاکستانی پاسپورٹ دیکھ کر وہ السلام علیکم کہتے ہوئے مجھے مخاطب ہوا اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے وعلیکم السلام کہتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ اگر وہ مجھ سے مخاطب نہ بھی ہوتا تو میں از خود اس سے مخاطب ہونے جا رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامے رکھا اور اُس سے پوچھا کہ وہ افریقن ہوتے ہوئے اتنی اچھی پنجابی کیسے سیکھ گیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا کہ میرے فادراں (Father) لاہور پاکستان سے آئے تھے اور کینیا ریلوے میں مزدوری کرتے تھے۔ انہوں نے یہاں میری والدہ سے شادی کر لی جو مقامی افریقن تھی ۔ اس کے بطن سے میں اور میری یہ بہن پیدا ہوئی اور رزلٹ آپ کے سامنے ہے ۔ میرے والد اپنے گھر میں پنجابی بولا کرتے تھے ۔ میری والدہ بھی پنجابی سیکھ گئی تھی اور دنوں بہن بھائی بچپن سے ہی پنجابی بولتے چلے آ رہے ہیں ۔ میری بہن سے کوئی ایشین اس لئے شادی نہیں کرتا کہ یہ افریقن ہے اور افریقن اس لئے شادی نہیں کرتا کہ یہ ایشین ہے۔ اب ہمارے فادراں فوت ہو چکے ہیں اور ہماری مادراں وہ سامنے بیٹھی ہے ۔ میں نے اس طرف دیکھا تو سامان کے پاس ایک بوڑھی لیکن صحت مند عورت بیٹھی ہمیں ہی دیکھ رہی تھی ۔ میں نے ان سے کہا کہ میں بزرگوں کو سلام کرنا چاہتا ہوں ۔ ہم اس خاتون کے پاس چلے گئے ۔ میں نے السلام علیکم کہا اور ہاتھ ملایا۔ وہ چاہت اور محبت سے ملی ۔ دعائیں دیں اور بولی آپ میرے بچوں کے والد کے وطن سے ہیں ۔ مجھے اپنے بچے ہی لگتے ہیں ۔ یہ سب باتیں وہ ٹھیٹ پنجابی زبان میں کر رہی تھی ۔ میں حیران سا قدرت کے کرشمے دیکھ رہا تھا۔ آخر کار ہم لاؤنج میں بیٹھ کر اپنی فلائٹ کا انتظار کرنے لگے جو اپنے شیڈول کے مطابق صحیح وقت پر آ گئی ۔ جہاز میں سوار ہوتے ہی ایسے محسوس ہوا کہ ہم گھپ اندھیرے سے اجالے میں آ گئے ہوں ۔ نازو انداز و خوبصورتی ،موتیوں جیسے دانت دکھاتے ہوئے کمرشل مسکراہٹیں ،Submissiveness ،سب کچھ اس فلائٹ میں تھا۔ مہمان نوازی اور کھانے کا معیار اچھا تھا۔ مصری حسینائیں کمال کی تھیں اور لبرل ازم سے لبریز تھیں ۔ جہاز رات کے کسی حصے میں اومان ائرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔

ہم ٹرانزٹ لاؤنج میں چلے گئے ۔ گلف ائیر کے کاؤنٹر سے جب کراچی کی فلائٹ کا پتہ کیا تو کاؤنٹر والی لڑکی

نے اپنے کمپیوٹر کی تلاشی لیتے ہوئے ہمیں بتایا کہ اومان- کراچی آپ کی سیٹیں OK ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ فلائٹ منسوخ کر دی گئی ہے۔شام کی فلائٹ میں اومان- کراچی آپ کو Book کر سکتی ہوں۔میں نے رضامندی ظاہر کی۔جب اس نے ٹکٹوں پر سٹیکر لگا کر مجھے ٹکٹیں واپس کر دیں تو میں نے اسے کہا ہمیں ویزا سپانسر کر کے ہوٹل وارنٹ بنا کر دیں تا کہ ہم آرام کر سکیں۔وہ سوچ میں پڑ گئی۔کہنے لگی میں ایسا نہیں کر سکتی۔میرے اصرار کرنے پر اس نے فون کر کے اپنے سپروائزر کو بلوایا۔میں نے تمام سچویشن کو Explain کرتے ہوئے اسے پھر سے کہا کہ آپ ہمیں ویزا اسپانسر کریں اور ہوٹل کے کاغذات بنا کر دیں۔کافی سوچ بچار کے بعد وہ کہنے لگا میں ہوٹل میں رہائش نہیں دے سکتا۔ویزا اسپانسر کروا دیتا ہوں میں نے کہا ٹھیک ہے آپ ویزا اسپانسر کر دیں۔ہم ہوٹل میں اپنے خرچے پر قیام کر لیں گے۔وہ ہمارے پاسپورٹ امیگریشن آفیسر کے پاس لے گیا اور ٹرانزٹ ویزے لگوا لایا۔ائر لائن کی گاڑی دیگر لوگوں کو لے کر Ruwi ہوٹل جا رہی تھی۔میں نے اسی سپروائزر سے کہا کہ ہمیں بھی اسی گاڑی میں ہوٹل بھجوا دیں۔اس نے کہا No Problem اور عربی میں ڈرائیور کو ہمارا سامان گاڑی میں رکھنے کو کہا۔اسی اثنا میں اومانی کسٹم آفیسرز نازل ہو گئے اور سامان کی تلاشی لینے لگے۔میں نے دونوں بیگ کھول کر اُن کے سامنے رکھ دیے۔بیگز کے اوپر ہی دو وڈیو کیسٹس رکھی تھیں۔وہ انہوں نے اٹھا لیں اور بیگز بند کر دیے۔دونوں ویڈیو کیسٹس بوٹسوانہ ٹریڈ فیئر کے متعلق تھیں جو حسن نانک، اس کی بیگم حوا اور بیٹے اختر نے بنائیں تھیں۔انہوں نے مجھے کیسٹوں کی رسید دیتے ہوئے کہا جب آپ واپس جا رہے ہوں گے تو آپ کو یہ رسید دکھانے پر دونوں کیسٹس ڈیوٹی پر موجود آفیسر واپس کرے گا۔اس طرح ہم ہوٹل پہنچ گئے۔ہوٹل خوبصورت تھا اور کمرے بھی آرام دہ تھے۔یہ Five star ہوٹل تھا۔لیٹتے ہی ہوش نہ رہا اور دوسرے روز 10 بجے آنکھ کھلی۔تیار ہو کر سامان کاؤنٹر پر منگوایا، ہوٹل کا بل کلیر کیا۔کیونکہ اس ہوٹل کا Check Out ٹائم 11 بجے تھا۔عرصہ کے بعد لذیذ ناشتہ کیا۔ناشتہ میں اتنی زیادہ ٹاپ کوالٹی ڈشز تھیں کہ اگر گنوانا چاہوں تو نہیں گنوا سکتا۔ہم اومان شہر دیکھنے نکل کھڑے ہوئے۔ایک جگہ جہاں دیگر بینک بھی تھے وہاں یونین کارپوریشن کا بورڈ لگا ہوا تھا اور Digitally دنیا جہان کی کرنسیوں کے ریٹ ڈسپلے کیے جا رہے تھے۔ایسے ہی مجھے خیال آیا کہ اگر ڈرافٹ بن سکتا ہو تو یہاں سے بنوا کر بھجوا دیا جانا چاہیے۔ہم نے Taxi فارغ کر دی اور ادارے میں داخل ہو گئے۔سامنے جو منیجر صاحب تشریف فرما تھے وہ تو پاکستانی تھے ہی دیگر تمام سٹاف بھی پاکستانی تھا۔میں نے منیجر کو بتایا کہ ہم US ڈالرز میں ڈرافٹ بنوانا چاہتے ہیں آپ کے ادارے کی Viability and Authentication کیا ہے۔اس نے بتایا کہ یہ یونائیٹڈ بینک کا ذیلی ادارہ ہے۔آپ اس کو فراڈ کارپوریشن نہ خیال کریں۔جیسا کہ ملک عزیز میں یہ کام بہت عرصہ ہوتا رہا، جب لوگ لُٹ چکے تو قانون حرکت میں آیا، جس کا خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔میں نے اسے کہا کہ بیس ہزار ڈالرز کا ڈیمانڈ ڈرافٹ بنا دیں۔وہ

کاغذی کارروائی کرنے لگا تو دروازے کے شیشے میں سے میری نظر سڑک کے دوسری طرف Habib Bank Zurich کے بورڈ پر پڑی۔ بے اختیار میری ایک لمبی سانس نکل گئی جس کو عام فہم زبان میں ٹھنڈی سانس یا آہیں بھرنا بھی کہتے ہیں۔ منیجر نے مجھے کہا خیریت ہے طبیعت تو خراب نہیں ہے۔ میں نے کہا نہیں یہ سامنے بینک کا بورڈ دیکھ کر ایک دوست یاد آ گئے۔ یہ دوست جناب برجیس علی زیدی تھے جو 1969 میں حبیب بینک فرید گیٹ برانچ میں سیکنڈ آفیسر تھے۔ بہت اچھے خوش مزاج آدمی تھے۔ آہستہ آہستہ ہماری واقفیت دوستی میں بدل گئی اور ایک بار ہماری انتہائی ضرورت کے وقت ہمارے بہت کام آئے تھے۔ جس دن میری شادی ہوئی اُسی دن ان کی بھی شادی تھی۔ وہ ملتان کے رہنے والے تھے۔ شادی سے پہلے وہ جس مکان میں رہتے تھے وہاں رات کو وہ ڈر جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ رات بھر مجھے کوئی تنگ کرتا ہے۔ میں انہیں اپنے پاس لے آیا۔ اس طرح اکٹھے ہنسی خوشی ٹائم گزر گیا۔ پھر ان کا ٹرانسفر ملتان ہو گیا اور ملاقاتیں گاہے بگاہے ہونے لگیں۔ ہم دونوں عیال دار ہوتے گئے اور زندگی کے جھمیلوں میں گم ہو گئے۔ کسی نہ کسی مشترکہ دوست سے کبھی کبھار خیر خیریت پتہ چل جاتی تھی اس کے بعد ان کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا اور کراچی سے وہ اومان آ گئے۔ یہاں انہوں نے حبیب بینک زیورخ میں شمولیت کر لی۔ کراچی حبیب بینک پلازہ میں اکثر جاتا رہتا ہوں۔ میں نے وہاں سے ان کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ وفات پا چکے ہیں۔ اس دوران میری آنکھیں بھیگ چکیں تھیں۔ منیجر نے بتایا کہ وہ بھی کراچی حبیب بینک میں ہی جاب کرتا رہا ہے اور برجیس زیدی کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ وہاں پر دو برجیس تھے۔ ایک کا انتقال آن ڈیوٹی ہی ہو گیا تھا اور وہ یہ والے برجیس نہیں تھے۔ کیونکہ ایک ماہ پہلے میری ان سے ملاقات کسی دعوت میں ہوئی تھی اور وہ آج کل Al-Ali Bank میں Branch Manager ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے میرا ڈرافٹ تھما دیا اور کہا تشریف رکھیں میں برجیس علی زیدی کا فون نمبر تلاش کرتا ہوں۔ میز کی دراز سے وزٹنگ کارڈز کا فولڈر نکالا اور ایک ایک کر کے تلاش شروع کر دی۔ جلد ہی مطلوبہ کارڈ مل گیا۔ منیجر نے کارڈ اور فون میرے آگے کر دیے۔ میں نے کارڈ پر دیے گئے نمبر پر فون کیا تو خاتون سیکرٹری نے فون اٹھایا۔ میں نے برجیس علی زیدی کا نام پوچھا کہ اگر وہ موجود ہوں تو میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بولی: موجود ہیں مگر آپ کون ہیں؟ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا اور میں بے خودی میں بول گیا کہ اسے کہو کہ اس کے والد صاحب بول رہے ہیں اور فوراً اس سے بات کرنے کے خواہشمند ہیں۔ سیکرٹری نے جب یہ سنا تو وہ مودّب ہو گئی اور یہ کہتے ہوئے لائن ملا دی Sir! Your Fathar is on line.

وہ بھی برجیس زیدی تھا فوراً بولا میرے والد تو قبرستان میں مقیم ہیں اور وہاں سے فون آنا ممکن نہیں ہے Any How بات کرتے ہیں۔ جب انہوں نے ہیلو کیا تو وہ لہجہ، وہی انداز، جسے سن کر میں بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا

تھا کہ جسے میں مردہ جان کر اداس ہو جاتا تھا وہ ماشاءاللہ زندہ ہے اور میں اس سے مخاطب ہوں۔ میں نے اسی سرشاری میں دو چار مغلظات اور سنا دیں۔ وہ بڑے تحمل سے میری بکواس سنتا رہا اور کہنے لگا کہ آپ کی زبان مبارک سے جو پھول جھڑ رہے ہیں انہیں روکیں نہیں میں آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جیسے ہی میں نے کہا چشمہ تو لگا لو۔ وہ فوراً مجھے پہچان گیا۔ یہ فقرہ ہم نے اس کی پہچان بنا رکھا تھا۔ فوراً بولا ابے فرشتے تو یہاں بھی پہنچ گیا۔ کہاں پر ہے تو؟ میں نے منیجر کو فون دیا کہ زیدی صاحب کو لوکیشن سمجھا دیں۔ منیجر نے فون پر لوکیشن سمجھا دی۔ پانچ منٹ میں زیدی صاحب میرے پاس تھے۔۔ بہت محبت سے ملے پہلے اپنے بینک لے گئے پھر ایک فلسطینی ہوٹل میں فلسطینی لڑکیوں کے جھرمٹ میں ڈنر کروایا۔ پورا شہر لے کر گھومتے رہے اور رات گئے ائرپورٹ پر ہمیں الوداع کر کے چلے گئے، ان کو زندہ دیکھ کر آج تک میں سرشار ہوں۔ ائرپورٹ پر جب رسید دکھائی گئی تو ہماری وڈیو کیسٹس جوں کی توں ہمیں واپس کر دی گئیں۔ گلف سے سفر کرنے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے ہم کراچی سے ہوتے بہاول پور اپنے اپنے گھر پہنچ گئے۔

واپس بہاول پور آ کر میں نے گلف ائر کے ہیڈ آفس واقع کاشف سینٹر، کراچی کو اپنے لیگل ایڈوائزر کے توسط سے نوٹس بھجوا دیا۔ ہوٹل کے بل وغیرہ کی کاپیاں بھی ساتھ منسلک کر دیں اور مطالبہ کیا کہ ہمیں ہوٹل کی رہائش دینے کا آپ کا بکنگ کاؤنٹر پابند تھا جو اس نے نہیں دی۔ ہمارے اتنے ڈالر خرچ ہوئے ہیں۔ برائے مہربانی ہمیں ادائیگی کی جائے۔ ایک ماہ کے بعد ایک رجسٹرڈ لیٹر ملا جس میں معذرت کے ساتھ ایک پندرہ ہزار کا چیک بھی تھا۔

باب6: بوٹسوانہ اور ساؤتھ افریقہ

(دی گرینڈ ایسٹر رینڈ شو1992)

فرشتوں اور جنات کے پاس عبادت تو ہے
لیکن محبت اور عشق کی مستی انسان کا نصیب ہے

بوٹسوانہ اور ساؤتھ افریقہ

(دی گرینڈ ایسٹر رینڈ شو 1992)

پاکستان آتے ہی گھریلو امور میں مصروف ہو گیا۔ ٹرسٹ کالونی سے رہائش سیٹلائٹ ٹاؤن میں منتقل کر لی گئی۔ میرا بڑا بیٹا نوید کاشف ماشاءاللہ .B.Sc کے لیے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے گھر بدلنے میں بہت دلچسپی لی اور تمام کام جانفشانی سے انجام دیے۔ میرا رائٹ ہینڈ بنا رہا۔ میں دل میں خوش تھا کہ نوید ایک ذمہ دار اور فرمانبردار بیٹے کے طور پر تیزی سے ابھر رہا ہے۔ میرے دل سے اس کے لئے دعائیں نکلتیں۔ وہ نہ صرف اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھا بلکہ اپنے بہن بھائیوں اور اپنی والدہ صاحبہ کے حکم و ہدایت کے مطابق تمام گھریلو امور بہت احسن طریقے سے انجام دیتا رہا۔

ایک روز میں نے اسے کہا کہ اگر آپ کی (B.Sc.(Math,Physics میں فرسٹ ڈویژن آ گئی تو میں آپ کو انٹرنیشنل سفر کراونگا۔ ملک آپ کی مرضی کا ہوگا۔ اس نے اپنے بھولے پن میں کہا ''ڈیڈی جان اپنا وعدہ یاد رکھنا''۔ میں نے دوبارہ اپنے الفاظ اچھی طرح ادا کر کے اسے یقین دلایا اور کہا Whatever I am Saying I mean it, Please go Ahead for Victory۔ بچے نے پرامید اور پیارے انداز میں کہا انشاءاللہ۔ میرے دل دماغ میں ایک سکون کی لہر اٹھی اور روحانی طور پر مجھے سیراب کر گئی۔

جب بھی میرا لاہور جانا ہوتا تو میں اپنے پھوپھی زاد بھائی محمد رحمان صاحب کے ہاں ہی قیام کرتا۔ کزن ہونے کے علاوہ وہ میرے خاص الخاص دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ اسی طرح جب وہ بہاول پور تشریف لاتے تو صرف میرے پاس ہی قیام فرماتے تھے۔ ہم آپس میں بزنس کے متعلق صلاح مشورہ بھی کر لیتے تھے۔ میں نے رحمان بھائی کو تمام ٹورز کی مکمل روئیداد سنائی اور انہیں بتایا کہ جیسے ہی گورنمنٹ آف بوٹسوانہ سے ہماری کمپنی رجسٹرڈ ہو کر ہمیں امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ لائسنس، ورک پرمٹ اور ریذیڈنٹ پرمٹ ملتا ہے تو فوراً بوٹسوانہ جا کر ہول سیل کا ویئر ہاؤس کھولنا چاہتا ہوں۔ وہ بولے مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔ میں نے انہیں بتایا کہ کل میں بہاول پور جا رہا ہوں۔ وہ کچھ سوچ میں تھے خاموش ہو گئے۔ رات 10 بجے وہ میرے کمرے میں آئے۔ ان کے ہاتھ میں دو PIA کی ٹکٹیں تھیں۔ بولے کہ کل میں آپ کے ساتھ ہی بہاول پور جاؤنگا اور بزنس کے بارے میں صلاح مشورہ

کریں گے ۔میرے پاس آپ کے لیے ایک Proposal ہے اگر آپ متفق ہوئے تو پھر اگلا پروگرام ترتیب دینگے۔ یہ سن کر میں سوچتا رہا اور پھر سو گیا۔ دوسرے روز ہم لوگ بہاول پور آ گئے ۔بہاول پور میں آج بھائی صاحب کا دوسرا روز تھا۔ہم کمرے میں بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ FAX مشین نے تین بار ٹرٹر کیا اور Fax Message کی صورت میں کاغذ باہر نکالنے شروع کر دیے جو ہماری نئی کمپنی Tifexo Botswana Pvt. Ltd. کی رجسٹریشن، ورک پرمٹ، امپورٹ ایکسپورٹ لائسنس اور ریذیڈنٹ پرمٹ تھے۔تھوڑی دیر کے بعد میرا اور عمران کا ویزہ بھی بذریعہ Fax آ گیا۔ بھائی صاحب سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔انہوں نے اپنے بیٹے فرید رحمان کا ذکر کیا کہ وہ لندن سے واپس آ چکا ہے۔آپ اُس کو بھی اِس بزنس میں شامل کریں اور اپنے ساتھ بوٹسوانہ لے جائیں۔ بھائی صاحب نے مزید فرمایا اگر آپ ایک ٹیم کی شکل میں کام کرینگے تو بزنس زیادہ ترقی کرے گا۔ پاکستان میں تمام بزنس کے امور کی نگرانی میں کرلونگا تا کہ ریگولر سامان کی ترسیل آپ کو جاری رہے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا کیونکہ آپس میں پیار، محبت، عزت واحترام حد درجہ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خوشی محسوس ہو رہی تھی ۔لہٰذا بزنس شروع کرنے کے ابتدائی امور طے کر لیے گئے اور بھائی جان واپس لاہور چلے گئے ۔اب میرے سامنے بہت بڑا میدان تھا جس میں نہ صرف میں نے سرپٹ گھوڑا بھگانا تھا بلکہ خود بھی بہت زیادہ بھاگ دوڑ کرنی تھی۔اللہ تعالیٰ پر آس رکھ کر میں نے چیلنج قبول کرتے ہوئے کام شروع کر دیا۔

گزشتہ تجربے کی روشنی میں خریداری کی لسٹ ترتیب دی۔ کچھ سامان لاہور سے اور کچھ کراچی سے خریدنا قرار پایا۔ میں بہاول پور سے عازم لاہور ہوا۔ائرپورٹ پر رحمان بھائی نے ریسیو کیا۔دوسرے روز ہمارا تمام دن شاہ عالمی مارکیٹ میں گزرا۔ جہاں سے ہم نے لارنس پور کی سوٹنگ خریدی۔لیڈیز ریشمی کپڑے کے رول، جس کو تھان بھی کہتے ہیں، بہت اچھی کوالٹی اور خوبصورت رنگوں میں خریدے۔تیسرے روز ایک لیدر جیکٹ فیکٹری وزٹ کی ۔ان کو سانچو کے اٹالین لیدر سے بنی ہوئی لیڈیز اینڈ جینٹس جیکٹس کا آڈر دیا۔مصنوعی جیولری اور چاندی کی جیولری کی خریداری کی۔تمام سامان کی پیکنگ کروائی اور کراچی کے لیے بذریعہ ٹرک بک کرا دیا گیا۔لیدر جیکٹس کی ڈلیوری لینے گئے تو فیکٹری کے منشی نے کہا: سر آپ ٹینشن نہ لیں آپ کا آڈر تیار ہو رہا ہے اور ہم کراچی کے لیے کل بک کروا کر آپ کو بلٹی دے دینگے ۔رحمان بھائی مطمئن ہو گئے حالانکہ وہ خود لاہور کے باسی تھے اور پکے لاہوری تھے۔ میں راضی نہ ہوا اور دوسرے روز فیکٹری جا پہنچا۔اس وقت لیدر جیکٹس پیٹیوں میں پیک ہو کر نمبر لگائے جا رہے تھے۔ جو پیٹیاں اب تک بند نہیں کی گئیں تھیں میں نے ان کا تمام سامان نکال کر چیک کیا۔عجیب وغریب قسم کی لیدر جیکٹس برآمد ہوئیں جن کا ہمارے سامان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ تمام ڈیڈ لیدر جیکٹس تھیں جنہیں کوئی مفت لینا بھی پسند نہ کرتا۔ یہ فیکٹری کا منشی بے ایمان ترین آدمی ثابت ہوا۔ میں نے تمام پیٹیاں کھلوا کر دوبارہ فریش لیدر

جیکٹس ان میں پیک کروائیں اور اپنے سامنے سامان کراچی روانہ کیا۔ میری موجودگی میں بھی یہ بے ایمان شخص کوشش کرتا رہا کہ کسی نہ کسی طرح وہ اپنی مرضی کا کوڑ کباڑ پیٹی میں بند کروا دے مگر اب اعتبار اٹھ چکا تھا۔ میری نظر میں اس منشی کی حیثیت ایک چور اُچکے سے زیادہ نہیں تھی۔ ویسے بظاہر باریش بھی تھا، تبلیغی جماعت اور نماز قائم کرنے کی بات بھی کرتا تھا، مگر صرف ظاہراً مسلمان تھا۔ لاہور میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے۔ ایک اور فیکٹری سے ہم نے نائٹ کلب کے ڈانسنگ ڈریس بنوائے۔ دیگر Occassions کے لیے بھی خوبصورت ڈریس تیار ہوئے۔ چوبرجی کے ساتھ والی گلی میں ایک خاتون کی فیکٹری تھی جو لیڈیز شلوار قمیض تیار کر کے آرڈر کے مطابق دیتی تھی۔ اس سے سینکڑوں سوٹ بنوائے۔ اس طرح لاہور کی ہماری خریداری بسلسلہ افریقہ مکمل ہوگئی۔ اب ہمیں کراچی جانا تھا۔ وہاں سے نہ صرف بقایا خریداری کرنی تھی بلکہ کنٹینر بھی Book کروا کے افریقہ بھجوانا تھا۔

لاہور کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر میں اور رحمان بھائی کراچی چلے گئے۔ جہاں ائرپورٹ پر کالو جی نے ہمارا استقبال کیا۔ دوسرے روز طے یہ پایا کہ سندھی مسلم سوسائٹی میں رحمان بھائی کے سسر صاحب کا جو بنگلہ خالی پڑا ہے اس کو عارضی ٹھکانہ اور سٹور بناتے ہیں۔ جیسے ہی لاہور کا سامان کراچی پہنچا وہ اس بنگلے میں سٹور کر دیا گیا۔ کراچی سے خریداری شروع کر دی گئی۔ سب سے پہلے باتھ روب بنانے والی فیکٹری جو انڈسٹریل اسٹیٹ میں تھی وزٹ کی اور ان کو اچھا خاصا آرڈر دیا۔ یہ فیکٹری لاہور کے دو بھائی علی ٹیکسٹائل کے نام سے چلا رہے تھے۔ یہ بھی بے ایمانوں کے سردار ثابت ہوئے۔ ہمارے دیے ہوئے آرڈر کی بجائے اپنی فیکٹری کا کباڑ پیٹیوں میں بند کر کے ہمیں دینا چاہتے تھے۔ میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا اور میری کوشش ہوتی تھی کہ ہر پیٹی میرے سامنے پیک کی جائے ورنہ میں انکار کر دیتا تھا۔ بڑی مشکل سے ان بے ایمان برادران سے ڈیل فائنل ہوئی۔ ہم نے اپنا کپڑا خرید کر گزری کے پاس ایک فیکٹری سے جینٹس شرٹ بنوائیں۔ رحمان صاحب واپس لاہور چلے گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے اپنے ایک دیرینہ دوست اور سابق پارٹنر سے میرا تعارف کروایا۔ اس کا نام تو شیر محمد تھا لیکن سب اس کو شیرو کے نام سے پکارتے تھے۔ شیرو سانولا، لمبے قد کاٹھ اور اچھے نین نقش کا 50/55 سالہ، باتونی اور ہرفن مولا قسم کا آدمی تھا۔ رحمان بھائی کا فرینک اور بہت پرانا فیملی فرینڈ تھا۔ 1974 کے لگ بھگ میٹروپول ہوٹل کراچی کے نزدیک ''مریم'' کے نام سے رحمان بھائی اور شیرو کی ایک بڑی اور اس وقت کے حساب سے بہت ماڈرن کراچی کی مشہور دکان تھی جو لیڈیز اور جینٹس آوٹ فٹ ڈیل کرتی تھی۔ شیرو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کراچی کا انسائیکلو پیڈیا تھا۔ جو چیز عام مارکیٹ میں ایک صد روپے میں مل رہی ہوتی ہے وہ بولٹن مارکیٹ میں 75 روپیمیں ملتی ہے۔ لیکن گلی محلوں اور جہاں بھی یہ چیزیں مینوفیکچر ہو رہی ہوتیں وہاں 30/35 روپے میں

دستیاب ہوتی ہیں۔تمام دکاندار ان ہی گلی محلوں سے خرید کر اپنی قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔کراچی میں کون، کہاں، کیا بنا رہا ہے وہ شیرو کو معلوم تھا۔وہ ہمیں لے جاتا اور بازار سے 50% کم پر ہماری ڈیل فائنل ہو جاتی۔ اس کی سوشل واقفیت بھی بہت تھی۔اس کا بھائی سندھ کا ایڈووکیٹ جنرل تھا۔ایک روز میں نے کہا شیرو بھائی مجھے ہاتھ سے بنائی ہوئی اصل ریشم کی ٹائیاں لینی ہیں۔جو افریقہ میں ٹاپ براس لوگوں میں As a Gesture of Friendship پیش کر سکوں۔وہ بولا نو پرابلم شام کو چلیں گے۔ہم سارا دن مینوفیکچرز اور ہول سیل ڈیلروں کے پاس آتے جاتے اور سامان جمع کرتے رہتے۔شیرو کی وجہ سے کافی مدد بھی ہوگئی۔وہ ہر طرح کی چیز ہمیں دکھاتا اور مجبور کرتا کہ یہ بھی آپ خرید لیں، وہ بھی آپ خرید لیں۔مگر اپنے سابقہ تجربہ کی بنیاد پر مجھے جو چیز پسند آتی میں صرف وہ ہی لیتا۔کسی کی بھی چرب زبانی مجھے قبول نہ ہوتی اور نہ ہی میں کوئی اثر قبول کرتا۔جس کی وجہ سے شیرو میری ذات سے زیادہ خوش نہ تھا۔شام کو وہ مجھے ایک پوش علاقے میں لے گیا۔ایک بنگلے کے سامنے گاڑی کھڑی کی۔مجھے گاڑی میں ہی بیٹھا کر خود بنگلے کے اندر چلا گیا۔کچھ دیر کے بعد وہ بنگلے سے برآمد ہوا تو ایک بہت ہی جاذبِ نظر خاتون اس کو الوداع کرنے باہر تک تشریف لائیں۔جس کو دیکھ کر میں نہ صرف حیران ہوا بلکہ میں نے اس کو پہچان بھی لیا۔وہ عذرا تھی جو کہ ایک بیوٹشن کے طور پر پاکستان اور پاکستان سے باہر اپنی پہچان رکھتی تھی۔ان دنوں TV پر بھی اکثر و بیشتر اس کے کلپس دیکھے جا سکتے تھے۔T.V پر ابتدا کچھ اس طرح ہوتی تھی پہلے ایک Well equiped Beauty Parlour کا کلپ دکھایا جاتا۔پھر عذرا کو مستانی چال چلتے دکھایا جاتا۔اس کی خوبصورت لہراتی زلفیں دکھائیں جاتیں۔جنہیں عذرا ایک دلربائی کے ساتھ سر کو جھٹک کر اپنے چہرے سے ہٹاتی اور کرسی پر بیٹھی ایک نازنین کی جانب آتی، جس کے بال الجھے ہونے کے ساتھ نہ صرف بکھرے ہوئے ہوتے بلکہ دیکھنے میں بہت بدبصورت بھی نظر آ رہے ہوتے اور وہ سامنے لگے ہوئے آئینے میں اپنے بال دیکھ کر کرسی پر بیٹھی ہوئی بَل کھا کر چہرے کے تاثر کے ذریعے پریشانی کا اظہار کرتے دکھائی جاتی۔اتنے میں بیک گراونڈ سے آواز آتی ''اب عذرا آپ کے بال سنواریں گی''۔اس لئے میں عذرا کو فوراً پہچان گیا لیکن خاموش رہا اور دل میں سوچا کہ اب شیرو کو سبق سکھانا ہی پڑے گا۔دوسرے روز میں نے شیرو سے کہا کہ شیرو بھائی جو شخص کسی دوسرے کو بیوقوف خیال کرتا ہے اصل میں وہ خود بیوقوف ہوتا ہے۔شیرو نے کہا کہ وہ کچھ سمجھا نہیں۔میں سنی ان سنی کر گیا۔دوسرے روز شام کو میں نے عمران سے کہا شیرٹن کراچی میں غلام علی کا غزل پروگرام ہے چلیں گے۔وہ خوش ہو کر بولا ٹھیک ہے۔پھر میں نے اس سے پوچھا کہ جس بنگلے میں شیرو ہمیں باہر کھڑا کر کے خود اندر چلا گیا تھا کیا تمہیں وہ بنگلہ یاد ہے وہ بولا مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔شام کو ہم جلدی تیار ہو گئے اور عذرا کے بنگلے کی طرف کار بھاگی جا رہی تھی۔واقعی

عمران نے گاڑی سیدھی اسی بنگلے کے سامنے جا کر روکی۔ ابھی ہم گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے کال بیل پر انگلی رکھنے ہی والے تھے کہ ایک اور گاڑی آ کر رکی جس میں سے عذرا اپنی پوری آن بان شان کے ساتھ برآمد ہوئی۔ وہ واقعی ایک خوبصورت عورت تھی۔ اونچا لمبا قد، نفیس لباس، بولتی آنکھیں، اندازِ تکلم بے حد شائستہ دھیمے لہجے میں بولی فرمائیں۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا گزشتہ رات شیرو ہمارے لیے آپ کو ٹائیوں کا آڈر دے کر گیا ہے اس سلسلے میں آپ سے بات کرنی تھی۔ اگر آپ چند منٹ عنایت کر دیں کیونکہ آپ کا فون نمبر ہمارے پاس نہیں تھا ورنہ ٹائم لے کر آتے۔ وہ بولی آپ تشریف لائیں۔ ہم دونوں اس کے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ ڈرائنگ روم اس قدر نفاست سے سجایا گیا تھا کہ میں نے آج تک اس عمر میں بھی اتنی نفاست، خوبصورتی اور جاہ جلال والا ڈرائنگ روم نہیں دیکھا۔ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ اس گھر میں وہ اپنے جیون ساتھی مسٹر حسین، جنرل منیجر ہینو پاک اور ایک بیٹی کے ساتھ رہتی ہیں۔ کاروباری بات چیت جاری تھی کہ مسٹر حسین بھی تشریف لے آئے۔ وہ بھی نفیس اور مہذب شخصیت تھے۔ افریقہ دیکھنے اور افریقی کلچر کے متعلق جاننے کے خواہش مند تھے۔ جب بات چیت دوستانہ لب لہجہ اور چائے نوشی تک جا پہنچی تو میں نے مسٹر حسین سے اجازت طلب کی اور انہیں بتایا کہ میں آپ کے لئے بہاول پور کے روایتی تحائف لے کر آیا ہوں، اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔ وہ میری گفتگو سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے بولے آپ کی گفتگو اور شخصیت بہت متاثر کن ہے۔ میں نے عمران کو اشارہ کیا کہ کار سے تحائف اٹھا لائے۔ وہ تیزی سے گیا۔ جب وہ واپس آ رہا تھا تو آٹو میٹک الیکٹرونک گیٹ لاک ہو گیا۔ عمران نے گیٹ کے باہر لگے ہوئے فون سے بتایا اور کال بیل پر رکھا ہوا ہاتھ بھی نہ اٹھایا۔ عذرا نے اپنی بیٹی کو آواز دے کر صورت حال بتائی اور گیٹ کا اندرونی سوئچ آن کرنے کا کہا۔ اس طرح گیٹ تو کھل گیا لیکن ایک دھڑام سی آواز آنے پر ہم سب جب متوجہ ہوئے تو معلوم ہوا عمران بے ہوش ہو کر چاروں شانے چت فرش پر گرا پڑا ہے۔ ہم سب بھاگے گئے۔ عمران کو اٹھا کر صوفے پر لٹایا۔ تحائف اکٹھے کیے۔ عذرا کی بیٹی پریشانی سے ہماری شکلیں دیکھ رہی تھی۔ اس سے پوچھا بیٹا کیا ہوا تھا۔ وہ بولی انکل میں نے دروازہ کھولا، یہ صاحب اندر داخل ہوئے اور گر کر بیہوش ہو گئے۔ خیر عمران کے منہ میں کورامین کے ڈراپس ڈالے گئے تو وہ ہوش میں آ کر ہونقوں کی طرح ہمیں دیکھنے لگ گیا۔ میں نے ماحول کی تلخی کو دور کرنے کے لیے ٹاپک کا رُخ بدلا اور تحائف کھول کر دکھانے شروع کیے۔ حسین صاحب کے لیے ایک کھسہ، عذرا کے لیے ایک کُرتا اور دوپٹہ جو امبرائیڈری سے بھرا ہوا تھا اور خوبصورت رنگوں کا حسین امتزاج تھا اور بیٹی جو اس وقت کیمبرج کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی کے لیے ایک بہاول پوری سلیم شاہی جوتی۔ سب لوگ اتنے خوش ہوئے کہ خوشی آج الفاظ میں بتائی نہیں جا سکتی۔ عذرا بولی ادریس آپ نوابوں کے شہر کے باسی ہو، تحالف

بھی نوابی لائے ہو۔اس طرح عذرا کے پاس ہمارا پہلا وزٹ مکمل ہوا۔آتے ہوئے میں نے اسے کہا جو بھی آپ ریشم کی ٹائیاں بنائیں گی اس آڈر کو ڈبل کر لیں۔فون نمبر جو آپ نے عنایت فرمایا ہے میں اس پر آپ سے کنفرم کرنے کے بعد لینے آجاؤں گا۔وہ بولی ٹھیک ہے۔اب غلام علی شو میں جانا بے کار تھا کیونکہ رات کے 11 بج چکے تھے۔جب ہم گھر میں پہنچ گئے تو میں نے عمران سے پوچھا کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا۔وہ بولا انکل میں نے اتنی خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔جب میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو پھر مجھے ہوش نہ رہا۔بعد کے حالات آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔وہ بچی واقعی بے حد خوبصورت تھی۔اس میں ذرا برابر بھی غلط نہ تھا۔یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی میرا غصہ عروج پر تھا اور یہ بات میرے دماغ سے جا ہی نہیں رہی تھی کہ شیرو نے ہمیں باہر کیوں روکے رکھا۔جبکہ Pay Master تو میں تھا۔وہ تو رحمان بھائی کا نہ صرف سفارشی تھا بلکہ ہمارا ایک ادنیٰ سا ورکر تھا۔اس کی یہ آواز کہ ''آپ لوگ کار میں ہی رکیں میں ابھی آتا ہوں'' میرے کانوں میں سائیں سائیں کرتی رہتی۔میں سوچتا رہتا کہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔میری انا(Ego) مجھے ٹکنے نہ دے رہی تھی۔میں شیرو کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ رحمان بھائی کا فیملی فرینڈ تھا۔مزاج کے لحاظ سے میں بھی اپنے اور پرائیوں میں بدنام تھا۔ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ شیرو آ گیا۔وہ روزانہ کی بنیاد پر دو تین ہول سیلر اور مینوفیکچرز متعارف کرواتا اور ان کی مصنوعات کی تعریف کرتا اور افریقہ میں مقبول ہونے کی اُمید دلاتا تھا۔ابھی اس نے اپنا راگ شروع کرنے کی ابتدا ہی کی تھی کہ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا: شیرو فوراً شیرٹن ہوٹل جاؤ اور ان کے فیملی ہال میں 10 لوگوں کے لیے کل کی تاریخ میں ڈنر کے لیے Booking کراؤ۔ہمارا فیملی ڈنر ہے۔وہ جلدی سے چلا گیا اور دو گھنٹے کے بعد کنفرم بکنگ سلپ لے کر آ گیا۔پھر میں نے عذرا کو فون کیا اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ کل شیرٹن میں میری فیملی کے ساتھ ڈنر کر سکتی ہے؟اس نے کہا کیوں نہیں!لیکن مجھے حسین کو چیک کرنے دو کہیں اس کی کل کی مصروفیت نہ ہو۔میں نے اپنے میز پر رکھے ہوئے فون کا نمبر اسے دے دیا اور کہا کہ ابھی میں گھر پر ہی موجود ہوں آپ مجھے بتا سکتی ہیں۔15 منٹ بعد ہی عذرا کا فون آ گیا کہ حسین آپ کا سن کر بہت خوش ہوئے اور بولے میں اگر مصروف بھی ہوا تو ادریس کے ڈنر پر ضرور جاؤں گا۔میں نے اسی وقت تمام پروگرام کنفرم کرتے ہوئے ہال کا نمبر اور بکنگ نمبر اس کو بتا دیا۔

اس کے بعد میں نے کالوجی کو ان کے آفس میں فون کر کے دعوت دی اور کنفرمیشن بھی لی۔اس طرح ہم 8 لوگ مرد و خواتین اور عذرا اور حسین صاحب 10 لوگ ہو گئے۔دراصل ہم لوگ اپنی تمام خریداری مکمل کر چکے تھے۔اب صرف فیکٹریوں سے ڈیلوری کا انتظار تھا اس لئے کچھ ٹائم ہمارے پاس دیگر کاموں کے لیے سرپلس تھا۔شیرو نے مجھے متعدد بار پوچھا کہ کون کون سے فیملی ممبرز آ رہے ہیں کیونکہ کراچی میں مقیم میری تمام فیملی کو وہ جانتا تھا بلکہ

آنا جانا بھی تھا۔ میں نے اسے کہا آپ صرف رحمان بھائی اور فاروق بھائی (کالو جی) کی فیملی کو جانتے ہو لیکن میری فیملی کو نہیں جانتے۔ اس نے کئی بار میری توجہ مبذول کرائی کہ میں نے اس کو اور اس کی فیملی کو ابھی تک دعوت نہیں دی جبکہ میں نے تو اپنی فیملی سمیت ہر موقع پر آپ کی فیملی میں شامل ہوتا ہوں۔ جس کا میں نے کوئی نوٹس نہ لیا اور شیرو مایوس ہو کر خاموش ہو گیا۔ دوسرے روز دعوت بہت ہی خوبصورت انداز میں اپنے اختتام کو پہنچی۔ میری فیملی کی خواتین کو سخت اعتراض تھا کہ میں نے عذرا کی دعوت کیوں کی۔ آپا فرزانہ (بہن جی) مسز کالو کی انگریزی زوروں پر تھی۔ وہ ہر بات سوال جواب، دیکھنا، کھانا، پینا وطنز، کالو جی کو ڈانٹ ڈپٹ، میری جواب طلبی اور دھمکی کہ میں ابھی بھابھی یعنی میری مسز کو فون کرتی ہوں کہ ادریس بھائی بہت خراب ہوتے جا رہے ہیں انہیں افریقہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے انہیں اپنی نگرانی میں بہاول پور میں ہی رکھیں یہ سب انگریزی میں ہی نشر ہو رہا تھا۔ حسین صاحب اور عذرا صاحبہ بہت خوبصورت لباس میں ایک نہایت دلکش شخصیت، دوسرا بہت ہی جاذب نظر، ہوٹل کے آنگن میں چکور اور چکوری کی طرح اترے اس طرح کی تعریف کرنے پر دیگر تمام خواتین میرے خلاف ہو گئیں۔ میں نے عذرا اور حسین صاحب کو افریقہ کے کالا ہار جنگل میں شکار اور کیمپنگ کی دعوت بھی دے ڈالی جس کے وہ بہت خواہشمند بھی تھے۔ میری دعوت قبول کر لی گئی۔

دوسرے روز کالو جی نے مجھے اپنے بیڈ روم میں بلوایا اور بولے کہ ادریس بھائی مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی کہ عذرا آپی کو میامی امریکہ کے ساحل پر ملی تھی۔ مہربانی فرما کر اب پوری کہانی سنا ڈالو تا کہ میرا تجسس دور ہو جائے۔ میرا ہنس ہنس کر بُرا حال تھا۔ میں نے تمام کہانی من وعن کالو جی کو سنا ڈالی جن کا میں بے حد احترام کرتا تھا اور کرتا ہوں اور وہ بھی نہایت شفقت اور پیار و احترام سے پیش آتے تھے۔ وہ ہنستے ہوئے بولے شیرو کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ دوسرے روز جب شیرو حسب سابق میرے پاس ایک نئے عزم کے ساتھ اور چند بل لے کر آیا تو میں نے اسے کہا شیرو صاحب یہ تمام آرڈر میں کینسل کر چکا ہوں اس لئے پیمنٹ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تمام سامان موصول ہو چکا ہے اور تمام Payments کی جا چکیں ہیں۔ کل سے کینیٹر والے آ کر سامان لے جائیں گے لہٰذا اب آپ تکلیف نہ کریں۔ وہ خاموشی سے چلا گیا۔ رات کو جب میں کالو جی سے ملنے گیا تو شیروان کے پاس بیٹھا آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے لاہور رحمان صاحب کو بھی فون کیا تھا انہوں نے ادریس صاحب کو فون کر کے کہا اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ ادریس صاحب نے کہا کہ میں ایسے فیصلے کرتا ہی نہیں جن پر بعد میں نظر ثانی کرنی پڑے۔ فاروق بھائی نے شیرو سے کہا کہ آپ نے ادریس بھائی کو under-estimate کیا ہے۔ جب کالو نے شیرو کو بتایا کہ دعوت میں چیف گیسٹ حسین صاحب اور عذرا صاحبہ تھیں تو ساتھ ہی اس کے آنسو نکل آئے اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ کالو جی نے مجھے صرف ایک بار پوچھا کہ کیا کچھ گنجائش باقی ہے سامان لیا جا سکتا

ہے؟ میں نے کہا کنٹینر سے بھی زیادہ سامان ہوگیا ہے اور اب ذرا سی بھی گنجائش باقی نہیں ہے۔ وہ خاموش ہوگئے اور اس کے ساتھ ہی یہ باب ختم ہوگیا۔ کنیٹر لوڈ ہوکر پورٹ پر کسٹم کلیئرنس کے لیے جاچکا تھا۔ کنیٹر کلیئرنس کا لوجی کی مہربانی سے ہوئی۔ سی پورٹ کے حالات مختصراً عرض کرتا ہوں۔ سی پورٹ کا تمام عملہ چوروں کا گینگ لگتا تھا۔ کنٹینر ابھی سیل نہیں ہوا تھا۔ چیکنگ کے بعد کسٹم والے خود سیل کرتے ہیں۔ کارٹن کو تیز دھار آلے سے کاٹ کر اندر سے سامان نکالا ہوا تھا۔ میں نے کراچی کے مشہور روڈ ماسٹر برانڈ کے بوٹ آڈر پر بنوائے تھے، ان کے کئی ڈبے غائب تھے اور اسی طرح دیگر ڈبے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ سی پورٹ پر ہر آدمی بدنیت اور چور تھا چاہے وہ بڑا عہدے دار تھا یا چھوٹا ملازم تھا۔ میرے معزز قارئین اتنا لکھنے کو ہی کافی سمجھیں۔

گزشتہ بوٹسوانہ کے ٹورز میں ایک بات میرے مشاہدے میں آئی تھی کہ بوٹسوانہ میں بزنس کمیونٹی کے کچھ لوگ بھارت سے سنگر اور ڈانسر زلڑکیاں بلوا کر ان کا شو کرواتے ہیں۔ گانے ان سے پنجابی، اُردو، پاکستانی سنتے ہیں۔ ایسے ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نا اپنے پاکستانی فن کاروں کو گائیڈ یا مدعو کیا جائے۔ ہماری شاعری، ہماری دھنیں بھارت کیوں استعمال کرے۔ اس سلسلے میں مَیں نے ایک اداکارہ دوست کے توسط سے پہلے شیما کرمانی سے رابطہ کیا۔ رات 8 بجے اس کے گھر گئے۔ شیما کرمانی اور اس کے شوہر سے ملاقات ہوئی وہ بہت عزت احترام سے ملے، چائے بھی پلوائی۔ مگر وہ صرف کلاسیکل ڈانس ہی کرسکتی تھی اور اس کے پاس ٹیم ورک بھی نہ تھا۔ پھر کراچی آرٹس کونسل کے فن کاروں سے ملاقات ہوئی۔ مگر وہ آرٹسٹ کم اور سیاست دان زیادہ تھے۔ لیڈیز آرٹسٹ زیادہ تر سیاست دانوں کی ملکیت میں تھیں جن میں تمام پارسا، عوام کی غربت، عوامی دیگر مسائل، مہنگائی، غریب لوگوں کی حالتِ زار پر فکرمند، پاکستان پر زبانی کلامی قربان ہونے والے اور قوم کے درد میں گھل گھل کر مرنے اور مرمر کر جینے کے بعد ان آرٹسٹوں کی زلفوں کی چھاؤں میں اپنی اسیری گزارنے والے یہ نام نہاد قوم کے راہنما ہی تھے۔ اس لئے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا لیکن سوشل مصروفیت زیادہ ہوتی چلی گئی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کنٹینر روانہ ہوا۔ ہمیں Bill of Lading اور دیگر ضروری کاغذات موصول ہوگئے۔ اب میں نے اور عمران نے بہاول پور کا رخ کیا تاکہ اپنی اپنی فیملی کے ساتھ دن گزارے جائیں۔ ائر Booking ہم نے کالوجی کے ذمہ لگادی۔ انہوں نے ہمارے سامنے وہیں کمپنی منیجر کو بلا کر اس کے حوالے کردی اور حکم صادر کردیا کہ بذریعہ فیکس تمام سیکٹر کنفرم کرا کر پھر OK کی جائے۔ بہاول پور دن گزرتے پتہ ہی نہ چلا۔ میرا بیٹا نوید ایک ذمہ دار نوجوان کی صورت میں پورے گھر کو سنبھالے ہوئے تھا اور B.Sc. کی تیاری بھی کررہا تھا۔ گھر کا تمام معاشی نظام اب اس کے حوالے تھا جس کو وہ احسن طریقے سے چلا رہا تھا۔ دیگر تمام بچے بھی سکول وکالج میں زیرِتعلیم تھے۔ کراچی سے کالوجی کا Fax آ گیا جس میں کراچی - نیروبی PIA، نیروبی - جوہانسبرگ KLM اور جوہانسبرگ -

گیبرون ائر بوٹسوانہ میں سیٹیں کنفرم ہونے کی نوید سنائی گئی تھی۔ ساتھ ہی ایک Fax ڈاکٹر مکرم کی طرف سے تھا۔ جس میں اطلاعاً بتایا گیا تھا کہ BCCI دیوالیہ ہونے جا رہا ہے، اس لئے آپ بیس ہزار ڈالر کا چیک بذریعہ DHL فوراً بھجوا دیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ چیک ملتے ہی بینک سے رقم نکلوا کر کسی دوسرے بینک میں رکھ دی جائے۔ جیسے ہی FAX ملا اسی لمحے، ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر، میں نے چیک لکھا اور کراچی سے DHL کے ذریعے روانہ کر دیا۔ جو حیران کن طور پر کم از کم وقت میں ان کو مل گیا اور انہوں نے اسی وقت بینک سے کیش حاصل کر لیا اور مجھے اطلاع دے دی۔ میں بے فکر ہو گیا۔ اسی دوران مجھے دردِ گردہ کی شکایت رہنے لگی۔ شدید درد کی صورت میں گولیاں وغیرہ لے کر گزارہ کرتا۔ الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے پتہ چلا کہ 5mm کے 6 پتھر موجود ہیں۔ کنٹینر روانہ ہو چکا تھا۔ کاغذات میرے پاس تھے۔ سیٹیں کنفرم ہو کر کراچی کالو جی کے پاس تھیں۔ میں اللہ کے سہارے عمران کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ ملتان ائر پورٹ پر مجھے اللہ حافظ کہنے والوں میں میرے بیٹے نوید کے علاوہ ڈاکٹر نصیر الدین موجود تھے، جو اس وقت نشتر ہسپتال میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ کراچی فاروق بھائی اور ان کی اہلیہ محترمہ (بہن جی) نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ دو گاڑیاں لے کر آئے تھے۔ ایک کار بہن جی ڈرائیو کر رہی تھیں اور کالو جی ساتھ بیٹھے تھے۔ دوسری شیر خان ڈرائیور چلا رہا تھا جس نے ہمارا سامان اپنی گاڑی میں رکھا اور ہم گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ دوسرے روز فرید رحمان بھی لاہور سے کراچی آ گیا۔ اس طرح کورم پورا ہو گیا۔ ابھی ہماری فلائٹ میں کچھ دن باقی تھے۔ کنٹینر سے جو سامان بچ گیا تھا وہ ہم نے پیک کیا اور پرچون میں Book کرانے کی تیاری کرنے لگے۔ سندھی مسلم سوسائٹی میں جب ہم سامان اکٹھا کر رہے تھے اور وہاں قیام پذیر بھی تھے تو اس بنگلے کے اوپر والے حصے میں ایک بلوچ صاحب عرصہ دراز سے کرایہ دار کے طور پر قیام پذیر تھے اور سمندر کی دنیا کے باسی تھے۔ لانچیں وغیرہ تھیں۔ فشنگ ان کا کاروبار تھا۔ تین بیٹیاں، بیوی اور بہ نفس نفیس خود بہت ملنسار اور خوش مزاج تھے۔ صاحبِ بنگلہ کو ابا جان ان کی اہلیہ کو اماں جان اور دیگر بہن بھائیوں کو آپا جان اور بھائی جان کہہ کر پکارتے تھے۔ کرایہ کبھی ادا کر دیتے کبھی زار و قطار رو کر دکھا دیتے کہ حالات خراب ہیں۔ بزرگ ہنس کر خاموش ہو جاتے۔ جب ہم نئے نئے اس بنگلے میں عارضی طور پر گئے اور سامان کی ترسیل شروع ہوئی تو بلوچ صاحب کو بہت ناگوار گزرا۔ کیونکہ کبھی سامان آ رہا ہے، مزدور کارٹن اتار کر اندر رکھ رہے ہیں، گاڑیاں آ رہی ہیں، گاڑیاں جا رہی ہیں۔ اکثر بزنس مین جن سے کاروباری تعلق پیدا ہو رہا تھا، تواتر سے آتے جو بلوچ صاحب کو بہت ناگوار گزرتا۔ واپڈا میٹر انہوں نے بند کئے ہوئے تھے۔ پانی اور گیس کے میٹر بھی بند کئے ہوئے تھے اور بھی کافی قسم کی گڑبڑ تھی۔ شام کو پیتے پلاتے بھی تھے لہٰذا ہماری موجودگی بلوچ صاحب کو بہت ناگوار گزرتی۔ ہمارا قیام عارضی تھا اس لئے میں ہر قسم کی بدمزگی سے اجتناب کرتا اور پھر وہ ہمارے بزرگوں کو ابا جان اور امی جان کہہ کر مخاطب کرتا

تھا میں اس بات کا بھی بہت لحاظ کرتا تھا۔اس وقت کراچی کوسٹ گارڈ کے کمانڈر کرنل جی آر ساہی تھے جو میرے دوست ہونے کے ناطے اکثر مجھے ملنے آتے تھے۔بلوچ صاحب ہمارے قہقہے سنتے تھے اور خوش آمدید اور اللہ حافظ کہتے ہوئے بھی دیکھتے تھے۔ایک روز میں نے دیکھا کہ بلوچ صاحب نے کھانے کی ٹرے اٹھائی ہوئی ہے اور میرے کمرے میں بغیر اجازت داخل ہو کر فرمانے لگے ارے ادریس بھائی مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ آپ رحمان صاحب کے بھائی ہیں۔ارے بھائی وہ تو ہمارا داماد ہے۔آج بہت اعلیٰ قسم کے جھینگے آئے تھے تو آپ کی بھابھی صاحبہ کہنے لگی آپ خود جائیں اور ادریس بھائی کو کھانا دے کر آئیں۔یہ جھینگوں کی بریانی ہے اور یہ قورمہ ہے۔میں نے منہ میں پانی بھرنے کے باوجود تکلفاً انکار کیا تو وہ بہت زیادہ اصرار کرنے لگ گیا۔میں نے کہا اچھا آپ کا شکریہ سامنے والی ٹیبل پر رکھ دیں۔دونوں بچے باہر گئے ہوئے ہیں،آ جائیں تو ہم اکٹھے کھائیں گے۔وہ ٹرے رکھ کر چلا گیا۔میں ان دنوں تہمینہ درانی کی کتاب My Feudal Lord پڑھ رہا تھا۔اس کے جانے کے بعد پھر میں نے پڑھنا شروع کر دی۔تھوڑی دیر بعد دونوں بچے آ گئے اور ہم نے مل کر کھانا کھایا۔کھانا مزیدار اور ذائقہ دار تھا۔اگر میں یہ کہوں کہ میں نے جھینگوں کی اتنی اچھی بریانی پہلے کبھی نہیں کھائی تھی تو غلط نہ تھا۔دوسرے روز کرنل ساہی الوداعی ملاقات کے لیے آ گئے اور ہمیں اللہ حافظ کہتے ہوئے چلے گئے۔ان کے جانے کی دیر تھی کہ بلوچ صاحب نے ہمیں اوپر ہی اپنی فیملی میں بلوا لیا۔کھانا اس دن بھی بہت مزیدار اور اہتمام کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔میں نے بلوچ صاحب سے کہا آپ کی مہربانی اور مہمان نوازی کا بہت شکریہ۔آپ آئندہ تکلف نہ کریں کیونکہ مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔گھر میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سندھی میں بات کرتے تھے۔اتنے میں وہاں فرید نواز بلوچ T.V آرٹسٹ بھی آ گیا جو اس کا قریبی رشتے دار تھا۔اس کا بیٹا یاسر نواز جو آج کل T.V ڈراموں میں آ رہا ہے،اس وقت 10/12 سال کا تھا اور بلوچ کے پاس ہی رہتا تھا۔کوئی نہ کوئی شرارت کرنے پر میں اس کی پٹائی بھی کر دیتا تھا۔شام کو جب ہم کالو جی کے پاس گئے تو بلوچ صاحب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔مجھے کالو جی نے کہا کہ کرنل ساہی آپ کے پاس آتے ہیں۔میں نے ہاں میں جواب دیا تو وہ بولے بلوچ صاحب کا ایک کام ہے اگر آپ کروا دیں تو؟ میں نے بلوچ صاحب کی طرف دیکھا اور کہا فرمائیں۔انہوں نے کہا کوسٹ گارڈ والوں نے میری دو لانچیں پکڑی ہوئی ہیں وہ ریلیز کروا دیں۔میں نے کہا اچھا میں پتہ کرتا ہوں۔اس کے بعد وہ چلا گیا میں نے کالو کو جھینگا بریانی کی پوری کہانی سنائی تو وہ ہنسنے لگے۔دوسرے دن میں نے کرنل صاحب سے فون کر کے دریافت کیا تو پتہ چلا کہ سمگلنگ کے الزام میں دونوں لانچیں اور اس کا عملہ کوسٹ گارڈ کی تحویل میں ہے۔میں نے کالو جی کو تفصیل بتائی تو انہوں نے فوراً کہا کہ ہم کسی سمگلر کی سفارش کبھی بھی نہیں کرینگے۔مجھے کہا پرسوں تمہاری فلائٹ ہے کیا تمہاری تیاری مکمل ہے؟ میں نے کہا الحمدللہ مکمل ہے۔وہ بولے رب تعالیٰ آپ کو کامیاب کرے۔

دوسرے روز کالو جی کے گھر نصرت فتح علی خاں کا قوالی پروگرام تھا۔نصرت فتح علی خاں کالو جی کا بہت بڑا فین تھا اور ہر سال کالو جی کے گھر ایک رات کا پروگرام کرتا تھا۔تمام رات اللہ ہو اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر لوگ ہمارے سمیت جھومتے رہتے۔صبح نماز کے وقت جا کر یہ پروگرام ختم ہوا۔

آخر اگلے دن ہم تینوں یعنی راقم الحروف، فرید رحمان اور عمران احمد کراچی سے نیروبی کے لیے عازم سفر ہوئے ۔ یہ سفر بہت پرسکون تھا اور پھر اپنی قومی ائر لائن تھی۔رات نیروبی میں گزارنے کے بعد دوسرے روز KLM سے جوہانسبرگ کے لیے عازم سفر ہوئے۔KLM کی سروس اور کھانا اچھا تھا۔Booking کے وقت ڈیمانڈ دینے پر مسلم کھانا دیا جاتا ہے۔جوہانسبرگ سے گیبرون ائر بوٹسوانہ کا چھوٹا سا جیٹ ہمیں لے کر گیبرون ائر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔ائر پورٹ پر ہمیں لینے حسن نانک اور ڈاکٹر مکرم آئے ہوئے تھے۔ہم لوگ متواتر سفر کرنے سے بہت تھک چکے تھے اس لئے جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے۔دوسرے روز اتوار تھا۔حسن نانک نے مجھے کہا کہ کل بروز اتوار ڈنر گھر پر اکٹھے کریں گے۔اب ہمیں بزنس کے لیے گیبرون میں ہی قیام کرنا تھا اس لئے سوشل تعلقات بھی ضروری تھے۔مسز حوا بیگم بہت اچھا کھانا بناتی تھی۔سادہ اور نرم دل خاتون تھی۔میں اس کو بہن کی نظر سے دیکھتا تھا۔جب وہ میز پر کھانا سجا کر آواز دیتی "Come and eat" تو مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے میری آپا آواز دے رہی ہے۔میں اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ابھی ہم بیٹھے آپس میں بات چیت ہی کر رہے تھے کہ مجھے درد کا احساس ہوا جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور پھر نا قابل برداشت ہو گیا۔میں ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرنے کے بعد صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا۔سب بہت پریشان ہو گئے کیونکہ درد کی شدت سے میرے چہرے کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔بات کرنی مشکل ہو گئی۔حسن نانک اپنے کمرے میں تھا وہ جب آیا تو اس کو بتایا گیا کہ درد گردہ کی وجہ سے میرا بُرا حال ہے۔وہ ہنسنے لگ گیا اور وہ بولا یہ بھی کوئی بیماری ہے۔اس نے ماریشس کی زبان میں اپنی بیوی حوا بیگم سے کچھ کہا تو وہ بھاگی گئی اور گنے کی طرح کا ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھا لائی۔حسن نانک نے ایک چاقو کی مدد سے اس لکڑی کا برادہ بنایا اور اس کی بیوی نے پانی میں ابال کر مجھے ایک جگ پانی دیا اور کہا بھائی صاحب آپ کو جب بھی پیاس لگے آپ یہ پانی پئیں ان شاء اللہ پتھر نکل جائیں گے۔میں پین کلر گولیاں لے چکا تھا۔بے دلی سے جگ پکڑ لیا اور عمران سے کہا کہ مجھے گھر لے چلے۔گھر جا کر لیٹ گیا۔مجھے جلد ہی گہری نیند آ گئی اور بے خبر سو گیا۔رات اڑھائی بجے کا وقت تھا جب میری آنکھ کھلی۔مجھے سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔میں نے فرج کھول کر وہی جگ اٹھایا اور کرسی پر بیٹھ کر تمام جگ پی گیا۔پھر جا کر سو گیا۔صبح 5 بجے پھر آنکھ کھلی تو واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، تمام پانی پاس ہونا شروع ہو گیا۔جب میں واش اپ ہو کر باہر آیا تو بالکل فریش تھا۔دائیں بائیں جو بھاری پن اور درد تھا اس کا نام ونشان تک نہ تھا۔وہ دن اور آج کا دن پھر مجھے کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔لٹراساؤنڈ کرانے پر ڈاکٹر جوزفائین نے بتایا کہ تمام پتھر ریت کی شکل اختیار کر کے پاس ہو چکے ہیں۔صرف مثانے میں خراش ڈال گئے ہیں جس کی وجہ

سے صرف 3 دن اینٹی بایوٹک لے لیں۔ اب دیگر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں نے رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور آئندہ آنے والی مصروفیت کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا۔

ایک نیا شاپنگ سینٹر تعمیر ہو کر کام شروع کر چکا تھا۔ وہاں ہم نے ایک ہال نما ویئر ہاؤس کرایہ پر لیا جس کے ساتھ ایک کمرہ اور دو باتھ روم بھی تھے۔ ہال ہر لحاظ سے مکمل تھا۔ فرنٹ تمام کا تمام المونیم گرِل اور گلاس ورک سے سجایا گیا تھا۔ ہمیں فرم رجسٹریشن، ورک پرمٹ، ایک سال کا Resident Permit اور دیگر تمام کاغذات ہمارے کمپنی سیکرٹری مسٹر مسالیلا کے توسط سے مل چکے تھے۔ سابقہ قیام کی بنیاد پر اپنا پاکستانی لائسنس دکھانے پر بوٹسوانہ کا ڈرائیونگ لائسنس بھی مل چکا تھا۔ کنٹینر کسٹم کلیئرنس کے لیے میں نے اپنے سابقہ ایجنٹ مونیکا سے رابطہ کر کے تمام کاغذات ان کے حوالے کر دیے تھے۔ کنٹینر نے ساؤتھ افریقہ کی ڈربن پورٹ پر آنا تھا اور وہاں سے بوٹسوانہ کسٹم اتھارٹی کی تحویل سے کلیئر ہو کر ہمارے ویئر ہاؤس واقع گیبرون میں ڈیلیور ہونا تھا۔ اب مجھے رقم کی سخت ضرورت تھی۔ میں نے ڈاکٹر مکرم سے 20 ہزار ڈالر کا مطالبہ کیا تو انہوں نے مجھے حسن نانک کی راہ دکھائی۔ جب حسن نانک کے پاس گیا تو اس نے کوئی معقول جواب نہ دیا۔ دو تین دن میں ٹینس کی گیند بنا رہا۔ دراصل میں ڈاکٹر مکرم کی بے حد عزت کرتا تھا اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حسن نانک اور ڈاکٹر مکرم صرف بیس ہزار ڈالر پر نیت خراب کر لیں گے۔ ڈاکٹر صاحب گورنمنٹ ملازم تھے اس لئے بندوق حسن نانک کے کندھے پر رکھ کر چلائی گئی۔ دوسری طرف میں رات کو چین سے سو بھی نہ سکتا تھا۔ ویئر ہاؤس کا ایڈوانس کرایہ دینا تھا۔ کسٹم کلیئرنس ایجنٹ کا بل وقت آنے پر ادا کرنا تھا۔ اپنا ذاتی زندگی کی ضروریات کا خرچ۔ پہلے میں صرف اکیلا تھا اب ہم تین تھے۔ جب میں چکر لگا کر تھک گیا اور زبان کا مزہ، ایک دوسرے کا احترام اور اعتبار سخت خطرے سے دوچار ہو گیا تو میں نے سوچا پہلے اپنے آپ کو سنبھالا جائے۔ ویئر ہاؤس میں جو کمرہ تھا وہ اچھا خاصا `20x18 کا کمرہ تھا۔ اس میں بیڈ آ گئے۔ میز کرسی بھی آ گئی۔ تمام دن مصروفیت رہتی صرف رات کو سونا ہوتا تھا۔ مونیکا سے رابطہ کیا اور انہیں درخواست دی کہ ہمیں بھی دوسرے امپورٹر کی طرح کریڈٹ کی سہولت دی جائے۔ انہوں نے مجھے انٹرویو کے لیے بلا لیا جو رب تعالیٰ کے کرم سے بہت اچھا ہو گیا اور ساٹھ دن کے کریڈٹ کی اجازت مل گئی۔ ''مونیکا'' ایک انٹرنیشنل کسٹم کلیئرنس اور فریٹ فارورڈنگ ایجنسی ہے جو دنیا کے اکثر ممالک سے آپریٹ کرتی ہے۔ پھر میں فرسٹ نیشنل بینک آف ساؤتھ افریقہ گیا۔ اسی بینک نے BCCI کی جگہ لی تھی۔ اس کی منیجر ایک نوجوان خاتون تھی۔ پہلے خاتون کی خوبصورتی کا اندازہ کر لیں اور تصور کریں کہ اگر آپ ایسی خوبصورت خاتون کو انٹرویو دے رہے ہوں تو کیسی کیفیت سے گزر کر سانس لیں گے۔

یہ خاتون اچھی صورت، مناسب لمبا قد، نین نقش کٹاری، ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند، لپ سٹک کے ساتھ سرخ اور بغیر لپ سٹک کے گلابی، رخسار قندھاری اناروں کی مانند، لمبی گردن جس کو صراحی دار کہنا گردن کی توہین ہو گی، گولڈن مگر لہراتی ہوئی ریشم جیسی زلفیں، غزالوں جیسی مگر بیباک آنکھیں، دہکتے ہوئے انگارے اپنی

جان پر لئے قدرت کی مصوری اور صناعی کا ایک عظیم شاہکار تھی۔ میں نے کئی بار ملاقات کے لیے ٹائم مانگا مگر سیکرٹری نے کہا میڈم کا شیڈول بہت ٹائٹ ہے آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ چار روز کے بعد ملاقات ہو ہی گئی۔ اپنے آفس میں کرسی پر بیٹھی بے حد خوبصورت اور ڈیشنگ لگ رہی تھی۔ میں نے اپنا تفصیلاً تعارف کروایا۔ اپنی کمپنی کا بتایا۔ آن دی وے کنٹینر کا بتایا اور پھر BCCI کے دیوالیہ ہونے کی وجہ سے اپنے بیس ہزار ڈالر کے نقصان کا بتایا۔ وہ یہ سب نوٹ بک پر کسٹمر ہسٹری کے طور پر نوٹ کرتی گئی۔ اس کی مخروطی انگلیاں بہت آرٹسٹک تھیں۔ ہاتھ بھی وائٹ گولڈ کے پیالوں کی طرح تھے جن پر ناخن روبی کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میری تمام گفتگو سن کر وہ بولی کیا آپ کا اکاؤنٹ اس برانچ میں ہے۔ میں نے اپنی چیک بک دکھاتے ہوئے کہا یہ میرا اکاؤنٹ نمبر ہے۔ وہ بولی اب فرمائیں میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے اسے کہا کاروباری ضرورت کے تحت مجھے ایڈوانس کی ضرورت پڑ سکتی ہے اس کی سہولت دی جائے۔ وہ ایک لمحے کو سوچ میں گم ہوگئی پھر بولی اگر ایڈوانس کی سہولت اس Stage پر میں آپ کی کمپنی کو نہ دوں تو آپ کیا تاثر لینگے؟ میں نے جواب دیا مجھے اجازت ہے میں اپنے تاثرات بیان کروں۔ وہ بولی آپ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے بیان کر سکتے ہیں۔ میں نے بڑی اطمینان سے ایک طائرانہ نظر اس پر دوبارہ ڈالی۔ وہ آنکھیں گھما گھما کر مجھے دیکھ رہی تھی میں نے کہا بینک ایڈوانس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی خوبصورت ترین عورت سے باتیں کر لیں، اس کو دیکھا اور اس کو بنانے والے کی دل ہی دل میں تعریف کرتا رہا کہ وہ سب سے بڑا مصور ہے۔ اس لئے میری کوئی محسوسیات نہیں ہیں اور مجھے ایڈوانس کی ذرا بھر بھی پروا نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ بہت توجہ سے میری بات سن رہی تھی۔ میں نے کہا آپ کی یہ مخروطی انگلیاں اتنی خوبصورت ہیں کہ آپ ایک مصورہ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ جھٹ سے بولی میں سپین میں مصوری سیکھتی رہی ہوں اور پینٹنگ بنانا میرا شوق ہے۔ میں نے اسے کہا مجھے تو آپ انڈین معلوم ہوتی ہیں۔ وہ میری اس آبزرویشن سے بہت حیران ہوئی اور بولی میرے والد انڈین تھے اور پنڈت خاندان سے تھے جبکہ میری والدہ سپین سے ہیں۔ میں ساؤتھ افریقہ سے فارغ التحصیل ہوں۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا کہ اس سے پیشتر یہ خود کہے کہ انٹرویو کا ٹائم ختم ہو گیا اب آپ جا سکتے ہیں میں نے کہا Ok Miss World میں اجازت چاہوں گا اور آپ کے ٹائم دینے اور مجھے برداشت کرنے کا شکریہ۔

وہ بھی اخلاقی طور پر کرسی سے کھڑی ہوگئی۔ پھر کیا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بغیر پروں کے پری ہو۔ قدرت نے اس کو پدمنی نسل سے پیدا کیا تھا۔ میری کیفیت اور محسوسیات کو وہ اچھی طرح نوٹ کر رہی تھی اور بہت ہی ظالمانہ انداز میں مسکرا بھی رہی تھی میں نے کھسیانا سا ہو کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا یہ۔ سوچتے ہوئے کہ اگر قسمت نے یاوری کی اور اس پری پیکر نے ہاتھ ملا لیا تو اس کے ہاتھ کا لمس بھی کمال درجے کا ہوگا۔ ہاتھ آگے بڑھاتے ہی

اس نے بھی ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میرے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے ہاتھ واپس کھینچنے کی کوشش کی تو وہ بولی مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ابھی اس کے کمرے کے دروازے میں ہی تھا کہ وہ بولی مسٹر آفتاب میں نے آپ کی کمپنی کے لیے دس ہزار پولے کا ایڈوانس منظور کر دیا ہے۔ آپ لین دین شروع کریں تو یہ لمٹ میں بڑھاتی جاؤنگی۔ میرے چہرے پر اطمینان اور خوشی کی لہر دیکھ کر وہ کھنکھناتی ہوئی آواز میں ہنسی اور بولی You are Handsome guy۔ ظاہر ہے میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ تھا اور یہ تو بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ بقول شاعر:

ہم کچھ ایسے بھی نہ تھے مثلِ انار و مہتاب
جب ہمیں آگ لگائی تو تماشا نکلا

اب آہستہ آہستہ میرے تعلقات حسن نانک اور ڈاکٹر صاحب سے کشیدہ ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ہمارے پاس آتے جاتے رہے اور اپنی بیوقوف روش کے مطابق بن مانگے مشورے بھی دیتے رہے جو ہمیں ہرگز قابل قبول نہ تھے۔ بیس ہزار ڈالر کا الزام حسن نانک پر لگا کر اس کو مجرم قرار دیتے ہوئے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دیتے تھے۔ جب میں یہ کہتا کہ میں نے چیک آپ کے نام کا ارسال کیا تھا تو پھر برا سا منہ بنا کر اپنے DNA پر آ جاتے۔

BCCI کے قصہ پارینہ بننے کے بعد جو سٹاف فارغ ہو گیا ان میں سے ایک صدیقی صاحب تھے جنہوں نے نور جہاں کے نام سے ایک ہوٹل کھول لیا جہاں پر پاکستانی کھانے دستیاب ہونے لگے۔ صدیقی صاحب کی بیگم صاحبہ بہت مزے مزے کے کھانے پیش کرتیں۔ اب ہم مستقل طور پر صدیقی صاحب کے نور جہاں ہوٹل میں کھانا کھانے لگے۔ افریقن مال شاپنگ سینٹر میں ایک سری لنکن ہوٹل بھی تھا جہاں کبھی کبھی اتوار کے روز جانا ہو جاتا تھا۔ ایک Chicken Licken ادارہ تھا جس کا مزیدار حلال Bar-B-Q بہت مشہور تھا۔ یہ ایک مسلمان کا بزنس تھا۔ اس کے علاوہ قابل ذکر حلال کھانا شاید ہی کہیں اور ملتا ہو۔ ایک دن خوشخبری مل ہی گئی کہ مونیکا والے کل شام تک کنٹینر ہمارے ویئر ہاؤس میں پہنچا دینگے اور دوسرے روز واقعی کنٹینر ہمارے ویئر ہاؤس میں تھا۔ میں بہت خوش تھا کہ ہم سب اپنے کام میں مصروف ہو جائیں گے۔ تمام سامان کھول کر ویئر ہاؤس میں سٹینڈ پر سجا لیا گیا۔ نہ صرف گیبرون کی خواتین آئیں بلکہ دوسرے شہروں سے بھی لوگ آئے۔ کچھ دکاندار آئے جو اپنی دکانوں کے لیے سامان لے گئے۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی فیملی کے لیے کچھ تحائف سپیشل طور پر تیار کروا کر لائے تھے اور اسی طرح حسن نانک کی فیملی کے لیے بھی تحائف لائے تھے۔ دو روز کے بعد ڈاکٹر صاحب 3/4 بجے کے قریب آئے اور تمام تحائف واپس کر گئے کہ ہمیں پسند نہیں آئے۔ یہ ان کی جہالت اور غیر مہذب ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ میں نے پہلی بار ان سے سختی سے بات کی اور کہا کہ آپ بچوں کی طرح کا رویہ اور عادات اپنا کر اپنی عزت و

احترام خود گنواتے ہیں۔مگر ایسی باتوں کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

اس دوران گیبرون ٹریڈ فیئر شروع ہو چکا تھا اور ہم اس کے Participant تھے۔ٹریڈ فیئر کے دوران مسٹر اینڈ مسز لونیل، مسز صدیقی اور دیگر پاکستانی اور انڈین لوگ ہمیں وزٹ کرتے رہے۔مسز لونیل اکثر تشریف لاتیں، گھر آنے کی دعوت ضرور دیتی اور اپنی سادگی میں تمام گھریلو امور اور دیگر کمیونٹی کی بابت کھل کر بات کرتیں۔ان کی باتیں لگی لپٹی کے بغیر ہوتی تھیں۔اب ہم نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار بھی خرید کر لی تھی کیونکہ اس کے بغیر گزارہ نہ تھا۔ پورے گیبرون کی خواتین میں ہم جانے پہچانے جاتے تھے۔ایک اور کریکٹر سے ہماری ملاقات ہوئی جو کپانو تھا اور Kopano Store کا مالک تھا۔وہ اکثر ہمیں مسجد میں ملتا یا اپنے سٹور پر۔تیز طرار، ڈرامے باز تھا۔اس کا سٹور کافی مشہور تھا اور اچھا خاصا بڑا بھی تھا۔اس کی زیادہ سیل اور گیبرون میں مشہوری کی وجہ کچھ لوگ اس کو خریدنا چاہتے تھے۔آخر ایک دن ہم نے سنا کہ کپانو سٹور بک گیا ہے اور چند روز بعد دوسری خبر یہ تھی کہ Kapano Again کے نام سے کپانو بھائی نے دوسری مارکیٹ میں ایک نیا سٹور کھول لیا ہے۔ایک روز اتفاقاً میرا گزر اُس مارکیٹ سے ہوا تو Kapano Again کے ڈیجیٹل بورڈ پر نظر پڑی۔میری نظروں نے کپانو کو تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا تو کپانو ایک کرسی پر بیٹھا نظر آ گیا۔درمیان میں ایک چھوٹا سا میز تھا اور میز کے دوسری طرف کپانو سٹور کی ملازمہ جس کو آپ انچارج سٹور بھی کہہ سکتے ہیں تشریف فرما تھی۔دونوں کی کرسیوں اور میز کو ایک کاؤنٹر نے کور کیا ہوا تھا اور کاؤنٹر کی اوٹ سے کپانو کے پاؤں خاتون کی گود میں تھے۔جبکہ خاتون کے پاؤں کپانو کی گود میں تھے اور چھت میز کی استعمال کی جا رہی ہے۔آگے قارئین کرام خود سمجھ کر نقشہ کشی کر لیں۔دراصل راز اس لئے راز نہ رہا کہ میں ان کے سٹور کے مین گیٹ سے اندر داخل نہ ہوا بلکہ بغلی دروازے سے داخل ہو کر اچانک ان کے سر پر جا پہنچا۔عام کسٹمر تو کاؤنٹر پر ہی رک جاتا ہے اور اندر کی طرف میز کے نیچے نہیں دیکھ سکتا تھا۔یہ خاتون کون تھی؟ مجھے اپنے پڑھنے والوں کو شرمندہ اور پریشان نہیں کرنا اس لئے (مٹی پاؤ)

جہاں ہم نے اپنا ویئر ہاؤس Develop کیا تھا ہمارے دائیں طرف ایک بیوٹی پارلر تھا جسے یاسمین نامی ایک مسلمان لڑکی چلا رہی تھی جس کا تعلق زمبابوے سے تھا۔جب صبح آ کر وہ اپنا پارلر کھولتی تو دیگر لڑکیوں کو صفائی کا کام سونپ کر میرے آفس میں آ جاتی۔آتے ہی کہتی My Dear Brother السلام علیکم۔میرے جواب دینے پر بہت خوش ہوتی اور دعائیں دیتی۔جب صفائی مکمل ہو جاتی تو چلی جاتی۔اس سے ملحقہ دکان میں ڈرائی کلیننگ کا کام ہوتا تھا۔بڑی بڑی مشینیں انسٹال کی گئیں تھیں۔مجھ سمیت اکثر لوگ اپنی ڈرائی کلیننگ کی تمام ضرورت یہاں سے ہی پوری کرتے تھے۔ہمارے ویئر ہاؤس کے بائیں طرف ایک برٹش لیڈی ریس کورس کلب کو چمڑے کا سامان سپلائی کرنے کا ٹھیکہ لئے ہوئے تھی اور یہ اس کا شوروم تھا۔اس میں ریس کورس کلب اور گھوڑوں سے متعلقہ

تمام سامان موجود تھا۔ میں نے اس کو بتایا کہ آپ یو کے سے تمام سامان منگوا کر سپلائی کرتی ہیں اگر آپ پاکستان سے منگوائیں تو کوالٹی میں بہت بہتر ہوگا اور قیمت میں کم ہوگا۔ میری بات سن کر وہ بہت حیران ہوئی اور بولی آپ مجھے چھوٹے آرٹیکل کے سمپلز منگوا کر دیں اور تمام دیگر آرٹیکل کی تصاویر اور پرائس لسٹ بھی منگوائیں۔ میں نے اپنے ایک Cobbler دوست کو جو آرمی سے ریٹائرڈ ہو کر اب یہ بزنس کر رہا تھا بذریعہ FAX تمام صورت حال سے مطلع کیا۔ جلد ہی اس کی طرف سے مطلوبہ آئٹم کے نمونے اور پرائس لسٹ معمولی شرائط کے ساتھ موصول ہوگئی۔ نمونہ جات برٹش لیڈی کو بہت پسند آئے۔ چمڑے کی کوالٹی کے بارے میں مجھے اس نے کہا کہ میں لندن لیبارٹری میں چمڑے کا تجربہ کروا کر ہی کسی نتیجے پر پہنچ سکتی ہوں۔ میں نے بے پرواہی سے اسے کہا:

Take your time please, think nicely and then let me know.

وہ خوش ہوگئی اور بولی میں جلد ہی ایک آڈر کے ساتھ آپ کو وزٹ کرونگی۔ اس طرح اس لیڈی سے بھی اچھے باعزت تعلقات قائم ہو گئے۔ ہمارے ساتھ ہی ایک سپر مارکیٹ تھی جس کی وجہ سے کافی رونق رہتی تھی۔ مارکیٹ میں داخلے کے وقت دائیں طرف ایک نائٹ کلب تھا جو صرف ویک اینڈ یعنی ہفتہ اتوار کی شام رات 8 بجے سے صبح 4 بجے تک سروس دیتا تھا۔ تمام رات فاسٹ میوزک اور انسانی چیخوں کی آوازیں آتی تھیں۔ ایک رات جب ہم کچھ حساب کتاب کا کام کر رہے تھے تو حسبِ معمول کلب کا شور شرابہ شروع ہو گیا۔ جیسے ہی پہلی چیخ کی آواز آئی عمران نے خود کلامی کی کہ آج تو ہم مصروف ہیں لیکن کل تمہاری چیخوں میں ہماری چیخیں بھی شامل ہونگیں۔ میں خاموش رہا۔ دوسرے روز میں نے دیکھا لڑکے بڑی تیاریوں میں تھے۔ میں نے آہستہ سے پوچھا آج کون سی لنکا ڈھانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں تو اس نے نائٹ کلب کی طرف اشارہ کیا۔ بس پھر کیا تھا میرے جوتوں نے ان کے عزم کی لنکا ڈھا دی۔ جب تک میں وہاں رہا کسی نے نائٹ کلب کا نام دوبارہ نہ لیا۔ وہ ایک چھوٹا کلب تھا۔ تمام مقامی لوگ وہاں آتے، شراب پی کر غل غپاڑہ کرتے اور ناچتے ناچتے رات گزار دیتے تھے۔ صرف ایک برٹش لڑکی جو اس نائٹ کلب کی مالک تھی۔ اچھی خاصی قبول صورت اور جسمانی لحاظ سے گل وگلزار تھی۔ اپنے فارغ اوقات میں ہمارے ویئر ہاؤس میں ہی پائی جاتی تھی۔ مزید کوئی بھی ہماری دلچسپی اس کلب یا بوچڑ خانے میں نہ تھی۔

ایک پنجابی ہندو فیملی اکثر ہمارے ویئر ہاؤس میں آتی تھی۔ دونوں میاں بیوی پڑھے لکھے، تہذیب یافتہ تھے۔ میں ہمیشہ انہیں To the point بات کرتے ہوئے پاتا۔ ایک روز وہ آپس میں خاص ایسٹ پنجاب کی پنجابی میں بات کر رہے تھے اور میری تمام توجہ ان کی طرف تھی۔ جب وہ میری میز پر اپنا بل ادا کرنے آئے تو میں کھڑا ہو گیا اور ان کی ہی پنجابی زبان میں مخاطب ہوا کہ اگر آپ اتنی اچھی پنجابی زبان بول لیتے ہیں تو انگریزی بلوا بلوا کر میرا منہ کیوں ٹیڑھا کیا۔ دونوں ہنس پڑے۔ میں نے کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اب آپ

تشریف رکھیں ،ڈرنکس انجوائے کریں اور مجھے بتائیں کہ آپ انڈیا کے کون سے علاقے کے ہیں ۔وہ بولے ہمارے ماتا پتا ڈسٹرکٹ ہوشیار پور سے ہیں۔ہم لندن میں پیدا ہوئے ۔پتا جی کا دیہانت ہو چکا ہے جبکہ ماتا جی ہیں اور آج کل لندن سے ہمارے پاس آئی ہوئیں ہیں۔میں نے کہا مجھے آپ لوگوں سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے خاتون بولی بھائی آپ نے پنجابی کہاں سے سیکھی ؟میں نے اسے بتایا کہ میرے والد صاحب ڈسٹرک ہوشیار پور کے شہر ہردوخان پور سے ہیں اور والدہ محترمہ جالندھر سے ہیں۔وہ حیرانی سے میرا منہ تکتے رہ گئے ۔وہ بولی میری ماتا ہردوخان پور میں ہی پیدا ہوئیں اور وہ خان پور کے پٹھان خاندانوں کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔میں کل ان کو ساتھ لے کر آؤنگی۔انہوں نے اپنائیت کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ وہ مجھے اپنے سے لگنے لگے۔وہ چلے گئے مگر ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ دونوں اپنی ماتا جی کے ساتھ واپس آ گئے ۔بقول ان کے جیسے ہی انہوں نے گھر جا کر میرا بتایا تو ماتا جی نے کہا کہ کل کس نے دیکھی ہے مجھے ابھی لے کر چلو۔میں اس بچے سے مل کر پوچھنا چاہتی ہوں کہ ہردوخان پور کے کس خاندان کی اولاد ہے ۔میں نے دیکھا کہ برف کے گالوں کی طرح سفید مگر خوبصورت اماں جی سفید لباس میں تشریف لے آئیں ۔اپنی بڑی بڑی مگر خوبصورت آنکھوں سے مجھے پنجابی میں پوچھتیں، بیٹا کیا آپ کو اپنے بڑے بزرگوں کے نام آتے ہیں۔میں نے کہا ماتا جی آپ تشریف رکھیں مجھے سب کے نام آتے ہیں۔وہ ہانپتے کانپتے کرسی پر تشریف فرما ہو گئیں تو میں نے کہا ماتا جی میرا نام ادریس ہے۔میرے والد محترم کا نام اقبال احمد ہے میری والدہ محترمہ کا نام رضیہ بیگم ہے۔جبکہ میرے دادا جان اور دادی جان کا نام بالترتیب سلطان احمد خان اور ماہتاب بیگم ہے۔حاجی غلام محی الدین میرے پردادا کا نام ہے وہ بولیں معراج بیگم آپ کی کیا لگتی ہیں؟ میں نے جھٹ سے جواب دیا وہ میرے والد کی بڑی بہن اور میری پھوپھی ہیں۔ماتا جی تو پھڑک اٹھی اور بولی میں بھی تمہاری پھوپھی ہوں ۔معراج بیگم اور میں اکٹھے کھیلتے تھے اور میرا بچپن تمہارے پردادا کے گھر میں گزرا ہے ۔پھر میرے خان بابا حاجی غلام محی الدین کے بارے میں بہت باتیں مجھے بتاتی رہیں اور میری دادی اماں کی باتیں کرتی رہیں جس کو سن کر میرا سر فخر سے بلند ہوتا رہا۔اس بزرگ خاتون نے یہ بھی بتایا کہ آپ کے والد صاحب کی شادی میں بھی میں شامل تھی ۔بلکہ ہم رات کو محلے کی تمام لڑکیاں مل کر ناچ گا لیتی تھیں۔بڑے خان بابا کے ڈانٹ ڈپٹ کرنے پر اپنے اپنے گھروں میں بھاگ جاتی تھیں۔وہ بولی میری زیادہ دوستی معراج بیگم سے تھی جو سب سے بڑی تھیں۔ان کی دو اور بہنیں بھی تھیں۔ایک کا نام سردار بیگم اور سب سے چھوٹی کا نام عزیز بیگم تھا۔پھر انہوں نے مجھے کہا اوئے ادھر آ میرے پاس۔میں اٹھ کر قریب ہو گیا تو اپنے پرس سے 100 پونڈ کا نوٹ نکال کر مجھے دیا۔میں نے لینے میں ذرا دیر کی اور ابھی انکار کرنے ہی والا تھا کہ ایک ہلکی سی چپت میری گال پر محسوس ہوئی۔ میں نے نوٹ پکڑ لیا۔ماتا جی نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا اور بولی بیٹا تم اپنے آباؤ اجداد کی طرح بہت ہی پیارے

بچے ہو اور میرے بیٹے ہو۔ میری خوشی کی انتہا نہیں ہے کہ میں نے معراج بیگم کی اگلی نسل دیکھ لی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ ماتا جی کی آنکھیں بھیگ کر سرخ ہو چکی ہیں۔ میں نے اپنی دونوں بانہیں ان کے گلے میں ڈال کر ان کا ماتھا چوما اور درخواست کی کہ وہ اپنی دعاؤں میں ہمارا نام لے کر شامل کیا کریں۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ چند روز بعد ماتا جی نے واپس لندن چلے جانا تھا۔ جب تک میں بوٹسوانہ میں رہا ان کے گھر سے لڈو، برفی اور دیگر کھانے کی چیزیں میرے لئے آتی۔ جو کچھ بھی ان کے گھر میں کھانے کی ڈش یا مٹھائی تیار ہوتی وہ ایک ڈبے میں بند ہو کر میرے لئے ضرور آتی جوان کا داماد دفتر جاتے ہوئے مجھے دے کر جاتا۔ ساتھ ماتا جی کی طرف سے دعاؤں اور پیار کا سندیسہ بھی ہوتا۔ ایک روز ماتا جی نے مجھے بتایا کہ ہردوخان پور میں آپ کے خان بابا کے گھر میں اب ہمارا خاندان رہتا ہے اور آپ کے خاندان کی تمام قبریں اب تک محفوظ ہیں۔ میرا خاندان ان تمام قبروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ انہوں نے مجھے قبروں کے محل وقوع بھی بتائے اور ان پر لگے ہوئے کتبوں کی تفصیل بھی بتائی۔ یہ تجسس و بے چینی مجھے بھارت لے گئی مگر میں وہاں تک جانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر ایک دن ماتا جی ملنے آ گئیں۔ میرے لئے بہت سے تحائف لے کر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میری دادی اماں تشریف لے آئیں ہوں۔ مجھے پیار کرتے ہوئے ایک بار پھر وہ اشکبار ہو گئیں اور بولیں میرے بچے میں کل لندن واپس چلی جاؤنگی بس تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔ میں نے اداس سے لہجے میں پوچھا دادی اماں پھر کب آئیں گی؟ وہ بولی بیٹا بھگوان کی یہ کرپا کیا کم ہے کہ اس عمر میں بھی میں آپ جیسے پیارے بچے سے مل کر جا رہی ہوں۔ مجھے اب ذرا سی امید بھی نہیں ہے کہ بھگوان مجھے یہاں دوبارہ آنے کی مہلت دینگے۔ بس اب تو سورگ میں تمہاری پھوپھی اور دادی اماں کے پاس ہی میرا قیام ہوگا۔ ان کے پاس کھڑی ہوئی ان کی بیٹی رونے لگ گئی۔ ہماری آنکھیں بھی بھیگ چکیں تھیں۔ ہم اس وقت ایک خاندان کی طرح تھے اور ماتا جی ہمیں اداس کر کے ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔ وہ چلی تو گئیں مگر تا قیامت میرے دل و دماغ، احساسات اور محسوسات میں گھر کر کے بس گئیں۔ میری ان سے روز ملاقات ہوتی ہے کیونکہ وہ میرے دماغ میں خانہِ روح کے ساتھ والے خانے میں رہائش پذیر ہیں۔

ایک روز ماتا جی کے داماد مع اپنی اہلیہ محترمہ کے (جواب میرے لئے بہن کا درجہ) رکھتی تھی روتے ہوئے بولے ہم آج کی فلائٹ سے لندن جا رہے ہیں ماتا جی کا دیہانت ہو چکا ہے آپ کو صرف اطلاع دینی تھی۔ بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ دونوں مجھ سے لپٹ گئے۔ ہم تینوں بے اختیار رونے لگ گئے۔ یہ ہوتی ہے عوام سے عوام کی محبت، مودی شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

سید امتیاز علی سے اکثر ملاقات ہو جاتی۔ ان کے چٹکلے اور دھیمے لہجے کی گفتگو میں کافی پسند کرتا تھا۔ اس لیے عزت احترام کا رشتہ آہستہ آہستہ ترقی پاتا گیا۔ ایک روز وہ بوٹسوانہ چھوڑ کر جوہانسبرگ جا بسے اور ''زی روخس'' نامی

ایک کمپنی میں بطور کمپیوٹر سپیشلسٹ ملازم ہو گئے۔لیکن رابطہ برقرار رہا۔اکثر فون پر بات ہو جاتی۔میری طرح امتیاز صاحب نہ سگریٹ پیتے تھے، نہ دیگر اُم الخبائث کو پسند کرتے تھے، نہ کسی سے دھوکہ فراڈ، نہ بُری سوسائٹی اور نہ ہی کسی کے معاملات میں دخل اندازی کرتے تھے۔اپنی مستی میں مست اور امریکہ جا کر سیٹ ہونے کے پروجیکٹ پر بڑی سبک خرامی سے گامزن تھے اور کامیاب بھی رہے۔صرف ماہ جبینوں و نازنینوں اور پری وش قسم کی خواتین سے پین فرینڈ شپ کے دلدادہ تھے۔راولپنڈی کے رہنے والے اور پوسٹ گریجویٹ، سیریس اور سیلف میڈ آدمی تھے۔ان کی والدہ ماجدہ بہت پروقار اور خاندانی خاتون تھیں ہم انہیں اماں جان کہتے تھے۔

ایک روز میں اپنے آفس میں اکیلا ہی اداس اداس بیٹھا تھا۔دونوں لڑکے دکانداروں سے رقم کی وصولی پر گئے ہوئے تھے۔ہماری ملازمہ مرسیڈیشو باہر سٹول پر بیٹھی اُونگھ رہی تھی کہ ایک چمکتی ہوئی کار آ کر رکی۔اس میں سے جینز اینڈ جیکٹ میں ملبوس ایک خاتون اتری اور سیدھی میری طرف آئی۔میرے دل کا جلترنگ بج اٹھا۔میں اس کی طرف ابھی نظر بھر کر دیکھ ہی رہا تھا کہ عدم کا ایک شعر یاد آ گیا

اے عدم چاند سی بھویں اُن کی
وقتِ جنبش کمان ہوتی ہیں

ایک سسکاری کی سی آواز آئی۔ ہیلو آفتاب! میں احترام میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نہ جانے کتنی بار Welcome کہہ دیا۔وہ مسکراتی آنکھوں سے باتیں کرتی اپنی بھونوں کے کمان سے میرے دل پر تیر برساتی کرسی پر تشریف فرما ہو گئی جبکہ میں ابھی کھڑا ہی تھا۔اس کی باڈی ٹاک ہی ایسی تھی کہ میں بیٹھنا بھول چکا تھا۔اسی اثنا میں کانوں میں رس گھولتی آواز آئی oh! Sit down Please اور میں روبوٹ کی طرح بیٹھ گیا۔وہ بولی میں نے آپ کی لمٹ کے کاغذات بنا کر ہیڈ آفس بھجوا دیے ہیں جلد ہی آپ کی ضرورت بینک سے پوری ہو جایا کرے گی۔میں نے اسے کہا کہ میں آپ کے بینک کا شکر گزار ہوں اور اگر میں چاہوں کہ آپ کی تعریف کروں اور آپ کا شکریہ ادا کروں تو انگلش ڈکشنری اور میرے ملک کی ڈکشنری جس کو ہم اُردو ڈکشنری کہتے ہیں، مجھے کوئی بھی مناسب الفاظ نہیں مل رہے۔میرا خیال ہے کہ ان ڈکشنریز میں ابھی کچھ الفاظ ایجاد ہونا باقی ہیں۔وہ بہت خوش ہوئی۔اتنے میں ملازمہ فروٹ جوس کے ٹن میز پر رکھ چکی تھی۔اب وہ جانے کی اجازت کی خواہش مند تھی۔میں نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہا میرے پاس وہ دل ہے ہی نہیں کہ میں آپ کو جانے کا کہہ دوں مگر جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔وہ کہنے لگی آفتاب تم بہت کہہ چکے۔میرا جواب صرف ایک لائن میں ہے ''ایک خوبصورت دل بہتر ہے ہزار خوبصورت چہروں سے مگر تمہارے پاس تو دونوں ہیں'' اور ہوا کے جھونکے کی طرح غائب ہو گئی۔میں اس کو کار تک چھوڑنے گیا تھا جب واپس آیا تو احساس ہوا کہ پورا ہال میڈم روشس پرفیوم کی خوشبو سے مہکا ہوا ہے۔

''بارش کا دوسرا قطرہ''

ہم نے دی گرینڈ ایسٹر رینڈ شو آف ساؤتھ افریقہ کے لیے ایک سٹال کی درخواست دی ہوئی تھی۔ یہ سٹال ہماری کمپنی کو Botswana based کمپنی کے طور پر ملنا تھا جس کے لئے آج بذریعہ Fax ہمیں اطلاع دی گئی کہ آپ کا سٹال منظور ہو چکا ہے۔ تین دن کے اندر تمام چارجز کا چیک بحق انتظامیہ شو، بھجوا کر فائنل منظوری حاصل کی جائے۔ میں نے فوراً ضروری ادائیگی کا چیک بنا کر روانہ کیا۔ جلد ہی فائنل منظوری کا لیٹر، کارسٹکرز، ہال نمبر 1 کا نقشہ، میرے سٹاف کے لیے کارڈ اور گیٹ کارڈز ایک مکمل پیکج کی صورت میں موصول ہو گیا۔ یہ شو 21 روز کے لیے تھا اور ہمیں زیادہ سیل کی توقع تھی۔ میں نے مونیکا والوں کو فون کیا کہ ایک چھوٹا کنٹینر ہمارا سامان لے کر جوہانسبرگ کے لیے روانہ کریں۔ وہ دوسرے روز ہمارے تیار کردہ کارٹن لوڈ کر کے لے گیا اور ہم بذریعہ کار روانہ ہو گئے۔ انتظامیہ کی طرف سے ہمیں جوہانسبرگ شو والی جگہ سے ملحقہ سٹور مہیا کیا گیا جہاں ہم نے اپنا کارگو محفوظ کیا اور تالا لگا دیا۔ بحسب ضرورت اپنا سامان وہاں سے لیتے رہے۔ شو شروع ہونے سے ایک دن پہلے ہم نے اپنا سٹال سیٹ کرنا شروع کیا۔ ہم بوٹسوانہ شہری کے طور پر شرکت کر رہے تھے کیونکہ اس وقت تک پاکستان ساؤتھ افریقہ کو تسلیم ہی نہیں کرتا تھا۔ سٹال کے Face پر جہاں The Tifexo Botswana Pvt. Ltd. لکھا تھا، میں نے وہ اتروالیا۔ کیلی گرافر سے کہا کہ اس کو دوبارہ اس طرح لکھو اور میں اس کی Full Payment کروں گا۔

The Tifexo Botswana Pvt.Ltd.(All items are imported from Pakistan)

میں ذہنی اور دلی طور پر یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ میرے ملک عزیز کا بنایا ہوا صنعت و حرفت کسی اور ملک کے نام سے یتیمی کی حالت میں پڑا ہو۔ اسی طرح TV والوں نے کلپس بنائے اور اسی طرح اخبار والوں نے خبریں دیں۔ انتظامیہ نے کچھ اعتراض کیا تھا مگر میں نے ان کو جواب دیا کہ میں سٹال بند تو کر سکتا ہوں مگر اپنے قابلِ قدر کسٹمرز کے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتا۔ اس لئے سامان کا اوریجن لکھنا ضروری تھا۔ کیونکہ سٹال کے face پر بوٹسوانہ لکھا ہوا ہے مگر تمام سامان پاکستان سے امپورٹ کیا ہوا ہے۔ اس کی کسٹم کلیئرنس بھی بطور پاکستان کارگو ہے پھر میں کیوں جھوٹ بولوں اور لکھوں۔ انتظامیہ نے میرے ساتھ نہ صرف اتفاق کیا بلکہ میری بہت عزت و توقیر کی۔ اس طرح میں پہلا پاکستانی ہوں جس نے بڑے شب شبا کے ساتھ ساؤتھ افریقہ کے شو میں پاکستان کی شمولیت کو یقینی بنا کر اس خطے میں پاکستانی پروڈکس کے ذریعے اپنے ملک کو روشناس کرایا۔

سید امتیاز علی (جن کو آئندہ امتیاز بھائی لکھا جائے گا) نے کمال مہربانی سے ہمارے لئے ہل برو کے ایک گیسٹ ہاؤس میں ایک بڑا کمرہ بک کروایا ہوا تھا۔ جس میں ہم تینوں رات کو تھکے ہارے آتے تو پھر ہوش نہ رہتا،

کیونکہ صبح پھر جانا ہوتا۔امتیاز بھائی نے ہمارے لئے ایک مسلم فیملی میں On Payment کھانے کا بندوبست بھی کر دیا تھا۔وہ دوپہر کو کھانے کا ٹفن دے جاتے اور رات کو پہلا لے جاتے اور دوسرا دے جاتے ۔۔ہم تینوں کو ہلو کے بیل کی طرح ہر وقت مصروف رہتے۔تمام دن گاہکوں میں مصروف رہنا،شام کو سٹور سے سامان لا کر سٹال کو دوبارہ سے بنانا سجانا تا کہ روز آنے والے کسٹمرز کو نئے نئے آرٹیکل اپنی طرف مائل کریں۔امتیاز بھائی کے دو قریبی عزیز، اویس اور راشد الخیری ،کراچی سے جوہانسبرگ آئے ہوئے تھے۔امتیاز بھائی کی وجہ سے وہ بھی ہمارے مددگار تھے اور سٹال کے معاملات میں ہماری مدد کرتے۔ایک ٹیم ورک تھا۔پاکستانی بھائی ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کا عزت، احترام، پیار، محبت کے جذبے پر قائم تھا۔خود امتیاز بھائی بھی جب فارغ ہوتے تو سٹال پر آ جاتے جس سے ہماری بہت مدد ہو جاتی۔ہم ایک بہت بڑے ہال کے سٹال نمبر 6 میں تھے۔ہم جیسے سینکڑوں سٹال اس ایک ہال میں تھے۔اس طرح کے کچھ ہال اور بھی تھے جو انٹرنیشنل ہال نمبر 6 to 1 کہلاتے تھے۔لوکل لوگوں کے لیے علیحدہ سینٹر بنائے گئے تھے۔اوپن ایریا اس کے علاوہ تھا۔ہم باری باری جاتے اور دیگر ہالوں کا جائزہ لیتے ،لوگوں سے ملتے۔

ہمارے ساتھ والا سٹال ایک برٹش Mr. Brown کا تھا۔وہ ہر قسم کے سپرنگ ڈیل کر رہا تھا۔اس کی ایک پیاری سی 6/7 سال کی بیٹی تھی۔وہ باتونی اور ذہین بچی تھی۔اپنی ماں کے ساتھ جب بھی آتی تو ماں سے ہاتھ کھینچ لیتی اور میرے پاس آ جاتی۔مجھے وہ اپنی بیٹی نوشی کی طرح لگتی۔اسی طرح بھولی بھالی باتیں کرتی۔ہم چاکلیٹ مل کر کھاتے۔وہ زیادہ تر اپنے پونی (گھوڑے کا بچہ) کی باتیں کرتی جو اس کے فارم واقع برطانیہ میں موجود تھا۔مسٹر براؤن سے میری اچھی دوستی ہو گئی تھی۔میں کبھی کبھی اس کو از راہِ مذاق پوچھ لیتا Mr. Brown, are you light Brown or dark Brown? وہ ہنستے ہوئے جواب دیتا:

I don't know, I am dark or light Brown, but I am Brown.

دونوں میاں بیوی خوش مزاج اور انگریزوں کے کسی معزز خاندان سے معلوم ہوتے تھے .میں نے انہیں شریف النفس پایا۔میں نے ایک دن مسٹر براؤن کو اپنا سٹال چھوڑ کر بارگرل کے پاس کاؤنٹر پر کھڑے پیگ پیتے دیکھ لیا۔جب وہ واپس آیا تو میں نے اسے کہا کہ جیسے ہی Her Majesty آتی ہے میں آپ کی تمام رپورٹ دوں گا۔میں نے تو مذاق میں یہ بات کہی تھی لیکن وہ میری منتوں پر اتر آیا اور بولا پلیز یہ ظلم نہ کرنا۔وہ بہت ناراض ہو گی اور اس کی ناراضگی میں برداشت نہیں کر سکتا۔مجھے اس روز پتہ چلا کہ مسٹر براؤن مظلوموں کا صدر ہے۔(جو شخص بیوی سے ڈرے وہ مظلوم اور جو نہ ڈرے وہ ظالم)۔

ہماری سیل روزانہ کی بنیاد پر بہت اچھی ہو رہی تھی۔سٹال پر کبھی اخبار والے کبھی TV اور کبھی ریڈیو والے

انٹرویو لینے آتے۔ ہم تقریباً ایک لاکھ Rand سے زیادہ کی سیل کر چکے تھے۔ دو مقامی افریقن ملازم بھی رکھے ہوئے تھے۔ ایک روز ہمارے سٹال پر ایک Princess آئی جس کا نام بوسی ملانگے تھا۔ وہ کوانڈے بیلے صوبے کے چیف منسٹر پرنس جیمز کی بیوی تھی۔ جیمز اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اونچی لمبی، سجی سجائی یہ خاتون بہت طمطراق سے آئی۔ ساتھ کچھ اور خواتین بھی تھیں جو اس کو پروٹوکول دے رہی تھیں۔ ایک سیکرٹری بھی ساتھ تھی۔ جس نے فرسٹ لیڈی کا مجھ سے تعارف کروایا۔ وہ سب اس کو فرسٹ لیڈی کہہ کر مخاطب کر رہی تھیں۔ فرسٹ لیڈی نے معمولی سی کوئی چیز خریدی اور جانے لگی۔ میں عمران کو اشارہ کر چکا تھا کہ ڈرنکس لے آئے۔ کچھ تکلف کے بعد سب نے ڈرنکس لے لئے اور بات چیت بھی جاری رہی۔ میں نے فرسٹ لیڈی کو اپنی کرسی پر بیٹھا دیا اور خاص جیولری میں سے ایک بہت خوبصورت ٹاپس کا جوڑا نکال کر اس کو پیش کیا۔ ٹاپس کی چکا چوند دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے اپنے پہنے ہوئے ٹاپس اتار لئے اور کان میرے سامنے کر دیے۔ میں نے اس کی سیکرٹری کو اشارہ کیا کہ وہ پہنائے لیکن فرسٹ لیڈی نے مجھے کہا کہ اگر آپ نے مجھے گفٹ دینا ہے تو عزت اور توقیر بھی دینا ہو گی۔ یہ ہمارا قبائلی رواج ہے۔ اس نے پہلے ایک کان میرے آگے کیا اور پھر دوسرا۔ میں نے ٹاپس اس کے کان میں فٹ کر دیے۔ وہ بے حد خوش ہوئی۔ اس طرح جیسے ہنسی خوشی وہ تشریف لائی تھیں اسی طرح واپس چلی گئیں۔ دوسرے روز فرسٹ لیڈی کی سیکرٹری آئی اور مجھے کہنے لگی آپ ہمارے صوبے کوانڈے بیلے کے سٹال پر تشریف لائیں۔ مجھے فرسٹ لیڈی نے آپ کو لانے کے لیے بھیجا ہے۔ میں نے اسے کہا آپ چلیں میں 15/20 منٹ تک آتا ہوں۔ جب میں ان کے سٹال پر گیا تو میرا بہت Honourably استقبال کیا گیا۔ ڈرنکس پیش کئے گئے اور اپنے صوبے کی جنرل Information تفصیل کے ساتھ بتائی گئی۔ ایک گھنٹے کے بعد سیکرٹری کو حکم ہوا کہ مسٹر آفتاب کو ان کے سٹال تک الوداع کر کے آؤ۔ میں نے کہا میں خود ہی چلا جاؤنگا وہ بولی اس وقت آپ ہمارے سرکاری مہمان تھے۔ وہ سامنے TV کوریج ہو رہی ہے۔ آج پاکستان کے حوالے سے TV پر یہ کوریج دکھائی جائے گی۔ آپ ہمارے پہلے پاکستانی مہمان ہیں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوا اس لڑکی کے ساتھ واپس اپنے سٹال پر آ گیا۔

اگلے روز وہ اپنے خاوند چیف منسٹر پرنس جیمز کے ساتھ آئی اور کافی دیر اپنے لاؤلشکر کے ساتھ ہمارے سٹینڈ پر رکی۔ چیف منسٹر ایک خوش مزاج نوجوان تھا۔ وہ کافی دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ پھر نہ جانے اسے کیا خیال آیا مجھے کہنے لگا آپ ہمارے صوبے کا دورہ کریں۔ میں اور میری کابینہ آپ کو ویلکم کریں گے۔ میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ میرے اور میری ٹیم کے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا۔ وہ بولا کہ کل کانفرنس ہال میں ہمارے صوبے کے بارے میں سرکاری طور پر ایک تقریب منعقد ہو رہی ہے جس میں تفصیلاً بریفنگ دی جائے گی۔ تمام کابینہ اور بیوروکریسی موجود ہوگی۔ آپ کو ہماری طرف سے ایک پروٹوکول آفیسر بھیجی جائے گی جس کو

Follow کرتے ہوئے آپ تشریف لائیں۔ دیکھ اور سن کر ہمارے صوبے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں۔ دوسرے روز فرسٹ لیڈی کی سیکرٹری آ گئی ۔میں اس کے ساتھ کانفرنس ہال کی طرف روانہ ہو گیا۔ کانفرنس ہال کے مین گیٹ پر کھڑے پولیس آفیسر نے سیکرٹری کے کہنے پر میرے بائیں طرف ایک بیج لگایا اور ویلکم کہتے ہوئے گیٹ کھول کر مجھے راستہ دیا۔ اندر ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اکثریت افریقن کی تھی جبکہ کہیں کہیں افریقان بھی براجمان تھے (یہاں افریقن سے مراد کالے لوگ جو اس ملک کے اصل وارث ہیں اور افریقان سے مراد سفید چمڑی والے غاصب کان کن اور کسان جو اپنے آپ کو اب برٹش، ڈچ یا کچھ اور کہلانے کی بجائے افریقان کہلواتے ہیں اور نسلی تعصب پر یقین رکھتے ہیں)۔ تقاریر ہو رہی تھیں۔ ہال چونکہ بند تھا اس لئے ایک خاص قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ہال سے ملحقہ کمرے میں ہر برانڈ کی شراب موجود تھی۔ لوگ جاتے ،اپنی پسند کا گلاس چڑھاتے اور آ کر بیٹھ جاتے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں تقاریر سے زیادہ پینا پلانا زیادہ پسند تھا۔ کھانے کا بندوبست بھی تھا لیکن میرا سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ بمشکل میری ملاقات فرسٹ لیڈی سے ہو سکی جو آج سٹیج پر چیف منسٹر کے ساتھ بہت ہی چمکیلا بھڑکیلا لباس زیب تن کئے بیٹھی تھی۔ جسم کا آدھا حصہ لباس کے اندر تھا جبکہ آدھا حصہ لباس کے باہر تھا۔ میک اپ بھی کمال کا تھا۔

میں جلد ہی ہال سے باہر آ گیا۔ باہر آ کر مجھے سانس آیا۔ کچھ ہی دیر بعد فرسٹ لیڈی ہمارے پاس ہمارے سٹال پر آئی اور ناراضگی کے انداز میں پوچھنے لگی: آپ اپنی کرسی خالی چھوڑ کر کیوں چلے آئے۔ میں نے کہا پورے ہال میں آپ جیسا کوئی خوبصورت نہ تھا۔ آپ کے جلوے ناز انداز مجھے پریشان کر رہے تھے۔ اس لئے میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ وہ بہت ہنسی اور بولی تم سچ کہہ رہے ہو؟ فوراً ہی آئینہ میں اپنا از سر نو جائزہ لے کر اپنا میک اپ مرمت کرنے لگی۔

یہاں ایک واقعہ پیش کرتا ہوں۔ حیدر نامی پاکستانی ایک سٹور پر کام کرتا تھا اور ساتھی مقامی لڑکی کو ہر وقت تنگ کرتا تھا۔ کئی بار منع کرنے کے باوجود بھی باز نہ آیا تو لڑکی نے اپنے خاوند کو تمام بات بتا کر جاب پر جانے سے انکار کر دیا۔ اس کا خاوند بہت پریشان ہوا کیونکہ وہ خود بے روزگار تھا۔ بیوی کی تنخواہ پر گھر چل رہا تھا جبکہ دو بچے بھی تھے۔ یہ مقامی مسلم فیملی تھی۔ عزتِ نفس بھی رکھنی تھی۔ اس نے بیوی سے کہا کہ تم جیسے کام جاتی ہو آج بھی اسی طرح چلی جاؤ۔ وہ آج کے بعد تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔ بیوی نے روزمرہ کی طرح میک اپ کیا اور جاب پر چلی گئی۔ حیدر حسب عادت اس کے اردگرد رہا۔ اتنے میں لڑکی کا خاوند آ گیا جس کے ہاتھ میں ایک تولیہ تھا۔ اس نے آتے ہی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور واش روم میں لے جا کر اس کا منہ پانی سے دھو کر تولیے سے صاف کر دیا۔ میک اپ کے بغیر جو شکل ظاہر ہوئی وہ دیکھ کر خوف آتا تھا۔ تب جا کر یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد پتہ چلا کہ یہ حیدر نامی

شخص کسی لڑکی سے زیادتی کرنے کے کیس میں ملوث ہو کر ملک سے بھاگ گیا۔

آج امتیاز بھائی بہت خوش تھے کیونکہ ان کی ایک پین فرینڈ، خیر النساء نامی خاتون کیپ ٹاؤن سے تشریف لا رہی تھیں اور وہ بھی پورے پندرہ دن کے لیے۔ ایک اور زلیخاں نامی مسلمان خاتون جنہیں سب جولی کہتے تھے امتیاز بھائی کی دوست تھی۔ ہم سب انہیں جولی باجی کہتے تھے۔ مہمان نواز، مہربان اور مسلم تشخص رکھنے والی خاتون تھی۔ اپنے حلقہ احباب میں سوشل تھی اور پاپولر بھی تھی۔

ڈربن سے زیادہ تر ہندو ناریاں آتیں جو پنجابی سوٹ اور جیولری کی عاشق ہوتیں۔ شکل صورت چاہے جیسی بھی ہو فیشن کی دلدادہ ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت ہونے کے ناطے جو کچھ ان کو عطا کیا تھا وہ انہوں نے عام نمائش پر لگایا ہوا تھا۔ جیسے دکان پر مصنوعات سجائی جاتی ہیں۔ دیگر لوگوں میں یہودی، پرویزی، بہائی اور ملحد ہر طرح کے لوگ آتے اور اپنا اپنا راگ الاپنے کے بعد اگلے سٹال پر چلے جاتے۔ ایک قبول صورت اخباری رپورٹر بھی کئی بار تشریف لائی اور میرا انٹرویو لے کر گفٹ کا مطالبہ کرنے لگی۔ لیکن 21 روزہ نمائش کے دوران وہ گفٹ نہ لے سکی۔

فرسٹ لیڈی نے مجھے پیغام بھیجا کہ جو وفد آپ کی سربراہی میں کوانڈے بیلے کا دورہ کرنے والا ہے اس کی لسٹ بھجوا دیں تا کہ آپ کے دورے کو حتمی شکل دے کر انا ؤنس کر دیا جائے۔ جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

1- ادریس احمد آفتاب 2- سید امتیاز علی 3- فرید رحمان 4- عمران احمد
5- راشد الخیری 6- اویس 7- خیر النساء

چیف منسٹر نے بخوشی اس کو منظور فرما دیا۔ میزبانی کے فرائض فرسٹ لیڈی کو سونپ دیے۔ طے پایا کہ گرینڈ ایسٹر رینڈ شو ختم ہوتے ہی ہم یہ دورہ کریں گے۔

ایک روز میں سٹال پر اکیلا ہی تھا کہ مسلم عورتوں کا ایک غول شاپنگ کرنے آ گیا۔ وہ پنجابی شلوار قمیض اور دیگر لیڈیز سامان دیکھ کر حیران اور خوش ہوئے۔ انہوں نے دھڑا دھڑ خریداری شروع کر دی۔ ایک خاتون نے My Brother کہہ کر مجھے گلے لگا لیا۔ وہ بار بار یہ کہہ رہی تھی ''تم نے سچ بولا تھا''۔ میں نے جب غور سے اس خاتون کو دیکھا تو وہ آپا میمونہ تھی۔ جن کے پاس میں اور میجر عتیق کار خراب ہو جانے کی وجہ سے مہمان ہوئے تھے۔ ان کا خاوند، موسیٰ بھائی صرف ہمارے لئے مخالس برگ سے پریٹوریا گیا اور کار کی واٹر باڈی لے کر آیا تھا۔ میں نے روتی ہوئی آپا کو حوصلہ دیا۔ جس سے آپا کو کچھ اطمینان ہوا۔ وہ میرے پاس کرسی پر بیٹھ گئی اور دیگر خواتین سے بولی یہ میرے بھائی کا بزنس ہے۔ تم سب اپنا تمام سامان یہاں رکھ دو اور تمام شوگھوم پھر آؤ۔ جاتے ہوئے سامان کے ساتھ مجھے بھی لے لینا۔ خواتین کے جانے کے بعد آپا نے روتے ہوئے بتایا کہ تم نے سچ کہا تھا۔ وہ لڑکا شادی کے ایک ماہ بعد ہی لڑکی کا زیور اور کچھ رقم لے کر بھاگ گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے طلاق بھجوا دی۔ موسیٰ اکثر تمہیں یاد

کرتا ہے اور روتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ہم اپنے پاکستانی بھائی کی بات مان لیتے تو برباد نہ ہوتے۔ پھر وہ کہنے لگی اگر آپ کی نظر میں کوئی پاکستانی لڑکا ہو اور آپ اس کی گارنٹی دیں تو ہم اس لڑکے کو بہت اچھا کاروبار کروا دیں گے۔ میں نے کہا یہ آپ کا خیال غلط ہے کہ میرے یا کسی اور کے گارنٹی دینے سے لڑکی کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ وہ کافی دیر میرے سٹال پر رہیں۔ دیگر خواتین جاتے ہوئے انہیں ساتھ لے گئیں۔

دو پولیس والے جو سفید چمڑی تھے نہ صرف ہمارے پاس آتے بلکہ تمام دن ہماری خیر خبر رکھتے۔ اس طرح ان سے بھی دوستی سی ہو گئی۔ ایک دن پولیس مین مسٹر مینی اور اس کا جونیئر ساتھی میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور بات چیت جاری رہی۔ مینی کہنے لگا: میں روز سوچتا ہوں کہ آج آپ سے دل کی بات کرونگا مگر ہمت نہیں پڑتی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا مینی بلاکم وکاست کہہ ڈالو، میں سن رہا ہوں۔ وہ بروکن الفاظ کے ساتھ بولا: یہ جو بوٹ سامنے رکھا ہے، مجھے بے حد پسند ہے، لیکن میری قوت خرید سے باہر ہے۔ آج میں اپنی بیوی سے کچھ Rand مانگ کر لایا ہوں مگر پھر بھی کم ہیں۔ اگر آپ مجھے یہ بوٹ آدھی قیمت پر دے دیں تو میں بہت زیادہ شکر گزار ہوں گا اور آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ میں نے کہا تمہارے پاس جتنے Rand ہیں مجھے دے دو۔ اس نے فوراً جیب سے مڑے تڑے نوٹ نکالے اور میری طرف بڑھائے۔ میں نے کہا ان کو سیدھا کرو۔ بڑی مالیت کا نوٹ پہلے رکھو پھر چھوٹی مالیت کے نوٹ لگاتے جاؤ۔ جب وہ روبوٹ کی طرح میرے حکم پر عمل کر چکا تو ایک بیس رینڈ کا نوٹ میں نے اپنی جیب سے نکال کر اس کے نوٹوں کے ساتھ لگا دیا تا کہ گنتی پوری ہو جائے یعنی 230 کی جگہ 250 ہو جائے۔ پھر میں نے اس کو ایک خالی لفافہ اپنے میز سے اٹھا کر دیا اور کہا کہ تمام نوٹ اس لفافے میں بند کرو۔ اس کے بعد میں نے اس کے پسندیدہ بوٹ اس کو پیش کئے جو کراچی سے روڈ ماسٹر کے آفندی صاحب سے بنوائے تھے اور بہت خوبصورت تھے۔ ساتھ ہی کہا: No Price It is Gift from me۔ نوٹوں والے لفافے کے باہر مسز مینی کے لیے لکھا "Gift to my Sister, Idrees from Pakistan" اور لفافہ بھی مینی کے حوالے کر دیا۔ جب اس نے پڑھا تو وہ نہال ہو گیا۔ دو قدم پیچھے کی طرف ہٹا اور مجھے سیلوٹ کیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے رب تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ آج وہ قوم مجھے سیلوٹ کر رہی ہے جن کا پروٹوکول کچھ اس طرح تھا:

1- White comes First. 2- Coloured comes Second.

3- Asian comes Third. 4- Black comes Fourth.

اس کے بعد میری مینی سے کافی دوستی ہو گئی جو آخر تک قائم رہی۔ ایک روز وہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی لے کر آیا۔ وہ مجھے Brother کہہ کر مخاطب کرتی رہی۔ اس کو میں نے جیولری بھی Gift کی جس کا اس نے کئی بار جھک

کر شکریہ بھی ادا کیا۔

میں اکثر بہاول پور اپنے گھر فون کر کے اہلیہ محترمہ سے بات چیت اور بچوں کی خبر گیری ضرور کرتا تھا۔نوید نے بتایا کہ وہ امتحان سے فارغ ہو چکا ہے۔میرے پوچھنے پر کہ بیٹا پیپرز کیسے ہوئے ہیں وہ بولا بس آپ تیاری کریں کہ مجھے کب لے کر جانا ہے۔میں اس کو پر اعتماد سن کر دلی طور پر بہت خوش ہوا۔اس وقت ہمارے سٹال پر فون نہیں تھا۔میں پبلک بوتھ سے فون کیا کرتا تھا۔میں نے عمران اور فرید رحمان سے کہا کہ آپ لوگ تو اکثر گھومتے رہتے ہیں یہاں پر چھ انٹرنیشنل ہال اور بے شمار لوکل شیڈ کام کر رہے ہیں جن میں 109 ملکوں کی نمائندگی ہو رہی ہے۔ مجھے آج کم از کم انٹرنیشنل ہال وزٹ کرنے دیں۔امتیاز بھائی اپنی پین فرینڈ کے ساتھ شوگھومنے گئے ہوئے تھے۔ راشد الخیری اور اویس بھی اپنے محلے ملکی لین کی مسلم لڑکیوں کو لے کر شوگھومنے گئے ہوئے تھے۔میں بھی لڑکوں کو تسلی تشفی دیتا ہوا وزٹ پر نکل کھڑا ہوا۔تمام ہال میں نے ہر نظریے کے تحت وزٹ کیے۔اگر ایک ایک نظریے کی تعریف و تفصیل لکھنے لگوں تو ایک علیحدہ کتاب بن جائیگی۔ابھی آپ اس کو نظریہ بزنس و نظریہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ہم آہنگی اور خاص طور پر مذہبی ہم آہنگی سمجھ لیں۔ہاں اگر آپ حسن شناس ہیں اور جمالیات کی قید میں گھٹن محسوس نہیں کرتے تو اس نظریے کو بھی دیگر نظریات میں شامل کر لیں۔ہال نمبر 1 سے لے کر ہال نمبر 6 تک میں نے ہر ایک سٹال گھوما۔ان کے ساتھ بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ ترکی، پیراگوئے، اسرائیل اور لاطینی امریکہ سے جو لیدر جیکٹس ساؤتھ افریقہ میں امپورٹ کی جاتیں ہیں ان کا I.T.C(Import Trade Control) 3% ہے۔جبکہ باقی دنیا کے لیے 85% اور دیگر ٹیکس علیحدہ سے Pay کرنے پڑتے ہیں۔ہماری لیدر جیکٹس کی سیل نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ دوسرے ملکوں کی نسبت وہ کافی مہنگی تھیں۔جب یہ بات میرے علم میں آئی تو میں نے سوچ بچار کرنے کے بعد پریٹوریا کریم بھائی کو فون کیا جو پریٹوریا اسلامک سینٹر کے چیئرمین تھے۔یہ سینٹر ساؤتھ افریقہ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔فاروق کریم بھائی، جولی آپا کے سگے بھائی تھے۔نیک اور بے لوث انسان تھے۔میں نے انہیں بتایا کہ ہمارا ملک ایک اسلامی ملک ہے اور جانور اسلامی طریقے سے ذبح کئے جاتے ہیں جبکہ دوسرے ممالک میں ایسا نہیں ہے۔آپ ہماری لیدر جیکٹس کے لیے ایک سرٹیفکیٹ جاری کریں جس میں لکھا ہوا ہو کہ یہ حلال جانور کی حلال کھالوں سے تیار شدہ جیکٹس ہیں۔تمام مسلم کمیونٹی کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ صرف حلال جیکٹس استعمال کریں۔سرٹیفکیٹ فوراً جاری کر کے بذریعہ FAX قابلِ ذکر لوگوں کو اطلاع کر دی گئی ۔جس کا بے حد فائدہ ہوا۔ہال وزٹ کرتے کرتے میں باہر اوپن ایریا میں نکل آیا جہاں جھولے لگے ہوئے تھے ۔الیکٹرونک جھولے بہت تیزی سے حرکت کرتے۔جب وہ اوپر سے نیچے کی طرف آتے تو فال بہت تیز ہوتی۔ بچے اور عورتیں چیختے چلاتے اور ایک شور برپا کر دیتے۔میں تماشا دیکھنے کھڑا ہو گیا۔میری نظر جھولے میں بیٹھے

امتیاز بھائی اور خیرالنساء پر پڑی جو ایک دوسرے میں مگن تھے۔ میں دوسری طرف چلا گیا جو شو ایریا کا اختتام تھا۔ یہاں پر گاڑیاں پارک کی گئی تھیں۔ آگے اینٹی بار برڈ وائر لگی ہوئی تھی۔ جس کے دوسری طرف دور تک میری نظر دیکھ رہی تھی۔ میں گردونواح کا جائزہ لے رہا تھا اور کچھ مقامی افریقن ننگ دھڑنگ لوگوں کو کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایک بوڑھا سا سفید چمڑی والا آدمی، نیکر اور بنیان میں ملبوس، سر پر ہیٹ رکھے ہوئے کام کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں چونکہ وطن پرست خیالات رکھتا ہوں۔ مقامی مزدوروں کے بارے میں میرے دماغ میں سمندری لہروں کی مانند جوار بھاٹا موجزن تھا۔ اتنے میں مجھے محسوس ہوا کہ میرے عقب میں کوئی موجود ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک کالا شخص، بوسیدہ سے کپڑے پہنے بد، بو سے لبریز Hello Master کہتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا ۔میں نے بھی Hello کہتے ہوئے پوچھا How are you?۔ اس نے طنزیہ طور پر کہا:

Master: I am not fine. I am hungry.

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو 50/60 Rand نکل آئے۔ میں نے اسے دے دیے۔ وہ میرے دوستانہ رویے پر حیران ہوا اور کہنے لگا No More۔ میں نے اس کو دونوں جیبیں جھاڑ کر دکھا دیں۔ دراصل میں اس کو غصہ نہیں دلانا چاہتا تھا کیونکہ طاقت میں وہ مجھ سے زیادہ تھا۔ دائیں بائیں صرف گاڑیاں کھڑی تھیں اور جھولے کی وجہ سے اتنا شور تھا کہ کان پڑی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ جب وہ مطمئن ہو گیا کہ اس کے پاس اور نوٹ نہیں ہیں تو اس کی نظر میری گھڑی اومیگا سی ماسٹر گولڈ واچ پر پڑی۔ اس نے کہا کہ یہ گھڑی اتار دو اور ساتھ ہی خنجر نما چاقو نکال کر میری گردن کی طرف کیا۔ میں پیچھے تاروں کے ساتھ جا لگا۔ اس کی سختی کے باوجود میرا رویہ۔ نرم اور دوستانہ تھا اس کی توجہ ہٹانے کے لئے میں بولا no,no, he is my friend جیسے ہی اس نے گردن گھوما کر اپنے عقب میں دیکھنے کی کوشش کی، میں نے اپنے لانگ بوٹ کی ایک ہٹ پوری طاقت سے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان لگائی۔ اسی دوران اس کا خنجر میری گردن پر زخم لگا چکا تھا۔ بچت اس لئے ہوگئی کہ میں تاروں کی پروانہ کرتے ہوئے ان پر جھول گیا۔ جس کی وجہ سے میری قمیض پھٹ گئی اور کمر پر اچھی خاصی خراشیں پڑ گئیں۔ دونوں ٹانگوں کے درمیان میرے بوٹ کی ہٹ نے اسے زمین پر گرا دیا۔ بس یہی موقع تھا۔ میں نے زخم کی پروانہ کی اور بھاگ کر St. Johns Ambulance کی پوسٹ پر رپورٹ کی۔ جنہوں نے فوراً پولیس بلوالی اور مجھے فسٹ ایڈ دے کر سٹال پر چھوڑ گئے۔ میں نے اپنی خون آلود قمیض اتار کر ٹی شرٹ پہن لی۔ پولیس جب موقع پر پہنچی تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ صرف خنجر پڑا تھا جو پولیس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ پولیس کئی بار کالے لڑکوں کو پکڑ کر لائی اور مجھے کہا کہ آپ شناخت کریں۔ میرے انکار پر ان کو چھوڑ دیا جاتا۔

رب تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے زخم بڑی تیزی سے ٹھیک ہو گئے۔ شو کا سلسلہ چلتا رہا۔ اب ہم اپنے ہال میں،

ہمسائیوں میں، ریگولر وزیٹرز میں اور خاص طور پر فرسٹ لیڈی اور اس کے سٹاف میں بہت پاپولر ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک ہی ٹیم کا حصہ ہیں۔ فرسٹ لیڈی اپنے سٹال سے زیادہ ہمارے سٹال پر پائی جاتی۔

گھر فون کرنے پر پتہ چلا کہ نوید کا رزلٹ آ چکا ہے اور حسب وعدہ اس کی فرسٹ کلاس فرسٹ ڈویژن آئی ہے۔ میں بے حد خوش تھا کہ میرا دوسرا بچہ گریجویٹ ہو گیا۔ ایک پریشان کن بات تھی کہ نوید بیمار تھا اور بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں نے امتیاز بھائی سے کہا کہ سٹال پر فون لگوانا چاہتا ہوں تا کہ بچے کی لحہ لحہ خبر مجھے ملتی رہے۔ اب مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ فکر کھائے جا رہی تھی۔ فرسٹ لیڈی آئی تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بولی آفتاب کیا ہوا؟ تم ایسے تو کبھی نہ تھے۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا بیٹا بیمار ہے اور مجھے اپنے سٹال پر فون دیے۔ وہ بولی کل تک لگ جائے گا اور تمہارا بیٹا بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ دوسرے روز فون لگ گیا۔ میں نے ڈاکٹر ریاض ملک، ڈاکٹر سعید ملک، ڈاکٹر مبارک کو فون کئے۔ یہ تمام دوست احباب تھے۔ میڈیکل سپیشلسٹ سی۔ ایم۔ ایچ بہاول پور کرنل الطاف الرحمان میرے دوستوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر ریاض ملک خود گھر جا کر خون کے نمونے لے آتے اور کرنل الطاف علاج کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا۔ نوید روبہ صحت ہونے لگا۔ مجھے بھی چین آنے لگا۔ نوید سے میں روزانہ فون پر بات کرتا تو مجھے تسلی ہوتی۔ اب میرے لہجے کی تلخی کم ہوتی گئی۔ چہرے کی شگفتگی لوٹ آئی اور یارانِ دل کی محفل سجنے لگی۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں ایک دلربا خوبصورت مگر مختصر لباس میں آ رہی ہے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہنستے ہوئے کہا کہ مجھے نہیں معلوم میں تمہارا استقبال کیسے کروں۔ اپنی خوشی کا پیمانہ تمہیں کیسے دکھاؤں کہ وہ اپنی حد سے تجاوز کر کے چھلک رہا ہے۔ وہ ہنستے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی: تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھی ہیں جو مجھے بہت پسند آتی ہیں۔ وہ صرف چند منٹ میرے پاس رکی اور بولی کہ میرے پاس تمہارے لئے بہت بڑی خبر ہے۔ میں نے کہا میرے پاس بھی ایک خبر ہے۔ وہ بولی جلدی سے بیان کرو۔ میں نے کہا دنیا کی چند خوبصورت خواتین میں سے ایک خاتون اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔ اس کا چہرہ دیدنی تھا کیونکہ خوبصورت تو وہ تھی ہی لیکن احساسِ خوبصورتی اس کو چار چاند لگا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ، بات چیت کا انداز، چال اور آنکھوں کا استعمال اتنے مہلک اور کارگر تھے کہ حسِ جمالیات رکھنے والے کسی بھی مظلوم کو فنا کر دینے کے لیے کافی تھے۔ اس کی گالوں کے ڈمپل دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ سپینش، عربی ملاوٹ کے بعد پنڈت خاندان کی پیوند کاری نے ایسی مہلک پدمنی نسل کی حور تخلیق کر دی جس کا دنیا بھر میں جواب ہی نہیں ہے۔ میں نے اسے یاد دلایا کہ آپ مجھے کوئی خبر سنا رہی تھیں جو میری بے ربط باتوں کی وجہ سے نہ بتا سکیں۔ وہ بولی آپ ایک نیچرل اور Straight Forward انسان ہو۔ خوش خبری یہ ہے کہ آپ کا کیس میں نے ایڈوانس کے لیے ہیڈ آفس فارورڈ کیا ہوا تھا۔

ایڈوانس ڈیپارٹمنٹ کے جنرل منیجر نے ایک ملین پولے کی سیکشن دے دی ہے۔ کچھ شرائط ہیں۔ جب میں آپ کو آفیشلی بلواؤں گی تو سب طے کر لیں گے۔ یہ سب کچھ subject to my approval and discretion. ہے۔

بقول عدم:

جن نگاہوں میں کچھ مروت ہو
دیر سے مہربان ہوتی ہیں

اور وہ جیسے دھرتی ہلاتی آئی تھی ویسے ہی میرا دل مچلاتی چلی گئی۔ 15/20 منٹ کے بعد ہی اس کا فون آ گیا۔ بولی کہ میں نے کسی کے سامنے کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ کل میں آپ کو مین گیٹ سے لے لوں گی، ڈنر اکٹھے کریں گے۔ گیٹ پر ہی واپس ڈراپ کر کے میں گیبرون چلی جاؤنگی۔ میں نے صرف Ok کہہ کر فون بند کر دیا۔ ابھی بزنس کو بڑھاوا دینے اور بینک ایڈوانس کو صحیح سمت استعمال کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ پیٹرز برگ ٹریڈ شو کی انتظامیہ آ گئی۔ ان کی دعوت پر میں نے وہاں بھی سٹال Book کروالیا۔ کیونکہ ابھی کافی سامان باقی تھا اور ہمیں بزنس کے علاوہ دیگر کوئی کام نہ تھا۔ شو کے بعد کوانڈے بیلے جانا تھا اور پھر پیٹرز برگ جانا تھا۔ ماشاءاللہ اب میرا بیٹا نوید کاشف صحت مند ہو گیا تھا۔ گھر سے سب خیر کی خبریں آ رہی تھیں اس لئے کوئی پریشانی نہ تھی۔ اب صرف گیبرون جا کر غاصبوں سے بیس ہزار ڈالر وصول کرنے تھے۔ ہماری ٹیم میں اب خیر النساء بھی شامل تھی۔ یہ محترمہ ایک انڈین نژاد مسلم اور کیپ ٹاؤن کی رہنے والی تھی۔ کبھی اس کے آباؤ اجداد انڈیا سے ساؤتھ افریقہ آئے تھے۔ اس کی جائے پیدائش کیپ ٹاؤن تھی۔ امتیاز بھائی سے پین فرینڈ شپ ہونے کی پاداش میں یہاں موجود تھی۔ پتلی دبلی، دھیما لہجہ، لینز کے ذریعے آنکھیں خوبصورت بنائی ہوئیں تھیں۔ شادی کو زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی کیونکہ شادی کے کچھ ماہ کے بعد ہی خاوند چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ یہ مرض افریقہ میں عام ہے کہ خاوند بھگوڑا ہو جاتا ہے۔ وجہ بھگوڑا خاوند ہی بتا سکتا ہے۔ جب میں گیبرون واپس جاؤنگا تو اس سوال کا جواب ضرور تلاش کرونگا۔ بھگوڑے خاوندوں اور متروک کی گئی بیویوں کے انٹرویو کرنے کے بعد اپنے خیالات اور Facts Finding Intervews Reports اپنے قارئین کے سامنے ضرور پیش کرونگا۔

اس کے بعد خیر النساء نے شادی نہیں کی اور جاب کر کے اپنی کفالت خود ہی کرتی رہی۔ وہ لڑکوں کو کیپ ٹاؤن کی باتیں سنا رہی تھی۔ اپنی بات چیت کے دوران اس نے بتایا کہ اگر عید کے روز کوئی مسلمان عورت باہر گلی یا مارکیٹ میں جائے اور کوئی مسلمان آدمی اس کو عید مبارک کہہ کر گلے لگا کر پیار کر لے تو اس حرکت کا بُرا نہیں منایا جاتا۔ عمران جھٹ سے بولا بہت اچھا میں اپنی آئندہ عید کیپ ٹاؤن میں آپ کی گلی اور گھر کے سامنے کھڑے ہو کر

مناؤں گا۔اس کے بعد ایک قہقہہ اور تمام لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔اتنے میں فرسٹ لیڈی بھی آ گئی بولی بہت خوش نظر آ رہے ہیں آپ لوگ۔ میں نے کہا یہ بیوقوف لوگ ہیں۔خوشی ان کو ایک سال گزرنے کے بعد عید کے روز کیپ ٹاؤن میں ملے گی اور یہ ایڈوانس میں ہنس رہے ہیں۔جب اس کو خیر النساء کی طرف سے تمام ماجرا بیان کیا گیا تو وہ بھولے پن سے بولی عید اب ایک سال کے بعد آئے گی اور کیپ ٹاؤن جانے کی کیا ضرورت ہے پیار کرنا ہے تو مجھے کر لو۔ گلے ملنا ہے تو مجھے مل لو۔سب شرما کر چپ کر گئے اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ہمارے پیٹرز برگ جانے کا سن کر جولی باجی بہت خوش ہوئی کیونکہ ان کا گھر وہاں تھا۔وہ بولی میں ساتھ جاؤنگی۔ میں نے کہا جب وقت آئے گا دیکھیں گے۔شو میں صرف تین دن باقی رہ گئے تھے۔ہم کافی تجربہ کار ہو چکے تھے۔ لوگوں کا پتہ چل چکا تھا۔بزنس کے حوالے سے لوگوں سے جان پہچان ہو گئی تھی۔

اتوار کو فون آ گیا کہ میں گیٹ پر ہوں۔مین گیٹ سے جیسے ہی میں باہر نکلا وہ گاڑی میں بیٹھی چشمہ لگائے بہت گریس فل لگ رہی تھی۔اس نے اشارہ کرتے ہوئے اگلے دروازے کا لاک کھول کر دروازہ کھول دیا۔میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا چشمہ لگانے سے آنکھیں چھپ گئیں،اگر میں نے ڈوبنا ہو تو کیا کروں؟اس نے چشمہ اتار کر ڈیش بورڈ میں پھینک دیا اور بولی لو اب ڈبکیاں کھاؤ۔تم ایسی باتیں کرتے ہو پھر مجھے تمہاری بہت یاد ستاتی ہے۔ٹھیک سے کام نہیں کر سکتی ،تم بہت Mesmerizing ہو۔ گاڑی بہت تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ جوہانسبرگ کے مضافات ختم ہو چکے تھے کسی اور سیٹلائٹ ماڈرن ترین آبادی کے Out Skirts شروع ہو رہے تھے۔آخر ہم ایک نہایت ہی خوبصورت ولا کے سامنے رکے جو خودکار نظام کے تابع تھا۔گیٹ کھل گیا اور گاڑی پورچ میں پہنچ گئی۔ یہ ایک خوبصورت گھر تھا۔گھر کیا پوری کی پوری بستی ہی خوبصورت تھی۔ پودوں کی بہار تھی۔ پھول، پودے، بیلیں، لان Ornamental plants بے حد خوبصورت لگ رہے تھے۔ پودوں کی ترتیب، لائنوں کی ترتیب،کمال درجے کی پلاننگ کے تحت کی گئی تھی۔ابھی میں ہونقوں کی طرح اپنے چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ میری نظر سوئمنگ پول پر پڑی۔وہ eliptical shape میں اور بہت صاف ستھرا تھا۔نیلگوں شیڈ دے رہا تھا۔دو تین آرام کرسیاں بھی رکھی تھیں۔تولیہ سٹینڈ غرض کہ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔اتنے میں گاڑی کھڑی کر کے وہ آ گئی۔ پہلے ہم نے پورے گھر کا چکر لگایا کچھ۔ پودے میرے لئے نئے تھے اور کچھ پودوں کے متعلق میں جانتا تھا کیونکہ یہ میرا شوق تھا۔ہم ایک دوسرے سے سوال جواب کرتے گھر کے سیٹنگ روم میں جا بیٹھے۔کافی اور کولڈ فش آ گئی۔میں نے صرف کافی لی کیونکہ کولڈ فش میں نہیں کھا سکتا تھا۔یہ گھر اندر سے اتنا خوبصورت اور سجا ہوا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ میں اس کی تعریف لکھوں تو الفاظ ساتھ نہیں دیتے اور نہ ہی قارئین کرام یقین کرینگے۔وہ مجھ سے مخاطب ہوئی آپ کو میرا گھر پسند آیا۔میں نے کہا گھر ایک سیکنڈری چیز ہے۔گھر کے مکین اگر دل اور دماغ سے

خوبصورت ہوں تو یہ گھر بے حد خوبصورت ہے۔ آپ کی شخصی، بصری، سمعی خوبصورتی بے مثال ہے اس لئے یہاں کا تنکا بھی خوبصورت ہے۔ رب تعالیٰ نے آپ کو اور آپ سے متعلقہ ہر چیز کو بے مثال حسن عطا کیا ہے۔ میرے یہ خیالات نیز جو کچھ بھی آپ کے متعلق کہا ہے اور آپ نے بہت صبر سے برداشت کیا ہے وہ نہ صرف میرے رب تعالیٰ کی تعریف ہے بلکہ اس کی مصوری کے شاہکار کی بھی تعریف ہے جو آپ کی شکل میں میرے سامنے موجود ہے۔ آپ بولتی ہیں تو جلترنگ دل و دماغ میں بجنا شروع ہو جاتے ہیں۔ چلتی ہیں تو زمین سے اوپر تیرتی ہوئی محسوس ہوتیں ہیں۔ میری طرف نظر بھر کر دیکھتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک جھیل کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں اور جب بولتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ آپ نے مجھے جھیل کی گہرائی سے کھینچ کر اپنے گلے کا ہار بنا کر جھیل کے کنارے پر لا کر پٹخ دیا ہے۔ جب آنکھیں گھوما کر میری طرف دیکھتی ہیں تو آپ کی بھوویں تیر کمان ہو کر کمال نشانہ لے کر تیر سیدھا دل میں پیوست کر دیتی ہیں۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یونانی دیومالا کے مطابق حسن و عشق کے دیوتا کیوپڈس کی شہزادی کا دوسرا جنم آپ کی شکل میں ہوا ہے۔ دیوتا کیوپڈس کے تمام تیر آپ اپنی نظروں میں پرو کر لے آئی ہیں اور ایک ایک کر کے اس سیاح پر اپنی قاتل اداؤں کی شکل میں نشانہ لے کر برسا رہی ہو جو اپنے وطن سے ہزاروں میل دور غریب الوطن تاجر کی صورت میں تمہارے حسن کے قفس میں قید ہے۔ ایک تیر بھی خطا نہیں جا رہا۔ اس کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ بولی میں سوئمنگ کاسٹویم پہن کر آتی ہوں اور تمہارے لئے بھی لاتی ہوں۔ سوئمنگ کرتے ہیں۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ پری جمال اگر کپڑوں میں اتنی خوبصورت لگتی ہے تو نیم کپڑوں میں کیسی لگے گی۔ وہ سوئمنگ کاسیٹوم اپنے چاندی جیسے صحت مند کسرتی جسم پر سجا کر آ گئی اور ایک کاسٹیوم میرے لئے بھی لائی۔ سامنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی آپ وہاں جا کر تبدیل کر سکتے ہیں۔

اپنے سیٹنگ روم کے ایک کونے میں اس نے ایک خودکار ہینڈل گھمایا تو لکڑی کا خوبصورت دروازہ کاسٹر ویل پر پھسلتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔ خوبصورت کاؤنٹر مع کیبنٹ برآمد ہوئے جو نفاست سے دنیا جہان کی شراب کی بوتلوں سے سجائے گئے تھے۔ اس نے پوچھا کون سی پسند کرو گے۔ میں نے بھولے پن سے نہایت ہی بیچارگی سے جواب دیا: میں جب تمہاری آنکھوں میں ڈوب کر پیتا ہوں تو مجھے Dom Perignon (ڈیکوری مارگریٹا) کا نشہ ہوتا ہے۔ جب تمہیں نظر بھر کر دیکھتا ہوں تو The Macallon کا نشہ ہوتا ہے۔ جب تمہارے ہونٹوں سے پیتا ہوں تو.... The Macallon 55 کا نشہ ہوتا ہے۔ لال دین قریشی آف سویڈن اور اسلم کمال کے بقول بے مثال حسنِ بے لباس آرٹ کے نام پر ہو تو۔۔ اس دوران وہ اپنے من پسند مشروب کے دو گلاس پی چکی تھی۔ خوبصورت آنکھیں بھوکی شیرنی کی طرح غرا رہی تھیں۔ مجھے پتہ اس وقت چلا جب پول میں گر چکا تھا کیونکہ اس کا دھکا بہت شدید تھا۔ پھر ہلکی ہلکی پھوار، ٹھنڈی ہوا، موسم مہربان، پدمنی مہربان، شدید بارش و بے حساب برستے و

کڑکتے بادل وبجلی کی چمک دھمک دیدنی تھی ۔کمال کمال کمال Rainbow اور Thunder Stroke بادل برستے برستے تھک کرتھم گئے ۔زمین جل تھل ہوگئی ۔نہ جانے کب سے پیاسی تھی اس لئے تو خشک سالی کی وجہ سے قحط تھا۔ادھرزلفوں کے گھمبیر سائے سمٹ گئے ۔شام رات کی آغوش میں جانے کے لیے تڑپنے لگی ۔سیاہ بادل اپنے بساط لپیٹ چکے تھےاور رات کا پھیلاؤ بڑھنے لگا۔وہ مجھے باہر گیٹ پر چھوڑ کر جلد گیبرون آنے کی نصیحت کر کے بجلی کے جھماکے کی طرح غائب ہوگئی ۔جب سٹال پر پہنچا تو پوری ٹیم میرے لئے فکرمند تھی ۔کبھی نہ جانے والا آج صبح سے غائب ہے۔امتیاز بھائی نے بہت سنجیدگی سے پوچھا کہ آج کہاں گئے تھے۔میں نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا کہ میری ایک پین فرینڈ عرش سے آئی ہوئی تھی اس کے ساتھ گیا تھا۔پھر کسی نے اس ٹاپک پر بات نہ کی۔

کل ہمارا آخری دن تھا۔اکیس دن ہم نے بھرپور بزنس کیا زندگی کے نئے تجربے ہوئے ۔نئے لوگ ملے ۔بزنس کا پھیلاؤ،تاجروں سے صلاح مشورے،تاجرنما ٹھگوں اور دھوکا بازوں سے بچاؤ۔یہ سب ہمارے تجربے کا حصہ تھا۔اگر میں یہ کہوں کہ یہ شو ہمارے لئے بہت فائدہ مند ثابت ہوااور اچھے بڑے بزنس کی راہیں کھول گیا تو غلط نہ ہوگا۔

جوہانسبرگ خوبصورت اور ساؤتھ افریقہ کا بڑا شہر ہے ۔مزاج کے حساب سے لوگ ذرا تلخ ہیں جبکہ کیپ ٹاؤن کے لوگ نرم خو ہیں ۔اس وقت کرائم ریٹ جوہانسبرگ میں کم تھا مگر آج کل بہت زیادہ ہے ۔جوہانسبرگ میں زنانہ مردانہ ان ڈور کرکٹ بھی دیکھی جوایک ہال میں کھیلی جاتی تھی ۔جس میں زیادہ تر دفاتر میں کام کرنے والی خواتین اور مرد حضرات ہوتے ۔یہ کرکٹ ٹینس بال سے کھیلی جاتی جس کے قواعد وضوابط طے شدہ تھے ۔ایک نو کیچ کا معاملہ جس کا جج میں تھا۔مقدمہ کچھ ایسے تھا۔ایک موٹی صحت مند لڑکی نے مخالف پلیئر کے شارٹ کھیلنے پر بھاگ کر کیچ لینے کی کوشش کی ۔جب بھاگ کر گیند کے قریب پہنچی تو اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں بال ہاتھ سے پھسل کر زمین پر نہ گر جائے اور شرط لگی ہوئی اننگ ہار نہ جائے ،اس نے اپنی V گلے کی شرٹ کا گلہ ہاتھ سے لمبا کیا اور بال اس کے اندر چلی گئی ۔ایمپائر نے کیچ کا اعلان کرتے ہوئے مخالف ٹیم کے چیمپئن پلیئر کو آؤٹ قرار دے دیا۔جبکہ بال ابھی اندر ہی تھی ۔مخالف ٹیم نے اس کو کیچ ماننے سے انکار کر دیا۔بحث شروع ہوگئی ۔مخالف ٹیم نے کہا کہ ہمیں بال دکھائی جائے کہ کیچ ہوئی بھی ہے یا نہیں ۔مخالف ٹیم کی لڑکیاں اپنی ٹیم کو سپورٹ کر رہی تھیں ۔مخالف ٹیم نے ایمپائر سے مطالبہ کیا کہ ہمیں کیچ کی گئی گیند باہر نکالے بغیر دکھائی جائے ۔لڑکی نے غصے میں اپنی ٹی شرٹ نیچے کر دی ۔جہاں بال صاف نظر آ رہی تھی ۔اب مخالف ٹیم نے یہ اعتراض کیا کہ بال ہاتھوں سے کیچ کی جاتی ہے نہ کہ جسم کے کسی دوسرے حصے سے ۔ایمپائر نے کہا کہ اس قسم کا معاملہ دنیائے کرکٹ میں کہیں بھی پیش نہیں آیا جس کی مثال دیکر فیصلہ کیا جا سکے ۔آپ ریفری مقرر کر لیں ۔قرعہ فال میرے اور فرسٹ لیڈی کے نام نکل آیا۔ہم اپنی اپنی

کرسیوں سے اٹھ کر آ گئے۔ مجھے فرسٹ لیڈی نے کہا اب کیا کریں۔ میں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں پھر جیوری سے کہا آپ نے غور نہیں کیا، مخالف ٹیم کے مرد و خواتین نے خود کہا تھا کہ اگر ہمیں کیچ کی گئی بال دکھا دی جائے تو ہم کیچ تسلیم کر لیں گے۔ ان کو نہ صرف بال دکھا دی گئی بلکہ وہ ایسی جگہ پھنسی ہوئی ہے کہ صرف ہاتھ ڈال کر ہی نکالی جا سکتی ہے۔ یہ عدالت کیچ تسلیم کئے جانے اور بال کی باعزت رہائی کا حکم صادر فرماتی ہے۔ لڑکی نے جلدی سے بال نکال کر مجھے دے دی اور میں یہ تاریخی بال پاکستان لے آیا۔ فرسٹ لیڈی اور دیگر سب لوگوں نے تالیاں بجا کر میرے فیصلے کی توثیق کر دی۔ مخالف ٹیم شرط ہار گئی۔ کیچ کرنے والی لڑکی میری بہت شکر گزار ہوئی۔

آج ہمارے شو کا آخری دن تھا۔ رات آٹھ بجے تک سیل جاری رہی پھر بچا کھچا سامان گتے کے کارٹنز میں پیک کیا گیا۔ یہ سامان اور سٹور میں رکھا ہوا باقی سامان ایک ویئر ہاؤس میں رکھوا دیا گیا دیگر ملازموں کو تنخواہ دے کر فارغ کر دیا گیا۔ ایک مقامی لڑکا کہنے لگا ماسٹر میں نے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بولا میں 2/3 سال سے اس شو میں کام کر رہا ہوں۔ یہ ہمارا سیزن ہوتا ہے۔ میں اکثر غیر ملکی نمائش کنندگان کے پاس بطور ورکر کام کرتا ہوں۔ آپ نے اگر کولڈ ڈرنکس منگوائے تو تمام ورکرز کو بھی دیے۔ اگر کھانا منگوایا تو ہمارے لئے بھی منگوایا۔ تنخواہ کے علاوہ ہمیں ٹپ بھی دی۔ ہمیں مسٹر کہہ کر پکارا اور آج آخری دن ہمیں ہماری پسند کے کپڑے بھی دیے۔ اس سے پہلے ہمیں کسی ملکی یا غیر ملکی نے اس قابل نہ سمجھا۔ ہم سب آپ کے احسان مند ہیں اور ہمیشہ آپ کو یاد رکھیں گے۔ ساتھ ہی وہ رونے لگ گیا۔ میں نے اسے گلے لگایا۔ اس کے ساتھ تصویر بنوائی تو وہ سب خوش ہو گئے۔ اس طرح دی گرینڈ ایسٹر رینڈ شو ختم ہوا۔ اسی اثنا میں مسٹر مینی پولیس مین آ گیا۔ وہ ہمیں پیک کرتے دیکھ کر اداس لہجے میں کہنے لگا: کیا آپ لوگ آج ہی گیبرون واپس چلے جائیں گے؟ میں نے کہا ابھی نہیں۔ ابھی ہم کوانڈے بیلے آفشل ٹور پر جائیں گے۔ پھر پیٹرز برگ شو پر جائیں گے۔ اس کے بعد گیبرون جائیں گے۔ اس نے پوچھا: یہاں جوہانسبرگ میں آپ کا قیام کہاں ہے؟ میں نے اسے گیسٹ ہاؤس کا بتایا۔ امتیاز بھائی بولے کوانڈے بیلے جانے سے پہلے گیسٹ ہاؤس چھوڑ دیا جائے گا اور آپ کا سامان اوکلے کورٹ میرے گھر پر رکھ دیا جائے گا تا کہ کرایہ داری سے بچا جا سکے۔ مینی بولا میرا پولیس اسٹیشن بھی ادھر ہی ہے اور میرا گھر بھی ادھر ہی ہے۔ ملاقات ہوتی رہے گی۔ اس طرح ہم تمام کاموں سے فارغ ہو کر آرام کرنے کے لیے اپنے گیسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ دوسرے روز میں نے تمام ٹیم کا کھانا ایک مسلم ہوٹل میں کیا ہوا تھا تا کہ جن صاحبان نے ہماری بھرپور مدد کی ان کی خدمات کو سراہا جائے اور اگلے سفر کے لیے پروگرام طے کیا جائے۔ اس دعوت میں جولی باجی کے علاوہ ان کی دو عدد سہلیاں جوان کی کزن بھی تھیں شامل ہوئیں۔ اکثر عورتیں یہاں بزنس ویمن، ورکنگ ویمن، شادی کے بغیر، طلاق یافتہ اور خود کفیل ہوتیں تھیں۔ اگر خوش قسمتی سے خاوند اور بچوں والی ہے تو بھی وہ ورکنگ ویمن ہے۔

خاوند خود کماتا ہے، بیوی اپنا کماتی ہے۔ نہ اس کا بوجھ خاوند پر ہے اور نہ خاوند کا بوجھ بیوی پر۔ عجیب سی بے برکتی اور غیر قدرتی کیفیت چہروں سے جھلکتی نظر آتی تھی۔ دوران لنچ یہ طے پایا کہ صبح سب جلد تیار ہو کر امتیاز بھائی کے گھر آ جائیں گے۔ میں نے امتیاز بھائی سے کہا آپ نہ صرف ہمیں لینے آئینگے بلکہ گیسٹ ہاؤس کا بل بھی آپ چیک کرینگے کیونکہ Booking آپ کے نام سے ہے۔ وہ بولے ٹھیک ہے۔ یہ اچھا ہوٹل تھا جسے ایک انڈین نژاد مسلم خاتون بڑے مزے مزے کے حلال کھانوں کے بینر کے نیچے چلا رہی تھی۔ اس کی لڑکیاں ٹیبل سروس کرتی تھیں۔ خود کاؤنٹر پر بیٹھتی تھی۔ کسی آدمی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ میں نے امتیاز بھائی سے کہا ہیئر کٹنگ کروانی ہے۔ بال بہت بے ترتیب ہو چکے ہیں۔ وہ بولے یہاں قریب ہی ایک ہیئر کٹنگ سیلون ہے۔ مہمانوں کو رخصت کر کے چلتے ہیں۔ میں اور امتیاز بھائی سیلون کے اندر گئے۔ اب اندر کا ماحول ملاحظہ فرمائیں۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اگربتیوں کی بہت تیز خوشبو سے واسطہ پڑا۔ سامنے نظر پڑی تو ہندوؤں کے بھگوان آلتی پالتی مارے براجمان تھے۔ جن کے سامنے ناریل اور نہ جانے کیا کیا رکھا ہوا تھا۔ گیروی رنگ کے کپڑے پہنے 4/5 خواجہ سرا بطور کاریگر کھڑے تھے جو کٹنگ اور مساج کے لیے دستیاب تھے۔ میرے لئے تو اگربتیوں کی خوشبو ہی کافی تھی کجا خواجہ سراؤں سے کٹنگ یا مساج کراؤں۔ میں جس تیزی سے شیشے کا دروازہ کھول کر اندر گیا تھا اسی تیزی سے باہر آ گیا۔ امتیاز بھائی میرے پیچھے بڑی تیزی سے آئے۔ میں کار میں بیٹھ چکا تھا۔ بولے کیا ہوا؟ میں نے کہا ابھی میرے حالات اتنے خراب نہیں ہوئے کہ میں ہندوؤں اور پھر خواجہ سراؤں سے کٹنگ اور مساج کراؤں۔ سب ساتھی ہنس پڑے۔ ہم اورینٹل پلازہ اور ملکی لین سے ہوتے ہوئے امتیاز بھائی کے گھر واقع اوکلے کورٹ آ گئے۔ صبح ایک نئی دنیا کی تلاش میں جانا تھا جہاں اب تک کوئی پاکستانی یا انڈین نہ جا سکا تھا۔

لیکن وہاں جانے سے پہلے میں اپنے قارئین کرام کو ایک کریکٹر سے ملوانا چاہتا ہوں جس کو تمام جوہانسبرگ منشی لاہوری کے نام سے جانتا تھا۔ تمام جوہانسبرگ سے میری مراد تمام ایشیائی کمیونٹی سے ہے۔ منشی لاہوری عین عالمِ شباب میں کسی نہ کسی طرح جوہانسبرگ کھانے کمانے پہنچ گئے۔ نوجوان، قبول صورت کماؤ پوت تھے۔ آہستہ آہستہ جب معاشی پریشانی دور ہوتی گئی۔ انسانی فطرت اور قدرتی ضرورت کے تحت جوانی کی ضربات برداشت کرتے ہوئے ایک انڈین نژاد مسلم حسینہ کو دل دے بیٹھے۔ حسینہ نے بھی اس بانکے سجیلے جوان کو خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے دل کے مندر میں پوجا پاٹھ کے لیے سجا لیا۔ نتیجہ شادی پر جا کر ایک بیٹی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ دونوں میاں بیوی کام کرتے گئے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے خوشحالی آتی گئی۔ گھر، گاڑی اور دیگر تمام سہولیات میسر آ گئیں۔ اگر میاں بیوی میں محبت زیادہ ہو تو اولاد کی بھی لائن لگ جاتی ہے۔ منشی صاحب کی بھی بیٹیاں تھیں۔ اپنی کوشش اور شدید خواہش کے باوجود دوبارہ پاکستان نہ آ سکے۔ ایک تو پاکستانیوں کی بدنامی بہت تھی کہ یہ لوگ شادی

یا دوستی کرتے ہیں، ایک دو بچے پیدا کرتے ہیں، واپس پاکستان جا کر پھر کبھی پلٹ کر نہیں آتے۔ کوئی محبت کی ماری خاتون، مصیبتیں اٹھاتے، کسی نہ کسی طرح پاکستان اپنے خاوند یا دوست کا پیچھا کرتے ہوئے آ بھی جائے تو یہاں بھی ایک عدد بیوی اور دو تین بچوں کا خاندان سنبھالے ہوئے ہوتا ہے۔ اس خاتون کو یا تو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا جاتا ہے یا حوصلہ تسلی دے کر روانہ کر دیا جاتا ہے کہ تم چلو میں ضروری کاموں سے فارغ ہو کر تمہارے پاس آ جاؤنگا۔ نہ تو ضروری کام ختم ہوتے ہیں اور نہ ہی پردیسی کبھی لوٹ کر آتا ہے۔

منشی صاحب تھے تو بھلے مانس اور قابل اعتبار لیکن بیٹیوں کا ساتھ، بیوی کی محبت، پردیسیوں کا اعتباری نہ ہونا، دو ملکوں کے درمیان قانونی رکاوٹیں اور پھر پاکستان میں اہم رشتوں کا وفات پا جانا۔ ان عوامل کے پیش نظر منشی صاحب نے جبر کر کے اپنے ارادے ترک کر دیے اور اپنے ہی بنائے ہوئے قفس میں مقید ہو کر رہ گئے۔ لیکن وہ اپنی وطنی جبلت کو ہر پاکستانی کی خدمت کر کے تسکین دیتے تھے۔ اب ان کی بیٹیاں نہ صرف جوان تھیں بلکہ شادی شدہ اور صاحب اولاد بھی تھیں۔ اتفاقاً ان کی ایک بیٹی ہمارے سٹال پر اپنے بچوں اور خاوند کے ساتھ تشریف لے آئیں۔ جب انہوں نے پاکستان کا لفظ پڑھا تو ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بولی آپ سب پاکستانی لگتے ہیں۔ میں نے ذرا ناراضگی سے کہا تمہارا کیا مطلب ہے؟ ہم پاکستانی لگتے نہیں بلکہ پاکستانی ہیں اور ہمیں فخر ہے کہ پاکستان ہمارا مادر وطن ہے۔ وہ بولی بھائی صاحب ناراض نہ ہوں۔ میں بھی ایک پاکستانی کی بیٹی ہوں۔ میری اُردو ایسی ہی ہے اس لئے آپ کو اچھا محسوس نہیں ہوا۔ میں بھی نرم پڑ گیا۔ اس نے جاتے ہوئے مجھے کہا اپنا فون نمبر مجھے لکھ دیں میرے والد محترم منشی لاہوری آپ سے بات کریں گے۔ میں نے ایک کاغذ پر نمبر لکھ کر اس خاتون کو دے دیا۔ دوسرے روز دو تین خواتین ایک بزرگ کو سہارا دیتے لے آئیں۔ میں جلدی سے کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انہیں کرسی پر بٹھایا، پانی وغیرہ پلایا۔ یہ تھے منشی لاہوری جو عمر عزیز کے نوے سال پورے کر کے اکانوے سال میں تھے۔ ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ ان کی بیٹیاں شوگھومنے چلی گئیں اور انہیں ہمارے پاس چھوڑ گئیں۔ منشی لاہوری بہت تجربہ کار اور جہان دیدہ بزرگ انسان تھے۔ پاکستان اور پھر خاص طور پر لاہور کو یاد کر کے آنکھیں نم کر لیتے۔ مجھے انہوں نے کچھ اس انداز سے ڈنر کی دعوت دی کہ میں انکار نہیں کر سکا۔ حالانکہ میں ہر کسی کے ساتھ سوشل ہونے سے کنی کتراتا تھا۔ دوسرے روز ہم منشی لاہوری کے خوبصورت گھر پہنچ گئے۔ یہ ایشین آبادی کی ایک خوبصورت کالونی میں واقع تھا جس کو Lodem کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ گھر کیا تھا ایک منی پاکستان تھا۔ پاکستانی جھنڈا، مسٹر محمد علی جناحؒ کی قدِ آدم خوبصورت تصویر، لاہور کے اہم مقامات کی تصاویر، غرض سجاوٹ کی چیز سے بلکہ پورے گھر سے پاکستانیت کی جھلک دیکھی جا سکتی تھی۔ کھانا بھی بہت پر تکلف اور لاہوری سٹائل میں بنا ہوا تھا۔ ان کی پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت لازوال تھی۔ محبت، عزت، احترام اور بھیگتی آنکھوں سے انہوں نے ہمیں باہر

تک رخصت کرتے ہوئے پاکستان کے لیے محبت کا پیغام دیا۔ اور مجھے خاص طور پر کہا آپ جب بھی دوبارہ تشریف لائیں تو ایک بوتل میں میرے وطن کی مٹی ضرور لانا۔ میں اب اپنی عمر پوری کر چکا ہوں۔ میرے انتقال کی صورت میں میری قبر میں مٹھی بھر مٹی میرے وطن کی بھی ہونی چاہئے۔

صبح ہماری KwaNdebele روانگی تھی۔ فرسٹ لیڈی نے صبح 6 بجے ہی ایک ٹویوٹا ہائی ایس بھجوادی تھی۔ اللہ کا نام لیتے ہوئے ہم ایک وفد کی شکل میں اپنی منزل KwaNdebele کی طرف رواں دواں ہوئے۔ جمعہ کا روز تھا۔ سفر جاری تھا۔ موسم بھی بہت اچھا تھا۔ میں نے اب تک KwaNdebele کے بارے میں جو ہوم ورک کیا تھا اس کے مطابق جوہانسبرگ سے اس کا فاصلہ 320 کلومیٹر تھا اور یہ پری ٹوریا کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ اس علاقے کو 1981 میں داخلی طور پر آزاد کر کے اس کی خودمختار گورنمنٹ بنادی گئی تھی۔ KwaNdebele کا مطلب ہے: لوگوں کی سرزمین یا وطن۔ 1986 to 1981 تک اس کا صوبائی دارالخلافہ Siyabuswa تھا پھر بدل کر KwaMhlanga رکھ دیا گیا۔ اس صوبے کی آبادی 1992 میں چار لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ Prince Senzan gakhona James mahlangu. بطور چیف منسٹر 30 اپریل 1990ء کو برسر اقتدار آئے۔ اب کچھ چیف منسٹر کے بارے میں کہ یہ کون تھا: Name: Senzan gakhona Mahlanga

Nick Name: James prince ۔ وہ بادشاہ کا دوسرا بیٹا تھا جس کا پورا نام کچھ اس طرح تھا۔ Ndzun dza mabhoko king Mabusabesala II, اور اس کی والدہ محترمہ ملکہ Johanna selepi ۔ پرنس James کا ایک بڑا بھائی اور چھوٹی بہن بھی تھی ۔ پرنس James کی شادی پرنس Busi Mhlanga سے ہوئی اور وہ دو بچوں کے والد ہیں۔ KalaNclebele پچیس سو مربع کلومیٹر رقبہ پر محیط تھا۔ جوہانسبرگ سے ہم چھ گھنٹے اور 30 منٹ کی ڈرائیو کے بعد اس کے صوبائی کیپٹل KwaMhlanga جا پہنچے۔ ہم 15/20 منٹ سفر کی وجہ سے لیٹ ہو گئے تھے۔ جب ہم چیف منسٹر سیکرٹریٹ پہنچے تو فرسٹ لیڈی بوسی ملانگے باہر ہی پریشانی کے عالم میں ٹہل رہی تھی۔ جیسے ہی ہماری گاڑی سیکرٹریٹ کے مین گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو بگل بجا کر مہمانوں کی آمد کا اعلان کیا گیا۔ یہ ان کے سرکاری اور قبائلی رسم و رواج کے مطابق تھا۔ پھر مقامی زبان میں کچھ پڑھا گیا جو بعد میں فرسٹ لیڈی سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ ان کا لوکل ترانا ہے جو کچھ اس طرح تھا "Nkosi Sikel Eliafrika" جس کا مطلب ہے "God Bless Africa"۔

ہمارا پرتپاک خیر مقدم ہوا۔ چیف منسٹر نے باہر آ کر ہمارا استقبال کیا۔ پھر اپنی تمام کابینہ سے ہمارا تعارف کروایا۔ اس کی کابینہ آٹھ وزراء پر مشتمل تھی۔ ہمیں سیکرٹریٹ کے کانفرنس ہال میں لے جایا گیا جہاں چیف منسٹر نے ہمارے لئے خیر مقدمی کلمات کہے اور ہمارے آنے کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے کہا کہ ہمارے صوبے کی تاریخ میں یہ

پہلا پاکستانی تاجروں کا وفد ہے جس نے ہمیں عزت بخشی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی وزٹ کرتے رہیں گے اور ہم پہلے سے بھی بڑھ کر ہمیشہ ان کا استقبال کریں گے۔

اب مجھے بطور وفد کے سربراہ کے خطاب کی دعوت دی گئی۔ میں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کر کے رسماً چیف منسٹر اور تمام کابینہ کا شکریہ ادا کیا۔ بزنس کی سہولیات اور اس کی ترقی پر بات کی۔ علاقے کی خوبصورتی، افریقن قبائل کی دریا دلی اور مہمان نوازی پر بات کی۔ خاص طور پر سامنے بیٹھی فرسٹ لیڈی کی طرف اشارہ کر کے اور اس کا نام لیتے ہوئے کہا کہ آج کی میٹنگ، آج کا دن، میں اس عظیم خاتون کے نام کرتا ہوں۔ جس کی فہم و فراست اور ایک پُل کا کردار ادا کرنے کی وجہ سے آج ہم یہاں موجود ہیں۔ اس پر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ سب نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔ پھر میں نے تحائف پیش کرنے کی اجازت چاہی جو میں نے آتے ہی فرسٹ لیڈی کے حوالے کر دیے تھے اور اب میرے سامنے رکھے تھے۔ چیف منسٹر سے شروع ہو کر تمام منسٹرز کو تحائف پیش کیے گئے۔ وہ سب بچوں کی طرح خوش ہوئے۔ چیف منسٹر نے کہا ہمارے صوبے میں صرف ایک مسلمان فیملی کاروبار کرتی ہے۔ ہم نے اپنی طرف سے ان کے گھر میں آپ لوگوں کے لیے نہ صرف لنچ کا بندوبست کیا ہوا ہے بلکہ آپ وہاں جمعہ نماز بھی ادا کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی بولا کہ مجھے ایک آسٹریلین وفد سے ملنا ہے۔ فرسٹ لیڈی اور اس کا سٹاف آپ کا دورہ مکمل ہونے تک آپ کے ساتھ رہے گا۔ آپ اپنی ضرورت کے تحت ہر چیز ان سے طلب کر سکتے ہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اجازت چاہی۔ سب نے ہمیں گاڑی تک آ کر Good Bye کہا۔ فرسٹ لیڈی کی قیادت میں ہم اس اکلوتے مسلم خاندان کے گھر پہنچ گئے جو ہمارے ہی انتظار میں تھے۔ جاتے ہی جمعہ نماز کے لیے میزبان نے آذان دے دی۔ انہوں نے گھر سے ملحقہ جگہ پر ایک چھوٹی سی مسجد بنائی ہوئی تھی۔ باجماعت نماز ادا کر کے کھانے کی میز پر آ گئے۔ اس دوران فرسٹ لیڈی نے پوچھا کہ میں آپ کا دیگر پروگرام ترتیب دے دوں یا آپ کی کوئی فرمائش ہے۔ میں نے ٹیم ممبران کی طرف دیکھا تو مختلف آوازیں آئیں ''ٹاپ لیس ڈانس''۔ فرسٹ لیڈی نے بہت ہی نفیس آواز میں کہا اونو پرابلم اور میزبان کا فون اٹھا کر آرڈر پاس کرنے شروع کر دیے۔ جب سب بندوبست ہو گیا تو وہ بولی ہم یہاں سے 100km جنگل کے اندر جا رہے ہیں۔ وہاں کے قبیلے کو درخواست کی گئی ہے کہ ہمارے معزز مہمان تمہارا قبائلی ڈانس دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ تیاری کر رہے ہیں۔ اب چلتے ہیں تا کہ اندھیرا ہونے سے پہلے واپس آ سکیں۔ لڑکے تو چھلانگیں لگا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اب دو گاڑیاں بھاگ رہی تھیں۔ ایک گاڑی میں فرسٹ لیڈی کے ساتھ میں بیٹھا تھا۔ اس کی سیکرٹری، ڈائریکٹر انڈسٹریز اور تین سول سرونٹ اور تھے جو چیف منسٹر کی طرف سے مقرر کئے گئے تھے۔ ہم 100km کا فاصلہ طے کرتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ جیسے ہی ہماری گاڑیاں اونچائی سے نیچے وادی میں اتریں سنک بجنا شروع ہو گئے۔

خواتین کا ایک گروپ قبائلی لباس اور جنگلی زیورات سے مزین ایک گول دائرے میں ناچ رہا تھا۔ کالے بھوت کی طرح کے دو آدمی ڈرم پیٹ رہے تھے۔ ایک سنک پھونک رہا تھا۔ میں کئی بار اس قسم کے رقص کی سروریئت سے آشنا ہو چکا تھا۔ اس کی رنگینی اور سنگینی کے مزے بھی لے چکا تھا۔ دیگر لوگوں کے لیے یہ سب کچھ نہ صرف نیا تھا بلکہ حیران کن بھی تھا۔ لڑکے میری وجہ سے Uneasy بھی تھے اور شرما بھی رہے تھے۔ میں نے فرسٹ لیڈی سے کہا سوفٹ ڈرنکس کی حد تک سروس جاری رہے لیکن ہارڈ ڈرنکس بند کروا دیں۔ یہ ہم سے کسی کا بھی Subject نہیں ہے۔ اس نے ایک شمپیئن کی بوتل اٹھائی اور بولی آؤ ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ آپ کے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرونگی۔ امتیاز بھائی، خیر النساء، فرسٹ لیڈی اور راقم الحروف جنگل میں بنے ریسٹ ہاؤس کے فرنشڈ کمرے میں جا بیٹھے۔ باہر غل غپاڑہ ہوتا رہا۔ پہلے جنگلی ناچ ہوتا رہا۔ پھر جنگلی دیکھتے رہے اور پاکستانی جوان ناچتے رہے۔ فرسٹ لیڈی کی سیکرٹری ہمارے ایک پاکستانی جوان کے ساتھ چپک بٹن رہی۔ جبکہ دوسرا لُوس مارتا رہا کیونکہ وہ تھا ہی انتہا درجے کا لُوسی۔ لُوسی کی definition لکھنے کے لیے ایک الگ chapter درکار ہوگا اس لئے ’مٹی پاؤ‘۔

کمرے میں بیٹھتے ہی فرسٹ لیڈی نے دو گلاس اپنے پسندیدہ مشروب کے چڑھائے اور آنکھیں مٹکا کر بولی: آفتاب آپ کچھ پوچھ رہے تھے۔ میں نے اور امتیاز بھائی نے باری باری جو بھی سوالات کئے ان کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے۔ مگر اس سے پہلے وہ نشے کی ترنگ میں مجھے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی تم سگریٹ، چائے، شراب اور دیگر تمام نشہ آور خرافات سے مکمل طور پر اجتناب کرتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ اس کے بدلے میں کیا کرتے ہو؟ امتیاز بھائی نے یہ کہہ کر ٹوک دیا۔ Come To the Point

ہمارے ملے جلے سوالات کے جوابات میں جو کچھ ہمیں حاصل ہوا وہ مندرجہ ذیل ہے۔ یہ تمام تفصیل فرسٹ لیڈی کی فراہم کردہ ہے۔ ساؤتھ افریقہ کے قابلِ ذکر قبائل جن میں

Ndebele- Pedi- Zulu-Tronga Basotho- Tswana- Xhosa Venda- twana

اس کا کل رقبہ ایک لاکھ تئیس ہزار مربع کلو میٹر اور آبادی تین کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ جس کو آپ 3½ کروڑ کے مساوی مان سکتے ہیں۔ آبادی کی تقسیم کچھ اس طرح سے ہے۔

افریقن دو کروڑ بیس لاکھ (جو اس خطے کے اصل مالک ہیں اور مختلف قبائل پر مشتمل ہیں)۔ وائٹ خود کو Afrikans کہلواتے ہیں اور غاصب ہیں جو برٹش کان کن، ڈچ کسان، کچھ جرمن اور کم تعداد میں دیگر یورپی ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تعداد پچاس لاکھ کے قریب ہے۔ تیس لاکھ کے قریب Coloured ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بلیک اور وائٹ کے باہمی اختلاط سے دنیا میں آئے۔ مزید یہ کہ Colonial دور کے ابتدائی دنوں میں کیپ Province میں کچھ ڈچ، فرنچ سیٹلرز آئے۔ ان کے علاوہ (Brown Skin (Bushmen اور

Khaikhoi جن کو Hottentots بھی کہا جاتا ہے جو اس علاقے کے اصل باسی تھے اور ایشین جو دس لاکھ کے قریب ہیں۔ان کا اصل وطن بھارت ہے۔ان کو 1870 میں گنے کے کھیتوں میں کام کرنے، مالی کے طور پر اور Skilled اور Semiskilled لیبر کے طور پر کام کرنے کے لیے لایا گیا تھا۔مزدوری کرتے کرتے یہ لوگ ترقی کرتے گئے۔اور آہستہ آہستہ بزنس کے پروفیشن کو اپناتے گئے۔ان ہی مزدوروں کی نسل آج ساؤتھ افریقہ میں بزنس کے اجارہ دار ہیں اور بڑے بڑے ٹائی کون ہیں۔ان میں ہندو مسلمان سب ہیں۔ ہندوؤں کا گڑھ ناٹال ڈربن ہے۔بحری جہاز کے ذریعے ان کو بھرتی کر کے لایا جاتا تھا۔کچھ لوگ کھانے، کمانے اور انجانی دنیا دیکھنے کے شوق میں خود بھی آجاتے تھے۔اکثر کو پہلے آجانے والے ان کے اپنے رشتے دار راہنمائی کر کے بلوا لیتے تھے۔یہ لوگ صوبائی مقام ڈربن کی پورٹ پر آف لوڈ کر دیے جاتے۔پھر یہ وہیں کے ہو کر رہ جاتے۔آج بھی ان کی اکثریت ڈربن میں ہی پائی جاتی ہے۔

فرسٹ لیڈی نے ایک لمبا سانس لے کر کہا کہ میرا ملک بہت امیر ہے۔دنیا کا پچاس فیصد سونا میرے ملک میں پایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ .Platinum, Chromium Manganese Vanadium Fluorspar. اور کول نیز اس کے علاوہ دیگر معدنیات بھی پائی جاتی ہیں۔لائیوسٹاک فش، فروٹ، مکئی، اُون، شوگر اور دیگر انڈسٹری وغیرہ بھی ہے۔جنگلی حیات میں ہم افریقہ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ہمارے پارکس دنیا کے مشہور ترین پارکس ہیں۔

The Kruger National park. The KwaZulu Game Reserves.

The Gems Bok Kala Hari National Park.

ان Game Reserves میں ہر قسم کی جنگلی حیات پائی جاتی ہے۔Languages میں Afrikaans اور English سرکاری اور علاقائی میں Zulu، Xhosa، Sotho، Trwana، Shangaan، Ndebele، Swazi، Venda اور African Languages بھی ان کے علاوہ قبائل میں بولی جاتی ہیں۔وہ کچھ دیر سانس لینے رکی اور ایک پیگ اور نوشِ جاں کرتے ہوئے مجھے آنکھ ماری کہ تھوڑی سی چکھ تو لو۔میں نے شکریہ کے ساتھ انکار کیا تو وہ بولی ہمارے تین Capitals ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

1) Pretoria (administrative)

2) Cape Town (Legislative)

3) Bloemdontein (Judicial)

ہمارے ہمسایہ ممالک میں Botswana, Zimbabwe. Mozambique Namibia ہیں۔

ہمارے کیپ کی طرف اگر Atlantic Ocean ہے تو ڈربن کی طرف سے Indian Ocean ہے۔
ہمارے قابل ذکر بڑے شہر Cape Town, Kimberley, Bloemfonteln, Durbain
Tzaneen, Johannesberg, Pretoria, Port Elizabeth, Pietersberg, Gautong.
ساؤتھ افریقہ کے صوبائی انتظامی یونٹ کچھ اس طرح سے ہیں۔

1- Eastern Cape. 2- Fre State. 3- Gauteng. 4- Kwa Zulee- Natal.
5- Limpopo. 6- Mpumalanga. 7- Northern cape.
8- North West. 9- Western Cape.

اور اگر دنیا جہان کی نازنینوں اور جبینوں کا میلہ دیکھنا ہو تو اس ملک کی Best Beaches وزٹ کریں۔

Lang Beach. Clifton Beach. De Hoop Nature Reserve.
Pletten Berg bay Port St: Johns.

آپ کو یہاں نہ صرف حُسن کی قوس وقزح ملے گی۔ بلکہ نیچرل لباس میں، نیچرل حسن آپ کی آنکھوں کو خیرہ کردے گا۔ حسن کا تھنڈر زمین کی کشش کی طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ دونوں زندگی فنا کرنے کے لیے بے حد کارآمد ہیں۔ باقی قسمت یاوری کرے تو آپ راجہ اندر بن سکتے ہیں۔ ورنہ ساحل کی نہایت صاف ستھری ریت، سمندری جل پریوں کے جسم سے جھڑ کر آپ کے سر میں بھی چمک سکتی ہے۔ پھر اسی پر اکتفا کیجیے۔ استاد محترم کا فرمان ہے کہ سفر میں زادراہ لے کر چلو۔

اب ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ رات ایک بجے ہم امتیاز بھائی کی رہائش اوکلے کورٹ خیریت سے پہنچ گئے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے لیٹتے ہی پریوں کے دیس میں جا پہنچے۔ صبح امتیاز بھائی کی پین فرینڈ خیرالنساء اپنے دیس کیپ ٹاؤن روانہ ہوگئی۔ اب ہم نے پیٹرز برگ شو پر جانا تھا مگر اس سے پہلے تین واقعات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

دوسرے روز اوکلے کورٹ کی مسجد میں نماز پڑھنے گیا تو انگلش میں واعظ کرنے والے مولوی صاحب جانے پہچانے سے لگے۔ وعظ بھی سنتا رہا اور ان کا چہرہ دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ جب نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو ان کے قریب جا کر سلام کیا اور پوچھا کیا آپ نے مجھے پہچانا۔ وہ بھی حیران سے مجھے دیکھتے رہے۔ میں نے کہا ڈاکٹر مبین مجھے پہچانو۔ انہوں نے مجھے گلے لگا لیا یہ۔ ڈاکٹر صاحب ہمارے بہاول پور کے قائداعظم میڈیکل کالج (QMC) سے فارغ التحصیل تھے اور آج کل جوہانسبرگ سے Specialization کر رہے تھے۔ ماشاءاللہ بہت بڑی تبدیلی آئی۔ ڈاکٹر صاحب تو سراپا تبدیلی تھے۔ مسجد کے قریب ہی ڈاکٹر صاحب کا گھر تھا۔ مجھے ان سے

مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ اسی آبادی کے ملکی لین والی سڑک پر مین روڈ پر ایک بنگلہ تھا جس میں انڈین سٹار ریکھا قیام پذیر تھی۔ اس کے ساتھ اس کی خاص دوست ایک سکھنی سریندر کور بھی قیام پذیر تھی جو ائر انڈیا میں ائر ہوسٹس تھی ی۔ ہ دونوں ہی Nymphomaniac تھیں۔ ہربل میڈیسن میں دلچسپی کی وجہ سے میں ان کو نسخے لکھ کر دیا کرتا تھا۔ اگر صحت نے اجازت دی تو اس بیماری، سریندر کور اور ریکھا پر الگ سے کتاب لکھوں گا۔ جس میں بے حد تفصیل سے ہر قسم کی ساخت بیان کی جائے گی۔ ایک روز اوکلے کورٹ امتیاز بھائی کے گھر کے اوپر والے پورشن سے رونے کی آواز آنے لگی۔ اس پورشن میں بابو بھائی نام کے ایک مسلمان مع اپنی زوجہ محترمہ کے قیام پذیر تھے۔ انہوں نے کراچی کے کسی مدرسے سے حفظِ قرآن کیا تھا۔ صرف دو گھرانے ہی مسلمانوں کے تھے۔ باقی ادھر اُدھر تمام ہندو ورکنگ ناریاں رہتی تھیں۔ بابو بھائی اور ان کی اہلیہ محترمہ سے آتے جاتے سلام دعا ضرور ہوتی تھی۔ پاکستانی مسلمان ہونے کی وجہ سے دونوں ہمیں بہت پیار سے ملتے تھے۔ میں اور امتیاز بھائی بھاگ کر سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے جب اوپر بابو بھائی کے گھر کے کمرے میں پہنچے تو ان کی اہلیہ کو بہت زیادہ روتے ہوئے پایا۔ میں نے بابو بھائی سے ماجرا پوچھا تو وہ بولے میری اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔ ہم نے اپنے کسی عزیز کا بچہ لے کر پالا ہوا تھا۔ وہ بچہ تین سال سے ہمارے پاس، ہماری آنکھوں کا تارا اور دل کا سکون بن کر پرورش پا رہا تھا۔ آج اچانک اس کی والدہ آئی اور اپنا بچہ لے گئی۔ بس میری زوجہ محترمہ اس وقت سے روئی جا رہی ہے۔ جب بھی بچے سے منسوب کوئی چیز دیکھتی ہے رونا شروع کر دیتی ہے۔ ہم کافی دیر اس کے پاس بیٹھے اس کی دلجوئی کرتے رہے۔ صرف اس کو ہنسانے کی خاطر میں نے خاتونِ خانہ سے کہا کہ میرے پاس آپ کے لیے دو مشورے ہیں۔ جن سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو سکتا ہے۔ وہ بہت غور سے میری طرف متوجہ ہو گئی۔ میں نے کہا اگر آپ مجھے اپنا بیٹا بنا لیں تو نہ صرف آپ اماں جان بن جائیں گی بلکہ میرے دس بچوں کی دادی اماں بھی بن جائیں گی اور میں بھاگنے والا بھی نہیں۔ دوسرا مشورہ یہ ہے کہ آپ میری کسی خوبصورت لڑکی سے شادی کروا دیں۔ میرے جتنے بھی بچے ہوئے وہ سب آپ کے۔ اس کا ہنس ہنس کر موڈ مزاج بہت اچھا ہو گیا اور ہم واپس آ گئے۔ اب میں جب بھی اس کو گلی میں دیکھتا یا بالکونی میں دیکھتا تو اماں جان السلام علیکم کہتا۔ وہ خوش ہوتی، ڈھیروں دعائیں دیتی۔ ہمارے لئے بریانی اور دیگر مزیدار چیزیں پکا کر رکھتی۔ صرف اماں جان کہنے پر دل جان سے صدقے واری جاتی۔

اوکلے کورٹ کے قریب ہی اورینٹل پلازہ کے نام سے ایک بڑی مارکیٹ تھی جس میں صرف ایشین نژاد افراد بزنس کرتے تھے۔ ہر چیز کی دکان اس پلازہ میں تھی۔ یہ ایک بہت بڑی بلڈنگ تھی۔ اس کے ایک جیسے کئی گیٹ تھے۔ اگر آپ ایک گیٹ سے پلازہ کے اندر داخل ہو جائیں اور کوشش کے باوجود یہ چاہیں کہ آپ اسی گیٹ سے باہر نکلیں تو یہ ممکن نہ تھا۔ بھول چوک ہونا لازم تھا۔ میں فارغ اوقات میں اورینٹل پلازہ شاپنگ سنٹر اکثر جایا کرتا

تھا۔ پر رونق جگہ تھی۔ ایک مسلمان دکاندار کو کچھ سامان دیا ہوا تھا، اس کے پیسے بھی لینے تھے۔ جب میں ان کی دکان میں داخل ہوا تو ایک بزرگ اور تین نوجوان لڑکیاں دکان میں موجود تھیں۔ لڑکیوں نے جینز اور چولیاں پہنی ہوئی تھیں لیکن چہرے سے غصہ میں معلوم ہوتیں تھیں۔ بلکہ ایک تو رو رہی تھی، مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کیں اور آپس کی بحث بند کر دی۔ میں نے دکاندار سے حال احوال پوچھا اور رونے والی لڑکی سے رونے کی وجہ پوچھی۔ وہ پھر رونے لگ گئی۔ ان میں جو سب سے چھوٹی تھی وہ ذرا منہ پھٹ تھی۔ میں نے اسی سے ذرا اپنائیت کا اظہار کیا تو وہ طوطے کی طرح بولتی گئی اور ذرا بھی نہ شرمائی۔ وہاں کی لڑکیاں خود کفیل ہونے کی وجہ سے اور ہر وقت آدمیوں کے کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنے کی وجہ سے بات چیت اور کارکردگی میں آدمیوں کی طرح ہی ہوتی ہیں۔ جیسے خواجہ سرا نسوانیت پسند بن کر عورتوں کی نقل کرتے ہوئے بہت بُرے لگتے ہیں، اسی طرح بات چیت میں وہ مردانہ طرز عمل اختیار کرتیں ہیں اور مردانہ کپڑے پہنتی ہیں تو ان کی نسوانیت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اب اس دکان میں جو مقدمہ چل رہا تھا وہ کچھ ان حقائق پر مبنی تھا۔ یہ تینوں لڑکیاں اس دکاندار کی سگی بیٹیاں تھیں اور غیر شادی شدہ تھیں۔ اپنے باپ کی دکان پر بطور ہیلپر ز کام کرتی تھیں۔ آج ان کو ذاتی ضرورت کے تحت کچھ پیسوں کی ضرورت تھی جو انہوں نے اپنے والد محترم سے مانگے۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ شدید ضرورت کی وجہ سے لڑکیوں نے مطالبہ بار بار کیا تو بڑے میاں ڈانٹ ڈپٹ پر اتر آئے۔ لڑکیوں کے رونے کی وجہ ضرورت پوری نہ ہونا اور باپ سے نہ صرف ڈانٹ برداشت کرنا بلکہ والد کا یہ کہنا کہ میں ہر ہفتہ تمہیں تمہاری مزدوری دے دیتا ہوں اس کے علاوہ نہ تمہیں کوئی رقم ملے گی اور نہ ہی دکان سے تم سب کوئی چیز لے سکتی ہو۔ جاؤ اپنا اپنا کام کرو۔ جب لڑکیاں یہ سب مجھے بتا رہی تھیں وہ شقی القلب آدمی خاموشی سے لاتعلق ہو کر بیٹھا رہا۔ میں یہ سب سن کر بہت حیران ہوا۔ اتنے میں وہ نوٹ گن کر ایک لفافے میں ڈالتے ہوئے میری طرف ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا یہ آپ کی Payment اب آپ جا سکتے ہیں۔ اس کا رویہ دیکھتے ہوئے اسے احساس دلانے کا فیصلہ میں ذہن میں کر چکا تھا۔ میں نے اسے بیٹیوں کی برکت، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کو ذمہ داری کا احساس دلانے کے لیے بہت کچھ کہا مگر وہ اڑیل گدھے کی طرح صرف ڈھی چوں ڈھی چوں ہی کرتا رہا۔ آخر میں وہ غصے سے بولا اگر یہ تمہاری دکان ہوتی، یہ لڑکیاں تمہاری بیٹیاں ہوتیں، تو تم ان کی فرمائش پوری کرتے۔ میں نے کہا مسلمان ہو تو رویہ بھی مسلمانی اختیار کرو۔ لالچ کے تحت یہودی نہ بنو۔ اب غور سے سنو میں سات بہنوں کا بھائی اور سات بیٹیوں کا باپ ہوں۔ اگر میری بیٹی کہے مجھے پوری دکان چاہئے آپ دکان سے نیچے اتر جائیں تو میں ایک سوال کئے بغیر ہر چیز اس کے حوالے کر کے گھر چلا جاؤنگا۔ اگر وہ بیٹی یہ کہے کہ آپ کے جسم کا گوشت چاہئے تو میں کہوں گا اے جانِ پدر تم لے سکتی ہو۔ آپ کی یہ تینوں بیٹیاں میرے لئے میری

اپنی بیٹیوں کی طرح ہیں۔ میں نے لڑکیوں سے پوچھا کہ بیٹا آپ نے اپنے والدِ محترم سے کتنے رینڈ مانگے تھے؟ بڑی دونوں خاموش رہیں مگر چھوٹی پھٹ سے بول پڑی کہ ہم نے اپنے والدِ محترم سے کہا تھا کہ ہماری بہن کو پیسے دے دیں ہم اپنے لیے نہیں مانگیں گی۔ مگر انہوں نے کہا کہ ہفتہ وار جو آپ کو ادائیگی کی جاتی ہے اسی میں گزارا کریں۔ میں کسی کو ایک رینڈ بھی نہیں دے رہا۔ میں نے کہا بیٹی کوئی بات نہیں۔ یہ آپ کے والد محترم ہیں ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ آج نہیں تو پھر کسی دن یہ ضرور آپ پر مہربان ہو کر آپ کو نہال کر دینگے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ اگر ماں کے پاؤں میں جنت ہے تو باپ ''بابِ جنت ہے''۔ اس لئے ادب واحترام کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھیں۔ جو لفافہ دکاندار نے مجھے میرے سامان کے عوض دیا تھا وہ میں نے بڑی والی کو دیتے ہوئے کہا اس میں تمہارے مطالبے سے کہیں زیادہ Amount ہے۔ آپ تینوں بہنیں تقسیم کر لینا۔ ان کی خوشی قدرتی انداز میں ظاہر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دکاندار بولا اگر آپ کا بیٹا یا کوئی رشتہ دار لڑکا یا لڑکے ہوں تو آپ شادی کر کے ان لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ میں نے ناراضگی سے اسے کہا کہ میں سڑکوں پر بچوں کے رشتے کرتا گھوم رہا ہوں کیا؟ تم ایک بہت ہی Uncivilized انسان ہو۔ لڑکیاں پھر رونے والی ہو گئیں اور بولیں کاش ہم پاکستان میں آپ جیسے باپ کے گھر جنم لیتیں۔

دوسرے روز صبح ہم نے پیٹرز برگ کے لیے سفر شروع کرنا تھا۔ امتیاز بھائی نے کرایہ پر ایک ٹویوٹا ہائی ایس بک کروادی تھی جس میں تمام سامان آ گیا۔ ہم کار میں سفر کرتے ہوئے پیٹرز برگ کی طرف رواں دواں ہوئے۔

Pietersburg ہائی وے پر لگے ہوئے Milestone کے مطابق جوہانسبرگ سے 320km کے فاصلے پر تھا۔ ہائی وے اچھی صاف ستھری تھی۔ ذرا بھی ٹوٹ پھوٹ نہ تھی۔ سفر کا پتہ ہی نہ چلا اور ہم لوگ چار گھنٹے اور تینتیس منٹ میں پیٹرز برگ کے مین چوک میں تھے۔ جولی باجی ہمارے انتظار میں تھی۔ ان کے ساتھ ان کی کزن اور بھابھی بھی ہمارے استقبال کے لیے تشریف لائی تھیں۔ وہ ہمیں پہلے اپنے گھر لے گئیں۔ جہاں پر بے حد پرتکلف لنچ پیش کیا گیا۔ گھر کا کھانا وہ بھی مسلم فیملی کلچر کے مطابق۔ مزید یہ کہ پرخلوص، عزت واحترام کے ساتھ۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں ان خواتین کو کس طرح اپنی عقیدت اور احترام پیش کروں۔ کھانے کے بعد جولی باجی ہمیں ہمارے کمرے دکھانے کے لیے اسی گھر میں اور ساتھ والے گھر لے گئی۔ یہ دونوں گھر ماڈرن تھے۔ آرام دہ اور ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اگر کمی تھی تو صرف مرد کی تھی۔ کیونکہ جولی باجی کی شادی نہیں ہوئی تھی اور دیگر خواتین طلاق یافتہ تھیں۔ تمام ورکنگ ویمن تھیں۔ کسی کی سپر مارکیٹ تھی تو دوسری وہاں ملازم تھی یا کسی اور جگہ ملازمت کر رہی تھی۔ میں نے جولی باجی سے درخواست کی کہ ہم آپ کے پاس آتے جاتے، کھاتے پیتے رہیں گے مگر قیام ہمارا گیسٹ ہاؤس میں ہوگا۔ آپ جو بھی گیسٹ ہاؤس مناسب خیال کریں اس کی Booking کروا

دیں۔ بہت پس وپیش کے بعد بالآخر وہ مان گئیں لیکن اس شرط پر کہ ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا میں خود لے کر آؤں گی آپ کہیں اور نہیں کھانے جائینگے۔ دراصل اکیلی خواتین کے ساتھ ان کے گھر میں قیام کرنا اخلاقی طور پر مناسب نہیں تھا۔ میں نے بے حد احترام سے جولی باجی کو سمجھا دیا۔ انہوں نے فون کر کے ایک صاف ستھرے گیسٹ ہاؤس میں ہماری booking کروادی جو ہمارے لئے آرام دہ ثابت ہوا۔ اس کی انتظامیہ بھی خواتین پر مشتمل تھی۔ مرد حضرات صرف تبرکاً نظر آئے جو پلمبر، الیکٹریشن یا مستری وغیرہ تھے۔

دوسرے روز سے شو شروع ہو گیا۔ وہی مصروفیت، وہی گہما گہمی، شور شرابہ۔ وائٹ کمیونٹی بہت ذوق شوق سے آتی تھی۔ تمام آرٹیکل بھی شوق سے دیکھے جاتے۔ Very Good, Very Fine, Will Come back کہہ کر چلے جاتے اور پھر کبھی واپس نہ آتے۔

ایشین کمیونٹی شوق سے آتی اور خریداری بھی کرتی۔ یہ ایک درمیانے درجے کا ملکی شو تھا جو صرف سات دن کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ ہمارے پاس ان گنت آئٹم تھے اور زیادہ تر خواتین کے من پسند تھے اس لئے ہمارے پاس بہت رش ہوتا تھا۔ ہماری میزبان بھی ہماری مدد کے لیے آ جاتی تھیں جو وزٹرز پر کڑی نظر رکھتی تھیں۔ اس لئے ہم 99% چوری چکاری اور اچکوں سے بچ گئے۔ شو کے ساتھ ہی Iglo ٹائپ ایک ڈانس کلب بنایا گیا تھا جس میں شہر کی لڑکیاں اور لڑکے آ کر اپنی فرسٹیشن مٹاتے۔ بس نقصان یہ ہوتا جیسے ہی ڈانس کا راونڈ شروع ہونے کی گھنٹی بجتی تمام سٹال وزٹر بھاگ کر اوگلو میں چلے جاتے اور پھر کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ بے ہنگم موسیقی، چیخنا چلانا۔ مجھے سب پاگل ہی لگتے تھے۔ یہ پاگل پن ہی تو ہے۔ مدہوشی میں نہ لباس کا ہوش، نہ تن کا ہوش۔ گلے میں سے ایسی آوازیں نکالتے تھے جیسے لگڑ بگے جنگل میں مردار کھاتے ہوئے نکالتے ہیں۔ یہ کون سا کلچر متعارف کرانے کی سعی کر رہے تھے۔ چلو اگر اس کو آپ ڈانس کیٹگری کی نظر سے دیکھیں تو راک اینڈ رول، رمبا سمبا، چاچا، ٹوسٹ یا کپسل ڈانس۔ یہ سب ہمارے وطن میں بھی بہت مقبول تھے اور Argentine Tango, Ballet, Tap Dance Waltz, Swing, Salsa, Rund. Hip-Hop Donve, cha cha, Sumba, Fox trot, modern dance, Jaz Dance Breuk Dance, Polka, paso Doble, Mambo, Jive, Foek Dance and ouicks Dance مندرجہ بالا سٹائل اور طرز کے علاوہ بھی دنیا جہان میں بے شمار طرزِ ڈانس موجود ہیں۔ میں نے صرف وہ نام لکھے ہیں جن کی bollywood بھارت میں چربہ سازی کی گئی۔ مقبولیت حاصل کرنے کے لیے آئٹم سانگ کے نام پر ڈانسر اداکاراؤں کے کپڑے اتروا کر ان کو ڈانس کی مقبولیت کا ذریعہ بنایا گیا۔ جس میں بھارت بہت کامیاب بھی رہا۔ مگر یہاں تو پاگل پن کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ میں نے اس کو پاگلوں کا رقص قرار دیکر اپنی ٹیم ممبران کے ادھر جانے پر پابندی لگا دی۔

آج ہمارے شو کا آخری دن تھا۔شام کو تمام پیکنگ مکمل کر کے سامان ویگن والے کے سپرد کر دیا گیا۔کار کی سروس اور دیگر غذائی ضروریات پوری کرنے کے بعد اس کے پاپی پیٹ کو ایندھن سے بھر دیا گیا۔آج رات جولی باجی کی سہیلی کی طرف سے ڈنر تھا۔سب لوگ موجود تھے۔میں نے کھڑے ہو کر تمام خواتین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور برملا کہا کہ اگر کوئی مرد میزبان ہوتا ''چاہے میں خود ہی کیوں نہ ہوتا'' تو شاید اس طرح خیال نہ رکھ پاتا جس طرح آپ خواتین نے ہمارا خیال رکھا۔پر تکلف مزیدار، ذائقہ دار، گھر کا حلال اور پاکیزہ کھانا، تین وقت آن ٹائم ہمیں پہنچایا۔ہم اس کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرنا بھی چاہیں تو نہیں کر سکتے۔کیونکہ وہ الفاظ ابھی ادب میں ایجاد ہی نہیں ہوئے جن کا سہارا لیتے ہوئے ہم یہ جسارت کریں۔میں نے مزید کہا کہ آپ ہرگز یہ خیال دل میں نہ لائیں کہ یہ سب میں زمانہ سازی اور رسماً کہہ رہا ہوں۔نہیں ہرگز نہیں۔کیونکہ میں خود بھی یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔آپ کی خدمات جتنی بڑی ہیں اتنے ہی میرے الفاظ چھوٹے ہیں، میں صرف جزاک اللہ خیر احسان الجزا ضرور کہوں گا اور آپ کی دعاؤں کا طالب رہوں گا۔

میرے ان الفاظ کے جواب میں ایک خاتون نے کھڑے ہو کر صرف یہ کہا You are going for good and this is not fair.۔اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔جولی باجی نے ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دعوتِ طعام دی۔رات 11/12 بجے تک محفل بہت گرما گرم رہی۔محفل برخاست کرنے کی میں نے درخواست کی تو جولی باجی بولی جیسا کہ آپ ابھی فرما رہے تھے کہ ہم صبح بہت جلد نکل جائیں گے تو ایسے طوطا چشم تو نہ بنو۔صبح سات بجے ناشتہ تیار ہوگا۔آپ گیسٹ ہاؤس سے سیدھے یہاں تشریف لائیں گے۔ناشتہ کریں اور ہم سب آپ کو اللہ حافظ و ناصر کہیں گے۔ان کی سابقہ بہترین سروسز، مخلص پن اور عزت احترام کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں انکار کر سکتا۔میں کیا کوئی بھی انسان انکار نہ کر سکتا تھا۔میں نے صرف جولی باجی کو "Yes Boss" کہا۔جس سے وہ بہت خوش ہوئی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ناشتہ کرنے کے بعد ہم عازمِ سفر ہوئے۔صرف خواتین کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر مجھے تکلیف ہوئی۔جانا تو سب نے ہی ہوتا ہے۔مہمان، شادی کے بعد اولاد، بہن بھائی جب وہ اپنے گھر والے ہو جائیں، دوست احباب، غرض یہ کہ ہر آنے والے کو جانا ضرور ہوتا ہے، اُداسی، پیار، محبت، عزت، احترام۔یہ سب اشرف المخلوقات کے جذبے ہیں جو اس کو دوسری مخلوق سے افضل بناتے ہیں۔جو روح بھی مالک و خالق دنیا میں بھیجتے ہیں اس کا بھی ٹائم مقرر ہے اور اپنے مقرر کردہ ٹائم پر اس نے عالمِ ارواح میں لازمی طور پر واپس چلے جانا ہے۔یہ انسانی جسم دنیاوی مٹی سے پروان پاتا ہے اور واپس اسی مٹی میں مل کر مٹی ہو جاتا ہے۔جانے والے کے لواحقین جتنا بھی روئیں، چیخیں چلائیں، شور مچائیں یا جو بھی جتن کریں، بحکمِ ربی جانے والے نے جانا ہی ہے۔یہ امر ہے۔تمام دن سفر کرتے

ہوئے ہم چھ گھنٹے کے بعد تین بجے او کلے کورٹ میں آف لوڈ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کو فون کیا تو انہوں نے کہا آپ لوگ فوراً گیبرون آئیں۔آپ کو جو ہانسبرگ بھیجا تھا، آپ پیٹرز برگ کیا لینے گئے تھے۔میں انہیں بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم نے پیٹرز برگ میں اتنی سیل کی ہے اور اب ہم جو ہانسبرگ واپس آ چکے ہیں۔کچھ پارٹیوں سے دیے ہوئے سامان کی Payment لینی ہیں۔ایک دو روز میں ہم گیبرون واپس آ جائیں گے۔مگر وہ میری بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔جیسے میں ان کا Subordinate ہوتا ہوں۔میں نے انہیں باور کروادیا محترم ڈاکٹر صاحب میں آپ کا ماتحت نہیں ہوں۔آئندہ بھولے سے بھی میرے ساتھ اس لہجے میں بات نہ کریں ورنہ ردعمل کے آپ خود ذمہ دار ہونگے۔یہ ہمیشہ آپ یاد رکھیں۔میں نے انہیں مزید کہا کہ میں حسن نانک کو نہیں جانتا۔آپ میرے بیس ہزار ڈالرز کا بندوبست کر کے رکھیں۔مجھے آتے ہی مل جانے چاہیئں۔جب میں مناسب خیال کرونگا، آجاؤنگا۔دراصل ہمیں جو ہانسبرگ میں ابھی ایک ہفتہ اور رکنا تھا کیونکہ ہم نے دکانداروں سے وصولی کرنی تھی۔

دوسرے روز فرسٹ لیڈی کا فون آ گیا۔اس نے بتایا کہ گیبرون میں افریقن عورتوں کے مسائل پر ایک سیمینار ہونا ہے جس کی چیئر پرسن میں ہوں۔میں نے یہ پروجیکٹ صرف تمہاری وجہ سے چیئر کرنا قبول کیا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ابھی چند روز ہم قیام کریں گے اور تمام Payment وصول کر کے گیبرون جائیں گے تو بہت خوش ہوئی۔بولی میں اپنا تمام پروگرام تمہیں Fax کر رہی ہوں۔تم اپنی واپسی اس پروگرام کے تحت کرلو اور دیگر لوگوں کو اپنی کار میں روانہ کردو۔میں تمہیں خود او کلے کورٹ سے لے لوں گی۔یہ ایک بہت اچھی آفر تھی کیونکہ فرسٹ لیڈی کے پاس Latest Model کی مرسیڈیز کار تھی اور وہ خود ڈرائیو کرتی تھی۔میں نے تمام پروگرام OK کر دیا اور اپنے کاروباری معاملات نبٹانے شروع کر دیے۔

اب میں اپنے قارئین کو کچھ پیٹرز برگ کے حالات سے آگاہ کردوں۔

پیٹرز برگ اس کا پرانا نام ہے۔جب ہم وہاں گئے تھے تو اس کا نام پیٹرز برگ تھا لیکن آج کل اس کا نام بدل کر Polokwana رکھ دیا گیا ہے۔یہ ایک افریقن زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''امن کی جگہ''۔یہ شہر 1886 سے لے کر 2002 تک پیٹرز برگ کے نام سے ساؤتھ افریقہ کے نقشے پر دیکھا جا سکتا ہے۔یہ صوبہ Lim popo کا صوبائی دارالخلافہ ہے۔Voortrekkers جو کہ Afrikaans کا بانی تھا اس نے 1884 میں اس شہر کی زمین ایک مقامی کاشتکار سے خرید کر 1886 میں اس شہر کی بنیاد رکھی۔اور Boer General جس کا نام Joubert تھا اور وہ ایک "Priest" (مذہبی آدمی۔تبلیغ کرنے والا) تھا۔

1899 کی ساؤتھ افریقن جنگ میں یہ شہر TransVaal اور Orange free state کا عارضی

دارالخلافہ بھی رہا تھا اور آج تک تجارتی سنٹر ہے ۔اس کی پیداوار میں آلو، ادرک، مکئی، مونگ پھلی، (Sorghum) جوار Stevia (Alfalfa)، ہر قسم کا فروٹ، Groundnuts اور ساوتھ افریقہ کے مشہور ترین مویشی Finest Cattle ranehes ۔یہاں کی مشہور ترین یونیورسٹی The University of Limpopo شہر کے مشرق میں 23km کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر ایجوکیشن سینٹر کہلاتا ہے۔ جہاں تک انڈسٹری کا تعلق ہے وہ بھی اس شہر میں رواں دواں ہے۔ یہاں پر گوشت Processed، Arbestos (Jim & Jewesl) Coreendum Dairy Products, Fruit Juices, Mineral water. اور Candy بنانے کے پلانٹس کام کر رہے ہیں۔جس سے لوگوں کے روزگار کا مسئلہ بھی حل ہو رہا ہے۔

دن گزرتے گئے اور ہم اب جوہانسبرگ کی طرف رواں دواں تھے۔ دیگر لوگ پہلے جا چکے تھے۔ میں اور فرسٹ لیڈی پرانے روٹ کو چھوڑ کر کسی دوسرے روٹ سے جا رہے تھے جس کا مجھے علم نہ تھا۔سفر خوشگوار تھا۔فرسٹ لیڈی نہ صرف اچھی ڈرائیور تھی بلکہ پرمزاح خاتون تھی۔ سوفٹ اور عاجزی سے بولتی تھی۔ کوآپریٹو تھی۔ ڈرائیونگ تحمل سے کر رہی تھی۔ہم 5 بجے کے قریب Gaborone Sun Hotel پہنچ گئے ۔فرسٹ لیڈی نے وہاں قیام کرنا تھا۔ ہوٹل سے ہی میں نے عمران احمد کو فون کیا کہ مجھے آ کر لے جاؤ۔ ہوٹل میں فرسٹ لیڈی کا سٹاف پہنچ چکا تھا۔ جب تک عمران مجھے آ کر لے نہیں گیا وہ میری آنر میں کھڑی رہی۔

دوسرے روز بچا ہوا تمام سامان ویئر ہاؤس میں سجا دیا گیا اور کام شروع کر دیا گیا۔ میں روزانہ کی بنیاد پر 20 ہزار ڈالر کا مطالبہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ کچھ میں نے وصول بھی کر لئے تھے۔ڈاکٹر صاحب اور عمران مجھ سے بہت تنگ تھے۔ میرا خیال ہے کہ عمران، ڈاکٹر صاحب کا مخبر بنا ہوا تھا کیونکہ دونوں ہی بے حد کمزور شخصیت تھے اور خاندانی لحاظ سے بھی معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ اس لئے خفیہ سازش میں مصروف رہے۔عمران نے تمام رپورٹس ڈاکٹر صاحب کو دیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو مستقبل کے رنگین لالچ دکھائے اور مجھے پاکستان واپس بھجوانے کا عندیہ بھی اسے سنا دیا۔ڈاکٹر صاحب نے رحمان صاحب کو لاہور فون کر کے بتایا کہ اگر بزنس چلانا ہے تو ادریس کو فوراً واپس بلوائیں ۔میں لڑکوں کی تربیت کر رہا ہوں۔ ادریس سب سے بڑی رکاوٹ ہے ۔رحمان صاحب نے بغیر سوچے سمجھے مجھے فون کر دیا اور کہا کہ آپ کچھ عرصہ کے لیے واپس آ جائیں، لڑکے آپ سے گھبراتے ہیں اور کام صحیح طور پر نہیں کر سکتے۔ میں نے ان کو اپنے بیس ہزار ڈالر کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور کہا کوئی بات نہیں۔رقم کا کیا ہے وہ تو آ ہی جائے گی۔ یہ میری ذاتی رقم تھی اس لئے انہوں نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔

اب عمران اور ڈاکٹر صاحب کے پوشیدہ گُن ظاہر ہونے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ جو کام میں عبادت سمجھ کر

رہا تھا میری دلچسپی اس میں بے حد کم ہوتی جا رہی ہے۔ میں نے ڈالرز کا مطالبہ تیز کر دیا اور کہا جب تک تم لوگ میری رقم ادا نہیں کرتے میرے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے سختی کرنے کی وجہ سے مجھے کچھ نہ کچھ رقم ملنے لگ گئی اور آہستہ آہستہ میں تمام رقم وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اصل ڈالر کہاں گئے، کون لے گیا، کس کام آئے، امانت خرچ کیوں کی گئی؟ جب ان باتوں کا جواب مانگا تو ادریس جملہ نقائص کا مجموعہ بن گیا۔ میں نے اپنی ائر Booking گیبرون۔ جوہانسبرگ۔ ماریشس۔ دوبئی۔ کراچی کروالی تھی۔ دوبئی تک ساؤتھ افریقن ائر لائن اور دوبئی سے کراچی لفتھانزہ ائر لائن نے کنفرم کر کے مجھے Fax کر دیا۔

میں نے فرسٹ لیڈی کی نور جہاں ریسٹورنٹ میں دعوت کی اور پورے پروٹوکول کے ساتھ جوہانسبرگ کے لیے اس کو روانہ کر دیا۔ پھر امتیاز بھائی کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ میں واپس پاکستان جا رہا ہوں۔ وہ بہت حیران ہوئے۔ بولے اتنی جلدی۔ ساؤتھ افریقہ میں ہمارے ساتھ سب سے زیادہ تعاون امتیاز بھائی نے کیا جس کے لیے میں ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کر سکتا تھا میں نے کیا۔ پھر میں بینک اپنی دوست کے پاس گیا۔ وہ مجھے اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بولی میں اکثر آپ کا پتہ کرتی رہی ہوں، مگر ویئر ہاؤس بند دیکھ کر واپس آ جاتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ میرے اکاؤنٹ پر آبزرویشن لگا دو کہ مسٹر ادریس ملک سے باہر ہیں اس لئے ان کے واپس آنے تک ایڈوانس کی سہولت معطل کی جاتی ہے۔ اس نے مجھے دکھایا کہ جو ایک ملین کی منظوری وہ میری Face-value پر لے کر آئی تھی وہ اس نے میرے اکاؤنٹ میں مارک کی ہوئی تھی۔ وہ میری اس کارروائی پر بہت disappoint ہوئی۔ وہ بولی مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے؟ میں نے اس کو تمام باتیں صاف صاف بتا دیں اور مزید کہا کہ یہ ایک بڑی Amount ہے اور تمہاری محبت ہے کہ تم نے مجھ پر اعتبار کیا۔ میں اپنی ذات کے لیے تو آپ کو یقین دلا سکتا ہوں لیکن دیگر کسی بھی شخص پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ میں پاکستان جا رہا ہوں۔ وہ بولی اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ بینک کے کچھ آفیشلز آ رہے ہیں۔ آج ڈنر اکٹھے کریں گے کل تم نے چلے جانا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ ہر حالت میں ایڈوانس کی سہولت معطل رہنی چاہیے۔ وہ بولی اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں بینک سے باہر نکل آیا۔

آج ڈاکٹر صاحب ملنے آئے تو میں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے روز عمران وغیرہ مجھے ائر پورٹ پر چھوڑنے آئے تو ڈاکٹر صاحب بھی ائر پورٹ پر موجود تھے۔ مجھے کہنے لگے کہ میں آپ کو اللہ حافظ کہنے آیا ہوں۔ میں نے کہا اس کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔ وہ بولے آپ سفر پر جا رہے ہیں غصہ نہ کریں اور بات کو ختم کریں۔ میں کوئی جواب دیے بغیر لاؤنج کی طرف چلا گیا اور مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔

اپنے عرصہ قیام کے دوران جو کچھ اور جتنا بھی میں اس ملک بوٹسوانہ کے بارے میں جان سکا وہ مندرجہ ذیل

ہے۔ یہ ایک Land Locked ملک ہے (اس کو سمندر نہیں لگتا) ۔اس کے ہمسایہ ممالک میں Angola, South Africa, Zambia, Zimbabwe, اور Namibia ہیں۔کل رقبہ 5,82000 km ہے اور آبادی پندرہ لاکھ کے قریب ہے۔دارالخلافہ گیبرون ہے، جس کا ذکر اس باب میں کئی جگہ پر آیا ہے۔دیگر شہروں کے نام کچھ اس طرح سے ہیں۔

Ramatiabama, Mochudi, Mahalapye, Palapye, Selebi Phikwe, Francis Twon, Bakaranga, Kazngula, Mamuho, Lobaste, Malepolole, Kanye, Serole, Serule اس کے علاوہ اور شہر بھی ہیں مجھے اتنے ہی نام یاد رہ سکے۔

بوٹسوانہ Nickel، Copper اور Diamond پیدا کرنے والا ملک ہے۔جس کی وجہ سے اس کی اکانومی (Economy) بہت اچھی ہے اور تیزی سے ترقی کرتا ہوا ملک ہے۔اس کے تین شہر Diamond mines کی وجہ مشہور ہیں جن کے نام بالترتیب مندرجہ ذیل ہیں۔ Orapa, Letlha kane, Jwaneng جبکہ Copper اور Nickel, Selebi- Phikwe کے علاقے سے نکالا جاتا ہے۔Livestock دنیا کا 50% بوٹسوانہ کے پاس ہے۔.Botswana Meat Commission مسلمانوں کے زیرنگرانی دنیا کے اکثر ملکوں کو حلال گوشت ایکسپورٹ کرتا ہے۔بوٹسوانہ واحد افریقن ملک ہے جو EEC کو بھی گوشت ایکسپورٹ کرتا ہے۔اپنی ضرورت کی 80% امپورٹ ساؤتھ افریقہ سے کرتا ہے۔1980 سے آج تک نظامِ تعلیم فری ایجوکیشن پر یقین رکھتا ہے۔بوٹسوانہ کے مشہور نیشنل پارکس میں شامل ہیں:

1- Chobe National Park 2- Moremi wild Life Reserve

3- The Okavongo Delta 4- Central Kalhari Games Reserve.

5- Nxai pan nat: park. 6- Makga Dik Gadi pont games reserve

7- Khutse games Reserve.

بوٹسوانہ کی سرکاری زبان انگلش ہے جبکہ نیشنل Setswana۔مسلمان اقلیت میں ہیں، عیسائی اکثریت میں ہیں، دیگر Traditional Believer بھی ہیں۔جنگل میں جڑی بوٹیوں سے علاج کرنے والا، جادوٹونہ کرنے والا، روایتی مذہب کا پیروکار اور مبلغ ''ماروتی'' کہلواتا ہے۔روایتی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد بھی بہت ہے۔اس ملک کا بہت بڑا حصہ کالاہاری ڈیزرٹ پر محیط ہے اور جنگلی حیات سے مالا مال ہے۔

آپ کو گوجرانوالہ کے ایک خان صاحب کا زندہ جاوید قصہ سناتا ہوں۔آپ اس کو لطیفہ، قصہ، واقعہ یا دماغ کی خرابی بھی کہہ سکتے ہیں۔خان صاحب موصوف عرصہ دراز سے گیبرون میں مقیم ہیں۔ایکسیڈنٹ شدہ کاریں،

جیپیں اور دیگر وہیکل اونے پونے خرید کر، بمپر تا بمپر ری بلڈ کر کے، ان کو نئی گاڑی کی طرح بنا کر فروخت کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ اولاد اللہ تعالیٰ نے عطا نہیں کی۔ ایک کے بعد دوسری بیوی آتی جاتی رہتی ہے۔ خوشحالی خان صاحب کی عاشق ہے۔ شکار کے بہت رسیا اور چھوٹے بڑے شکار کا نہ صرف لائسنس رکھتے ہیں بلکہ پوری ٹیم اور شکار کے لیے کار آمد گاڑیوں کا fleet بھی ان کے پاس موجود ہے۔ میری ان سے اچھی خاصی ہیلو ہائے تھی۔ میں نے ان سے کہا جب آپ شکار پر جائیں تو مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ وہ بولے یہ بہت جی داری کا کام ہے۔ کمزور دل اور بزدل آدمی کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ میں نے ان کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا کہ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ وہ مجھے کہنے لگے اگلے ویک اینڈ پر شکار کا پروگرام فائنل ہے۔ آپ تیاری رکھنا، کالا ہار جانا ہے۔ میں نے کہا کالا ہار کا نام لے کر مجھے ڈراؤنہ۔ میں انشاءاللہ تمہارے ساتھ ضرور جاؤں گا۔ وہ بولے اگر ایک بات کہوں بُرا تو نہیں مناؤ گے۔ میں نے کہا خان بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔ وہ بولا آپ کا کس قوم یا برادری سے تعلق ہے؟ میں نے کہا میں بھی پٹھان ہوں۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پین میز پر گر گیا اور بولا (تسی کیہڑے پٹھان ہو) آپ کون سے پٹھان ہیں؟ میں نے کہا ''ککے زئی پٹھان''۔ وہ حیران پریشان بولا آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔ میں نے کہا اس میں بتانے والی کون سی بات ہے۔ وہ ذرا چیخ کر بولا بھائی جان یہ بات بتانے والی ہے۔ کیونکہ ایک ککے زئی بھائی ہمارے پاس ہے اور ہمیں پتہ ہی نہیں۔ میں سمجھ گیا کہ خان صاحب کا تعلق گوجرانوالہ کی ککے زئی برادری سے ہے۔ میں نے خان صاحب سے جانے کی اجازت مانگی تو No کہہ کر بولے آپ ڈاکٹر صاحب کے بھائی کس طرح ہو گئے۔ میں انہیں بتایا کہ وہ احتراماً مجھے بھائی جان کہتے ہیں ورنہ میرا ان سے خونی رشتہ نہیں ہے۔ آج آپ نے ہماری بہت بڑی پریشانی دور کر دی۔ انہوں نے لنچ مجھے اپنے ساتھ کروایا اور پھر جانے کی اجازت دی۔ ساتھ ہی بتایا کہ میں خود آپ کو صبح چار بجے لینے آؤنگا۔ شکار کا پروگرام اور آپ کی شمولیت پکی ہوگئی۔ واقعی وہ ٹھیک ٹائم پر کال بیل پر ہاتھ رکھ کر اٹھانا بھول گئے۔ میں بھی ایک چھوٹے سے بیگ میں ضرورت کی چیزیں ڈال کر ان کی گاڑی میں جا بیٹھا اور ہمارا سفر شروع ہوگیا۔ میں قارئین کرام کو روایتی شکار کی کہانی بیان کر کے بے مزہ نہیں کرونگا۔ صرف ایک واقعہ بیان کرونگا جو کہ آپ کے لئے نیا ہوگا۔

جنگل میں ایک Puma نظر آیا۔ اس کو عرف عام میں کالا چیتا بھی کہتے ہیں۔ خان صاحب خود ڈرائیو کر رہے تھے اور ساتھ ان کی پوری ٹیم تھی جو سات مقامی افریقن آدمیوں اور ایک گائیڈ پر مشتمل تھی۔ کیمپ میں بھی کچھ سٹاف تھا جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ خان صاحب کے پاس Holland & Holland گن تھی۔ اس کے سٹاف ممبران کے پاس بھی گنیں تھیں۔ Puma بھاگ رہا تھا۔ فورویلر اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ سپیڈو میٹر کی سوئی 115 کلومیٹر فی گھنٹہ کے ہندسے پر کھڑی کانپ رہی تھی۔ Puma اور جیپ ساتھ ساتھ تھے۔

افریقن سٹاف نے جال کئی بار Puma پر پھینکا۔وہ ہر بار جُل دے جاتا۔ادھر مشین بھاگ رہی تھی جس میں ایندھن بھرا ہوا تھا دوسری طرف ایک گوشت پوست کی جنگلی حیات بھاگ رہی تھی۔خونخواری ایک طرف پاپی پیٹ ایک طرف۔جانور کی رفتار کم ہونے لگی۔جنگلیوں نے جال ٹھیک نشانے پر پھینکا اور جنگلی پکڑا گیا۔اب جیپ بھی رک گئی۔فاتح اپنے جاہ جلال کے ساتھ جیپ سے اترا۔درباری بھی اترے اور گنیں تان کر کھڑے ہو گئے۔خانِ اعظم بڑی تمکنت کے ساتھ چلتے ہوئے قید Puma کے پاس پہنچے جو زمین پر پڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔خان صاحب نے آؤ دیکھا اور نہ تاؤ دیکھا دو تین بہت زوردار تھپڑ Puma کے جڑ کر بولے:

You Bloody Tiger, Always Remember that, you met a khan in Kalahar.

ساتھ ہی جا کر اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئے اور Puma کی رہائی کا حکم صادر فرما دیا۔تمام لوگ اپنی گاڑیوں میں سوار ہو گئے۔انہوں نے رسی کچھ اس طرح سے کھینچی کہ جانور آزاد ہو گیا اور کچھ اس انداز اور رفتار سے بھاگا کہ پرواز کرتا ہوا محسوس ہوا۔خان صاحب نے بڑے انداز سے میری طرف دیکھا اور بولے کیوں خان صاحب مزا آیا۔میں نے کہا خان صاحب اگر ہتھ جوڑی چیتے کو آزاد کر کے کی جاتی تو بہت مزا آتا۔وہ ہنستے ہوئے بولے (تُسی تے مخول بوت کر دے او) آپ مذاق بہت کرتے ہیں۔شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے کیمپ میں واپس آ گئے۔دو شکار شدہ ہرن باورچی کے حوالے کئے جو بہت مہارت رکھتا تھا۔اس نے ہرن کے گوشت سے 4/5 الگ الگ ذائقے والی ڈشیں بنائیں۔افریقن سٹاف ممبر ہرن کو آگ پر بھون کر ایسے کھا گئے جیسے چیتا شکار کر کے ہرن کی ہڈیاں تک چٹخا کر کھا جاتا ہے۔جب خان صاحب نے رات کو ناؤ نوش کی محفل گرم کی تو میرے علاوہ سب مدہوش تھے۔میں سوچ رہا تھا کہ اگر چیتا اپنے ساتھیوں سمیت اس وقت واپس آ جائے تو جیسے انہوں نے ہرن کی ہڈیاں تک چٹخائی ہیں ،اسی طرح وہ ان کی ہڈیاں بھی چٹخا سکتا ہے۔میری زندگی کا یہ انوکھا تجربہ تھا۔دو دن بعد ہم واپس گیبرون آ گئے۔

واپسی کا سفر شروع ہوا۔لاؤنج صاف ستھرا تھا اور زیادہ رش بھی نہ تھا۔میں سوچ بچار میں گم بیٹھا ڈاکٹر مکرم،حسن نانک اور عمران کی ذہنیت اور شخصیت کی ضرب تقسیم کر رہا تھا۔ایک نئے ملک ماریشس جانے اور اس کو Explore کرنے کی خوشی بھی محسوس کر رہا تھا۔سب سے بڑی خوشی جس کا کوئی متبادل ہی نہ تھا اور نہ ہے اور نہ کبھی ہوگا،وہ خوشی اپنے گھر،اپنے بچوں اور اپنی اہلیہ محترمہ کے پاس عرصہ دراز کے بعد جانا تھا۔اس لئے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ فکر نہ کرو تم گھاٹے میں نہیں ہو،ان ہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ فلائٹ اناؤنس ہو گئی،تمام مراحل سے گزرتا ہوا جہاز میں سوار ہو گیا،موسم اچھا تھا فلائٹ بھی ہموار تھی،پتہ ہی نہ چلا کب جوہانسبرگ کے ائرپورٹ پر جہاز لینڈ کر گیا۔

اپنے اپنے دائرے میں دیکھ لو
حسبِ طاقت ہر کوئی فرعون ہے

باب 7: ماریشس (Mauritius ء1992)

ہجر لازم ہے تو..... پھر وصل کا وعدہ کیسا
عشق تو عشق ہے کم کیسا ..... زیادہ کیسا

ماریشس

(Mauritius)

جوہانسبرگ انٹرنیشنل ائرپورٹ کے ٹرانزٹ لاؤنج میں انتظار کے کرب آمیز لمحے گزار رہا تھا کہ ماریشس کے لیے ساؤتھ افریقن ائرلائن کی پرواز اناؤنس ہوگئی۔ میں اپنے متعلقہ گیٹ کے عین سامنے ہی بیٹھا تھا۔ اُٹھ کر جہاز میں چلا گیا۔ جبکہ لوگ ابھی لائن میں کھڑے ہونا شروع ہی ہوئے تھے۔ سفید چمڑی والی ایک درمیانی سی عمر کی ائرہوسٹس نے دیدے نچاتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں نے اپنا بورڈنگ کارڈ اس کے سامنے لہرایا۔ بورڈنگ کارڈ پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے اس نے دائیں طرف ایک سیٹ کی طرف بڑی بے رخی سے اشارہ کر دیا۔ میں نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے آہستہ سے Thank You Aunt کہہ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے گھور گھور کر دیکھتی رہی اور میں اس کی نقل کرتے ہوئے دیدے نچاتا رہا۔ جہاز آہستہ آہستہ مسافروں سے بھر گیا۔ دیگر ائرسٹاف کی خواتین بھی عمرِ عزیز کی نہ صرف بہت ساری بہاریں چکھ چکی تھیں۔ بلکہ بہاریں اب خزاں کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ جن کے نمایاں آثار ظاہر ہو کر آثار قدیمہ کا پتہ دے رہے تھے۔ ہم ٹھہرے ماہر آثار قدیمہ، اس لئے میری دلچسپی قدرتی طور پر نمایاں تھی۔ عمارتِ عظیم کی خوبصورتی کا اندازہ موجودہ شکست و ریخت کے باوجود کیا جاسکتا تھا۔ گنبدوں "Doms" کی اونچائی، گولائی اور رنگ وروغن پر محنت کر کے ان کو نمایاں کرنے کی کوشش تو کی گئی تھی مگر قدرت کا مقابلہ تو کیا ہی نہیں جاسکتا۔ کیونکہ ہر چیز کا مقدر فنا ہے۔ باقی نام صرف اور صرف مالک اور خالق کا رہے گا۔

اس عمر میں زوال کی طرف بڑھتے ہوئے قدم اور گھٹتا ہوا حُسن شباب۔ زندہ دلی وخوش مزاجی اور سنہرے خواب کہاں نصیب ہوتے ہیں۔ سنہری خواب دکھا کر بلوری پیمانے توڑنے والے شکاری تو کسی اور جنگل میں شکار کھیلنے نکل گئے ہونگے۔ لہٰذا خوش مزاجی اب کہاں سے آئیگی اور سزا بیچارے پردیسی غریب الوطن بھگتیں گے۔ میں بھی بھگت رہا تھا۔ شراب کے علاوہ مہمان نوازی بھی برائے نام تھی۔ مہمان نوازی کا ایک انداز تو بہت ہی پیارا ہے جیسے: ہائے اللہ آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔ پلیز کچھ تو پسند فرمائیں۔ یہ والی ڈش لے لیں۔ یہ مجھے بھی بہت پسند ہے وغیرہ۔ دوسرا انداز جو اس جہاز کے سٹاف نے اپنایا ہوا تھا "یہ کھانا پڑا ہے کھا مر لینا نہیں تو بھاڑ میں جاؤ"۔ بس اسی کھینچا تانی میں سٹاف نے Disembarkation Card مسافروں میں تقسیم کرنا شروع کر دیے۔ جس کا مطلب تھا کہ منزل آیا ہی چاہتی ہے۔ کارڈ کی خانہ پری کرتے ہوئے نظر ایک لال رنگ سے پرنٹ لئے گئے نوٹس پر پڑی۔ جس پر لکھا تھا اگر کسی بھی مسافر سے منشیات برآمد ہوئی تو اس کی سزا موت ہے۔ فوراً ہی میرے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا کہ اگر ملکِ عزیز میں بھی یہ قانون رائج ہو جائے تو ہر سال وہ نوجوانانِ پاکستان بچ جائیں جو اس جان لیوا زہر کے عادی ہو کر نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں۔ پھر عرصہ دراز کے بعد سب کچھ گنوا کر ماں باپ، بہن بھائی کو دیوالیہ کر کے، عزتِ سادات نیلام کر کے، راہی ملک عدم ہو جاتے ہیں۔

زندگی کتنی بھی دکھی ہو عدم
جینے والوں کو پھر بھی پیاری

پرواز نارمل تھی، لینڈنگ بھی بہت عمدہ تھی۔ جب کھڑکی سے باہر دیکھا تو جہاز رن وے پر بھاگ رہا تھا۔ ائر پورٹ بہت بڑا نہیں تھا۔ قانون کی حکمرانی تھی۔ مسافروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جا رہا تھا۔ ماریشس قانون کے مطابق اُس وقت پاکستان پاسپورٹ ہولڈرز بغیر ویزا کے آسکتے تھے۔ جن کو ائر پورٹ پر انٹری لگا دی جاتی تھی۔ میرے پاسپورٹ پر بھی پندرہ روز کی انٹری لگا دی گئی۔ متعلقہ آفیسر نے اپنا نام قدرت اللہ بتایا اور الگ کاغذ پر اپنا فون نمبر لکھ کر دیا۔ مزید کہا اگر آپ کو کوئی بھی پرابلم پیش آئے تو مجھے آپ دیے گئے نمبر پر فون کر سکتے ہیں۔ یہ اس مسلمان شخص کی ایک مسلمان بھائی و پاکستان اور پاکستانیوں سے محبت کا بین ثبوت تھا۔ جیسے ہی میں باہر نکلا رشید مُولکن نامی ایک شخص میرے نام کا Placard لئے کھڑا تھا۔ جس کو گیبرون سے ہی بذریعہ فون اور پھر Fax کے ذریعے اطلاع دی گئی تھی۔ سلام دعا کے بعد سامان کار میں رکھ کر اس نے میرے لئے کار کا دروازہ کھولا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا بھائی صاحب کار میں تشریف رکھیں۔ میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا کار میں بیٹھ گیا اور وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ یہ ایک نیا تعمیر شدہ گھر تھا اس کے گھر میں اس کی اہلیہ محترمہ اور دیگر خواتین بھی تھیں۔ محبت، چاہت، عزت واحترام اور مہمان نوازی جاری وساری رہی۔

ماریشس کا دارالخلافہ پورٹ لوئیس ہے۔ اردو میں اسے موریطانیہ کہتے ہیں۔ یہ ایک جزیرہ نما ملک ہے۔ اس کا کل رقبہ تقریباً 1900 مربع کلومیٹر ہے اور یہ بحیرہ ہند میں واقع ہے۔ ماریشس چائے، خام چینی اور صاف شدہ چینی کا بڑا ایکسپورٹر ہے۔ آلو، پیاز اور تمباکو کی پیداوار بھی قابل ذکر ہے۔ مگر قابل کاشت رقبہ کے 90% حصے پر گنا کاشت کیا جاتا ہے۔ اس کی کرنسی کا نام روپیہ ہے۔ افریقہ میں per Capita Income سب سے زیادہ ماریشس کی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے تحت یہ خطہ زمین جس بھی استعماری قوت کے زیر تسلط رہا اس کو آباد کرنے کے لیے مزدور انہوں نے ہندوستان سے ہی منگوائے۔ نتیجے کے طور پر جتنے بھی ایشیائی نسل کے لوگ یہاں آباد ہیں یہ سب ان مزدوروں کی نسل سے ہیں۔ مقامی آبادی کالی نسل کے لوگوں کی تھی جو وقت کیساتھ ختم ہوتی گئی۔ مزدوروں اور مقامی خواتین کے جنسی اختلاط سے ایک نئی نسل نے جنم لیا جو ماریشس میں نمایاں ہے۔ آٹے میں نمک کے برابر کبھی کبھی نیم مردہ سا کوئی کالا نظر آجاتا تھا۔

دوسرے روز رشید مولکن مجھے اپنی کار میں شہر کا چکر لگوانے لے گیا۔ رشید مولکن نے مجھے 4/5 مسلم خاندانوں سے بھی ملوایا اور ان کو بڑے فخر سے بتایا دیکھو پاکستان سے میرے پاس مسلم بھائی بطور مہمان آیا ہے۔ سب لوگ

بہت حیران ہوئے اور پیار سے ملے ۔ ہر کسی نے کھانا آفر کیا۔ بعض خاندان تو بہت جذباتی بھی ہوئے اور مجبور کرنے لگے کے کم از کم ایک رات ہر مسلم فیملی کے گھر بطور مہمان قیام کروں، مگر یہ ممکن نہ تھا۔

ہم سارا دن پورٹ لوئیس گھومتے رہے۔ مارکیٹیں ،شاپنگ سینٹر، کپڑے کی اکثر دکانیں، لبنانی تارکین وطن کی تھیں۔ ان سے بزنس کی بات کی تو سب نے حسبِ حال توجہ سے بات سُنی بلکہ خوشی کا اظہار بھی کیا اور کہا انڈیا سے ہمیں نوے دن کے اُدھار پر ہر قسم کا کپڑا آتا ہے اگر آپ ایک سو بیس دن کے اُدھار پر مال سپلائی کریں تو ہم مسلمان بھائی ہونے کے ناطے آپ سے خریداری کرلیا کریں گے ۔ میں نے کہا ایک سو بیس دن کے بعد کی شرط (L.C) لیٹر آف کریڈٹ میں شامل کردیں گے۔ وہ بولے No آپ ہمیں اوپن کاغذات بھیجیں گے جس میں کوئی شرط نہیں ہوگی۔ Payment آپ کو ایک سو بیس دن کے بعد مل جایا کرے گی اور ساتھ ہی انہوں نے درجنوں تھان کپڑے کے کھول کر میرے سامنے رکھ دیے جو کوالٹی کے لحاظ سے بہت ہی کمتر کپڑا تھا۔ یہ لوگ زیادہ منافع کمانے کے چکر میں کم کوالٹی کا کپڑا امپورٹ کر کے لوگوں کو مہنگے داموں فروخت کر کے ان کا استحصال کر رہے تھے۔ جب میں نے اس کو ایک لیڈیز سوٹ دکھایا تو وہ تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر ساتھ ہی بولا کہ یہاں کے لوگوں کو اچھی کوالٹی کے کپڑوں کی تہذیب نہیں ہے۔ آپ کم سے کمتر کوالٹی میں بھی کپڑا بھیج سکتے ہیں۔ مگر شرائط وہی ہوں گی جو آپ کو بتادی گئی ہیں۔ میں اس کی اور اس جیسے دیگر دکانداروں کی باتیں سن کر بہت مایوس ہوا۔ تجربہ یہ ہوا کہ اگر اپنا شوروم کھول کر صرف پاکستانی، ہر قسم کے آئٹم، بہت اچھی کوالٹی میں لوگوں کو Introduce کروائے جائیں تو یہ ایک کامیاب بزنس ہوسکتا ہے۔ کپڑا، بیڈنگ، نقلی جیولری اور خواتین کی آرائش و زیبائش کے ہر قسم کے سامان کا بزنس ماریشس میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ میں مستقبل کے ایکسپورٹرز کی رہنمائی کرتے ہوئے یہ ضرور عرض کرونگا کہ وہ ادھار کی بنیاد پر کسی بھی ملک میں اپنا مال ایکسپورٹ نہ کریں۔ چاہے ان کو یقین دلانے والا باریش، حاجی، نمازی، فرشتہ صورت، مکہ مکرمہ سے ہی آیا ہوا ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اگر مکہ مکرمہ آنے جانے سے فرق پڑسکتا ہوتا تو ابوجہل تو رہتا ہی مکہ مکرمہ میں تھا۔ ہاں اگر نیت ٹھیک ہو تو پھر مکہ مکرمہ جانا بھی افضل ترین ہے اور نبی کریم ﷺ کا فرمان بھی ہے کہ کسی کو اس کی ظاہری شکل وصورت، نمازیں پڑھنے اور دیگر اعمال کی وجہ سے نیک مت جانو۔ جب تک کہ آپ نے اس کے ساتھ سفر نہ کیا ہو، لین دین نہ کیا ہو، اس کی ہمسایہ گیری نہ کی ہو اور اس کے ساتھ رشتہ داری نہ کی ہو۔ میں نے دیکھا کہ ایک طرف نہرو مارکیٹ کا نیون سائن لگا ہوا تھا اور اس کے بالمقابل جناح مارکیٹ کا نیون سائین بھی لگا ہوا تھا۔ یہ پورٹ لوئس کی مشہور مارکیٹیں ہیں۔ یہاں پر ہندو اور مسلمان برادرانہ ماحول میں رہتے ہیں ۔ Inter Religion Marriages کا رواج عام ہے اگر خاوند ہندو ہے تو بیوی مسلمان ہے اگر بیوی ہندو ہے تو خاوند مسلمان ہے۔ ''بچوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔''

میں آج تک جن ممالک میں بھی جا سکا، ان کے ڈاؤن ٹاؤن، گوشت سبزی فروٹ مارکیٹ، لیڈیز مارکیٹ ضرور وزٹ کرتا رہا۔ آج بھی میں اور رشید مولکن پورٹ لوئس کی مین مارکیٹ میں گھوم رہے تھے۔ یہ ایک بڑے ہال نما پرانی سی بلڈنگ تھی جو Colonial (نو آبادیاتی) دور کی یاد تازہ کروا رہی تھی۔ ہم مین گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ مارکیٹ کے اندر آدمی کے قد سے صرف ایک فٹ کم اونچائی کے لمبے لمبے پلیٹ فارم بنے ہوئے تھے۔ جس کے ایک طرف گوشت فروخت کرنے والے، اچھی کوالٹی کا گوشت، صاف ستھرے ماحول میں لے کر کسٹمر کا انتظار کر رہے تھے۔ اس پلیٹ فارم کے سامنے والے پلیٹ فارم پر Sea food والے انواع اقسام کی مچھلیاں اور آکٹوپس لے کر بیٹھے تھے۔ دوسری لائن میں ہر قسم کی سبزیاں خوبصورتی سے سجائی گئی تھیں۔ یہ بھی دوسرے ملکوں کی مارکیٹوں کی طرح ایک عام مارکیٹ تھی لیکن دو آئٹم اس مارکیٹ کو دنیا کی دوسری مارکیٹ سے منفرد کرتے تھے۔

(۱) ہم دونوں مٹن اور بیف کی دکان کو بغور دیکھتے ہوئے پوری مارکیٹ کا ایک چکر لگانا چاہتے تھے۔ میں نے رشید مولکن کو منع کیا تھا کہ جب تک ہم تمام مارکیٹ گھوم نہ لیں آپ نے گوشت سبزی کی خریداری نہیں کرنی۔ وہ میری رہنمائی کرتا گیا اور ہم دونوں مارکیٹ میں گھومتے رہے۔ ایک مٹن کی دکان پر میں رک گیا اور غور سے لٹکے ہوئے جانور کو دیکھتے ہوئے میں نے رشید مولکن سے پوچھا کہ کیا ماریشس میں قصاب ہرن کا گوشت فروخت کر سکتے ہیں؟ وہ بولا کہاں ہے ہرن کا گوشت؟ میں نے سامنے لٹکے ہوئے جانور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہرن ہے بکرا نہیں ہے۔ اس نے مقامی زبان میں قصاب سے پوچھا تو اس نے کہا یہ ہرن کا ہی گوشت ہے مگر اس شخص کو کیسے پتا چلا۔ یہ شخص کون ہے اور کس ملک سے آیا ہے۔ رشید مولکن نے قصاب کی تمام باتوں کا جواب دینے کے بعد مجھے بتایا کہ گورنمنٹ نے کچھ قصابوں کو ہرن کا گوشت فروخت کرنے کی اجازت دے رکھی ہے اور یہ لائسنس یافتہ ہیں۔ مگر وہ حیران ہے کہ آپ نے پہچانا کیسے۔ میں نے اسے بتایا کہ گوشت کی خشکی، ریشے کا نہ ہونا اور گوشت کی رنگت اور بناوٹ سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ ہرن کا گوشت ہے۔ ہم قصائی کو حیران ہوتا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

(۲) جہاں سبزیاں فروخت ہو رہی تھیں وہاں چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں سبز جڑی بوٹیاں پتوں، جڑوں، درختوں، چھوٹی چھوٹی لکڑیوں اور انواع و اقسام کے جنگلی پھلوں اور پھولوں کی شکل میں بہت خوبصورتی سے سجی ہوئی برائے فروخت تھیں۔ ہر جڑی بوٹی پر اس کے فوائد اور جس بیماری میں یہ کارآمد تھی کے چھوٹے چھوٹے بورڈ آویزاں کئے گئے تھے۔ بیماریوں میں جملہ امراض دل، کینسر، گنٹھیا، الرجی، درد گردہ، آشوب چشم و دیگر آنکھوں کی بیماریاں، بواسیر، معدے کی بیماریاں، دماغی و سینے و پیٹ کی بیماریاں اور دیگر تمام قسم کی بیماریوں کے نام لکھے ہوئے

تھے۔ان میں سے صرف ایک جڑی بوٹی کا مجھے تجربہ تھا جو لکڑی کی شکل میں تھی۔جس کا ذکر میں باب نمبر ۳ میں کر چکا ہوں۔ یہ بوٹی اور میرا تجربہ 100% کامیاب تھے۔باقی جڑی بوٹیوں کا مجھے تجربہ نہیں تھا۔البتہ جو دوائی میں نے گردے کی پتھری کی صورت میں گیبرون میں لی تھی۔وہ میں نے دکاندار سے خرید لی اور اپنے ساتھ پاکستان لے آیا۔ایک روز پتہ چلا کے بھائی محمد علی کے گردے میں پتھر پائے گئے ہیں۔تو میں نے ان کو پانی بنا کر پلایا جیسے مجھے پلایا گیا تھا۔ پھر کبھی ان کو گردے میں پتھری کی شکایت نہ ہوئی۔ بقایا لکڑی ایک دوست کے کام آئی۔دونوں ہی اس علاج کی وجہ سے روبہ صحت ہو گئے۔اس کے بعد ہم نہرو مارکیٹ اور جناح مارکیٹ گھومتے رہے۔دونوں مارکیٹیں پورٹ لوئس کی مین مارکیٹس ہیں جس کو ہندو، مسلمان دکاندار آپس میں اتفاق سے چلا رہے ہیں۔نہ ہندو مسلمان کا سوال اور نہ ہی مذہبی انتہا پسندی۔ گورنمنٹ میں بھی ساجھے داری ہے۔اگر صدر ہندو ہے تو مسلمان وزیراعظم ہے۔اور اگر مسلمان صدر ہے تو ہندو وزیراعظم ہے۔اسی طرح دیگر اختیارات بھی آبادی کی بنیاد پر تقسیم کئے گئے ہیں۔

ہم Sir, See woo Sagur Ramgoolam Botanical Gardens. دیکھنے گئے۔ یہاں پر ایام غلامی کی سمادھی بھی بنائی گئی ہے۔ یہاں مجھے رشید مولکن نے انناس بھی پیش کئے جو شیریں، خوش ذائقہ اور خوشبودار تھے۔ یہ ایک خوبصورت باغ تھا۔سیر و تفریح کے لیے خوبصورت جگہ تھی اور خاص طور پر Dating کے لیے آزاد اور ماڈرن گارڈن تھا۔ ماریشس مشرقی افریقہ کا ملک ہے۔ یہاں 70% لوگ انڈین نژاد ہیں جن میں بھوجاپوری، تامل، تلیگو، کیرالہ کے لوگ قابل ذکر ہیں۔Rodrigues, Creoles, Franco, Chinese نسل کے لوگ بہت کم ہیں۔ ہندو مذہب کے ماننے والے 52% ہیں۔ ماریشس 975ء میں عرب ملاحوں نے دریافت کیا تھا۔جنہوں نے اس سرزمین کو Dena Arabi کا نام دیا اس کے بعد 1507 میں Portuguese ملاحوں کی آماجگاہ رہا۔جنہوں نے اس جزیرے میں اپنی دلچسپی قائم رکھی۔

1598 میں Dutch (ولندیزی) ملاحوں نے اس پر قبضہ کرلیا اور 120 سال تک یہ ان کے قبضے میں رہا۔ 1710 to 1715 تک کی تگ و دو اور لڑائی کے بعد فرانس نے اس پر قبضہ کرلیا اور اس کا نام Islede France رکھ دیا۔1810ء میں اس جزیرے کی ناکہ بندی برطانوی استعمار کے ہاتھوں ہوئی۔آخر کار مجبور ہو کر فرانس نے اس جزیرے کو برطانیہ کے حوالے کر کے فرار کی راہ لی۔ اب ماریشس Rodrigues، Agalega، The Chagos Archipelago, Tromelin, St: Brandon اور Seychelles برٹش قبضہ میں آ گئے اور برٹش کالونی کے طور پر جانے جاتے تھے۔

آخر 1968 میں آزادی نصیب ہوئی اور 12 مارچ 1968ء یوم آزادی قرار پایا۔آزاد ماریشس کے پہلے

وزیراعظم Sir, See Woo Sagur Ram Goolam مقرر ہوئے اور Queen Eliazbeth II بطور ہیڈ آف اسٹیٹ ماریشس کی ملکہ قرار پائی۔ 12 مارچ 1992ء کو آزادی کے 24 سال بعد ماریشین ری پبلک قرار پایا۔ آخری گورنر جنرل Sir, Veerasamy Ringadoo ملک کا پہلا صدر بن گیا۔ مگر یہ سب عبوری بندوبست تھا اس کے بعد CasamUteem نے اس کو Replace کیا۔

ماریشس ایک Welfare State ہے جہاں گورنمنٹ اپنے ہر شہری کو Universal Health Care 100% فری فراہم کرتی ہے۔ تعلیم فری ہے۔ بوڑھے لوگوں، طلبہ اور معذوروں کے لیے سفری سہولت فری ہے ۔اگر آپ Global Peace Index دیکھیں تو ماریشس دنیا کا سب سے زیادہ امن پسند ملک ہے۔ انتظامی طور پر ماریشس کو 9 ڈسٹرکٹ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس میں ایک سٹی، چار ٹاؤن اور ایک سو تیس دیہات ہیں جن کے نام کچھ اس طرح سے ہیں۔

Fleaq, Grand Port, Moka, Pamplemousses, Plaines Wilhems,

Port Loceis, Riviere dee Rempart, Riviere Noire, Savanne

ہمارا دن ٹورازم کے دفتر سے رہنمائی لیتے ہوئے گزر گیا۔ رات کا کھانا ماریشس کے ایک مسلمان حبیب کے گھر تھا. جہاں اس نے اور مسلمان گھرانوں کو بھی بلوایا ہوا تھا۔ رشید مولکن نے بتایا کہ حبیب نمازی پرہیزگار انسان ہے۔ ہمیں جب بھی مذہبی رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے ہم سب اس کے پاس جاتے ہیں۔ سب مسلمان ہندو اور دیگر مذاہب کے لوگ اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ جب سے اس نے آپ کے بارے میں سُنا ہے وہ ملنے کے لیے بے چین ہے۔ آج آپ کے اعزاز میں نہ صرف تعارفی تقریب ہے بلکہ ڈنر بھی ہے۔ میں نے کہا میں اتنا اہم تو نہیں پھر بھی ایک مسلمان بھائی کی محبت میں ضرور اس کے درِ دولت پر حاضری دونگا۔ اس کے بعد ہم نزدیکی Beach دیکھنے چلے گئے۔ اس Beach کو دیکھ کر مجھے اتنی نفرت ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ جب ہم Beach Area میں داخل ہوئے اس وقت وہاں پر فرانس سے آیا ہوا ایک گروپ فٹ بال کھیل رہا تھا۔ اس میں ہر عمر کی خواتین اور مرد شامل تھے اور تمام کے تمام مکمل طور پر برہنہ تھے۔ یہ اتنا بدصورت اور کراہیت انگیز منظر تھا کہ بیان سے باہر۔ اس کی تفصیل اگر لکھ دوں تو میری یہ تصنیف گندگی اور بدصورتی کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو جائے گی۔ دیگر Beaches کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) Anse La Raie.

(2) Bain Boceef.

(3) Calodyne.

(4) Cap Macheurcux.

(5) Grande Gaube.

(6) Grand Bay Publice Beach.

(7) La Cuvette.

(8) Mont Choisy.

(9) Perybere.

(10) Point Aux Pinent.

(11) Pointe Aux Canoniers.

(12) Poudre D'or.

(13) Troce aux Biches.

Beaches at the East of Mauritius.

(1) Blue Bay.

(2) Belle Mare.

(3) Flacq.

(4) Lile Aux Cerfs.

(5) la Pointe d'Esny.

(6) Post Lafayette.

(7) Roche Noir.

Beaches at the South of Mauritius.

(1) Bale Du Cap.

(2) Gris Gris.

(3) La Combeese.

(4) Le Bouchon.

(5) Riambel.

(6) Saint Felix.

(7) Soulllac.

(8) Pomponette.

Beaches of the West of Mauritius.

(1) Albion.

(2) Flice En Flace.

(3) La Preneuse.

(4) Lemorne Brabant.

(5) Point Aux Sables.

(6) Tamorin.

(7) Tombeau Bay.

ماریشس کی کوسٹ لائن 160 KM لمبی ہے۔ یہاں اس کے علاوہ بھی Beaches ملیں گی ۔جو Beaches قابل ذکر ہیں میں نے صرف ان کے نام لکھے ہیں۔

Balaclavaاور Pereybere ماریشس کی خوبصورت ترین Beaches ہیں۔ جہاں پر آپ کو یورپ بھر کے لوگ کپڑوں میں ۔اور بغیر کپڑوں کے بھی نظر آئیں گے میں ان کی مادر زاد برہنگی پر قلم اٹھا کر اپنی کتاب کو ناپاک نہیں کرونگا۔

تھک ہار کر ہم دونوں گھر چلے آئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد گھر کی خواتین سے خوش گپیاں کرتے ہوئے پاکستان اور پاکستانی کلچر کے متعلق گفتگو جاری رہی۔ خاص طور پر اپنی اہلیہ محترمہ اور بچوں کے بارے میں تعارفی سلسلہ چلتا رہا جسے سن کر ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اُڑ کر پاکستان کی سیاحت کرنے چلے آئیں۔ ماریشس کی خواتین محنتی، صابر شاکر، قدرتی طور پر سانولے سلونے اور چمکیلے رنگ میں رنگی ہوتی ہیں۔

کچھ ساڑھیوں اور شلوار قمیض میں، نوجوان نسل جینز اور کُرتی میں، ''بڑی بڑی سمندری آنکھیں'' بقول حسن عباسی:

تمہاری آنکھوں میں ڈوبنے کے بعد
میں سمندر کو مانتا ہی نہیں

نرم خو، نزاکت ولطافت کی پُتلیاں۔ ایسے بولتی تھیں جیسے ہلکے سروں میں بانسری درمیانی شب کی خاموشی میں بھلی لگتی ہے۔ موقع محل، موڈ مزاج اور عمر عزیز کی رفتار کے حساب سے جب ان کی آواز ذہن پر اپنی لہروں کا صوتی اثر چھوڑتی تو میں نازک اندام لڑکی کی آواز کو Synchronize کرنے کی کوشش کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

راگ ملہار کی مٹھاس پورے ماحول میں پھیلی ہوئی ہے۔ جیسے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ مختلف خواتین کی آواز کی شیرینی، ان کی عمر، گھریلو حالات، معاشی خوشحالی یا بدحالی اور مزاج کے مطابق محسوس کی جاسکتی تھی۔ اس لیئے مُمری، دادرا، دیپک کی تھاپ محسوس ہونے کو ہم کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ کیونکہ اللہ رب العزت نے ان کے گلوں کو مُرکیوں سے گل آمیز کر رکھا تھا۔ جب وہ آہستہ آہستہ باتیں کرتیں تو باڈی ٹاک اتنی خوبصورت انداز میں اپنی طرف متوجہ کرتی جیسے زمین کی کشش فضا سے گرنے والے انسانی جسم کو کھینچتی ہے مگر جان لیوا ہوتی ہے۔

سرِ شام ہی محترم حبیب بھائی کا فون رشید مولکن کے دولت کدہ پر آ گیا۔ فرمایا اگر آپ لوگ مناسب خیال کریں تو ابھی آ جائیں کیونکہ باقی تمام فیملیز میرے گھر تشریف لا چکی ہیں اور ادریس بھائی سے ملنے کی مشتاق ہیں۔ ہم بھی تیار ہو کر گپ شپ کر رہے تھے۔ مجھے جب رشید مولکن نے مسلم فیملیز کے اشتیاق کا بتایا تو میں نے کہا چلتے ہیں۔ دیگر خواتین نے کہا آپ لوگ چلیں ہم ایک گھنٹہ کے وقفے سے آ جائیں گی۔ 15/20 منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم حبیب ولا کے باہر موجود تھے۔ میں حیران رہ گیا۔ مرد و زن، کیا ہندو، کیا مسلمان اور عیسائی، بغیر کسی Religious Discrimination کے، ہنستے مسکراتے، ہاتھ ملاتے، گلے ملتے، عزت احترام سے ملے۔ مجھے نمایاں جگہ پر بٹھایا گیا۔ پورٹ لوئس کی کریم فیملیز موجود تھیں۔ بات چیت شروع تھی۔ پہلا شکوہ یہ تھا کہ آپ نے اپنا قیام اتنا مختصر کیوں رکھا۔ ہم آپ کے ویزے کی معیاد Extend کروا لیتے ہیں اور آپ کم از کم ایک روز ہر فیملی کے پاس قیام کریں۔ آپ کے تمام خرچ اخراجات ہمارے ذمے ہوں گے۔ کچھ سوالات پاکستان اور پاکستانی کلچر کے بارے میں کئے گئے۔ جس میں شادی بیاہ کے رسم و رواج، Joint Family سسٹم، خاص طور پر طلاق کے مسائل اور حلالہ کی قبیح روایت وغیرہ۔ اس محفل میں دیگر مذاہب کے لوگ بھی تھے اور کسی کی بھی دل آزاری سے بچنے کے لیے میں نہ صرف Defensive تھا بلکہ محتاط بھی تھا۔ ان میں ایک ہندو خاتون تھی جو دیکھنے میں بھی خوش شکل تھی اور نسوانی، ملبوساتی اور کاسمیٹکلی بھی جاذب نظر تھی جبکہ اس کا خاوند مسلمان اور کم گو قسم کا انسان تھا۔ ایک اور خاتون جو مسلمان تھی مگر خاموش خاموش۔ اس کا خاوند ہندو تھا اور بات بات پر بہت چہک رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں فیملیز کے مسلمان مرد و زن سگے بہن بھائی ہیں اور ہنود مرد و زن بھی سگے بہن بھائی ہیں۔ جیسے ہمارے ملک عزیز میں بعض خاندانوں میں وٹہ سٹہ شادیوں کا رواج ہے۔ یہ بھی اسی طرح ہی تھا۔ جو ہنود بہن بھائی تھے بات بات پر خدا کا لفظ استعمال کرتے جیسے ہمارا خدا، تمہارا خدا، مسلمان کا خدا، ہندو کے خدا وغیرہ۔ مسلمان خاوند بیوی سے دبا دبا تھا اور مسلمان بیوی خاوند سے ڈری ڈری اور خاموش تھی۔ 30,35 منٹ کی ملاقات میں ان گنت بار خدا کا لفظ استعمال کیا گیا۔ جب مجھے موقع ملا تو میں نے برملا کہا۔ کلچر اور پاکستان کے بارے میں بات ہوگی پہلے خدا کے بارے میں بات ہوگی اور میں صرف قرآن پاک کی حد تک محدود رہوں گا تا کہ کسی بھی بہن بھائی

کی دل آزاری نہ ہو۔قرآن پاک کا فرمان کسی بھی مسلمان کے لیے حکمِ آخر ہے اور میں تمام مسلمان خواتین و حضرات سے درخواست کرونگا کہ وہ میری بات کو توجہ سے سُنیں اور یاد بھی رکھیں۔ کیونکہ غلطی صرف اس وقت تک غلطی ہوتی ہے جب تک علم نہ ہو اور جب علم میں آ جائے تو پھر وہ غلطی نہیں رہتی۔عمل نہ ہونے کی صورت میں اللہ رب العزت کے حکم سے انحراف ہوگا۔

سب لوگ ٹوٹی پھوٹی اردو نہ صرف بولتے تھے بلکہ اچھی طرح سمجھتے بھی تھے۔سب مرد و زن ہمہ تن گوش ہو کر میری بات سن رہے تھے۔ میں نے سب کی خدمت میں عرض کیا کہ لفظ خدا نہ تو اللہ کا ذاتی نام ہے اور نہ ہی یہ صفاتی نام ہے نہ ہی یہ لفظ قرآن پاک میں ہے اور نہ ہی شریعت میں کسی اور جگہ وارد ہوا ہے۔ جبکہ برصغیر اور فارس میں اکثر علماء اور لوگ اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ یہ فارسی لفظ ہے اور فارس میں یہ غیر اللہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔مثلاً بیوی اپنے شوہر کو مجازی خدا کہتی ہے۔کشتی کے ملاح کو ناخدا کہا جاتا ہے۔شعرا کو خدائے سخن کہا جاتا ہے۔اور خرابی کہاں پر ہے ذرا توجہ فرمائیے۔

مجوسیوں کے عقیدہ کے مطابق ایک یزداں (اچھائی کا خدا) جبکہ دوسرا ہرمن (برائی کا خدا)۔اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب و نقائص اور کسی کی بھی ادنیٰ سی شرکت سے پاک و بری ہے۔ بدقسمتی سے لفظ خدا اتنا عام ہو گیا ہے کہ اگر کسی کو اس لفظ کی تشریح بتا کر منع بھی کیا جائے تو جواب ملتا ہے کہ بڑے بڑے علماء بھی تو یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کتابوں میں بھی لکھا جاتا ہے۔خدا کا لفظ نہ تو قرآن پاک میں ہے اور نہ ہی کسی بھی حدیث پاک میں ہے اور نہ ہی نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی فرمایا تھا۔ان کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کبھی بھی اس لفظ کو استعمال نہیں کیا اور نہ ہی تابعین اور سلف صالحین نے یہ لفظ استعمال کیا۔

کسی کو بھی دین میں اضافہ کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نہ ہی غیر اللہ کے نام کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔لہٰذا لفظ خدا اور لفظ God کا استعمال مسلمانوں کو نہیں کرنا چاہئے۔اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں الحمد للہ رب العالامین۔

قرآن شریف میں جگہ جگہ رب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا یہ رہنمائی کافی نہیں ہے۔اگر قرآنِ کریم کی (سورۃ اعراف 180) کا آپ لوگ مطالعہ فرمائیں تو اس میں صاف صاف لکھا ہوا ہے۔

''اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔پس ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو اور ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں۔ان لوگوں کو ان کے کئے کی سزا ضرور ملے گی۔'' سورۃ بنی اسرائیل ۱۱۰ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں'' کہہ دیجیے کے اللہ کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر جس نام سے پکارو تمام اچھے نام اس کے ہیں''۔آپ غور فرمائیں ان دونوں آیات میں اللہ کے ذاتی اور صفاتی ناموں سے پکارنے کا حکم دیا گیا

ہےاوراللہ کے ناموں میں کج روی کرنے والوں کے لیے سزا کے علاوہ لاتعلقی کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ملکِ فارس سے مدینہ منورہ گئے۔اس وقت بھی ان کے ملک فارس میں لفظ خدا ہی بولا جاتا تھا لیکن حضرت سلیمان فارسیؓ نے کبھی بھی اپنے خالق حقیقی کے لیے لفظ خدا استعمال نہ کیا۔

قربان جائیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذات وایمان پر کہ امامِ کائنات محمد رسول اللہ ﷺ نے جو فرمادیا وہی ان کا ایمان عمل بن گیا۔اللہ ہمارے رب کا ذاتی نام ہے۔اس کے علاوہ بے شمار صفاتی نام قرآن اور حدیث میں وارد ہوئے ہیں۔اس لیے خود بھی لفظ خدا اپنی زبانوں سے ختم کریں اور جو کوئی بھی آپ کے سامنے خدا بولے اس کو بھی احسن طریقے سے سمجھائیں اور اگر کسی کتاب میں خدا لکھا ہو تو پڑھتے وقت اللہ پڑھیں۔

تمام لوگ مسلم وغیر مسلم بے حد انہماک سے میری گفتگو سُن رہے تھے۔اس کے بعد پاکستان کے کلچر اور شادی بیاہ کے بارے میں بات چیت جاری رہی۔مسلم کی شادی غیر مسلم کے ساتھ پاکستان میں اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک غیر مسلم فریق مسلمان نہ ہو جائے۔اس پر سب بہت حیران ہوئے اور ناپسندیدگی کا اظہار ہونے لگا میں نے ان کو برملا کہا۔مذہب میں اپنے آقائے نامدار کے ہر حکم کی تعمیل کی جاتی ہے۔ناپسندیدگی کا اظہار کر کے آپ گناہ گار ہو رہے ہیں۔آپ کو اسلامی تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ہر قسم کے مسلک سے پاک پڑھے لکھے عالم کی آپ لوگوں کو سخت ضرورت ہے۔ایک عیسائی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا سر آپ کا کیا خیال ہے۔صرف مسلمان ہی جنت میں جائیں گے دوسرے لوگ جنت میں نہیں جائیں گے۔میں نے اسے بے حد نرمی سے جواب دیا کہ نہ تو میں کوئی مفکر ہوں اور نہ ہی عالم ہوں۔میں آپ کو ایک بہت بڑے عالم امام محمد عبدہ کا جواب سنا دیتا ہوں جو انہوں نے ایک پادری اور ایک ربی کے سوال کے جواب میں دیا تھا جو اپنے اپنے مذہب کے بہت بڑے عالم تھے۔

سوال تھا کہ جنت میں کون جائیگا یہودی، عیسائی یا پھر مسلمان؟ مسلمانوں کی طرف سے امام محمد عبدہ نے کھڑے ہو کر جواب دینا شروع کیا۔مسلمان عالم دین نے کہا کہ اگر یہودی جنت میں جاتے ہیں تو ہم بھی ان کے ساتھ جنت میں جائیں گے کیونکہ ہم ان کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں۔انہیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے اپنے بندوں پر نبی معبوث کیا گیا۔اگر عیسائی جنت میں گئے تو بھی مسلمان ان کے ساتھ جنت میں جائیں گے کیونکہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی مخلوق کی رہبری اور ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا۔لیکن اگر مسلمان جنت میں گئے تو صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت کے ساتھ اکیلے ہی جنت میں جائیں گے۔ہمارے ساتھ کوئی یہودی اور عیسائی جنت میں نہیں جائیگا کیونکہ انہوں نے ہمارے نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نہیں مانا اور نہ ہی ان پر ایمان لائے ہیں۔یہودی، ربی اور عیسائی پادری امام محمد عبدہؒ کے اس جواب کی تاب نہ لاتے ہوئے بغیر کوئی جواب دیے خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

ایک بڑی عمر کی خاتون نے اپنی بیٹی کے حوالے سے بات کی کہ اس کے شوہر نے اس کو طلاق دے دی ہے۔ اب کچھ عرصہ کے بعد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور معافی کا خواستگار ہے۔ لیکن مولوی کہتا ہے کہ حلالہ کرانا پڑے گا پھر نکاح جائز ہوگا۔ اس کے لئے وہ اچھے خاصے روپے مانگتا ہے اور .....؟ پھر وہ عورت رونے لگ گئی۔ میں نے اس کو کہا بہن رونے کی بجائے آپ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل سورتوں کا باترجمہ مطالعہ فرمائیں۔ آپ کو مکمل راہنمائی مل جائیگی۔ طلاق بدعت و طلاق حسن اور طلاق احسن کے متعلق ہدایت موجود ہے۔

(۱) سورۃ النساء سورہ نمبر 4 آیت نمبر 135

(2) سورۃ طلاق۔ سورہ نمبر 65 آیت نمبر 107

(3) سورۃ بقرہ سورہ نمبر 2 آیت نمبر 228 to 242

حلالہ کا ذکر نہ تو قرآن کریم میں ہے نہ ہی حدیث شریف سے ثابت ہے اور اگر پلاننگ کے تحت کیا جائے تو حرام ہے اور زنا کے زمرے میں آتا ہے۔

یہ سب پیشہ ور لوگوں کا گروہ ہے جو بھولے بھالے لوگوں کی سادگی اور مذہبی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ کراچی اور دیگر بڑے شہروں میں ملائشیا، انڈونیشیا افریقہ میں باقاعدہ حلالہ سینٹر کھلے ہوئے ہیں جہاں پر یہ غیر شرعی و غیر اخلاقی بزنس کیا جا رہا ہے۔

میں نے اپنی کم علمی کے باوجود بہت تفصیل سے انہیں بتایا حلالہ نام کی کوئی چیز قرآن پاک، احادیث مبارکہ میں موجود نہیں ہے اور نہ ہی مذہب اسلام میں اس کا کوئی وجود ہے۔ صرف حق مہر کی تلقین کی گئی ہے جو دوبارہ نکاح کی صورت میں پھر سے ادا کرنا ہوگا۔ عورتوں نے خوب تالیاں بجائیں۔

تمام لوگ کچھ نہ کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہیں لیکن اپنی حدود و قیود معلوم نہ تھیں۔ میزبان نے مہربانی فرمائی اور کہا آج بس اتنا ہی اور کھانے کا اعلان کر دیا۔ کھانا اچھا تھا۔ عقیدت، خلوص اور ذوق و شوق سے بھرپور اس دعوت طعام کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے اور میری حیثیت اندھوں میں کانا راجہ کی سی تھی۔

بقول پنڈت ہری چند اختر:

بھروسہ کس قدر ہے تجھ کو اختر اس کی رحمت پر
اگر وہ شیخ صاحب کا خدا نکلا تو کیا ہوگا

اپنے کمرہ خاص میں لے جا کر حبیب صاحب جو ہمارے آج کے میزان تھے بولے آپ یہاں سکون سے

تشریف رکھیں۔لوگوں نے آپ کو ذہنی طور پر تھکا دیا ہے۔ہم کافی دیر باہمی اوراور بزنس پر باتیں کرتے رہے اور کافی کا دور بھی چلتا رہا۔رات گئے ہم بمشکل ان کی اجازت ملنے پر واپس گھر آ گئے۔حبیب صاحب اور رشید مولکن نے مجھے متعدد بار کہا کہ آپ پورٹ لوئس میں اپنا بزنس سیٹ اپ ضرور بنائیں۔ہم آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کی ضرورت بہت شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

دوسرے روز صبح ناشتے کی میز پر حبیب بھائی کے آنے کی اطلاع ملی۔رشید مولکن نے انہیں فوراً ہی بلوا کر ناشتے کے لیے اپنے ساتھ ٹیبل پر بٹھالیا۔حبیب بھائی نے بتایا کہ آپ کے جانے کی دیر تھی کہ میں نے قرآن کریم کے عربی، انگلش، اردو اور ماریشس زبان کے نسخے منگوا کر پڑھنے شروع کئے۔آپ نے جو حوالے دیے تھے ان حوالوں کو کئی بار پڑھا۔جس کی وجہ سے کئی گھرانوں کا نہ صرف مسئلہ حل ہو گیا بلکہ خواتین کی عزت وعصمت بھی محفوظ ہوگئی۔سب لوگ آپ کے احسان مند ہیں اور آپ کو دعائیں دے رہے ہیں۔میں آپ کا اور رشید بھائی کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔میں نے کہا مجھے خوشی ہوئی اگر کسی بھی بہن بھائی کا کوئی بھی کام یا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔اس سے زیادہ عزت آوری اور کیا ہوسکتی ہے۔بس میری ایک ہی درخواست ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی شادیاں نہ ہونے دیں۔اس طرح آپ ایک لادین نسل پیدا کر رہے ہیں۔آگے جا کر آپ کا اور آپ کے اسلاف کا نام ونشان مٹ جائے گا۔ماریشس میں مسلمانوں اور دین اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔

بقول شاعر:

نفرتوں کا نصاب پڑھ کے محبتوں کی کتاب لکھنا
بڑا کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پہ داستانِ گلاب لکھنا

شوگر انڈسٹری میں اب تو بہت Modrenization آ گئی ہے مگر ماریشس میں جو سینکڑوں سال پرانی قدیم شوگر ملیں ہیں ان کو عجائب گھروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔گورنمنٹ آف ماریشس نے یہ کام بے حد احسن طریقے سے سرانجام دیا ہے۔ان عجائب گھروں میں انڈیا سے لائے گئے مزدوروں کی داستان اور شوگر انڈسٹری کی داستان بیان بھی کی گئی ہے اور دکھائی بھی گئی ہے۔ہر قسم کے سمندری (Marine) کھیل جو بھی آپ پسند کرتے ہوں دیگر ملکوں کی نسبت بہت کم قیمت پر آپ انجوائے کر سکتے ہیں۔آب دوز (Sub Marine) کی سیر بھی کر سکتے ہیں جو آپ کو سمندر کی تہ تک لے جائے گی۔ہر قسم کی سمندری حیات کو با آسانی دیکھ سکتے ہیں۔بھارت کے تامل، تیلگو، مدراسی، بھوج پوری اور دیگر علاقوں کے روایتی کھانے اور مقامی کھانوں کے رنگ ساتھ پیوند کئے گئے۔کھانے آپ کو بہ آسانی میسر سے ہو سکتے ہیں، پسند نہ پسند آپ کی اپنی ہوگی۔اکثر لوگ کالے، عورتیں بھی کالی کلوٹی، کچھ

سانولے رنگ، موٹی موٹی سفید آنکھیں، جن میں سرخ ڈورے، بھرپور جوانی، لمبے لمبے سیاہ بادلوں جیسے بال، اگر کھول کر مدمقابل کے سامنے لہرا دیں تو گھنگور گھٹاؤں کے چھا جانے والا منظر بن جاتا تھا۔ سمندری خوراک عام طور پر زیادہ استعمال کی جاتی ہے۔

اس لئے تو زمانے میں اجنبی ہوں میں
کے فرشتے ہیں سارے لوگ آدمی ہوں میں

ماریشس میں پہلی شوگر مل 1740ء میں قائم کی گئی جو آج ایک میوزیم ہے۔ ماریشس ایک جزیرہ ہے جہاں گیارہ شوگر ملیں کام کر رہی ہیں جن کی .Crushing Capacities = 75 ٹن سے لے کر 310 ٹن فی گھنٹہ ہے۔

گنا ماریشس کے لیے نقد آور فصل ہے۔ اس کو ولندیزی کسانوں نے جن کو بوویر کہا جاتا تھا۔ Introduce کروایا۔ وو اس سے "Arrack" نامی شراب بناتے تھے۔ فرانسیسیوں نے نئی اور ماڈرن ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے ملیں قائم کیں۔ آج کل ماریشس کی گنے کی فصل ساڑھے چھ ملین ٹن سالانہ سے بھی زیادہ ہے جو ایک ریکارڈ ہے۔

تعلیم کے شعبے میں بھی ماریشس کسی سے کم نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے ملک میں 31 یونیورسٹیاں ہیں۔ سب سے بڑی The University of Mauritius نیشنل یونیورسٹی ہے اور 261 سٹڈی پروگرام آفر کرتی ہے۔ اس کا مین کیمپس Reduit, Moka میں ہے۔

ماریشس کا دارالخلافہ پورٹ لوئس ہے جو 1735ء میں فرنچ گورنر .Mahede Labourdonnais نے تعمیر کروایا تھا اور آج ماریشس کا بڑا شہر ہے۔ ماریشس کی پورٹ لوئس بندرگاہ پوری دنیا میں مشہور ہے۔ پورٹ لوئس Moka Range پہاڑیوں نے گھیرا ہوا ہے۔ یہ دیکھنے میں بہت خوبصورت سین اور لینڈ سکیپنگ اور قدرت کے نظارے مہیا کرتی ہیں۔ دنیا سے لوگ شوٹنگ کرنے یہاں آتے ہیں۔ نوآبادیاتی دور کی بڑی بڑی خوبصورت بلڈنگز اس شہر کی عظمت اور خوبصورتی کی وجہ ہیں۔

1835ء کے برٹش دور میں تعمیر کی جانے والی ایک قلعہ نما بلڈنگ جس کا نام Fort Adelaide or Locitadelle خوبصورت، مضبوط عظمتِ رفتہ کی امین، طاقت کا نشان اور اس شہر کی پہچان کے طور پر پوری دنیا میں مشہور ہے۔

آخر میں صرف یہ لکھوں گا کہ مسافر تو بس مسافر ہوتا ہے اور مسافر کو ایک دن جانا ہی ہوتا ہے۔ چاہے اپنے

وطن جانا ہو یا آوارگی کے لیے کسی اور جہان میں جانا ہو۔ بغیر ٹکٹ کٹائے، بغیر کوئی خرچہ کیے، سب کچھ چھوڑ کر، اپنے پیاروں کو روتا تڑپتا چھوڑ کر جب رب عظیم بکنگ کر کے اپنا جہاز بھیج دیتا ہے تو مسافر اگلے جہاں کے سفر پر چلا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ روح آسمان سے آتی ہے اور واپس آسمان پر ہی چلی جاتی ہے۔ جسم اسی جہان کی مٹی سے بنا، اسی مٹی کی غذا پر پرورش پاتا رہا، لہٰذا بحکم ربِ عظیم جسم کو رزقِ خاک ہونے کے لیے خاک کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ یہ مسافر بھی اپنی بکنگ کروا کر اپنے وطن، اپنے پیاروں میں جانے کے لیے بیقرار تھا۔ وہ دن بھی آ گیا۔ رشید مولکن، حبیب بھائی اور دیگر مرد و خواتین نے عزت و احترام، پیار محبت، بھیگی آنکھوں، آنکھوں میں آس و حسرت کے ساتھ اللہ حافظ کہتے ہوئے رخصت کیا۔ اللہ حافظ اے ماریشس اور اہل ماریشس!

عہدوں پر رہتے ہوئے انسانیت دکھائیں
ریٹائرمنٹ کے بعد تو سبھی صوفی، حاجی اور فقیر بن جاتے ہیں

باب 8: ''آخری کوشش''(1993ء)

ہائے وہ گیسو ترے شانوں پہ بکھرے گیسو
ریشم و اطلس و کم خواب سے نکلوں کیسے
(نوید مغل)

آخری کوشش

ماریشس، ری یونین آئی لینڈ، مڈغاسکر سے ہوتا آخر کار میں اپنے وطن عزیز پاکستان پہنچ گیا۔ آتے ہی گھریلو امور میں مصروف ہوگیا۔ میری غیر موجودگی میں میرے بیٹے نوید کاشف نے اپنے دیگر بھائیوں، بہنوں اور والدہ محترمہ کو میری کمی محسوس نہ ہونے دی۔ تمام گھریلو، انتظامی، تعلیمی اور معاشی امور بہت سلیقہ مندی سے انجام دیے۔ میں دل ہی دل میں بے حد خوش تھا اور پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ افریقہ میں محنت کرنے کے بعد اس کا صلہ بہت ہی بھونڈے انداز میں ملا۔ مجھے یہ کہا جاتا رہا کہ آپ پاکستان سے افریقن کاروبار کو مال اور ہر طرح کی مدد فراہم کریں۔ ڈاکٹر صاحب لڑکوں کی ٹریننگ کر رہے ہیں۔ لڑکے تمام بزنس سنبھال کر اس کا انتظام وانصرام کریں گے۔ یہ سب سن کر دوستی کے ناطے اور بڑے بھائی کے احترام میں خاموشی اختیار کر لیتا۔ ایک روز ظہیر صاحب (والد عمران احمد) مجھے کہنے لگے پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب آپ کے اتنے زیادہ خلاف کیوں ہیں اور آپ کو گیبرون میں تو کیا پورے افریقہ میں بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کو کیسے پتہ چلا، کیا انہوں نے آپ کو فون کیا تھا؟ بولے نہیں! اُن کے 4/5 صفحات پر مشتمل کئی خطوط آئے ہیں۔ میں نے ناراضگی سے کہا آپ کو وہ خطوط ساتھ لے کر آنے چاہیے تھے۔ الزامات کے ثبوت ساتھ رکھ کر آپ میری جواب طلبی کر سکتے ہیں، یوں زبانی کلامی نہیں اور نہ ہی میں آپ کا کوئی Subordinate ہوں۔ اس لئے ادب ملحوظ خاطر رہے۔ وہ جھینپ سے گئے اور بولے ڈاکٹر صاحب نے خطوط میں مجھے اللہ تعالیٰ کے واسطے دیکر لکھا ہے کہ میرے یہ خطوط ادریس کو نہ دکھائے جائیں اور نہ ہی اس کے ساتھ خطوط کا کوئی ذکر کیا جائے۔ اس لئے میں آپ کو خطوط نہیں دکھا سکتا۔ مجھے یہ سن کر بے انتہا دکھ ہوا اور میں نے کہا: ''ظہیر صاحب آج مجھے احساس ہوا ہے کہ کمزور شخصیت کے ساتھ دوستی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں یہ خطوط خود میرے پاس آجائیں گے۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو آپ جیسے لوگوں کے بُت بنائے۔ اب یہی بُت فرعون بن گئے ہیں اور کچھ بھگوان بن کر سنگھاسن پر براجمان ہونے کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔ خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں۔ لیکن یاد رہے محمود غزنوی جیسی بُت شکن ضرب اگر لگ گئی تو پھر آپ کا کیا بنے گا، جنابِ عالی!''۔ اسی غصے میں ظہیر صاحب کو جانے کے لیے کہا۔

دوسرے روز میں لاہور چلا گیا۔ ائرپورٹ پر مجھے خوش آمدید کہنے رحمان بھائی خود تشریف لائے۔ جیسا کہ گزشتہ سالوں میں وہ مجھے خوش دلی کے ساتھ خوش آمدید کہتے چلے آئے تھے۔ ہم حسبِ سابق خوش گپیاں کرتے، کھاتے، کھیلتے دو تین دن خوب مصروف رہے۔ ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا کہ ڈاکٹر صاحب نے آپ کو جو خطوط لکھے ہیں وہ آپ نے مجھے نہیں دکھائے۔ وہ میرے بھائی اور دوست تھے۔ ککے زئی پٹھان بھی تھے۔ انہوں نے دوسری کوئی بات نہیں کی اور ایک فائل میرے سامنے رکھ کر یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ غور سے پڑھو، رات کو بات کریں گے۔ میں نے شام تک تمام بکواس نامہ پڑھ لیا۔ رات کو میں نے بھائی صاحب سے کہا آپ سے میرے

چند سوالات ہیں:

(1) کیا میں اپنے بیس ہزار ڈالر کی واپسی کے لیے ممکنہ انتظامات اور مطالبہ نہیں کر سکتا؟

(2) دونوں لڑکے میری ذمہ داری پر تھے۔ کیا میں انہیں اخلاقیات اور دیگر امور پر روک ٹوک نہیں کر سکتا؟

(3) کیا میں ڈاکٹر صاحب، آپ کا یا کسی اور کا Subordinate ہوں؟

(4) کیا میں بطور Pioneer مناسب اقدامات نہیں کر سکتا؟

(5) آپ نے مجھے ایک بیوقوف اور بے ایمان شخص کے کہنے پر واپس بلوا کر تمام بزنس تہس نہس نہیں کر دیا؟

میں نے انہیں مزید کہا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ وہ مجھے منانے کی کوشش کرتے رہے کہ آپ کچھ عرصہ پاکستان سے کام کرتے رہیں پھر موقع محل کے حساب سے آپ دوبارہ جا سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں کسی صورت آپ کی اس پالیسی سے متفق نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا ہوں تو اچھا کہیں اگر میں بُرا ہوں تو میرے سامنے ہی مجھے کہیں۔ درمیانی کیفیت خواجہ سرا کی ہوتی ہے۔ Why I Should be second to any body?

اس مسئلہ پر ہماری بہت میٹنگز ہوئیں۔ متعدد بار میں لاہور گیا اور کئی بار رحمان صاحب بہاولپور تشریف لائے۔ مگر میری ایک ہی بات تھی کہ مجھے اب بزنس سے آؤٹ سمجھیں۔ میں اپنی الگ دنیا بساؤں گا۔ ڈاکٹر مکرم جھوٹ کا لبادہ اوڑھے ہوئے مذہبی بہروپیا اور ایک کمزور شخصیت تھا۔ بھائی صاحب کی سادگی اور بزنس میں انتہا درجے کی دلچسپی کی وجہ سے یہ شخص جذباتی بلیک میلنگ کرنے میں کامیاب رہا، کیونکہ اُن کا بیٹا فرید رحمان وہاں بزنس کی وجہ سے قیام پذیر تھا۔ اب سب سے پہلے لڑکوں کی تعریف کے خطوط آنے سے شروع ہوئے جس میں لکھا ہوا ہوتا کہ ادریس کے جاتے ہی لڑکوں نے اپنی بھرپور قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے اور میں ان کی بھرپور تربیت کر رہا ہوں۔ بزنس دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آپ کا بیٹا اب میرا بھی بیٹا ہے اور بہت ہی ذہین اور قائدانہ صلاحیتوں کا مالک ہے وغیرہ۔ بھائی صاحب اور محترمہ بھابھی صاحبہ چونکہ ماں اور باپ تھے اور بیٹا چھ ہزار میل کی دوری پر تھا اس لئے ان کا جذباتی ہونا قدرتی امر تھا۔ مگر میں ان اطلاعات کو خواب ہی خیال کرتا تھا۔ میرا تجربہ تھا کہ بُرے شخص سے اس وقت بچو جب وہ برسر اقتدار ہو۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ بھائی صاحب اور محترمہ بھابھی کافی پریشان ہیں۔ میں نے بھائی صاحب سے کہا کہ آپ مجھے بتائیے کہ کیا بات ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا خط نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ جس میں لکھا تھا کہ فرید رحمان میرا کہنا نہیں مانتا یہ ادریس کا پیروکار ہے۔ میں بہت مایوس ہوا ہوں وغیرہ۔ مجھے بھائی اور بھابھی صاحبہ نے کہا کہ آپ کا کیا خیال ہے۔ میں نے کہا یہ شخص میرے مقابلے میں آپ کی پسند ہے۔ میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ یہ پہلے بھی آپ کی

خوشامد اور چاپلوسی کر کے آپ کو جھوٹ سنا تا رہا ہے۔ اب بھی یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مگر پسند آپ کی ہے لہٰذا آپ بھگتیں۔ اسی کھینچا تانی میں ایک ماہ گزر گیا۔ ایک روز پتہ چلا کہ فرید صاحب واپس آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے حسبِ معمول فون کر کے شکایات کے دفتر کھول دیے۔ جس پر رحمان بھائی نے بھی ترنت جواب دیکر ڈاکٹر صاحب کی طبیعت صاف کر دی۔ حسبِ عادت کافی سرزنش بھی کی اور کہا فرید رحمان کو واپس بھیج دیں۔ کچھ عرصے کے بعد بذریعہ پوسٹ مجھے ایک آڈیو کیسٹ موصول ہوئی جس میں ڈاکٹر صاحب نے رو رو کر اپنی اس بے عزتی اور ڈانٹ ڈپٹ کا تفصیلی حال بیان کیا ہوا تھا۔ اب ان کے پاس تربیت کرنے کے لیے صرف عمران بچ گیا تھا۔ انہوں نے بارہا مجھ سے فون پر اور بذریعہ Fax رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر میں نے ذرا سی بھی اہمیت نہ دی کیونکہ میرے نزدیک Invesment سے زیادہ اپنی عزتِ نفس اہم تھی۔ بہت منت سماجت کے بعد میں نے ڈاکٹر مکرم کو صرف ایک بار جواب دیا کہ آپ اپنی تربیت مکمل کر لیں جو اکثر آپ لڑکوں کو دیتے تھے یا باقیات کو دے رہے ہیں۔ پھر میں آپ سب کی تربیت کرونگا اور فون بند کر دیا۔ میں نے اس کے بعد کسی بھی فریق کی بات نہیں سنی اور روزمرہ زندگی میں مصروف رہا۔

اسی طرح 5/6 ماہ گزر گئے۔ اس دوران میرے بڑے بھائی شفیق احمد صاحب وفات پا گئے۔ وہ ساہیوال میں رہتے تھے اس لئے ساہیوال آنا جانا لگا رہا۔ آخر ایک روز میرے بیٹے نوید کاشف نے کہا کہ ڈیڈی جان آپ سب کچھ بوٹسوانہ میں پھینک کر آ گئے ہیں۔ کسی کی بھی پروا مت کریں۔ آپ نے اس تمام بزنس کو شروع کیا اور بنایا۔ چلیں افریقہ چلتے ہیں۔ اپنا بزنس سنبھالتے ہیں۔ میں بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کے نوید نے میرے خواب کے مطابق B.Sc. کر لی ہے۔ اس سے وعدہ بھی کیا ہوا ہے۔ ''میں بچوں سے جھوٹا وعدہ کبھی نہیں کرتا''۔ اس کا مشورہ بھی صائب ہے۔ پھر میں نے اس کی والدہ محترمہ سے مشورہ کیا کہ اگر میں اور نوید افریقہ چلے جائیں تو آپ بیٹے کی وجہ سے اُداس تو نہیں ہونگیں۔ انہوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے جواب دیا کہ نوید B.Sc. کر چکا ہے۔ اب ہائر ایجوکیشن کی طرف اس کا پہلا قدم ہے اور آپ اس کا اور اپنا ٹائم ضائع کر رہے ہیں۔ میری پرواہ کیے بغیر جو بچے کے لیے بہتر ہے فوراً قدم بڑھائیں۔ ایک ماں کا حوصلہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی محسوس ہوئی اور کچھ کر گزرنے کی لگن لگ گئی۔ میں نے فوراً ہی نوید کے ویزے کے لیے کوشش شروع کر دی اور کراچی فاروق بھائی کو Air Booking کے لیے فون کر دیا۔ نوید بھی اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ مزید 10/12 دنوں میں ٹکٹ، ویزا، فارن ایکسچینج سب فائنل ہو گیا اور ہم باپ بیٹا تمام سفری مراحل سے گزرتے ہوئے دوبئی ائرپورٹ پر لینڈ کر گئے۔ ہوٹل ڈیرہ پارک کا نمائندہ ہمارے نام کا Placard لئے کھڑا تھا۔ میرے اشارہ کرنے پر ٹرالی سے بیگز اور دیگر سامان لے کر گاڑی میں رکھنے لگا۔ 25/30 منٹ کے بعد ہم ہوٹل کے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ شام کو

ہم دونوں فریش ہو کر ہوٹل سے باہر گھومنے نکلے۔ایک لاہوری بادشاہ کے ہوٹل سے کھانا کھایا اور مُرشد بازار گھومتے ہوئے گرینڈ مارکیٹ تک جا پہنچے۔گرینڈ مارکیٹ دوبئ کی قدیم ترین مارکیٹ ہے جو ڈیرہ دوبئ اور پار دوبئ کے دہانے پر واقع ہے۔جب دوبئ میں قابل ذکر کچھ بھی نہ تھا تو گرینڈ مارکیٹ اس وقت بھی تھی۔آج کا مُرشد بازار 1966ء میں چھپر بازار تھا۔یہ سب باتیں میں اپنے بیٹے کو بتاتا گیا اور ہم پیدل چلتے گئے۔اسی طرح ہماری واپسی ہوئی۔اب رات ہو چکی تھی اور ہم ڈیرہ پارک واپس جا رہے تھے۔ہمارے راستے میں کئی نائٹ کلب آئے جن کے دلال اپنے اپنے نائٹ کلب کی خاصیت بتا کر لوگوں کو کلب کے اندر آنے پر اکسا رہے تھے۔ایک انڈین کلب کے سامنے میں نے اشارہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا آؤ بیٹا اندر چلتے ہیں۔ہم دونوں کلب کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔اس وقت کلب میں 30/35 انڈین لڑکیوں کا بہت ہی مختصر لباس میں کورس ڈانس ہو رہا تھا۔اماراتی عربی لہک لہک کر لڑکیوں پر قربان ہو رہے تھے اور درہم بھی لُٹا رہے تھے۔نوید 15/20 منٹ ہی برداشت کر سکا اور بولا ڈیدی جان مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا، یہاں سے چلتے ہیں۔میں نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور کلب سے باہر آ گیا۔میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔دراصل میں اپنے بیٹے کو قصداً نائٹ کلب میں لے گیا تھا۔وہ ایک نوجوان سائنس گریجوایٹ تھا اور ہائر ایجوکیشن کی تیاری کر رہا تھا۔میں بطور باپ اس کا مزاج، شوق اور ذہنی سوچ و پرواز آزمانا چاہتا تھا۔مبادا اللہ نہ کرے، کہیں شوقِ آوارگی تو نہیں؟ جب اس کی نیم غصے سے بھری ہوئی آواز آرکسٹرا کی آواز کو چیرتی ہوئی میرے کانوں سے ٹکرائی۔''ڈیڈی جان مجھے یہ سب پسند نہیں ہے۔چلیں''۔مجھے بے حد فخر محسوس ہوا۔انجانی خوشی سے لبریز وہ لمحے جو مجھے قدرت نے میرے اپنے بیٹے کے توسط سے عطا کئے وہ انمول تھے۔ایک خیال بجلی کی طرح کوندا کہ ''ادریس تمہارا بیٹا، تمہارا پَر ہے (Wing) تم اس کے سہارے پرواز کرو گے'' اللہ سبحان وتعالیٰ کی رحمت اور اس کی عطا کی ہوئی برکت سے اس دور میں بھی اپنے انہیں پروں کی مدد سے محو پرواز ہوں۔الحمدللہ رب العالمین! دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب کو نیک اولاد عطا فرمائے۔آمین! نوید نے اپنے پہلے انٹرنیشنل ٹیسٹ میں اول درجے میں پاس ہو کر ایک سخت گیر باپ کو اپنا گرویدہ کر لیا۔سخت گیر باپ کا لفظ میرے دیگر بچے بھی استعمال کرتے ہیں۔

ہم دوبئ، نیروبی، جوہانسبرگ تک تمام مراحل طے کرتے ہوئے گیبرون کی پرواز میں شامل ہو گئے۔یہ سب پروازیں پُرسکون تھیں اور آخر کار ہم (بوٹسوانہ) گیبرون کے وقت کے مطابق شام 4 بجے Sir Serctse Khama International Airport. پر بخیریت لینڈ کر گئے۔ائر پورٹ سے سیدھے اپنے ویئر ہاؤس گئے۔عمران موجود نہیں تھا۔ملازمہ مرسی ڈیشو موجود تھی۔ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔حال احوال پوچھتی رہی اور خاموشی سے ایک کاپی لا کر میرے سامنے رکھ دی۔اس کاپی میں وہ تمام رپورٹ موجود تھی جو میں گیبرون سے کراچی

جاتے ہوئے اس کے ذمے لگا گیا تھا۔اس کو فیس کے طور پر پانچ صد پولے بھی ادا کر گیا تھا۔حسبِ وعدہ بقایا پانچ صد پولے آج ادا کرنے تھے۔میرے گیبرون چھوڑنے کے دن سے لے کر آج تک کی میرے بتائے ہوئے ہر شخص کی رپورٹ اس کاپی میں موجود تھی۔مرسی ڈیشو شاباش، پانچ صد پولے اور دیگر مراعات کی حقدار تھی۔میں نے تفصیل سے تمام رپورٹس پڑھ کر کالی بھیڑوں کو مارک کرلیا۔کچھ ثبوت مجھے آفس ٹیبل کی درازوں سے مل گئے۔ ویئرہاؤس کا سرسری جائزہ لینے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا پاکستان سے امپورٹ کیا ہوا سامان فروخت کرنے کی بجائے ساؤتھ افریقہ سے سلے سلائے لیڈیز آؤٹ فٹ منگوا کر فروخت کئے جارہے ہیں۔جو میں نے اسی وقت بند کردیے۔ابھی میں گومگو کی کیفیت میں سوچ و بچار کر ہی رہا تھا کہ عمران بھی آ گیا۔مجھے دیکھ کر پریشان ہوگیا۔ لوکل ماحول کے مطابق اوٹ پٹانگ کپڑے پہنے، لمبے بال رکھے ہوئے تھے جیسے ہپی لوگ رکھتے ہیں۔میں نے اس کو گھور کر دیکھا اور پوچھا کہ تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ دوسری طرف میرے آنے کی وجہ سے پریشانی تو تھی ہی مگر خاموشی بھی گھر کر گئی۔نوید نے اس کی مدد کی اور کہا ڈیڈی جان کوئی بات نہیں کل تک عمران کٹنگ کروالے گا۔میں خاموش ہوگیا اور صرف اتنا کہا کہ آوارہ منش نہ بنو اور شرافت میں واپس آجاؤ۔میں نے تین ماہ تک بزنس کو دوبارہ ترقی دینے کی بھرپور کوشش کی۔مشکلات کے باوجود کچھ کامیاب بھی ہوا۔لیکن یہ ظالم بستی بستے بستے بستی ہے مگر اُجڑ ایک دن میں ہی جاتی ہے۔کچھ دن نوید بھی میری کوششوں میں شامل رہا۔لیکن جلد ہی اس نے ایک برٹش انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لے کر کمپیوٹر کا ایک سرٹیفکیٹ کورس کرلیا۔ساتھ ہی ساؤتھ افریقہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھی داخلہ کے لیے کاغذات جمع کروادیے اور جواب کے انتظار میں بے چین رہا۔

اس دوران ایک روز حسن نانک کا فون آ گیا۔میرے فون کا رسیور اٹھانے پر آواز آئی بھائی صاحب کیا حال ہے؟ میں نے اس سے کہا میں آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا اور دوبارہ مجھے فون مت کرنا۔میں نے فون بند کردیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب خود ملنے آئے۔میں اخلاقاً ہاں ہوں کرتا رہا۔جب انہوں نے حسن نانک کے حوالے سے بات کرنا چاہی تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو منع کردیا اور کہا کہ اب آپ جاسکتے ہیں۔مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔میں آپ جیسے منافق لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔وہ اپنا منافقانہ رویہ اور چہرہ لے کر چلے گئے۔دو تین دن بعد حسن نانک کا ایک خط بذریعہ پوسٹل سروس مجھے موصول ہوا۔جس میں کچھ گلہ شکوہ تھا اور لکھا تھا کہ تم بلڈی پاکستانی ایسے ہی ہوتے ہو۔میں سمجھ گیا کہ ڈاکٹر مکرم ایک بزدل آدمی ہے۔اس نے حسن نانک کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی ہے۔حسن نانک ایک جاہل انسان تھا۔وہ بول تو سکتا تھا لیکن لکھ نہیں سکتا تھا میں نے وہ خط اپنے لیگل ایڈوائیزر کو بھجوادیا۔اس نے خط پڑھتے ہی حسن نانک کو لیگل نوٹس بھجوادیا۔نوٹس ملتے ہی حسن نانک اور ڈاکٹر صاحب کو غشی پر غشی پڑنے لگی۔کیونکہ بوٹسوانہ میں یہ ایک بڑا جرم تھا۔پہلے ڈاکٹر مکرم

آیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ اچھے دنوں، اچھے تعلق۔ اکٹھے کھانے پینے اور مہمان نوازی کا حوالہ دیا۔ میں نے اسے کہا کہ جن حوالوں کو آپ نے بلینک چیک کی طرح سنبھال کر رکھا ہوا تھا اور آج کیش کرانا چاہتے ہیں تو میں ان حوالوں کا صلہ آپ کو ضرور دونگا۔ کیونکہ میرا تعلق ایک پٹھان خاندان سے ہے نہ کہ ضلع قصور کے کسی نائی خاندان سے۔ آپ حسن نانک کے پاس جائیں اور اسے کہیں کہ وہ written معافی مانگے اور پانچ صد پولے بھی ساتھ ادا کرے۔ میں نے اپنے وکیل کو بطور فیس ادا کیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پانچ صد پولے تو مجھے اسی وقت ادا کر دیے۔ معافی نامہ کے لیے دوسرے روز کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ اس شخص کی بیوقوفی دیکھیں خود ہی یہ سب سازش کی اور خود ہی اس کو سلجھانے کے لیے کبھی میری منتیں اور کبھی اپنے مہرے حسن نانک کے ترلے کرتا پھرتا رہا۔ اس شخص کی مثال ماچس کی تیلی سے ملتی جلتی ہے جس کا سر تو ہوتا ہے مگر دماغ نہیں ہوتا۔ اس لئے ذرا سی رگڑ پر بھڑک اٹھتی ہے اور اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ دوسرے روز معافی نامہ بھی آ گیا جو میں نے اپنے لیگل ایڈوائزر کو بھیج دیا اور اسے کہا کہ وہ اس معافی نامے کو ریکارڈ کا حصہ بنالے تا کہ اگر یہ لوگ آئندہ اس قسم کی گستاخی کریں تو ان کا سابقہ ریکارڈ کورٹ میں پیش کیا جا سکے۔ مجھے رام کرنے کی جتنی بھی کوششیں یہ کر سکتے تھے وہ کر چکے تھے۔ کبھی مراعات آفر کرتے، کبھی سہانے خواب دکھاتے اور بن مانگے مشورہ دینے سے ہرگز گریز نہ کرتے۔ میں نے ان کو اور ان جیسے باقی لوگوں کو ہمیشہ No کی نوک پر رکھا۔

ایک روز نوید اور عمران اپنی کار بینک کے باہر پارک کر کے بینک کے اندر چلے گئے۔ جب اپنا کام کر کے واپس آئے تو ایک بوڑھی وائٹ لیڈی اُن کار کے پاس کھڑی اپنی آنسوؤں سے تر آنکھیں صاف کر رہی تھی۔ انھیں دیکھ کر بولی کیا یہ کار آپ کی ہے؟ ہاں میں جواب ملنے پر بولی میں اپنی کار پیچھے کر رہی تھی کہ اچانک میری کار آپ کی کار سے جا ٹکرائی۔ جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ میری وجہ سے آپ کا نقصان ہو گیا۔ یہ میرے بیٹے کا کارڈ ہے آپ فون کر کے اس کو بلا لیں وہ آپ کا نقصان پورا کر دے گا۔ نوید نے مجھے فون کر کے تمام واقعے سے آگاہ کیا اور پوچھا اب کیا کریں؟ میں نے بچوں کو بتایا کہ بزرگ خاتون کو حوصلہ، تسلی دیں اور عزت سے پیش آئیں۔ جو قسمت میں تھا ہو گیا۔ اس خاتون کو کار میں سے میرا بزنس وزیٹنگ کارڈ دے کر روانہ کر دیں اور آپ فوراً میرے پاس آ جائیں۔ دوسرے روز ایک آسٹریلوی نوجوان میرے پاس ویئر ہاؤس میں آیا اور اپنا وزٹنگ کارڈ دیتے ہوئے بولا کل آپ کی کار سے جس خاتون کی کار ٹکرائی تھی وہ میری والدہ صاحبہ ہیں۔ آپ گاڑی ٹھیک کروالیں۔ میں تمام بل دینے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسے کہا آپ تشریف رکھیں اور چیک بک جیب میں رکھیں۔ میں نے مرسی ڈیشو کو اشارہ کیا۔ جو فریج میں سے جوس کا ٹن لا کر میز پر سجا چکی تھی۔ اس نے شکریہ کے ساتھ چیئر کیا اور ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اسے کہا کہ آپ کی والدہ صاحبہ ایک بزرگ خاتون ہے اور ہمارے

خاندان میں بزرگوں کی بے حد عزت کی جاتی ہے۔آپ کی والدہ صاحبہ اور میری والدہ صاحبہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔لہٰذا ہمیں کسی بھی صورت میں compensation نہیں لینی۔آپ تشریف لائے میں اس کے لئے آپ کا بہت شکر گزار ہوں یہ شخص میرا بے حد مشکور ہو کر چلا گیا۔اس نے جاتے ہوئے مجھے اپنا آفیشل کارڈ دیا جو میں نے ممنونیت کے ساتھ لے کر ٹیبل پر رکھ دیا اور مہمان کو اس کی گاڑی تک چھوڑنے چلا گیا۔واپس آ کر جب کارڈ دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ شخص یو این مشن کا سربراہ ہے اور آسٹریلیا کا رہنے والا ہے۔اس کے بعد میرے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے اور اکثر ملاقات بھی ہو جاتی۔وہ ایک straight forward اور شریف النفس انسان تھا۔اکثر مجھے وزٹ کیا کرتا۔

دوپہر کا کھانا نوید اور عمران اور میں صدیقی صاحب کے ہوٹل نور جہاں میں تناول کرتے تھے۔جب BCCI کا ڈاؤن فال ہوا تو اس کے اکثر ملازمین نے یا تو ادھر اُدھر دیگر اداروں میں ملازمت اختیار کر لی یا اپنی اپنی پسند اور بساط کے مطابق کاروبار شروع کر دیا۔صدیقی صاحب بھی BCCI کے سابقہ ملازم تھے۔ان سے میری اچھی سلام دعا تھی۔وہ علامہ علاؤالدین شمس صدیقی، پروفیسر صادق پبلک سکول بہاولپور کے قریبی رشتہ دار تھے۔جب انہوں نے مجھے پوچھا کہ آپ بہاولپور کے رہنے والے ہیں۔جواب اثبات میں ملنے پر علامہ صاحب کے بارے میں پوچھا۔میں نے انہیں بتایا کہ وہ ہمارے بزرگ دوستوں میں سے ہیں اور بہاولپور میں ہمارے پاس ہی ہوتے ہیں۔اس کے بعد ایک اُنسیت سی ہو گئی اور ہم روزانہ لنچ ان کے ہوٹل میں کرنے لگے۔جس کا انتظام وانصرام ان کی اہلیہ محترمہ اور دختر نیک اختر کرتیں تھیں۔کھانا بھی پاکستانی اور حیدرآبادی رنگ لیے ہوئے تھا۔اکثر مسلمان بھائیوں سے ملاقات بھی اسی ہوٹل میں ہو جاتی تھی اور سب سے بڑی خوشی جو مجھے ہوتی کہ نوید شوق سے کھانا کھا لیتا تھا۔

اسی ہوٹل میں ایک بدمعاش ٹائپ برطانوی بھی آتا تھا جو کسی وقت پشاور میں برطانوی کونسل جنرل رہا تھا۔روانی کے ساتھ اردو اور پشتو بھی بول لیتا تھا۔غالباً اس کی پوسٹنگ گیبرون میں تھی۔جہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد بقایا زندگی بطور فارمر گزار رہا تھا۔اس کے ماڈرن فارمنگ کے دو بڑے فارمز تھے۔وہ جب بھی ہوٹل آتا، شراب کی بوتل اور گلاس اس کی ٹیبل کی زینت ہوتے۔میں نے محسوس کیا کہ پہلے وہ اُردو میں پاکستانیوں کو گالیاں دیتا پھر پشتو میں شروع ہو جاتا۔میں نے اس کے ساتھ والی میز پر بیٹھنا شروع کر دیا تا کہ کنفرم ہو سکے کہ وہ کیا کہتا ہے۔جب میرا شک یقین میں بدل گیا تو میں بے قابو ہو کر اس کی میز پر اس کے بالکل سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔میں نے اُسے کہا کہ تم روزانہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر میرے پاکستان اور پاکستانی بھائیوں کو گالیاں دیتے ہو۔میں نہیں جانتا کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو۔مگر جو کچھ تم کہتے ہو وہ سب ملا جلا کر کاک ٹیل کی طرح تم اور تمہارا خاندان ہو

گا۔اگر تم نے یہ بدتمیزی بند نہ کی تو لارڈ میو، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور جنرل ڈائر کا انجام یاد رکھنا۔وہ تینوں جنرل ہوتے ہوئے بھی کتے کی موت مارے گئے۔تم جانتے ہو کہ ہم پٹھان سُور کا شکار ایک پھندہ لگا کر ہی کر لیتے ہیں۔وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بے شرمی سے ہنسا اور بولا بیٹھو تمہارے لیے پیگ بناتا ہوں۔میں نے کہا No میں شراب نہیں پیتا۔اسی اثناء میں نوید اور عمران ہوٹل میں داخل ہوئے۔انہیں دیکھتے ہی میں اپنی ٹیبل کی طرف آ گیا تا کہ بچے پریشان نہ ہوں۔لیکن کرسی چھوڑنے سے پہلے میں نے اپنی شہادت والی انگلی کھڑی کر کے اس کو آخری وارننگ دیتے ہوئے کہا: Mind it! Do not repeat this nonsense again, otherwise...! ۔اس کے بعد میں نے اس کے ٹیبل سے اردو اور پشتو کی گالیاں نہ سنیں۔ایک روز صدیقی صاحب نے ہنستے ہوئے مجھے کہا کہ آپ کے بارے میں مجھے تنبیہہ کر رہا تھا کہ یہ بہت خطرناک پٹھان ہے اس سے بچ کر رہنا۔میں نے ناراضگی سے صدیقی صاحب سے کہا کہ ایک تو آپ شراب فروخت کرتے ہیں دوسرا اگر شرابی پاکستانیوں کو گالیاں دیں تو آپ اگنور کر دیتے ہیں۔یہ وطن سے محبت تو نہ ہوئی۔انہوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا بلکہ سلام دعا بھی کم کر گئے۔اسی ہوٹل میں دو سگے بھائی بھی لنچ پر آتے تھے۔وہ یونی ایگل انشورنس کمپنی کے مالک تھے۔ان کا ہیڈ آفس لندن میں تھا۔ایک بھائی شراب اور دیگر خرافات سے مبرا تھا اور پاک صاف زندگی گزار رہا تھا جبکہ دوسرا بھائی شراب کا رسیا تھا۔شراب پی کر حاتم طائی بن جاتا تھا اور اکثر صدیقی صاحب سے کہتا کہ اس وقت جتنے لوگ بھی شراب پی رہے ہیں ان تمام کا بل میرے اکاؤنٹ میں شامل کر دیں۔دوسرا بھائی خاموشی سے کھانا کھاتا اور چلا جاتا۔ایک روز نوید اور عمران پہلے ہوٹل آ گئے اور میں 1/2 گھنٹہ کے بعد آیا۔میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکے یونی ایگل کمپنی کے مالک کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میری طرف آ کر میرے ساتھ بیٹھ گئے۔میں نے غصے سے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ اپنے اندر وصف پیدا کرو کہ لوگ تمہارے ساتھ بیٹھنا اپنے لئے اعزاز خیال کریں نہ کہ تم بے قدرے بن کر دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر ان کی باتیں سنو۔نوید بولا کہ ڈیڈی جان وہ آپ کے لیے پیغام دینا چاہتے تھے اس لئے ہم بیٹھ گئے۔میں نے پوچھا کیا پیغام دیا؟ نوید بولا کہ انکل نے پہلے ہمارے نام پوچھے۔پھر شہر کا نام پوچھا۔پھر ذات پوچھی۔میں نے بتایا کہ ککے زئی پٹھان ہوں اس پر وہ خوشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے ہاتھ ملایا۔پھر بولا کہ میرے دادا لاہور سے آئے تھے اور ککے زئی پٹھان تھے۔ہم لوگ افریقہ میں ہی پیدا ہوئے لیکن لندن میں سیٹل ہیں۔پورے افریقہ میں ہماری کمپنی کی برانچیں ہیں۔میں نے پوچھا پیغام کیا ہے؟ نوید نے کہا پیغام یہ ہے کہ ''اپنے ڈیڈی سے کہو کہ کبھی ہنس بول لیا کریں''۔ہم نے خاموشی سے کھانا تناول کیا اور چلے آئے۔اس کے بعد کبھی سرراہ ملاقات ہو جاتی۔کبھی کسی مال پر، کبھی لنچ پر تو بہت عقیدت سے سلام دعا کرتے۔

نوید اچھی گاڑی لینی چاہتا تھا کیونکہ ہمارے پاس سیکنڈ ہینڈ گاڑی تھی۔ ہمارے ویئر ہاؤس میں ایک ہندو خاتون اپنی ساس اور ایک 3/4 سالہ بیٹی کے ہمراہ اکثر آتی تھی۔ اس کا خاوند حال ہی میں فوت ہوا تھا۔ بچی بہت پیاری تھی۔ سب اس کو مانو کہتے تھے۔ گیبرون سے 50/60 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ٹاؤن میں یہ لوگ رہائش پذیر تھے۔ خاتون M.Sc. تھی اور اپنے خاوند والا عہدہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ واپس بھارت نہیں جانا چاہتی تھی جبکہ اس کی ساس بھارت واپس جانا چاہتی تھی۔

جب بھی یہ فیملی اپنے ٹاؤن سے گیبرون آتے تو سب سے پہلے میرے پاس آتے۔ فریش ہوتے، مشورہ کرتے پھر، اپنے کام کاج کرنے چلے جاتے۔ اپنا فالتو سامان میرے پاس چھوڑ جاتے۔ شام کو واپس جاتے ہوئے اپنا سامان لے کر اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلے جاتے۔ ایک روز حسب معمول یہ کُنبہ میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ بات چیت کے دوران انہوں نے اپنی کار فروخت کرنے کا عندہ دیا۔ نوید نے مجھے کہا ڈیڈی جان کار اچھی، نئی اور کم استعمال کی گئی ہے۔ کیوں نہ ہم یہ کار خرید لیں۔ میں نے بچے کا شوق دیکھتے ہوئے فوراً رقم نکال کر خواتین کے حوالے کی اور کار اسی وقت رکھ لی۔ لڑکوں سے کہا کہ آپ دونوں جا کر آنٹیوں کو ان کے گھر چھوڑ آؤ۔ دونوں خوشی خوشی گئے اور چھوڑ کر واپس آ گئے۔

نوید کے یونیورسٹی میں داخلے کے لیے سر توڑ کوششیں جاری رہیں۔ مشکل جو پیش آ رہی تھی وہ کچھ اس طرح تھی کہ نوید نے پاکستان سے B.Sc. ڈبل میتھ اور فزکس کے مضامین کے ساتھ کی تھی۔ لیکن داخلہ وہ کمپیوٹر سائنس میں لینا چاہتا تھا۔ ساؤتھ افریقہ میں طریقہ کار کچھ اس طرح تھا۔ سمندر پار سے آیا ہوا ہر طالبِ علم جو ہائر ایجوکیشن کی غرض سے یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتا ہو وہ یونیورسٹیز سنٹرل آفس میں اپنی تعلیمی اسناد بمعہ چارجز کے جمع کرائے گا اور چند دن انتظار کرے گا۔ جب یہ سینٹرل آفس اس کی تعلیمی اسناد اور دیگر تمام سپورٹنگ ڈاکومینٹس کے اصل ہونے کی تصدیق کر لے گا تو طالب علم کو ایک سرٹیفکیٹ جاری کیا جائیگا۔ اس سرٹیفکیٹ پر طالبِ علم کو داخلہ ملے گا۔ یہ سرٹیفکیٹ نوید کو مل چکا تھا۔ یونیورسٹی کے ایڈمیشن آفس نے کہا کہ یونیورسٹی آپ کو M.Sc. فزکس یا میتھ میں داخلہ دے سکتی ہے نہ کہ کمپیوٹر سائنس میں۔ کیونکہ کمپیوٹر سائنس تو آپ نے B.Sc. لیول تک پڑھی ہی نہیں اس لئے آپ کو کمپیوٹر سائنس میں داخلہ نہیں مل سکتا. جبکہ نوید مصر تھا کہ میں نے صرف کمپیوٹر سائنس میں ہی داخلہ لینا ہے۔ میں اس سلسلے میں بے حد پریشان تھا۔ کیونکہ میں دلی طور پر نوید کے مضبوط ارادوں کے ساتھ تھا۔ ہر وقت دعا گو رہتا اور کہتا یا باری تعالیٰ میں اور نوید صرف اور صرف تیرے آسرے پر گھر سے یہاں تک آئے ہیں۔ کوئی صورت عطا فرما، ہمیں کامیابیاں عطا فرما اور ہر طرح سے محفوظ فرما۔ آمین۔

ابھی اسی کیفیت میں تھے کہ امیگریشن آفس سے لیٹر آ گیا کہ آج دو بجے آفس تشریف لا کر کچھ سوالوں کا

جواب دیں۔نوید اور عمران جوہانسبرگ گئے ہوئے تھے۔میں دو بجے آفس چلا گیا۔انٹرویو کرنے والی خاتون ڈائریکٹر امیگریشن تھی۔ہیلو ہائے کے بعد اس نے پوچھا کہ نوید کا شف آپ کا کیا لگتا ہے؟ میں نے کہا میرا بیٹا ہے۔ اس نے پوچھا آپ کے کتنے بچے ہیں میں نے بتایا کہ میرے دس بچے ہیں۔اس نے ایک کاغذ اور بال پوائنٹ مجھے دیتے ہوئے کہا۔اپنے تمام بچوں کے نام اس کاغذ پر لکھ دیں۔میں نے فوراً ہی لکھ دیے۔وہ مجھے بہت کنفیوزڈ لگ رہی تھی۔میرے دو بچوں کا surname ادریس تھا۔کہنے لگی ان دو بچوں کو میں آپ کے بچے مانتی ہوں مگر دیگر کو نہیں۔میں نے اس کو سمجھانے کی کافی کوشش کی مگر وہ نہ مانی۔آخر میں نے اسے کہا جس طرح یہ آپ کا ملک ہے میرا بھی ایک ملک ہے۔میں State-Less نہیں ہوں۔میرے ملک میں بچہ اپنے باپ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ہر بچہ،عورت اور آدمی جب بھی کسی بھی مقصد کے لیے اپنا نام لکھتا ہے یا لکھواتا تو اپنا نام لکھنے کے بعد وہ اپنے باپ کا نام لکھتا ہے یا لکھواتا ہے۔کیونکہ ہمارے ملک میں باپ کا ہونا انتہائی ضروری امر ہے۔باپ خاندان کی پہچان ہے۔قبر پر بھی باپ کا نام مرنے والے کے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہوتا ہے۔فیملی نام کوئی چیز نہیں ہوتا۔باپ کا نام ہی فیملی نام ہوتا ہے۔باپ ہی خاندان کا سربراہ ہوتا ہے۔مذہبی طور پر جنت ماں کے قدموں میں ہے لیکن باپ بابِ جنت ہے۔آپ کے معاشرے میں باپ کوئی اہم شخص نہیں ہے بلکہ اکثر اس کا پتا ہی نہیں ہوتا۔اکثر خواتین کو یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ ان کے 4/5 بچوں میں سے کونسا بچہ اس کے کونسے بوائے فرینڈ کا ہے۔جبکہ پانچ بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ خاتون ابھی تک غیر شادی شدہ ہے۔وہ بولی میں آپ کا فلسفہ نہیں سمجھ سکی لیکن میں مسٹر نوید کا عارضی Resident Permit منسوخ کرتی ہوں اور ایک ہفتہ کے اندر اس کو بوٹسوانہ چھوڑنے کا حکم دیتی ہوں۔کیونکہ مسٹر نوید آپ کی سپانسرشپ پر بوٹسوانہ میں مقیم ہیں اس لئے مجھے آپ کو بلوانا پڑا۔آپ کے آنے کا شکریہ۔میں نے اس کا دفتر چھوڑنے سے پہلے اسے بتایا کہ بوٹسوانہ میں باپ ایک گمان جبکہ پاکستان میں ایک حقیقت ہے۔

میں پریشانی کے عالم میں امیگریشن آفس سے نکل کر اپنے کمپنی سیکرٹری یعنی اپنے وکیل کے آفس چلا گیا۔اس سے مشورہ کرنے کے بعد اپنی کمپنی کے 25% شیئرز نوید کے نام منتقل کر دیے۔اب اس کی قانونی حیثیت ایک Invester کی ہوگئی اور ساتھ ہی ورک پرمٹ Resident Permanent کلیم کر لیے۔کمپنی سیکرٹری نے تمام کاغذات مکمل کئے اور اسی وقت لے کر مجاز اتھارٹی کے پاس چلا گیا۔اتھارٹی نے ملک چھوڑنے کا حکم منسوخ کر کے اگلے ہفتے کی شنوائی رکھ لی۔نوید اور عمران ساؤتھ افریقہ گئے ہوئے تھے۔میں سکون کے ساتھ اپنے آفس واپس آ گیا اور نوید کو فون کیا کہ واپس آ جاؤ۔اگلے ہی روز دونوں واپس آ گئے۔

اگلی شنوائی پر ورک پرمٹ اور ریذیڈنٹ پرمٹ کنفرم ہو کر مل گئے۔دوسرے روز جب نوید واپس آیا تو بہت

خوش تھا۔ کیونکہ University of the Wit-Waters Rand of JohannesBurg. نے پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ ان کمپیوٹر سائنس میں داخلہ کی آفر کر دی تھی ۔ اگر ایک سال کا یہ ڈپلومہ کورس نوید کامیابی سے کر لیتا تو پھر کسی بھی یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا تھا۔ میں نے بطور باپ نوید کا Psychologically جائزہ لیا تو اس کو ہر لحاظ سے بہتر پایا۔ یونیورسٹی کی فیس جمع کروا دی گئی اور ساؤتھ افریقہ امیگریشن کو Study Permit کے لیے کاغذات اور ضروری فیس وغیرہ بھی بھجوا دیے گئے ۔ ابھی کلاسز شروع ہونے میں کافی ٹائم تھا۔ نوید کی خوشی دیدنی تھی لہٰذا میں بھی خوش تھا۔ وہ بوٹسوانہ میں خوب گھومتا پھرتا۔ گاڑی اُس کے پاس تھی۔ جب وہ نیا نیا میرے ساتھ آیا تھا تو میں خوفزدہ تھا کہ اگر وہ اپنی ماں اور بہن بھائیوں کی جدائی کی وجہ سے اداس ہوا تو میں کیا کرونگا۔ یہ خیال اور خوف میں نے دل میں رکھا۔ کبھی اس کا اظہار نہ کیا۔ مگر نوید نے بھی ککے زئی مرد بچہ ہونے کا ثبوت دیا اور میرے تمام خدشات غلط ثابت کیے جس پر مجھے آج بھی فخر ہے۔ میں نوید کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔

ایک دن نوید اور عمران میرے پاس آ کر بیٹھ گئے ۔ میں نے محسوس کیا کہ دونوں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ میں نے دونوں کو کہا گھبراہٹ اپنے چہروں سے ختم کرو اور جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہو بلا کم و کاست کہو۔ نوید نے مجھے کہا کہ کل دیوالی ہے۔ میں نے ایک لمبا سا سانس لیا اور کہا اچھا میرا تو خیال کہ ہم سب مسلمان ہیں اور دیوالی تو ہندوؤں کا تہوار ہے۔ نوید نے بتایا کہ کمیونٹی ہال میں دیوالی کا فنکشن ہے۔ تمام ہنود لوگ وہاں ہونگے اور ایک سو سے زیادہ ہنود داسیوں نے دیوالی کا رقص کرنا ہے۔ ہم وہ دیوالی رقص دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں سوچ و بچار کرنے لگا کہ بچوں کا شوق بھی پورا ہو جائے اور کوئی سکینڈل بھی نہ پنپ سکے ۔ کیونکہ ہندو کمیونٹی اعتراض کر سکتی تھی کہ غیر ہنود لڑکے ہمارے دیوالی کے فنکشن میں کیا لینے آئے ہیں۔ میں نے نوید سے کہا بیٹا فکر نہ کرو۔ میں ضرور کوئی نہ کوئی وسیلہ نکال لونگا کہ آپ بطور مہمان عزت و احترام سے دیوالی کا تہوار دیکھ آئیں۔ دوسرے روز دیوالی کی مٹھائی لے کر ہندو ناری، اس کی ساسو ماں اور بیٹی مانو تشریف لے آئیں۔ اپنا فالتو سامان انہوں نے ہمارے پاس رکھا۔ مٹھائی ہمیں پیش کی جو انہوں نے اپنے گھر میں خود تیار کی تھی ۔ بلاشبہ بہت مزیدار خوشبودار تھی اور ہماری ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔ میں نے ہندو ناری سے کہا کہا گرچہ وِدھوا ہونے کے ناطے آپ نے سفید ساڑھی لگائی ہوئی ہے مگر آپ کے حسن کا کیا کروں جو سفید گلاب کی طرح مستی میں ہے۔ ابھی وہ جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ اس کی ساسو ماں واش روم سے واپس آ گئی۔ میں نے دونوں خواتین سے کہا کہ آپ نے ہمیں دیوالی کی خوشی میں صرف مٹھائی دے کر ٹرخا دیا ہے۔ آپ جس فنکشن میں جا رہی ہیں۔ اس میں ہمیں ساتھ لے کر نہیں جا رہی۔ دونوں نے یک زبان ہو کر کہا ہم تو آپ لوگوں کو ساتھ لے کر جانا چاہتی ہیں اگر آپ پسند کریں تو زہے نصیب! چلیں۔ میں نے کہا میں مذہبی برداشت اور رواداری پر یقین رکھتا ہوں۔ اپنے دین اور ایمان پر قائم رہتے ہوئے مذہبی مار دھاڑ، تعصب اور

غنڈہ گردی پر یقین نہیں رکھتا۔ آپ لڑکوں کو ساتھ لے جائیں۔ ان کا خیال رکھیں۔ یہ آپ کے آج کے مہمان خصوصی ہیں۔ اس نے کہا: ہائے آپ کیوں نہیں چلتے ؟ میں نے کہا کہ میرا چہرہ لوگوں میں Prominent زیادہ ہے اور سب لوگ آپ کی طرح فراخ دل اور لبرل نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ مذہبی بھیڑیے بھی ہوتے ہیں۔ اس لیے میری نمائندگی میرا بیٹا کرے گا۔ دونوں بہت خوشی سے نوید اور عمران کو ساتھ لے گئیں اور دیوالی کا فنکشن ختم ہونے پر خود واپس میرے پاس چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں نے کھڑے ہو کر ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔ ہنود ناری طنزیہ ہنسی ہنستی ہوئی چلی گئی۔

رات کا کھانا، نوید اور عمران اکثر ایک انڈین نژاد مسلم خاتون کی طرف کھاتے جو نسل در نسل بوٹسوانہ کی شہری تھی۔ یہ خاتون ایک فوڈ بزنس کی مالکہ تھی۔ جیسے ہی ویئر ہاؤس بند ہوتا۔ دونوں لڑکے مجھے گھر چھوڑ کر آنٹی کے پاس چلے جاتے کیونکہ آنٹی بھی دونوں کا انتظار بے چینی سے کرتی۔ کبھی کبھی بچے بہت اچھا پیک کیا ہوا، مزیدار کھانا میرے لئے بھی لے آتے۔ پہلے پہل تو کھانے کی قیمت ادا ہوتی رہی۔ پھر آنٹی نے کھانے کی قیمت لینا بند کر دی۔ کیونکہ ہنسی مذاق، تہذیب، شرافت اور مسلم تشخص ہمیشہ ایک دوسرے کا احساس کرتا اور رشتوں کی محبت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس لئے میں بھی بے فکر ہو گیا کہ میرے بچے کا دل لگا ہوا ہے۔ ایک دن نوید نے مجھے کہا کہ بوٹسوانہ پولیس SSG یونٹ کے سامنے جو وائلڈ لائف پارک ہے، وہاں میں نے اور آنٹی نے جانا ہے میں خود بھی اس پارک میں کئی بار جا چکا تھا۔ میں نے کہا کل چھٹی کا دن ہے مجھے ویئر ہاؤس چھوڑ دینا اور کار سے جانا۔ مجھے تسلی تھی ایک تو پارک زیادہ دُور نہیں تھا دوسرا پولیس کمانڈوز یونٹ کا کمانڈر ایک SSP تھا جو اپنی نہایت ہی تیز طرار اہلیہ محترمہ کے ساتھ اکثر میرے پاس آتا اور گپ شپ بھی کرتا۔ خوش مزاج آدمی تھا۔ دونوں میاں بیوی آپس میں بات چیت کرتے لڑ بھی پڑتے اور صلح مجھے کرانی پڑتی۔ میں نے بے فکری سے اجازت دے دی۔ دراصل نوید کی خوشی میں مجھے اپنی خوشی نظر آتی۔ وہ اداس ہوتا تو میں پریشان ہو جاتا۔ اگر وہ کسی بات پر منہ بنا لیتا تو میں غمگین ہو جاتا۔ میرا دل کرتا کہ بس میں اپنے بیٹے کو ہر ممکن خوش رکھ سکوں۔ کیونکہ آئندہ آنے والے سالوں میں اس کے اور ہمارے (منِ حیثیت فیملی) اس کی پڑھائی کی وجہ سے جدائی آنے والی ہے۔ یہ سوچ مجھے پریشان کرتی تھی مگر کبھی میں نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا مبادا بچے کا عزم اور ہمت کم نہ ہو جائے۔ حالانکہ بچپن میں نوید کی تعلیم و اخلاقی تربیت اور زندگی کے ڈسپلن کی خاطر میں اپنے بچے سے بہت سختی سے بھی پیش آتا رہا ہوں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک تربیت یافتہ اور ہونہار بیٹا ثابت کر دیا تھا۔ لہٰذا اس کے بغیر مجھے سانس بھی نہیں آتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی بھی اپنے بیٹے یا کسی بھی فیملی ممبر کے سامنے اپنے ان خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کیا مگر۔ آج میرے دل و دماغ میں جو بحر بیکراں موجزن ہے میں اس کو اپنے قلم کے ذریعے کاغذ پر بکھیر رہا ہوں۔ میرا قلم اور جذبات ایک

ہوکر میرے بس میں نہیں ہیں۔اب جو حادثہ میں لکھنے جا رہا ہوں میرے لئے وہ قیامت سے کم نہیں ہے۔اگر میں یہ کہوں کے قیامت ایک باپ نے اپنے آنکھوں سے دیکھی تو غلط نہ ہوگا۔

نوید اور آنٹی گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے ۔میں ویئر ہاؤس میں بیٹھ کر کچھ کاغذی کام کرنے لگ گیا۔عمران دکانداروں سے وصولی پر چلا گیا۔کام تو میں کرتا رہا لیکن سینے میں دل اچھلتا رہا۔پریشانی بڑھتی گئی۔ڈپریشن میں اضافہ ہوتا گیا۔میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ تمہیں کیا پریشانی ہے مگر سوچ بچار کے باوجود کوئی وجہ بھی ذہن میں نہ آئی۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں ایک عورت خون آلود کپڑوں میں میری طرف آ رہی ہے۔چہرے پر زخموں کے تازہ نشان تھے جن میں سے خون رس کر باہر کپڑوں اور چہرے کو آلودہ کر رہا تھا۔جب میں نے اس کو پہچانا تو وہ آنٹی تھی جس کے ساتھ نوید وائلڈ لائف پارک دیکھنے گیا تھا۔اس نے مجھے بتایا کہ نوید وہاں پر ہی ہے اور آپ کو بلا رہا ہے۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اپنی کیفیت کیسے لکھوں۔بہر حال کانپتی ٹانگوں،روتے دل و دماغ کے ساتھ میں اکیلا ہی کسی نہ کسی طرح موقع پر پہنچ گیا۔جبکہ آنٹی کو میں نے ہسپتال بھجوا دیا کیونکہ اسے فرسٹ ایڈ کی اشد ضرورت تھی۔موقع پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ گاڑی جھاڑیوں میں ایک مینڈک کی طرح پڑی تھی مگر نوید نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھا تو ایک اونچے سے ٹیلے پر نوید بیٹھا تھا۔میرے دل و دماغ نے میرے منہ میں الحمدللہ رب العالمین ڈالا اور میں یہ ورد کرتا ہوا بھاگ کر اپنے بیٹے کی طرف بڑھا۔میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کو اپنے اندر سمولوں۔اس کے سارے جسم کو ٹٹولا۔اس نے کمر پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔پریشانی ایک بار پھر حاوی ہوگئی کیونکہ کمر ایک بہت ہی Sensitive جگہ ہے۔انسانی زندگی میں اس کا بے حد اہم مقام اور کردار ہے۔میں نے نوید سے پوچھا بیٹا چوٹ زیادہ کس جگہ لگی ہے۔تو اس نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا یہاں کمر پر۔میں نے اس کا ماتھا چوما اور کہا دیکھو بیٹا آپ تو میرے شیر بیٹے ہو اور ایک پٹھان بھی ہو۔اگر تم اپنی آنکھوں میں آنسو بھرو گے تو میرا دل غم سے پھٹ جائیگا۔پھر باپ کہاں سے لوگے۔یہ جو کچھ بھی ہوا ہے یہ انسانی زندگی کا حصہ ہے۔بس اب تم باپ کی آغوش میں ہو اور بھول جاؤ کہ کیا ہوا ہے۔میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اونچائی سے اترنا شروع کر دیا۔جب نوید میرے ساتھ اونچائی سے نیچے اتر رہا تھا تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا،وہ پرسکون تھا۔پھر میں نے اس کو ذرا زور سے کھینچا تو اونچائی سے نیچے اترنے کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔نوید پھر بھی پرسکون تھا۔میں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کرم کیا ہے۔معمولی چوٹیں آئی ہیں،زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔نوید بار بار اپنی کار کی طرف دیکھ رہا تھا۔میں نے اس کی گال پر پیار کرتے ہوئے کہا: بیٹا ایسی ہزاروں کاریں آپ پر قربان،آؤ چلتے ہیں۔اتنی دیر میں پولیس بھی آ گئی۔انہوں نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔میں نے پولیس یونٹ کے گیٹ کے باہر لگے ہوئے بوتھ سے کمانڈر

کوفون کیا تو وہ فوراً اپنے سٹاف کے ساتھ آ گیا۔ ہمدردی کا اظہار کرتا رہا اور پولیس کو ہدایات بھی دیتا رہا۔ مجھے اس نے ہی بتایا کہ کار نوید ڈرائیور کر رہا تھا اور یہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ باتوں میں ان کو پتہ نہیں کار کا ایک ٹائر سڑک کے گریول والے حصے پر چڑھ گیا جس کی وجہ سے گاڑی رول ہوتی ہوئی سڑک سے نیچے جھاڑیوں میں اُلٹی جا گری۔ دروازے لاک ہونے کی وجہ سے نہ کھل سکے۔ پولیس کیمپ کے گیٹ پر کھڑے ہوئے سپاہیوں نے کار کے شیشے توڑ کے دونوں کو باہر نکالا۔ میں نوید کو لے کر ویئر ہاؤس آ گیا۔ اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کرتا کم تھا۔ کبھی خیال آتا کہ نوید کی والدہ ماجدہ کو اور بہن بھائیوں کو کیا جواب دونگا۔ ایک ماں کی عظمت کو سلام کرتا ہوں جس نے اپنے لختِ جگر کو ہزاروں میل دور، جہان حیرت میں تعلیم کے لیے ایک لفظ کہے بغیر میرے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ یہ سب سوچ کر میں آدھا زندہ تھا اور آدھا مردہ تھا۔ انہیں سوچوں میں غرق تھا کہ پولیس والے آ گئے کیونکہ انہوں نے اپنی کارروائی مکمل کرنی تھی۔ ان کو میرے دوست SSP نے ہدایت دی تھیں کہ پولیس اسٹیشن بلانے کی بجائے ان کے دفتر میں جا کر بیان لے آؤ۔ لہٰذا ایک انسپکٹر اور اس کا سٹاف آ گئے۔

سوال جواب کچھ اس نوعیت کے تھے۔

گاڑی کا مالک کون ہے؟

جواب: ادریس احمد آفتاب

گاڑی چلانے والا کون ہے اور اس کا گاڑی کے مالک سے کیا رشتہ ہے؟

بیٹا

گاڑی چلانے والے نے شراب تو نہیں پی ہوئی تھی؟

No

کیا آپ گاڑی چلانے والے کے خلاف مقدمہ چلانا چاہتے ہیں؟

No

کیوں نہیں چلانا چاہتے؟

کیونکہ وہ میرا بیٹا ہے اور میری ہر چیز کا مالک ہے۔ یہاں انسپکٹر چونک پڑا اور بولا۔

Strange Enough۔

کیا گاڑی انشورڈ تھی۔

No

کیوں نہیں کروائی؟

میں نے ابھی حال میں ہی خرید کی تھی، کروانی تھی مگر موقع ہی نہ ملا اور یہ حادثہ ہو گیا۔
کیا آپ پولیس سے کسی مدد کے خواہاں ہیں؟

No. Thanks

اس کے بعد انہوں نے کچھ کاغذات میرے سامنے رکھے۔ میں نے دستخط کر دیے۔ پولیس نے گاڑی کے کاغذات اور نوید کا ڈرائیونگ لائسنس مجھے واپس کر دیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں دروازے تک رخصت کیا۔ پولیس کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ دھونس دھمکی لالچ نام کو بھی نہ تھی۔

اس کے بعد کبھی کبھی انسپکٹر میرے پاس آتا جاتا رہا۔ جب بھی آتا ہیلو مائی فرینڈ کہہ کر پکارتا۔ ایک دن کہنے لگا مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ اگر آپ کو منظور نہ بھی ہو تو آپ نے اس کو خفیہ رکھنا ہے۔ میں نے کہا آپ بلا کم وکاست بتائیں میں پوری توجہ سے سُن رہا ہوں۔ وہ بولا: ہم نے آپ کی گاڑی کا انشورنس والا chapter اوپن رکھا ہوا ہے۔ میں انشورنس والے کو خود ہی آپ کے پاس لاؤنگا اور Back Dates میں آپ کی گاڑی کی انشورنس کر کے آپ کو کاغذات جاری کر دینگے۔ پھر پولیس رپورٹ آپ کے حق میں جاری کر کے آپ کو کلیم دلائیں گے۔ 50% آپ کا ہوگا اور بقایا 50% میرا اور انشورنس والے کا ہوگا۔ بولو منظور ہے؟ میں نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا کہ واقعی آپ میرے خیر خواہ اور دوست ہو لیکن یہ سب کچھ میں اس لئے نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے میرا بیٹا واپس کر دیا۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ ایسی ہزاروں کاریں میں اپنے بیٹے پر قربان کر دوں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے سیلوٹ کیا اور بولا آپ کے اور میرے درمیان ایک شریفانہ وعدہ ہے کہ آپ یہ سب کسی کو بھی نہیں بتائیں گے۔ میں نے کہا بے شک میں ایسا ہی کرونگا۔ اس کے بعد میں نے اپنے پورے قیام کے دوران اس انسپکٹر کی شکل تک نہیں دیکھی مگر یہ سب کچھ ان کے لیے بہت حیران کن تھا اور وہ ہماری معاشرتی و اخلاقی قدروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ماشاءاللہ نوید بہت جلد صحت یاب ہو کر اپنی فارم میں واپس آ گیا۔ اب وہ نظر سے ذرا بھی اوجھل ہوتا تو میں بے چین ہو جاتا۔ گیبرون بہت بڑا شہر نہیں ہے اور مسلم کمیونٹی ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ اگر کہیں اور نہیں تو روزانہ مسجد میں اور کم از کم جمعے کے جمعے تو ضرور ایک دوسرے سے تفصیلاً حال احوال کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔ نوید کے ایکسیڈینٹ کا سب کو پتہ چل چکا تھا اور سب خیریت دریافت کرنے میرے پاس اپنی اپنی فرصت کے مطابق تشریف لاتے رہے۔ اگر کوئی نہیں آیا تو وہ ڈاکٹر مکرم اور حسن نانک تھے۔ ایک مسلم برادر جس کو ہم مذاق اور پیار میں Mr.Chiken کہتے تھے کیونکہ اس نے اپنے ریڈی میٹ کپڑوں کے بزنس کا نام Chiks رکھا ہوا تھا ہماری خیریت معلوم کرنے تشریف لائے۔ اظہار افسوس کرتے رہے اور جاتے ہوئے کہنے لگے۔ آجکل آپ کے پاس

کار نہیں ہے۔ میں عمران کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ اپنی کاروں میں سے ایک کار اس کو دے کر آپ کے پاس روانہ کر دونگا۔ جب تک آپ دوسری کار نہیں خرید لیتے آپ میری کار استعمال کریں۔ وہ عمران کو ساتھ لے گیا اور ٹویوٹا کیمرے کار دے کر اس کو واپس بھجوا دیا۔ کار بہت اچھی حالت میں تھی۔ بلکہ اگر میں یہ لکھوں کہ چم چم کرتی نئی کار تھی تو غلط نہ ہوگا۔ یہ اس کی مہربانی تھی اور میں ہمیشہ اس کا ممنون و مشکون رہوں گا۔

مسٹر اور مسز لونیل جن کا ذکر باب نمبر 3 میں تفصیل کے ساتھ آ چکا ہے، تشریف لے آئے۔ وہ بولے آپ نے ہمیں اپنا نہیں سمجھا۔ ہمیں تو آج دیوی کماری نے بتایا ہے جس سے آپ نے کار خریدی تھی۔ میں نے سب کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ ان لوگوں نے مجھے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میں پردیس میں ہوں۔ پردیسی تو ایک عام سے لفظ ہے ہم تو انٹرنیشنل پردیسی تھی۔ مسز لونیل کو ہم سب بھابھو کہتے تھے۔ وہ ایسا کہنے پر بہت خوش ہوتی تھی اور اپنائیت کا اظہار کرتی تھی۔ بھابھو صاحبہ بہت سادہ، مہمان نواز، خوش مزاج اور خوش گفتار خاتون تھیں۔ بس ذرا شیخی خور تھی۔ اس عادت کو بھی آپ اس کی سادگی کہہ سکتے ہیں۔ مجھے بہت ناراضگی سے بولی 1991ء سے لے کر آج 1993ء تک میں آپ کو متعدد بار دعوت دے چکی ہوں لیکن حضور نے ہم لوگوں کو کبھی بھی شرفِ باریابی نہیں بخشا۔ آج ہم دونوں آپ کو دعوت دینے بذاتِ خود حاضر ہوئے ہیں۔ ہماری بیٹیاں لندن سے آئیں ہوئی ہیں۔ ان کے اعزاز میں ہم نے محفل سجانے کے لیے بہت ہی خاص لوگوں کو مدعو کیا ہے۔ آپ ایک بار آ کر تو دیکھیں۔ اس نے نوید سے کہا۔ بیٹا! آپ اپنے ڈیڈی جان کو رام کریں۔ یہ ہمیں ہر بار کوئی نہ کئی مجبوری بتا کر انکار کر دیتے ہیں۔ نوید نے میری کرسی کی پشت سے آ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور بولا آنٹی آپ فکر نہ کریں۔ میں اپنے ڈیڈی جان کو لے آؤنگا۔ میں ہنستا رہا۔ دونوں میاں بیوی تاکید کرتے چلے گئے۔ اگلے روز ہفتہ تھا اور ایسی دعوتیں ہفتہ کے روز ہی کی جاتیں تھیں کیونکہ اتوار کو چھٹی ہوتی تھی۔

ہم جمعہ نماز کے لئے چلے گئے۔ ہر جمعہ نماز کے بعد مسٹر کپانو اور اس کے چند ہم خیال دائرے کی شکل میں کھڑے ہو کر میلاد شریف پڑھنا شروع کر دیتے۔ یہ کورس ایک گھنٹہ سے زیادہ کا ہوتا۔ نوید میلاد شریف پڑھنے والوں کے ساتھ کھڑے ہو کر میلاد پڑھنا شروع کر دیتا۔ میں ایک جمعہ نہ پڑھنے والوں کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا اور دوسرے جمعہ نوید کے ساتھ مل کر میلاد شریف پڑھ لیتا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی کپانو اور اس کے ہم نوا جیسے ہی تیزی سے دائرہ بنا کر اور ہاتھوں سے زنجیر بنا کر اونچی آواز سے پڑھنا شروع کرتے۔ ایک غیر ہم نوا صاحب میری طرف دیکھ کر کہتے۔ بھائی ان کو کیا ہو گیا ہے اور آپ کا بیٹا بھی ان کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں اور باڈی ٹاک سے اس بات کا اظہار کر رہا ہوتا تھا کہ کم از کم میں اپنے بیٹے کو تو منع کر سکتا ہوں۔ لیکن جب دوسرے جمعے بعد نماز اس نے مجھے بھی ہم نوائی میں شامل ہو کر میلاد شریف پڑھتے دیکھا تو بہت حیرانی کے عالم میں

پوچھا کہ حضرت آپ کا مسلک کیا ہے؟ میں نے کہا میرا مسلک مذہبی رواداری، ہم آہنگی اور مذہبی برداشت ہے۔ جو کچھ نبی کریمؐ نے فرمایا دیا وہ ہی میرا مذہب ومسلک ہے۔ میں 1924ء سے لے کر آج تک نئے پرانے مسالک کی وبا سے محفوظ ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم سب کو ہدایت وتوفیق عطا فرمائے۔ آمین! وہ حیرت سے مجھے دیکھتا رہا اور سر جھٹکتا رہا۔

دوسرے روز بعد نمازِ مغرب کے بعد نوید اور عمران بھابھو صاحبہ کے دولت کدہ پر جا پہنچے۔ یہ ایک کشادہ اور پرانا بھوت بنگلہ تھا۔ لان اور گھر کے اندر مناسب روشنی کا بندوبست کافی بھلا لگ رہا تھا۔ بہت ہی خاص فیملیز مدعو تھیں۔ اور اس لئے حُسن بے باک کا ایک بحر بے کراں تھا۔ لڑکیاں جینز اور کرتیوں میں پھنسی ہوئی تھیں۔ سانس لینے کے لیے V گلے والی کرتیاں جن کے V کچھ زیادہ ہی بڑے تھے۔ یہ آزاد خیال ماڈرن یوتھ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی اس کو عطا فرمایا تھا اس کی نمائش کرنے میں نہ ہی انہوں نے کنجوسی کی نہ ہی شرم کو دماغ پر مسلط ہونے دیا۔ اس جان لیوا تیر وتفنگ کو بے حد عسکری انداز میں Display کیا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے ہر قسم کے خطرناک ہتھیاروں کے نشیب وفراز بے حد واضح تھے اور دشمن خوفزدہ تھا۔ کیونکہ اتنا خوبصورت اور بے حد خطرناک اسلحہ دیکھ کر دشمن سمٹ سمٹ کر اپنی اپنی کرسیوں میں دھنس چکا تھا اور بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔ ارمان ٹکنے نہ دے رہے تھے۔ گلے خشک تھے۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ یہ تو تھی یوتھ۔ اب آنٹیوں کا نقشہ دیکھ لیں۔ خودکار ہتھیاروں کی مانند تھیں۔ اور یہ ہتھیار زیر استعمال ہونے کی وجہ سے میدان جنگ کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ بال رنگے ہوئے اور اپنے اپنے من پسند انداز میں سلجھائے ہوئے۔ کسی کی لٹیں ماتھے پر تو کسی کی آنکھوں سے ہوتی ہوئی گالوں پر جو بار بار ناگن کی طرح رخساروں کو ڈس رہی تھیں۔ ایک دل جلے نے ایک لمبا سانس لیا اور آہ بھری، جسے ہم سب عُرفِ عام میں ٹھنڈے سانس یا آہیں بھرنا بھی کہتے ہیں اور کہا ''کاش میں تمہاری زلفیں ہوتا اور تمہارے سیب جیسے رخساروں پر یوں ہی بھٹکتا رہتا۔ جیسے اس وقت تمہاری آوارہ زلفیں بھٹک رہی ہیں'' اس کے بعد پھر ایک لمبی آہ اور کرسی کی پشت سے لگ کر بے ہوشی کی کیفیت!

کسی آنٹی نے کس کر بڑا سا جوڑا بنایا ہوا تھا اور اس پر کالی جالی بھی لگائی ہوئی تھی۔ میک اپ اپنی اپنی سکن کے کلر کے مطابق تھا۔ بلاوز کے سائز دانستاً چھوٹے رکھے گئے تھے تاکہ اہمیت اور ورتھ قائم بھی رہے اور Visibility بھی زیادہ ہو۔ ساڑھیاں خوبصورت تھیں۔ کمر اور پیٹ ساڑھیوں سے باہر تھے اور ایک عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ ساڑھیاں پشت پر سے جینز کی طرح ٹائٹ رکھی گئی تھیں تاکہ تصویر کے دونوں رخ واضح رہیں اور دلچسپی کا باعث بنے رہیں۔ باڈی ٹاک، انگلش بول چال، مچلتا جسم، بولتی آنکھیں، ناچتے ہاتھ، بہکتے قدم، خون سے بھیگے ہوئے ہونٹ جیسے ابھی ابھی شکار کو کچا ہی چبا کر شیرنی فارغ ہوئی ہو، بلوری جام ہاتھ میں، قہقہے، سسکیاں،

سکاریاں، ناگن کی طرح پھنکارتی، لہراتی، دل کو ہرانگ سے ڈستی ہوئی، ہائے یہ آنٹیاں!

مہمانوں میں کھلبلی اس وقت محسوس ہوئی جب پرمیلا گپتا اور احسان خان (دلیپ کمار کا چھوٹا بھائی) تشریف لائے۔ پرمیلا گپتا ایک انڈین پلے بیک سنگر کے طور پر مشہور تھی۔ بمبئی سے گیبرون اور پھر جوہانسبرگ میں موسیقی کا شوکرنے آئی تھی۔ ہمارے آج کے میزبانوں کی پرزور فرمائش پر اس دعوت میں شریک ہوئی۔ اسی سنگرز ٹیم کا سربراہ خوش مزاج اور مہذب احسان خان تھا۔ میرے ساتھ کافی دیر گفتگو کرتا رہا۔ ابھی ہم لوگ لان میں ہی بیٹھے تھے کہ بنگلے کے ہال کمرے سے آرکسٹرا کی آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ کبھی دھیمی اور کبھی کان پھاڑ دینے والی چیخ و پکار سُنائی دیتی تھی۔ گمانِ غالب تھا کہ آرکسٹرا کو سیٹ کرنے کے بعد اس کی چیکنگ کی جاری تھی۔ بھابھی ست رنگی ساڑی میں ملبوس ہنستی مسکراتی لہراتی اور ہمیں دیکھ کر پھولے نہ سماتی، ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتی مجھے پکڑ کر گھریلو بار کے کاؤنٹر پر لے گئی اور بولی اپنی مرضی سے اپنا ڈرنک لے لیں۔ میں نے ہنستے ہوئے آہستہ سے کہا کہ بھابھوجی میں شراب نہیں پیتا۔ اپنا من پسند ڈرنک لیتے ہوئے ایک آنٹی جن کی دہلیز پر پیرانہ سالی دستک دیا ہی چاہتی تھی، میری طرف غور سے دیکھتی ہوئی بولی مسٹر لونیل یہ شخص ابھی بار بی کیو والے سے پوچھ رہا تھا کہ بیف اور چکن تم کون سی بوچری سے خرید کرتے ہو، کیا یہ حلال ہے؟ مسٹر لونیل نے ان کی تسلی کرائی کہ میں ہمیشہ مسلم بوچری سے گوشت اور چکن خرید کرتا ہوں اور بے فکر ہو جائیں یہ شخص نہ سگریٹ پیتا ہے نہ شراب پیتا ہے۔ آنٹی بولی یہ اور کس کام کا ہے؟ تم یہ سادھو کہاں سے پکڑ لائی ہو۔ آنٹی نشے میں تھی اور مفت کی شراب قاضی کی طرح اڑا رہی تھی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس کی ساڑھی کا پلو کب کا نیچے گر چکا ہے اور وہ صرف بلاوز اور پیٹی کوٹ میں کھڑی ہے۔ ساڑھی برائے نام اس کی ٹانگوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ مسز لونیل نے اشاروں کناروں سے اس کو کئی بار احساس دلایا۔ مگر نشے میں ہونے کی وجہ سے وہ سمجھ نہ سکی یا شاید مستی میں وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں نے ساڑھی اٹھا کر اُس کے اردگرد لپیٹ دی۔ اس کا ایک سرا بلاوز میں پھنسا دیا اور نیچے والا سرا پیٹی کوٹ میں پھنسا دیا تا کہ دوبارہ نہ کھل جائے۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ جب مسز لونیل اس کو پکڑ کر اپنے بیڈروم میں لے جا رہی تھی کہ اس آنٹی کی ستر پوشی دوبارہ سے کر کے اس کو برہنہ ہونے سے بچایا جا سکے تو وہ مسز لونیل سے کہہ رہی تھی کہ یہ آدمی سادھو نہیں ہے یہ تو بگلہ بھگت ہے۔

میں نوید اور عمران اورنج جوس سے ہی دل بہلاتے رہے۔ اتنے میں بھابھو آثار قدیمہ پر نیا رنگ و روغن کر کے اس کو دوبارہ لے آئی مگر میں اپنی کرسی سے اٹھ کر بار بی کیو کی طرف چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ بھابھو صاحبہ نوید اور عمران سے کچھ کہہ رہی ہے اور وہ میری طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ بھابھو صاحبہ میرے پاس آ کر مجھے کہنے لگی آپ نے لڑکوں کو ڈرا دھمکا کر ان کی آزادی کیوں سلب کی ہوئی ہے۔ اندر لڑکیاں ڈانس کر رہی ہیں اور ان کو بلا رہی ہیں۔ لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ ڈیڈی جان کی اجازت نہیں ہے۔ پھر وہ بولی بھائی صاحب میں آپ کی بنتی کرتی

ہوں ان کو اجازت دیں تا کہ یہ ہماری خوشی میں شامل ہوسکیں۔ میں نے دیکھا کہ دونوں لڑکے میری طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔ میرے اشارہ کرنے پر جیسے شاہین پرواز کے لیے پر کھولتا ہے۔ دائیں بائیں اور اوپر دیکھتا ہے اور پھر ایک بڑی اڑان بھرتا ہے۔ لڑکے بھی اسی طرح ہال کمرے کی طرف پرواز کر گئے۔ جب دروازہ نظر نہ آیا تو کون دروازے کو تلاش کرے۔ نوجوانان پاکستان انڈین ناریوں کو فتح کرنے کھڑکیوں سے ہی کود کر لڑکیوں کے دانس میں جا شامل ہوئے اور پھر جو ہلاگُلا اور چیخ و پکار کا شور شرابہ ہوا۔ نشے میں مست ہتھنیاں، گینڈیاں، گائے، بھینس اور بھیڑ بکریاں، تھرکتی کانپتی، ٹھوکریں کھاتی، ساڑھیوں کے پلو گراتی سنبھالتی، ٹھمکے پہ ٹھمکا لگا کر ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اسی اثناء میں بھا بھو صاحبہ تشریف لائیں اور بولی مسز ترپاٹھی آپ کو ڈانس کی دعوت دے رہی ہے۔ میں نے حیرانی سے کہا میں تو کسی مسز ترپاٹھی کو نہیں جانتا۔ وہ بے تکلفی سے ہاتھ مار کر بولی ارے میرے بھولے بھائی جس کی ساڑھی آپ نے ٹھیک کی تھی۔ میں نے تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بھا بھو سے کہا۔ میرے حالات ابھی اتنے خراب نہیں ہوئے۔ میری عمر صرف 45 سال ہے اور میں کم از کم 20/22 سال کی غیر شادی شدہ لڑکی کے ساتھ محو رقص ہوسکتا ہوں۔ بھا بھو صاحبہ نے غالباً میرے اس جواب کو بہت انجوائے کیا بلکہ از راہِ تفنن کہا اگر لڑکی 24/25 سال کی ہو تو.....؟ میں نے کہا 20/22 سال آخری حد ہے۔ ہنس ہنس کر اس کا برا حال ہو گیا۔ ایک دو ہتڑ اس نے مجھے اور دے مارا، ساتھ ہی یہ بھی کہا ''بھائی صاحب مخول بوت اچھا کر دے نے'' (بھائی صاحب مذاق بہت اچھا کرتے ہیں)۔ آخر کار ڈانس اور آرکسٹرا بند کر دیے گئے کیونکہ ہال کمرے میں ڈنر کے لیے بندوبست شروع ہو گیا تھا۔ جو نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں نے کیا۔ ہمارے ہاں اگر DIG یا SHO کی طرف سے بھی ڈنر یا لنچ دیا جا رہا ہو تو کانسٹیبل حضرات بھاگ بھاگ کر تمام انتظام، انصرام کر رہے ہوتے ہیں اور شاباش بچے کی آوازوں پر چابی والے کھلونوں کی طرح کام کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن بوٹسوانہ میں ایسا نہیں تھا۔ میں کسی کام سے سیکرٹری کامرس کے پاس بیٹھا تھا۔ بات چیت کے درمیان اس نے اپنے ڈرائیور کو بلوایا۔ 3/4 بار بلوانے کے ایک گھنٹہ کے بعد جب وہ آیا تو اس نے اپنے باس سیکرٹری کامرس پر چڑھائی کر دی اور بولا باس آپ کو علم ہے کہ یہ میرا لنچ ٹائم ہوتا ہے۔ آپ نے مجھے چار بار بلوا کر بہت ڈسٹرب کیا ہے۔ آئندہ خیال رکھنا ورنہ میں نوکری چھوڑ دونگا۔ سیکرٹری نے باقاعدہ اسے معذرت کی کہ مجھے خیال نہیں رہا۔ جبکہ ڈرائیور منہ میں کچھ کہتا ہوا چلا گیا۔ یہاں دعوت تو DIG ہاؤس میں ہو رہی تھی۔ صرف دروازے پر دربان باوردی تھا۔ دیگر سب لوگ گھریلو تھے۔ ہال کو ڈنر کے لیے تیار کر کے ڈنر لگا دیا گیا اور مہمانوں کو دعوتِ عام دی گئی کہ تشریف لائیں اور ڈنر کریں۔ ڈنر میں ان گنت ڈشز تھیں۔ اگر میں گننا چاہتا تو گن نہیں سکتا تھا۔ اپنی عوام کے لیے صرف اتنا لکھوں گا کہ آلوؤں کی ہی 10/20 قسم کی ڈشز تھیں۔ گوشت، چکن، دیگر سبزیاں، چٹنیاں، میٹھے میں ان

گنت ورائٹی تھی۔ پان مصالحہ جات کی اقسام کا ایک بڑا مینو الگ سے سجایا گیا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی عار نہیں ہے کہ اس ڈنر سے پہلے اور آج تک اتنی زیادہ اقسام کی ڈشز اور دیگر لوازمات ایک وقت میں نہیں پیش کیے گئے ہوں گے۔ یہ بھا بھو صاحبہ کا ہی کمال تھا جس کو ہم اس کی سادگی کی وجہ سے پھتو بھا بھی کہتے تھے۔

ڈنر کے بعد مسٹر لونیل مجھے اپنے بنگلے کی سیر کرواتے رہے۔ جگہ جگہ کھڑے ہو کر بتاتے کہ انگریزوں کے دور میں یہ بنگلہ ٹیکس کلیکٹر کا تھا جو اس وقت بہت بڑی اتھارٹی ہوتا تھا۔ یہاں وہ سوتا تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ لوگوں کی درخواستیں وصول کرتا تھا وغیرہ۔ میرا خیال تھا کہ مسٹر لونیل ابھی تک نو آبادیاتی دور کے اثرات سے متاثر تھے یا کمپلیکس میں مبتلا تھے۔ میری ایسی باتوں میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ بہر حال یہ ایک خوبصورت رنگین اور بہت بڑی دعوت تھی۔ بہت بھلے انداز میں اس کو Organize کیا گیا تھا۔ باقی جو کچھ بھی تھا وہ ان کے کلچر، ماحول، غربت سے نکل کر خوشحالی کی طرف قدم رکھنا، خود کو خاندانی خوشحال اور ماڈرن فیملیز کی طرح دکھانا یا برتاؤ کرنا یہ ایک الگ رویہ تھا۔ جس کے اثرات من حیث الکمیونٹی نہ صرف ظاہر تھے بلکہ یہ لوگ اس حمام میں سب کے سب ننگے تھے۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ ہم سب کا شکریہ ادا کر کے واپس آنے لگے تو احسان خان بھاگے بھاگے، اپنی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے تشریف لائے اور بولے کل کمیونٹی ہال میں ہمارا میوزیکل شو ہے۔ آپ ضرور تشریف لائیں۔ میں آپ کو Complementary Invitation جاری کر رہا ہوں۔ ابھی اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ میں نے کہا خان صاحب پلیز رکیں مجھے فری میں دعوت نامہ نہیں چاہیے۔ ہم تینوں ضرور آئیں گے اور ٹکٹ لے کر آئیں گے۔ کیونکہ سُر اور سنگیت سے بے حد لگاؤ ہے اور ہم جہاں بھی جاتے ہیں تینوں اکٹھے ہی جاتے ہیں۔ آپ کا بہت شکریہ۔ اگر آپ فرنٹ لائن میں ہمارے لئے تین سیٹیں مخصوص کر دیں تو یہ آپ کی نوازش ہوگی۔ ہم اس کو آپ کی فری دعوت خیال کرتے ہوئے آپ کے ممنون و مشکور ہونگے۔ وہ بولے خان صاحب فکر نہ کریں ایسا ہی ہوگا۔

دوسرے روز اتوار تھا۔ نوید مارکیٹ تک گیا تو واپس آ کر اس نے مجھے بتایا فروٹ کی ہول سیل شاپ پر بھارت سے آم امپورٹ کئے گئے ہیں۔ میں نے بیٹے کا شوق دیکھتے ہوئے کہا کہ آؤ چلتے ہیں اگر سہارن پوری آم ہوئے تو یہ آموں کی ایک اچھی قسم ہوتی ہے۔ دکان پر جا کر پتہ چلا کہ مالکہ ایک چائنیز لڑکی ہے۔ وہ نیکر اور بلاوز پہنے کھڑی تھی۔ آموں کے ڈبے گتے کے تھے اور ہر ڈبے میں 5 کلو آم تھے۔ وزن، پیکنگ کی تاریخ اور دیگر تمام ضروری معلومات ڈبے پر پرنٹ کی گئی تھیں۔ میں نے ریٹ طے کر کے 10 ڈبے خرید لیے۔ کار میں رکھے اور اپنے ویئر ہاؤس میں آ گئے۔ ساتھ والی سپر مارکیٹ سے برف بھی مل گئی۔ جو ایک کلو کے پیکٹ کی شکل میں گتے کے ڈبے

میں آئس کریم کی طرح پیک کی گئی تھی۔آم کے دو ڈبے کھول کر، برف لگا کر، دو گھنٹے کے اندر ہم تین لوگ 10 کلو آم چٹ کر گئے۔ دو اور ڈبے کھول کر دوبارہ برف میں لگا کر رکھ دیے گئے۔ تا کہ سیکنڈ شفٹ لگائی جا سکے۔ابھی ملازمہ مرسی ڈیشو چھلکے وغیرہ اٹھا رہی تھی کہ لوباسٹی ٹاؤن سے دو سول آفیسر ملنے آ گئے۔ وہ حیرانی سے بولے۔

Who Spoiled These mango? میں نے ہنستے ہوئے کہا یہ ہم نے ابھی صرف چکھے ہیں۔ پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔ میں نے آموں کی بالٹی کی طرف اشارہ کیا اور کہا پھر ہم یہ آم کھائیں گے۔ وہ انہیں قدموں پر واپس جانے لگے تو میں نے پوچھا واپس کیوں جا رہے ہو؟ وہ بولے ہم ہسپتال میں آپ لوگوں کے لیے بیڈز کا بندوبست کرنے جا رہے ہیں۔اس کے بعد ایک بڑا قہقہہ لگا۔

شام کو ہم فریش ہو کر میوزیکل شو دیکھنے اور سُننے چلے گئے۔ گیبرون اور جوہانسبرگ ایشین کمیونٹی سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔احسان خان صاحب نے حسبِ وعدہ چار سیٹر ایک صوفہ ہمارے لئے مختص کیا ہوا تھا۔ہمیں دیکھتے ہی وہ تشریف لے آئے۔ بہت عزت واحترام کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں صوفے تک لے گئے۔ سلام دعا، حال احوال پوچھنے اور بتانے کے بعد وہ اپنے انتظامی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ ہم بھی ہجوم ظالماں و مظلومین میں شامل ہو کر جائزہ لینے لگ گئے۔ایک سیٹ ہمارے پاس فالتو تھی اور میں خوبصورت ہمسایہ گیری کا قائل ہوں۔ بقول سہیل آفتاب:

صرف لفظ نہیں میں شعور لکھتا ہوں
ہر رنگ سے بہکتا سُرور لکھتا ہوں

یہاں ظالموں سے مراد وہ شوہر ہیں جو اپنی بیویوں سے نہیں ڈرتے اور مظلوموں سے مراد وہ شوہر ہیں جو اپنی بیویوں سے ڈرتے ہیں۔آج کی محفل صرف رنگین ہی نہیں تھی بلکہ قوس قزاح کے رنگوں کی مانند تھی۔ وہ فیملیز آئی ہوئی تھیں جن کا براعظم افریقہ کے بزنس پر قبضہ ہے۔ بڑے بڑے بزنس Icons جن کے بزنس اور پراپرٹی کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔مگر یہ سب ان کھیت مزدوروں کی اولاد ہیں جن کو ولندیزی، برٹشرز اور ویسٹ افریقہ میں فرانسیسی، دیگر جزائر جیسے ماریشس، ری یونین آئی لینڈ نیشلز، مڈغاسکر وغیرہ میں جہاز بھر بھر کر لائے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے آباؤ اجداد مزدور سے وینڈر بنے، دکاندار بنے اور پھر ترقی کرتے کرتے عرصہ دو صد سال، زیادہ یا کم، اس معیار پر جا پہنچے۔اللہ رب العزت انہیں مزید ترقی دے۔آمین! اکثریت مسلمانوں کی تھی لیکن ہندو کمیونٹی بھی تھی۔ بزنس مین، ملازم، گورنمنٹ ملازم سبھی بہت ذوق شوق سے شمولیت کر رہے تھے۔مسلمان عورتیں دور سے ہی اپنے مکمل لباس اور سر پر سکارف کی وجہ سے نظر آ رہی تھیں۔جینز، کرتیاں، ساڑھیاں آدھا جسم ننگا، میک اپ کی

فراوانی یہ سب کچھ ہندو خواتین میں نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہندو لوگ سٹیج پر آ کر گانے کا شوق بھی فرما رہے تھے کیونکہ سازندے موجود تھے لیکن ابھی پرمیلا گپتا اور دیگر لوگ تشریف آور نہیں ہوئے تھے۔ انتظامیہ عوام کو مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لئے جو بھی گانا گانے کا شوق پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس کو سازندوں کی سہولت فراہم کر دی جاتی تھی۔ یہ سازندے بھی بھارت سے پرمیلا گپتا کے ساتھ ہی آئے تھے۔ (سفالانا چین) (Safalana Chain) کے مالک جو ایک ملٹی ملینیئر ہندو تھا، سٹیج پر آیا ایک گانا سنایا۔ آواز تو واجبی سی تھی مگر سُر اور تال سے واقف تھا اس لئے کامیاب رہا۔ جیسے ہی وہ سُر سنگیت سے فارغ ہوا۔ پہلی لائن میں بیٹھے ہوئے کسی ہندو خاندان نے اس کے بیٹے کی شادی کی ودھائی دے ڈالی جو حال ہی میں ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر ودھائی سویکار کر لی۔ ایک خاتون نے اسے کہا کہ میں ابھی آپ کی بہو سے ملی ہوں۔ بہت سندر اور من موہنی صورت کی مالک ہے۔ یہ Arranged Marriage تھی یا Love Marriage؟ سفالانا سیٹھ نے بہت تحمل سے جواب دیا: جی ہاں میرے بیٹے نے دلہن سمیت تمام Arrangements کر کے مجھے اطلاع دی تھی اور کہا تھا پتا جی آ کر میرے پھیروں کا سماں دیکھیں اور مجھے ودھائی دیں۔ لہٰذا میں اس کو Arragned Marraiage مانتا ہوں۔

جب ہم ہال میں داخل ہوئے تھے۔ احسان خاں نے ہمارا خوش دلی سے استقبال کیا تھا۔ ہمیں ہماری جگہ پر بٹھا کر وہ دیگر انتظامی امور میں مصروف ہو کر غائب ہو گیا۔ تالیاں، سیٹیاں اپنے اپنے انداز میں ایک سماں تھا جو ناریوں نے باندھ رکھا تھا۔ اسی شور وغل میں احسان خاں اور پرمیلا گپتا تشریف لے آئے۔ لوگوں کی تالیوں نے ان کا استقبال کیا۔ اب احسان خان نے خوبصورت کوٹ پینٹ اور ٹائی پہنے ہوئے تھے۔ جبکہ ٹائی کا ڈمپل بھی بہت مناسب تھا۔ احسان خاں مردانہ وجاہت کے مالک تھے۔ فریش ہو کر، لباس زیب تن کر کے آئے تھے اس لئے بہت Handsome لگ رہے تھے۔ ایک منٹ میرے پاس رکے اور پھر Stage پر چلے گئے۔ اپنا اور اپنے تمام ساتھیوں کا تعارف کرایا پھر پرمیلا گپتا کا تفصیلاً CV بیان کیا اور کہا کہ ان کی طبیعت ناساز تھی مگر جیسے ہی گیبرون اور جوہانسبرگ کے پیار کرنے والے لوگوں کا دعوت نامہ اور فرمائش موصول ہوئی تو یہ اپنی طبیعت کی پرواہ کئے بغیر جہاز میں سوار ہو گئیں۔ پرمیلا گپتا سازندوں کے ساتھ اجودھا بائی کی طرح تخت افروز ہو کر تمکنت سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ یہ ایک بڑا کراؤڈ تھا جو شاید بھارت میں اس کو میسر نہیں آ سکتا تھا، کیونکہ بھارت میں ایک سے ایک اچھا سنگر موجود تھا۔ مقابلہ بہت سخت تھا۔ لوگ فن موسیقی سے اچھے خاص بہرہ ور تھے۔ باقی رہا سوال طبیعت خراب ہونے کا تو اداکار، سنگر یا شوبز دنیا کے دیگر لوگ یہ سب کا وطیرہ ہے۔ اپنا لمبا چوڑا تعارف کروانے کے بعد اپنے آپ کو The Only One کہلوا کر طبیعت خراب ہونے کے باوجود آنے کا احسان ضرور کریں گے۔ اب تو شوبز کے مرد حضرات نے بھی طبیعت خراب ہونے کے باوجود آنے کا احسان کرنا شروع کر دیا ہے۔ بس اپنی اہمیت

جتانے کا ایک بھونڈا انداز ہے۔ احسان خان نے مائیک پر میلا گپتا کو دے دیا۔ وہ ادھر اُدھر کی ہانکتی رہی۔ بات پھر طبیعت خراب ہونے کے باوجود ہزاروں میل کا سفر کرنے اور لوگوں پر احسان جتانے پر جا کر ختم ہوئی۔ آخر کار پروگرام کا آغاز ہو گیا۔ بطور سنگر پر میلا بس گزارہ تھی۔ میں خاص طور پر اس کو نوٹ کر رہا تھا۔ جب سُر اس کے گلے سے گرنے والا ہوتا یا گر رہا ہوتا تو وہ اپنے طبلچی کی طرف دیکھتی۔ ادھر کی بورڈ والا اس کی دھاڑ نکلوا دیتا۔ دوسری طرف طبلچی تھاپیں مارنا شروع کر دیتا اور اس طرح پر میلا کا مشکل وقت گزر جاتا اور وہ ہلکے سُروں میں تال کو سنبھال لیتی۔ یہ کئی بار ہوا۔ پروگرام چلتا رہا۔ ایک بجے وقفہ ہوا تو میں اٹھ کر سٹیج پر گیا۔ جہاں سب لوگ چائے اور دیگر لوازمات سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے طبلچی کی بہت تعریف کی اور اس کو 100 پولے کا نوٹ انعام میں دیا اور کہا کہ آپ اپنے فن میں بہت ماہر ہیں۔ جہاں میڈم کا بس نہیں چل رہا تھا آپ نے وہاں اپنے فن سے ان کی مدد کی۔ وہ کچھ حیران ہوا اور ہاتھ باندھ کر بولا: بس جی بھگوان کی کرپا ہے ورنہ میں کیا اور میرا فن کیا۔ قارئین کرام کی اطلاع کے لیے عرض ہے۔ پولا بوٹسوانہ کی کرنسی کا نام ہے اس وقت ایک پولا پاکستانی دس روپے کے برابر تھا اور سوانہ زبان میں پولا کا مطلب بارش ہے۔ جیسے ہی احسان خان کو میرا طنز سمجھ آیا۔ انہوں نے فوراً چائے کا کپ چھوڑ دیا اور مجھے گیبرون میں اپنے دوسرے میوزیکل شو کا بتانے لگ گئے جو گیبرون سن کے ہال میں ہونا تھا۔ بڑی گرما گرم دعوت دینے کے بعد آہستہ سے بولے۔ یہ آرٹسٹ لوگ بھی انسان ہونے کے ناطے رعایت کے مستحق ہیں۔ غلطی سب سے ہوتی ہے۔ فلم، ریڈیو، ٹی وی کے پروگرام غلطیوں سے پاک ہو کر نشر ہوتے ہیں جو پوری ٹیم کی کاوش ہوتی ہے۔ یہاں تو جو کچھ بھی گلے سے نکلا عوام تک جا پہنچا۔ آپ نے غلطی 100% صحیح پکڑی ہے مگر ذرا بھی رعایت نہیں کی۔ غلطی کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ یہ سب میں بھی دیکھ اور سن رہا تھا۔۔

شو کا دوسرا دور شروع ہو گیا جو پاکستانی گانوں پر مشتمل تھا۔ زیادہ تر نور جہاں کے نمبر گائے جا رہے تھے۔ دیگر سنگرز کے علاوہ ریشماں کے نمبرز بھی پسند کئے جا رہے تھے۔ مشرقی پنجاب سے ایک ہندو فیملی کی خاتون نے فرمائش کی چٹ بھیجی۔ جس پر ''سانوں نیر والے پُل تے بُلا کے'' لکھا تھا۔ یہ گانا پر میلا نے اچھا اور بہت شوق سے گایا اور بہت خوب گایا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب وہ گانا ذرا اہتمام سے گا رہی ہے۔ سُر اور تال کا خیال رکھتے ہوئے جہاں تکرار ضروری ہے۔ وہاں تکرار بھی ہو رہی ہے۔ گلے کی مُرکیوں سے کام لینے کی کوشش بھی کر رہی ہے۔ کبھی کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ میری پشت والی لین میں بیٹھی ایک خاتون نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لا کر انگلش میں کہا کیا یہ گانا آپ کے ملک پاکستان سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے اپنا منہ اس کی طرف کر کے اس کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا ابھی آنٹی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ مگر سرحدیں نوجوانی سے بڑھ کر جوانی پر قبضہ کر کے عمرِ عزیز کے میدانی، پہاڑی علاقوں پر بھی قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ گورا چٹا رنگ، کٹورا سی آنکھیں، چوڑی پیشانی، بال گھنے

اور لمبے جو دونوں شانوں سے نیچے تک پھیلائے ہوئے تھے جیسے سیاہ بادل دن کی روشنی کو ڈھانپ کر اندھیرا کر دیتے ہیں۔ابھی میں یہاں تک ہی دریافت کر پایا تھا کہ سوال پھر دوہرایا گیا۔میں نے اپنا خشک گلہ اس کی آواز سے تر کرتے ہوئے صرف "Yes" کہا۔دوسرا سوال کیا گیا۔آپ یہ لینگوئج لفظ بہ لفظ سمجھ اور بول سکتے ہیں؟ میں نے پھر پہلو بدل کر اس کی طرف دیکھا تو بہت نستعلیق انگلش میں اس نے اپنا سوال دہرایا۔اس کی آواز میرے کانوں میں جھرنے کی آواز کی طرح ٹکرا رہی تھی۔میں نے نوید کی تلاش میں نگاہیں ادھر اُدھر گھمائیں تو وہ ڈانسنگ فلور پر لڑکیوں کے ساتھ محوِ رقص تھا۔میدان خالی دیکھ کر میں نے اسے کہا مجھے اس طرح اپنی گردن دوسری طرف کر کے آپ سے گفتگو کرنے میں دقت محسوس ہو رہی ہے۔آپ میرے پاس برابر میں تشریف لے آئیں تو میں نہ صرف آپ کے سوالوں کا جواب دے سکوں گا بلکہ یہ میرے لئے آنر بھی ہوگا۔وہ اٹھی اور میرے برابر والی جگہ پر آ گئی۔ میں نے کھڑے ہو کر بہت گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا و۔ہ بولی کیا اس گانے کو آپ انگلش میں Interpret کر سکتے ہیں۔میں نے بہت مؤدب ہو کر جواب دیا میں لفظ بہ لفظ اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔

جب میں نے اس کو بتایا کہ یہ لڑکی جو شاعری میں اپنی کیفیت بیان کر رہی ہے اس کا مطلب اپنے محبوب سے شکوہ کرنا ہے کہ مجھے تم نے نہر کے پُل پر ملنے کے لیے بلایا تھا اور میں مقررکردہ پل پر پہنچ گئی ہوں مگر تم اب تک نہیں آئے۔ مجھے کیا معلوم کہ تم اب کدھر ہو۔ابھی میں یہاں تک ہی پہنچا تھا کہ وہ جذباتی انداز میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور مجھے کہنے لگی۔ میری شادی ایک پاکستانی آدمی سے ہوئی تھی۔ وہ مجھے بہت پسند تھا۔اچھا اور خوبصورت نفیس انسان تھا۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش تھی۔وہ چند دن کے لیے پاکستان گیا پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔اس کی خیر خبر بھی نہ آئی۔اگر کوئی چیز پاکستان سے آئی تو وہ طلاق تھی۔اب یہ لڑکی بھی کہہ رہی ہے کہ مجھے بلا کر میرا محبوب پتہ نہیں کہاں کھو گیا ہے۔اور ساتھ ہی موٹے موٹے آنسو ''میرے نینا برسیں چھم چھم چھماں چھم'' کے موافق اس کے خوبصورت رخساروں پر گرنے لگے جو ایسے محسوس ہو رہے تھے جیسے سفید گلاب پر شبنم کے قطرے۔میں نے اس کو کھینچ کر دوبارہ پہلو والی سیٹ پر بیٹھا لیا۔جیب سے ٹشو نکال کر اس کا میک اپ خراب ہونے سے پہلے آنسو ٹشو سے اٹھا لیے اور اس کو سمجھانے والے انداز میں کہا کہ جہاں تک گانے کا سوال ہے یہ شاعر کا خیال ہے اور فلم کی سچویشن کے مطابق سین کی ڈیمانڈ ہو سکتی ہے۔شاعر شراب کے نشے میں بھی ہو سکتا ہے اور خود شاعر کے ساتھ یہ حادثہ بھی ہو سکتا ہے۔وہ مزید جذباتی انداز میں بولی: آفتاب! یہ بتاؤ کیا یہ سب Sincerity پر مبنی ہے۔.No.No میں نے کہا۔اتنے میں نوید نے دیکھا کہ میرے پاس کوئی بیٹھا اتنے انہماک سے باتیں کر رہا ہے تو وہ سب کچھ چھوڑ کر گولی کی طرح میرے پاس آیا اور خاتون اور میرے درمیان آ کر پتھر کی چٹان کی طرح فکس ہو گیا۔میں نے جلدی سے خاتون سے کہا یہ میرا بہت ہی پیارا بیٹا ہے۔مزید میں نے خاتون کو مشورہ دیا کہ آپ سکون سے بقایا پروگرام

دیکھیں۔آپ جب بھی مجھے ملنا چاہیں تو ویئر ہاؤس تشریف لے آئیں۔جب میں نے اس کو ایڈریس سمجھانے کی کوشش کی تو وہ بولی مجھے معلوم ہے میں کئی بار شاپنگ کے لیے آ چکی ہوں۔آپ میرا وزٹنگ کارڈ رکھ لیں پھر ملاقات ہوگی۔کارڈ دیکھنے پر پتہ چلا کہ افریقن مال پر جو بیڈنگ کا بہت بڑا اسٹور ہے وہ اس کی مالکہ ہے اور محمد بھائی جن کو ہم اس اسٹور کا مالک سمجھتے تھے وہ اس کے ملازم ہیں۔محمد بھائی کی بیوی بھی اسی اسٹور پر کام کرتی تھی۔

پاکستانی اُردو، پنجابی نمبر پر میلا بہت توجہ اور محنت سے گاتی رہی۔تین بجے تک یہ محفل برپا رہی اور آخری نمبر لالی میری پت رکھیو بلا جھولے لالن سخی شہباز قلندر دما دم مست قلندر پر ہوا۔اس نمبر پر خواتین وحضرات نے وہ دھمال ڈالی کے محفل کا رنگ ڈھنگ قابل دید ہوگیا۔خوبصورت جوانیاں ہرانگ سے دھمال میں مست ہو کر اپنا آپ بھول گئیں۔ہوش اس وقت آیا جب انتظامیہ نے لائٹس آف کر دی۔

ابھی لوگ ہال سے باہر جا ہی رہے تھے کہ احسان خاں میرے پاس آئے اور بولے میڈیم نے آپ کو اور آپ کے ذوق شوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بے حد احتیاط اور لگن سے تمام نمبرز گائے ہیں۔آپ چل کر میڈیم کو داد دیں تا کہ کل کے پروگرام میں وہ مزید دل لگا کر آپ لوگوں کو محظوظ کر سکیں۔میں اخلاقاً احسان خاں کا لحاظ اور عزت کرتے ہوئے سٹیج پر چلا گیا۔پرمیلا اپنا آپ سنبھالتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔وہ سانولے رنگ کی ایک درمیانے بھرکم کی خاتون تھی۔بال بچے دار بھی ہوگی۔رویے کے لحاظ سے شوبز کی سیکنڈ کلاس خواتین سے ذرا کم ہی تھی۔نخرے کا یہ عالم تھا کہ یا طبیعت خراب تھی یا رات 8 بجے سے لے کر صبح 3 بجے تک گاتی رہی۔میں نے واجبی سے چند جملے کہے اور سٹیج سے نیچے اتر آیا جہاں میرا بیٹا میرا انتظار کر رہا تھا۔مجھے ہر نقلی چیز سخت ناپسند ہے۔پولٹری کا انڈا، برائیلر All Inorganic Foods/Fruits، حضرت انسان جو مصنوعی طرزِ عمل اختیار کرے اور Impersonation کرے چاہے وہ کوئی بھی ہو۔پرمیلا شکل صورت کے لحاظ سے نخروں کا منبع نہیں تھی۔لہٰذا مصنوعی نخرے، ادائیں، اس کے چہرے اور باڈی ٹاک سے بُرے اور cheap لگ رہے تھے۔بس عورت ہونے کے علاوہ اور دل لبھانے والی کوئی ادا یا خاصیت اس میں نہ تھی۔اس موضوع کو یہاں پر ختم کر کے اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آتا ہوں۔

دھمال اکثر خواتین وحضرات نے ڈالا اور ایک سماع بندھ گیا۔دھمال ایک ایسی طرز ہے جو ہر کسی کے پاؤں کو گردش میں لے آتی ہے اور اگر ہندو ناریوں کی ساڑھیاں سرک سرک کر زمین پر بچھی جا رہی ہوں اور جھولے لالن کی تھاپ پر قدرت کی عطا ہر پری وش، ہر مہر و ماہ ہر رشک حور کے چہرے اور دیگر اعضا سورج کی طرح تمازت حاصل کر کے پردیسیوں کو کوئلہ کباب کر رہے ہوں تو جلنے والا ہی جانتا ہے یہ تو اللہ بھلا کرے انتظامیہ کا جنہوں نے آگ کے شعلوں کو بھڑکنے سے پہلے ہی لائٹس آف کر کے روک دیا کیونکہ نیم لباس میں ناریاں رقص کرتے ہوئے

ایسے لگ رہی تھیں جیسے شعلے رقص کر رہے ہوں۔ دھمال یورپ، امریکہ، آسٹریلیا، افریقہ اور ایشیا کے ہر ملک میں ڈالی جاتی ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ اور تاریخ کیا ہے اس کی استھائی کچھ اس طرح ہے:

لال میری پت رکھیو بھلا جھولے لالن
سندھڑی دا سیہون دا سخی شہباز قلندر
دمادم مست قلندر سخی شہباز قلندر سخی لال قلندر

یہ سندھ کے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ سید عثمانی مروندیؒ المعروف لال شہباز قلندر کا صوفیانہ کلام ہے جو ۱۱۷۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۴ء میں وصال فرما گئے۔ سیہون شریف میں آج بھی ان کا مدفن سندھ کی پہچان ہے۔

اصل صوفیانہ کلام جس کی استھائی میں نے اوپر لکھی ہے تیرھویں (13) صدی میں صوفی شاعر امیر خسروؒ جو دنیا میں اپنی پہچان خود ہیں اور دلی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار سے ملحقہ احاطے میں ان کا مدفن ہے انہوں نے لکھا۔ اس کے بعد بابا بلھے شاہ نے اٹھارویں صدی میں اس کی نوک پلک پھر سے ٹھیک کی۔ اس کو سندھی کلچر میں ڈھالا اور جھولے لالن کا زیور اس نظم کو پہنایا۔ جھولے لالن کا مطلب ہے ایک خوبصورت جوان جس نے لال لباس پہنا ہو۔ مزید 600 سال بعد یہ علاقائی اور اسلامک کلام بن گیا۔ بھارت اور ایران میں بھی اس پر طبع آزمائی کی گئی۔ اور اسی طرح پنجاب اور سندھ میں ہر گانے والے اور شوبز کے مرد و خواتین کی پہچان بن گیا۔ کیونکہ بہت لوگوں نے اس کو گایا بھی اور بجایا بھی۔ قلندر اسلام میں صوفی بزرگوں کا لقب ہے۔ یہ ان بزرگوں کو کہا جاتا ہے جو روحانی طور دوسرے بزرگوں سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سمجھے جاتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں صرف دو قلندر مشہور ہیں۔ سخی شہباز قلندرؒ آف سیہون شریف سندھ پاکستان اور قلندر بوعلی شاہؒ آف پانی پت بھارت۔ حضرت رابعہ بصریؒ کو بھی آدھا قلندر کہا جاتا ہے۔ اس طرح پوری دنیا میں صرف اڑھائی قلندر ہوئے۔

1956 میں فلم جبرو کے لیے ''لال میری پت'' کو اس وقت کے مایہ ناز کمپوزر نے دوبارہ ری کمپوز کیا اور عنایت حسین بھٹی، فیصل حسین، اے آر بسمل نے اسے گایا۔ آج تک پوری دنیا میں اسی کمپوزیشن میں گایا جاتا ہے۔ یہ کمپوزر ماسٹر عاشق حسین ساکن بازار حکیماں لاہور تھا۔ ماسٹر عاشق حسین 2017ء میں جب فوت ہوئے تو اکثر پاکستانی نہیں جانتے تھے کہ یہ وہی جادوئی انگ کا کمپوزر ہے جو دنیا کو ایک انمول اور Melodious دھن دیکر جا رہا ہے۔

دوسری طرف شاعر ساغر صدیقی نے 1956ء میں فلم جبرو کے لیے اس کلام کو دوبارہ دھمال کے انداز اور آسان الفاظ میں لکھا جو امر ہو گیا۔ آج بھی دنیا اس کی دیوانی ہے اور اس کا کوئی نعم البدل نہیں مل سکا۔

ملکہ ترنم نورِ جہاں نے یہ دھمال فلم ''دِلاں دے سودے'' کے لیے گائی۔ ملکہ کے گانے میں اتنا سوز اور ترنم تھا

کہ روح کے تار بھی جھنجھنا اٹھتے تھے۔ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو انتقال کرنے والی ملکہ ترنم بھی سخی شہباز قلندر کی مریدنی تھی۔ ملکہ کو اس دھمال کی ریکارڈنگ کی جتنی آمدنی ہوتی اس کا کچھ حصہ وہ قلندر کے نام پر خیرات کر دیتی تھی۔ مُلکِ عزیز کی صوفیانہ کلام گانے والی گلوکارہ عابدہ پروین بھی قلندر کے مزار پر دھمال ڈالتے اور گاتے دریافت ہوئی ہیں۔ اور یہی دھمال اس کی وجہ شہرت بنا۔ جب آپ دھمال سن رہے ہوں اور دما دم مست قلندر کی آواز پر آپ اگر اپنے پاؤں کو گردش کرنے یا رقص کرنے سے روکتے ہیں تو خون کی گردش اور تنفس تیز ہو جاتا ہے۔ آپ کی نس نس اور رواں رواں رقص کرنے لگتا ہے۔ یہ سخی شہباز قلندر کی زندہ کرامت ہے۔

ایک روایت کے مطابق لال شہباز قلندر ایک خوبصورت جوان تھے۔ بولتے کم تھے۔ خاموش بیٹھے رہتے۔ دن کے وقت اپنے حجرے سے نکل کر ایک اونچی جگہ پر دھوپ میں بیٹھ جاتے۔ جہاں وہ تشریف فرما ہوتے وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک بہت امیر ہندو خاندان کی ماڑی (گھریلو عمارت) تھی۔ جس میں ایک حسین و جمیل لڑکی رہتی تھی۔ اپنی ماڑی سے قلندر کو دیکھتی رہتی، اشارے کرتی تھی اور ہر قسم کے جتن کرتی کہ کسی طرح قلندر کوئی جواب دے۔ مگر قلندر تو اپنی مستی میں مست، کبھی آسمان کو دیکھ لیتا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ آخر کار ایک عرصہ گزرنے کے بعد بھی ہندو لڑکی کو ناکامی ہوئی تو اس نے قلندر کو پیغام بھیجا۔ اگر تم نے میری طرف دیکھ کر میری بات کا جواب نہ دیا تو میں اسی ماڑی کی اوپر والی منزل سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں گی۔ جب یہ پیغام کسی توسط سے قلندر تک پہنچا تو وہ صرف مسکرائے اور جواب دینے کی بجائے اٹھ کر اپنے حجرے میں چلے گئے۔ اسی اثناء میں اس ہندو لڑکی نے اپنی ماڑی کے سب سے زیادہ اونچائی والی جگہ سے چھلانگ لگا دی اور زمین پر گرتے ہی دوسرے جہاں کوچ کر گئی۔ ایک شور برپا ہو گیا۔ ہندو بہت امیر اور بااثر خاندان تھا۔ عوام کا ایک ہجوم اُمڈ آیا۔ آپ بھی حجرے سے باہر آ گئے اور جو چادر آپ نے اوڑھ رکھی تھی وہ اتار کر مُردہ لڑکی کے اوپر ڈال دی۔ خود جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اب لڑکی کے وارثان نے اس کے مردہ جسم کو اٹھانا چاہا مگر نہ اٹھا سکے۔ بہت لوگوں نے مل کر زور لگایا مگر نہ اٹھا سکے۔ قلندر اپنی جگہ سے اٹھے اور لوگوں کو بتایا کہ یہ لڑکی روحانی طور پر مجھ سے منسوب ہو چکی تھی اور مسلمان ہو چکی تھی۔ اگر مسلمان اس کا جنازہ اٹھا کر اسلامی طریقہ کے مطابق اس کی تدفین کریں گے تو جنازہ اٹھ جائیگا۔ ورنہ تم لوگ زور لگا چکے ہو۔ چاہو تو اور کوشش کر کے دیکھ لو۔

لوگوں نے قلندر کو آج پہلی مرتبہ بولتے سنا تھا۔ اس سے پیشتر وہ کبھی بات چیت کرتے نہ پائے گئے تھے۔ ایک کہرام مچ گیا۔ مسلمان بھی آ گئے۔ جب ہندو تھک ہار گئے اور لڑکی کا جنازہ نہ اٹھا تو امام مسجد آگے بڑھا۔ کلمہ شہادت کا ورد کرتے ہوئے جنازہ اٹھا کر کھٹیا پر رکھا اور گھریلو عورتوں کے حوالے کیا تا کہ اگلے سفر کی تیاری کر سکیں۔ دریائے سندھ میں ایک مائی بی بی کا مزار اونچے ٹیلے پر ہے۔ جس کے چاروں طرف پانی ہے یہ وہی مائی بی بی ہے۔

ہندو، مسلمان سب عرُس کے دنوں میں مائی بی بی کی رسم مہندی کے طور پر نذر نیاز لے کر جاتے ہیں۔ دعائیں اور منتیں مانگی جاتی ہیں۔ پرانی منتیں پوری ہونے کی صورت میں نذر نیاز دی جاتی ہے۔

واپس اپنے ٹاپک پر آتے ہیں۔ جمعرات کو میں اور نوید محمد بھائی کے گھر جایا کرتے تھے۔ ان کو اسلامی قدروں کے بارے لیکچر لینے اور صحابہ کرام و احادیث مبارکہ کے بارے میں تاریخی حالات جاننے بہت شوق تھا۔ میرا پڑھا لکھا یہاں کام آ رہا تھا۔ ان فیملیز کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ محمد بھائی منگل یا بدھ کو ہی ہمارے ساتھ پروگرام بنا کر دعوت دے جاتے تھے۔ بلکہ جمعرات کو اپنا سٹور بند کرتے ہی ہمارے پاس آ جاتے اور ہم دونوں کو ساتھ لے کر جاتے۔ ان کی اہلیہ محترمہ اور دیگر رشتے دار خواتین بھی ہمیں سُننے کے لیے محمد بھائی کے گھر جمع ہو جاتے۔ رات کے کھانے کے بعد یہ محفل 11/12 بجے تک جمی رہتی۔ مجھے روحانی خوشی ہوتی جب سامعین میں سے کوئی مرد و خاتون یہ کہتا ہوا پایا جاتا کہ ادریس بھائی آپ نے میری زندگی سنوار دی مجھے اس سے پہلے یہ علم نہ تھا۔ دوسرے روز شام کا میوزیکل شو بھی گزشتہ شب جیسا ہی تھا کوئی نئی قابل ذکر بات نہ تھی۔ اس لئے اس کا کوئی ذکر نہیں۔

ایک روز میں اپنے ویئر ہاؤس میں بیٹھا سٹاک کی لسٹ بنا رہا تھا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا تو 4/5 مقامی لوگ ویئر ہاؤس میں داخل ہو رہے تھے۔ ایک آدمی معزز اور پُرکشش تھا۔ باقی لوگ عام سے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ویلکم کہتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ کرسیاں پیش کیں اور ملازمہ کو ڈرنکس پیش کرنے کا کہا۔ ہیلو ہائے ہوتا رہا۔ جب ڈرنکس پیش کر دیے گئے تو میں نے سربراہ سے پوچھا میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ اس نے بہت باوقار انداز میں اپنا تعارف کروایا۔ اس کے تعارف کے مطابق جب بوٹسوانہ، بچوانا لینڈ تھا تو یہاں بادشاہت تھی اور وہ اس بادشاہ کا بیٹا تھا۔ آج تقریباً تیس سال گزرنے کے بعد اگر میں بھول نہیں رہا تو اس نے اپنے والد کا نام Sir Seretse Goitsebeng maphire Khmas GCB, KBC بتایا تھا۔ اور اپنا نام Tshekedi Khama بتایا تھا۔

وہ ایک باوقار اور ہینڈسم شخص تھا۔ قدرت نے اس کے چہرے بُشرے اور بات چیت میں شاہانہ وقار عطا فرما رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مقناطیسیت تھی جو مدمقابل کو mesmerise کرتی تھی۔ اندازِ تکلم مدبرانہ اور عالمانہ تھا۔ وہ جتنی دیر میرے پاس بیٹھا رہا ہے اس کا رویہ اور اندازِ گفتگو نہایت شریفانہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک خاندانی بادشاہ کے بیٹے سے مخاطب ہوں جو کراؤن پرنس تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک لفافے میں کرنسی نوٹ ڈالے۔ اس کو بند کیا اور اس پر لکھا میرے لئے بہت آنر کی بات ہے کہ ہز ایکسی لینسی بذاتِ خود تشریف لائے یہ میری طرف سے گفٹ ہے اور کھڑے ہو کر کراؤن پرنس کو پیش کیا۔ کافی پس وپیش کے بعد اس نے قبول کر لیا اور

میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا: کیونکہ آپ کا تعلق ایک Princely State سے ہے اس لئے آپ شاہی آداب بڑے سلیقے سے نبھا رہے ہیں۔ میں ہنستا رہا۔ میں نے اسے کہا Your Excellency میں امید کرتا ہوں آپ آئندہ بھی تشریف لا کر مجھے سرفراز فرماتے رہیں گے۔ وہ بولا میں بہت خوش ہوں کہ میرے دوستوں میں ایک پاکستانی کا قابل قدر اضافہ ہو گیا ہے۔ اس نے میری ٹیبل سے ایک کاغذ اٹھا کر اپنا نام اور فون نمبر بمعہ ایڈریس لکھ کر مجھے دیا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ وقار کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کی آنر میں دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ بولا No My Freind اور میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنے ملازم کو اشارہ کیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہ باہر چلا گیا میں اس کو کار تک گڈ بائی کہہ کر واپس آ گیا اور کافی دیر تک سوچتا رہا کہ اللہ تعالیٰ اصل بادشاہوں کو ہر حالت میں وقار اور شہنشاہیت ضرور عطا کرتا ہے۔ چور اُچکے، ملک کو لوٹنے والے، اگر بادشاہ، صدر یا وزیراعظم بن جائیں تو شاہانہ وقار، چہرے پر پاکیزگی، رعایا کے ساتھ صلہ رحمی اور عوام کے دل میں اپنے لئے عزت احترام کہاں سے لائیں گے۔ یہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی عطا فرماتے ہیں۔ آج کل تو ٹھیکیدار پہلے ہی ریٹ لسٹ سیاسی لوگوں کو دے دیتے ہیں۔ خاص طور پر ان لیڈروں کو جو الیکشن ہار جاتے ہیں یا جن کو عدالتیں کرپشن کی وجہ سے تمام عمر کے لیے نااہل قرار دے کر گھر بھیج دیتی ہیں یا فوج آ کر مارشل لاء لگا کر ان چور اچکوں کو جیل میں ڈال دیتی ہے۔ ریٹ کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں۔

گاڑی پر ایک من پھول نچھاور کر کے گاڑی کے آگے لیٹنا اور سینہ کوبی کرنا۔

عورتوں کا سینہ کوبی کرنا اپنے دوپٹے کار کے آگے پھینکنا۔

لوگوں کا دھاڑیں مار کر رونا جبکہ کسی ایک کا اپنے اوپر تیل چھڑک کر آگ لگانا یعنی خودسوزی کرنا اور باقی لوگوں کا آگ بجھانے کے لیے تیار رہنا۔ حکومت کے خلاف نعرے لگانا اور گالی گلوچ کرنا۔

یا اللہ یا رسولؐ..... بے قصور، بے قصور دیکھو دیکھو کون آیا شیر آیا شیر آیا۔

یہ تمام کام جو بھی نام نہاد لیڈرز کروانا چاہیں، ہر آئٹم کا ریٹ الگ ہے۔ اپنا من پسند آئٹم کرائیں یا اپنا سکرپٹ لکھ دیں۔ ٹیم وہ سکرپٹ کر دے گی۔ ان کو تو صرف اپنی Payment درکار ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ایک ٹیم شیر والوں کا ڈرامہ کر رہی ہے۔ تو وہی ٹیم تلوار والوں کا سکرپٹ بھی کر رہی ہے۔ جبکہ دھیلے کی کرپشن کی قسم تو کھائی جاتی ہے۔ مگر اربوں اور کھربوں کی کرپشن کی قسم آج تک کسی نے نہیں کھائی۔ ایک بہت اہم شاہراہ پر ایک من چلے نے ایک پینا فلیکس لگایا ہوا تھا جس پر لکھا تھا ''آگے جانا منع ہے آگے شہباز شریف، زرداری کو سڑک پر گھسیٹ رہا ہے''۔ میں ایک پُروقار چہرے والے باعزت انسان کے بارے میں سوچتا سوچتا کہاں جا گرا؟ اپنے خیالات کو جھٹکتے ہوئے ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ ڈاکٹر جوزفائین تشریف لے آئیں۔ میری طبعیت کافی ناساز

تھی۔اس کا تفصیلی ذکر میں اپنی تصنیف ''مشرق کا موتی حوروں کا مسکن'' کے باب کالی ماتا کے پجاری میں کر چکا ہوں۔اس لئے لیڈی ڈاکٹر جوزفائین کے تعارف پر ہی اکتفا کرونگا۔ ڈاکٹر صاحبہ لندن کے رائل کالج سے میڈیسن میں پوسٹ گریجویٹ تھیں اور دی گیبرون ہسپتال، گیبرون میں اپنے شعبے کی انچارج تھیں۔دی گیبرون ہسپتال ایک امریکن انٹرپرائز ہے اور بوٹسوانہ کا سب سے بڑا ہسپتال ہے۔ڈاکٹر صاحبہ میری بہت اچھی دوست تھیں اور اکثر میرے پاس تشریف لاتیں رہتی تھیں۔ڈاکٹر صاحبہ بوٹسوانہ کی شہری ہونے کے ناطے ایک افریقن لڑکی تھی مگر ان کے والد کے خاندان میں کوئی نہ کوئی وائٹ آدمی ضرور تھا اس لئے کالی ہونے کے بجائے سانولی سلونی سی، پتلی دبلی، لمبا قد، نازک اندام، بڑی بڑی آنکھیں، بوائے کٹ، غیر شادی شدہ، حال ہی میں لندن سے تشریف لا کر دی گیبرون ہسپتال میں تعینات ہوئی تھیں۔اکثر فارغ اوقات میں ہم گپ شپ کرتے۔میری بیماری کے دوران میری مسیحا تھی۔ ہمدردی اور مہارت سے خود میرا میڈیکل چیک اپ کیا۔تمام کلینیکل ٹیسٹ کروائے۔ ایک دن میں نے اس کی ٹیبل سے فائل اٹھا کر دیکھی تو لال مارکر سے بڑا بڑا Free لکھا ہوا تھا۔حالانکہ یہ گیبرون کا سب سے مہنگا ہسپتال تھا۔ڈاکٹر صاحبہ، ادریس خاں آج تک آپ کا احسان مند ہے۔اسی ڈاکٹر نے میری فائل پر لکھا تھا کہ فوراً اپنے ملک واپس چلے جاؤ اور اپنی فیملی میں شامل ہو جاؤ۔اس کے بعد میں سنجیدگی سے ہمیشہ کے لیے پاکستان واپس جانے کا سوچنے لگا۔ڈاکٹر جوزفائین آئی اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔بولی تم کب پاکستان جا رہے ہو۔میں نے اس کو بتایا جیسے ہی بیٹا یونیورسٹی گیا، میں پاکستان چلا جاؤں گا۔وہ بولی مجھے لندن سے ایک بہت اچھی آفر ہے، میں بھی واپس جانا چاہتی ہوں۔آنے والے 30/35 دنوں تک میں بھی For Good چلی جاؤں گی۔مگر تمہیں بھی یہاں سے نکال کر جاؤں گی۔تم کافی سے زیادہ بیمار ہو۔بند کرو یہ سب کچھ اور جاؤ اپنے ملک۔دعا کرونگی اور خواہش رکھتی ہوں کہ جیسے تم اس ملک میں لال گلاب آئے تھے اسی طرح صحت مند ہو جاؤ۔میں نے ڈاکٹر صاحبہ کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ میں جلد از جلد پاکستان واپس چلا جاؤنگا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم نے پھر سے ایک سیکنڈ ہینڈ گاڑی خرید لی۔مسٹر چکن کی گاڑی ''جزاک اللہ خیر احسان الجزا'' کی دعا کے ساتھ واپس کر دی۔نوید اور عمران جوہانسبرگ گئے ہوئے تھے۔میں اکیلا ہی اداس سا فکر مند بیٹھا ہوا تھا کہ ایک BMW گاڑی باہر آ کر رکی۔میں نے اپنے ویئر ہاؤس کا تمام فرنٹ شیشے کا بنوایا تھا تا کہ میں باہر کا منظر دیکھ سکوں اور مجھے کوئی دوسرا نہ دیکھ سکے۔سنٹرل سکیورٹی سسٹم کا بٹن میری ٹیبل کے نیچے پاؤں کے پاس لگا ہوا تھا۔کسی بھی خطرے کے پیش نظر صرف ایک Push کافی تھا۔ایک سے دو منٹ میں مسلح سکیورٹی گارڈ حاضر ہو جاتے تھے۔میں گاڑی کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اس میں سے بجلی کے جھماکے کی طرح ایک پری وش اتری۔جس نے خوبصورت اپر کے ساتھ منی سکرٹ پہنی ہوئی تھی۔ابھی میں ہوش وحواس نارمل کر رہا تھا کہ اس نے دروازے کا

ہینڈل کیا گھمایا میرا تو دل و دماغ گھوم گیا۔ وہ میری بینک آفیسر تھی۔ جب میں وطن عزیز سے آیا تھا تو اگلے ہی روز میں بینک گیا تھا۔ مگر اس کے کیبن میں ایک بڑی بڑی مونچھوں والا لمبا تڑنگا، خشک سا روایتی سود خور یہودی براجمان تھا۔ جس نے بڑی مشکل سے بتایا کہ میڈم اس بینک کی جاب چھوڑ کر امریکہ اپنی مما کے پاس چلی گئی ہے۔ میرے ایڈوانس کے متعلق اس نے کہا کہ آپ نے خود اس کو بند کرایا تھا میں نے اس کو مستقل بند کر دیا ہے۔ لہٰذا تمام پروسیجر دوبارہ کرنا پڑے گا۔ جس کے لیے ابھی میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ کیونکہ کافی لوگ Que میں ہیں۔

میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے گلے ملی اور گلے لگا کر کافی دیر کھڑی رہی۔ بینک اور اس کی تلاش کی تمام داستان میں نے اس کو سنائی اور یہ بھی بتایا کہ میں جوہانسبرگ آپ کے گھر بھی فون کرتا رہا مگر فون ہر بار بند ہوتا تھا۔ جلوے دکھاتی، بجلیاں گراتی، جوس کاٹن اپنے ہونٹوں سے لگاتی، آنکھیں میرے چہرے پر جماتی وہ بولی میں نے بینک سے ریزائن کر دیا ہے کیونکہ USA میں میری امیگریشن منظور ہو کر مجھے PR(permanent Residence) مل چکا ہے۔ میرا یہ کیس کافی عرصے سے تاخیر کا شکار تھا۔ میں جوہانسبرگ میں For Good, Closing کے لیے آئی تھی۔ کل میں نے کسی کام کے لیے فون کیا تو بینک کے ایک ملازم نے بتایا کہ آپ واپس آ چکے ہیں اور بینک بھی آتے جاتے رہے ہیں تو میں بے اختیار جوہانسبرگ سے آپ کو دیکھنے کے لیے آ گئی۔ میں نے تمام پراپرٹی فروخت کر کے اپنے اثاثے امریکہ ٹرانسفر کر دیے ہیں۔ مجھے بہت جلدی امریکن بینک میں ایک بڑے عہدے پر جاب بھی مل جائے گی۔ چار روز بعد میری USA کی فلائٹ ہے۔ میں نے بھی گیبرون سے پاکستان جانے، نوید کے ساتھ واپس آنے اور نوید کو یونیورسٹی میں داخل کروانے تک کے تمام حالات بلاکم و کاست بیان کر دیے اور ہلکا سا عندیہ بھی دیا کہ یہ سب کچھ کلوز کر کے اپنے پیارے وطن واپس چلا جاؤں گا۔ وہ بولی تم USA میں بزنس کیوں شروع نہیں کرتے۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے پاسپورٹ پر 1981ء سے لے کر آج تک ہمیشہ USA کا ویزا لگا ہوا ہوتا ہے اور کل ہی میں نے یہاں پانچ سال کا ملٹی پل B1 B2 ویزا لگوایا ہے۔ مجھے ویزا کی پرابلم نہیں ہے۔ وہ بولی تو پھر پرابلم کیا ہے۔ میں نے کہا ذاتی طور پر مجھے USA پسند نہیں۔ وہاں کاروبار کرنے کے لیے اتنا زیادہ سرمایہ نہیں۔ میں اپنے بیوی بچوں سے بے حد محبت کرتا ہوں اور اگر میں امریکہ جا کر اپنے آرام و آرائش کی خاطر وہاں کی چکا چوند میں گم ہو جاؤں تو میرے بیوی بچوں کا کون پُرسان حال ہوگا۔ ماشاءاللہ میرے تمام بچے یونیورسٹی، کالج اور سکول جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے انسان پیدا فرمایا ہے۔ میں اپنے آپ کو جانور کیوں ثابت کروں۔ وہ حیرانی سے بولی کاروبار کے لیے سرمائے کی فکر نہ کرو، باقی کے مسائل آپ بہتر جانتے ہیں۔ میں نے جلدی سے موضوع بدلا کیونکہ بذریعہ کار وہ پانچ سو کلومیٹر کا سفر کر کے آئی تھی اور واپس بھی جانا تھا۔ اس لئے میں اس کے ساتھ عزت و احترام کا معاملہ رکھے ہوئے تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس کا احسان مند

تھا۔اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود جب اسے پتہ چلا کہ میں واپس آ گیا ہوں تو وہ فوراً ملنے چلی آئی۔ باتوں باتوں میں پتہ ہی نہ چلا دن کے دو بج گئے۔میں نے اسے لنچ کی دعوت دی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔آنسو سے تر خوبصورت، مخمور آنکھیں جب وہ میرے چہرے پر جماتی تو میں چابی والے کھلونے کی طرح اس کی کمانڈ میں آ جاتا۔ہم دونوں صدیقی صاحب کے نور جہاں ہوٹل چلے گئے۔

اس خاتون کو میرے ساتھ دیکھ کر صدیقی صاحب اور دیگر پاکستانیوں کے پیٹ میں خوب مروڑ اٹھے جوان کی آنکھوں اور دیگر حرکتوں سے ظاہر تھا۔اس نے شیمپین لی۔میں نے اورنج جوس کا پیگ لیا۔ پیمانے ٹکرائے اور ایک دوسرے کی صحت کا جام پیا۔تمام نظروٹو للچائی ہوئی نظروں سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔لنچ کرنے کے بعد وہ کار میں جا کر بیٹھ گئی اور میں بل دینے کاؤنٹر پر چلا گیا۔بل دینے کے دوران صدیقی صاحب نے اس خاتون کے بارے میں پوچھنا چاہا تو میں نے جھڑک دیا اور کہا: صدیقی صاحب اپنے آپ میں رہیں۔نو پرسنل ٹاک اور یاد رہے کہ آپ صرف آن پے منٹ میزبان ہیں اور کچھ نہیں۔وہ جھینپ کر خاموش ہو گئے۔ میرے پاکستان آنے تک خاموش ہی رہے۔جب میں واپس آیا تو گاڑی سٹارٹ کر کے وہ گاڑی میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔میں بھی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جیسے ہی ہم ویئر ہاؤس پہنچے وہ میرے ساتھ ہی گاڑی سے باہر آ گئی اور بولی: ادریس میرا سفر بہت زیادہ ہے اور میں صبح سے ڈرائیونگ ہی کر رہی ہوں۔لہٰذا اب میں اجازت چاہوں گی۔میں نے کہا دل تو نہیں کرتا مگر سفر کی طوالت کی وجہ سے میں آپ کو نہیں روکوں گا۔

اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا اور بولی یہ میرے USA کے کنٹیکٹ نمبرز اور ایڈریس ہے۔ ویزا تمہارے پاس ہے۔کبھی چکر لگا لینا۔میں تمہاری راہ دیکھوں گی۔وقت اور سچوئیشن کافی جذباتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائے کیونکہ مجھے اپنے بیوی بچے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیارے ہیں اور انشاءاللہ تاحیات رہیں گے۔بس وہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی، اُڑی اور چلی گئی مگر اس کی خوشبو کئی روز تک ویئر ہاؤس کے ہال کو مہکاتی رہی۔

جب میں پہلی بار بوٹسوانہ آیا تھا تو اکثر افریقن مال ضرور جاتا تھا۔اس وقت رونق والی سب سے اچھی جگہ وہی تھی۔باہر کے بنچوں پر ایک سردار جی بیٹھے ہوتے تھے۔کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر ایک لمبا سانس لیتے، کبھی آنے جانے والے کو دیکھتے اور کبھی آسمان کی طرف دیکھتے۔ایک دن میں ان کے پاس سے گزر کر اپنی کار کی طرف جا رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ سردار جی رو رہے ہیں۔میرے دل کو ایک چوٹ سی لگی۔میں چلتا گیا اور دو ٹن ڈرنک کے لے کر اس بینچ پر سردار جی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ایک ٹن میں نے ذرا زور سے کھولا تا کہ سردار جی متوجہ ہوں۔ جیسے ہی ٹن نے شور کر کے آواز نکالی تو سردار جی نے میری طرف دیکھا۔میں نے جلدی سے ٹن ان کی طرف کر کے کہا

''سنگھا بابا'' گرونانک کے نام کا''۔اس نے خاموشی سے ٹن لے لیا اور غمگین لہجے میں بولا۔آپ کہاں کے رہنے والے ہو۔میں نے کہا ڈیرہ بابا گرونانک۔ابھی الفاظ پورے ادا نہیں ہوئے تھے کہ اس نے میرے پاؤں کو ہاتھ لگا کر اپنے سر کو لگائے اور خوب جی بھر کے رویا۔میں خاموش رہا اور ساتھ والی دکان سے ٹشو لا کر اس کو دیے۔تھوڑی دیر میں اس کے ساتھ بیٹھا پھر اس کی اجازت لے کر واپس چلا آیا۔میں کار کے پاس جانے کی بجائے ٹمبا ٹریڈنگ سٹور پر ایوب خاں کے پاس چلا گیا۔میں نے اسے پوچھا کہ وہ سکھ جو بنچ پر بیٹھا رہتا ہے آج رو رہا تھا۔مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔میرا خیال ہے کہ وہ کسی بہت بڑے سانحے سے گزرا ہے۔ایوب خان نے مجھے بتایا کہ وہ سکھ گیبرون میں کئی سال سے مقیم ہے اور اس کا ٹائروں کا اچھا خاصا بزنس تھا۔وہ ایک بااصول اور ایمان دار آدمی ہے۔اس کی بیوی اور 4 بچے تھے۔انڈیا میں وہ جہاں کا بھی رہنے والا ہے وہاں ان کی خاندانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ایک دن وہ جوہانسبرگ گیا ہوا تھا۔گھر میں اس کی بیوی اور بچے اکیلے تھے۔دوسرے روز وہ جوہانسبرگ سے واپس آیا تو گھر کا دروازہ بار بار گھنٹی دینے پر بھی نہ کھلا۔فون بھی بند تھا۔پہلے اس کے ہمسائے آئے،انہوں نے حالات دیکھ کر پولیس کو بلوالیا۔پولیس نے اپنے طریقے سے دوازہ کھلوایا۔اندر ناقابل برداشت بو پھیلی ہوئی تھی۔بیوی اور چاروں بچوں کی لاشیں خون میں نہائی ہوئی پڑی تھیں۔بس اسی دن سے اس کی حالت پاگلوں جیسی ہے۔

ایوب خان نے مزید بتایا کہ پولیس کی تفتیش اور جوہانسبرگ کے سراغرسانوں کی تفتیش کے مطابق چند لوگوں نے رات کے وقت غیر قانونی طور پر سرحد پار کر کے واردات کی اور جس طرح خاموشی سے آئے تھے اسی طرح چلے گئے۔آج تک ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔اس کے بزنس اور گھر کو تالا لگ گیا۔گھر بھی اس کا ذاتی ہے دکان بھی اس کی ملکیت ہے۔مگر یہ پاگلوں کی طرح گھومتا رہتا ہے۔سب اسے جانتے ہیں۔اور اظہار ہمدردی کرتے ہیں مگر اس کے غم کا علاج نہیں ہے۔میں نے دل میں کہا علاج ہے اس کا علاج ''ان اللہ مع الصابرین'' ہے۔

دوسرے روز میں پھر کھانا پینے کی چیزیں لے کر اس کے پاس پہنچ گیا۔آہستہ آہستہ ہم باتیں کرتے رہے۔میں نے اس سے اس کے غم وفکر کے بارے میں کوئی بھی ذکر یا پوچھ پرتیت نہ کی۔کیونکہ میں سب جان چکا تھا مزید اس پر بات کرنا اس کے زخموں سے چھیڑ چھاڑ کرنے مترادف تھا۔میرا احترام اس نے کل کی طرح ہی کیا۔ہم نے اکٹھے مل کر کھایا پیا اور میں خاموشی سے کل پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔اگلے دن میں دانستاً ذرا دیر سے گیا تو اس کو بے چین پایا۔مجھے دیکھتے ہی وہ کِھل اُٹھا اور بولا تم کہاں تھے، میں تمہاری راہ دیکھ رہا تھا۔میں نے کہا: رات بابا گرونانک میرے خواب میں تشریف لائے۔اس نے ایک جھٹکا کھایا اور بولا ''واہ گرو جی کی کرپا'' کیا حکم احکام ہیں بابا جی کے؟ میں نے کہا: کوئی خاص نہیں بس مجھے شاباش دے رہے تھے کہ میرے بالک کا تم بہت خیال رکھتے

ہو، میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اُس نے فکر مندی سے پوچھا: میرے لئے کچھ نہیں کہا انہوں نے؟ میں نے کہا: بس کہہ رہے تھے کہ اس کا خیال رکھنا۔ وہ چپ ہو گیا اور میں آہستہ آہستہ اسے کھانے کی چیزیں دیتا رہا۔ اس طرح ہماری روز ملاقات بہت ضروری ہوتی گئی۔ کھانے پینے سے اس کی صحت بھی پہلے سے بہتر ہونے لگی۔ ایک ماہ گزر گیا۔ ہمارے پاکستان واپس جانے کے دن قریب آنے لگے تو میں اس کے پاس گیا۔ میں نے اسے کہا سردار جی آپ کو مبارک ہو رات بابا جی پھر خواب میں آئے تھے۔ اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور بولا جلدی بتاؤ۔ گرو جی نے کیا کہا کیونکہ رات وہ میرے خواب میں بھی تشریف لائے تھے اور فرمایا کہ جو آدمی تمہیں روز ملتا ہے وہ ایک اچھا مخلص آدمی ہے۔ میں اس کو تمہارے لئے پیغام دیکر بھیجوں گا تم اس پر عمل کر کے اپنے دشمن کو نہ صرف شکست دے سکتے ہو بلکہ اپنی بیوی اور بچے بھی واپس لے سکتے ہو۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس ذاتِ باری تعالیٰ نے مجھے رہنمائی فرما کر صحیح راستے پر لگا دیا۔ میں نے بہت سوچ کر جواب دیا کہ گرو جی نے مجھے ڈیرہ بابا گرونانک کے تخت کے سب سے بڑے گرنتھی سے ملنے کا کہا ہے۔ میں جاؤں گا اور تمہارے مسئلے کا حل ضرور لاؤں گا۔ لیکن بابا جی نے حکم دیا ہے کہ میرے بالک سے کہو کہ اپنا مکان فروخت کر کے اپنی دکان کو پھر سے اور بھرپور طریقے سے چلائے۔ اس کا بزنس بہت ترقی کرے گا۔ پھر نیا مکان خریدے جہاں اس کے بیوی بچے قیام کر سکیں۔ انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا ہے کہ میرا بالک ہو کر لوگوں کے سامنے بینچ پر بیٹھ کر روتا رہتا ہے۔ وہ میری بات بہت غور سے پلکیں جھپکائے بغیر سُن رہا تھا۔ یہ بات سُن کر اس نے میرے پاؤں چھو لئے اور بولا بڑے گرنتھی کو بھی کہنا کہ بابا گرو جی کو میری سفارش کریں۔ میں آج سے ہی گرو جی کے حکم کے مطابق عمل کروں گا۔ 4/5 روز میں ہی وہ مکان بک گیا جس کی وجہ سے وہ بے چین رہتا تھا۔ کیونکہ اٹھتے بیٹھتے بچوں کے کھلونے، بیوی کے کپڑے اور دیگر نشانیاں اسے ذہنی طور پر پاگل کئے رکھتی تھیں اور اس کے لاشعور پر قبضہ کر کے اپنا دباؤ بڑھاتی جا رہی تھیں۔ میں اُس کو اِس ہر پل کی اذیت سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ میں ابھی بوٹسوانہ میں ہی تھا کہ اس کے ٹائر سٹور کی صفائی ستھرائی شروع ہو گئی۔ مشینری کی صفائی، پرانے سٹاک کی اونے پونے فروخت اور نیا سامان آنا شروع ہو چکا تھا۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق پاکستان آ گیا۔ مجھے دلی سکون اور انجانی خوشی محسوس ہوتی رہی کہ ایک انسان پاگل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اگر یہ سکھ بھارت یا پاکستان میں ہوتا تو اب تک پاگل ہو چکا ہوتا۔ کیونکہ آتے جاتے محلے کے لڑکوں اور دیگر اوباش لوگوں نے اس کو پاگل پاگل کا ورد کر کے واقعی پاگل کر دینا تھا۔

میں لاہور میں تھا۔ میرے ایک دوست ملنے آئے جو ننکانہ صاحب میں سینئر سول جج تھے۔ میں نے گردوارہ بابا گورونانک میں سکھوں کی مذہبی رسوم اور دیگر مذہبی تبرکات کی زیارت کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولے آپ صبح آ جائیں۔ دفتر کا کام کر کے چلیں گے۔ دوسرے روز میں اور رحمان بھائی اکٹھے چلے گئے۔ مگر ان سے

ملاقات نہ ہوسکی کیونکہ وہ لاہور میں تھے اور کسی وجہ سے لاہور سے ننکانہ صاحب نہ آسکے تھے۔ میں اور رحمان بھائی خود ہی گردوارہ بابا گورونانک چلے گئے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ہمیں اندر جانے سے روک دیا گیا اور کہا گیا کہ ضروری کام ہورہا ہے۔ اس لئے زائرین کے لیے بند ہے۔ رحمان بھائی بہت مایوس ہوئے جبکہ میں نے انہیں کہا آپ فکر نہ کریں ابھی ہمیں اجازت مل جائیگی۔ سیوک ہمیں سمجھانے کی کوشش کررہا تھا کہ گوردوارہ کیوں بند ہے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: آپ بڑے گرنتھی صاحب سے جاکر کہو افریقہ سے اہل بیت کا غلام آیا ہے۔ اگر پھر بھی وہ انکار کریں تو ایک لفظ کہے بغیر ہم واپس چلے جائیں گے۔ اس نے بہت غور سے میری طرف دیکھا اور اپنے ساتھی کو کچھ کہتا ہوا میرا پیغام لے کر چل پڑا۔ جلد ہی وہ اور گرنتھی صاحب خود بہ نفسِ نفیس تشریف لے آئے۔ ہمارا سواگت کرتے ہوئے ہمیں اپنے ساتھ لے کر چل پڑے۔ ساتھ ساتھ تکلیف کے لیے معذرت خواہ ہوئے۔ پرشاد بھی پیش کیا۔ میں نے ان کو بوٹسوانہ کے سردار جی کا تمام واقعہ سنایا۔ انہوں نے مجھے بہت Appreciate کیا بلکہ احسان مندی کا اظہار کیا اور بولے میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ اس کے لیے ایک فرمان لکھ کر دیں کہ آپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ بہت دل لگا کر اپنا کاروبار کریں۔ اپنی مرضی کا رشتہ پسند کرکے شادی کریں۔ آپ کے ہاں دو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہونگی اور یہ بچے آپ کی ترقی، عزت اور افتخار کا باعث بنیں گے۔ انہوں نے مہربانی فرماتے ہوئے یہ فرمان جاری کردیا۔ ہم شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت کے خواہاں ہوئے تو وہ بولے: آپ نے سکھ کمیونٹی کی اتنی بڑی خدمت کی ہے۔ میں آپ کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔ اور اس طرح ہم شام تک لاہور واپس آگئے۔

جب میں دوسری بار بوٹسوانہ گیا تو میں نے سردار جی کو اچھی حالت میں پایا اور فرمان اس کے حوالے کیا جو گرومکھی زبان میں لکھا گیا تھا۔ سردار جی پیغام پڑھتے گئے اور روتے گئے۔ میرے پاؤں چھوڑنے کا نام نہ لیا۔ بس پاؤں پکڑے روتے رہے۔ مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا تھا مگر فرائیڈ کے مطابق اس طرح ذہن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ کئی خوفناک بیماریوں کا خطرہ بھی کم ہو جاتا ہے۔ میں سردار جی کو حوصلہ و تسلی دیتا ہوا واپس آگیا۔ دوسرے روز اس کی ٹائر شاپ پر جاکر میں نے کار کا ہارن بجایا۔ وہ فوراً باہر آگیا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ کار میں بیٹھو اور کار ایک طرف لے جاکر درختوں کے نیچے کھڑی کردی۔ اُسے رازداری سے بتایا کہ رات خواب میں بابا گرونانک کا حکم تمہارے لئے آیا ہے۔ مگر راز شرط ہے۔ تمام زندگی تم نے یہ بات کسی کو بھی نہیں بتانی۔ اگر رازداری کا وعدہ کرو تو بتاتا ہوں ورنہ کار سے اترو۔ اس نے ایک ہی سانس میں تمام گُرو کی سوگندیں اٹھالیں۔ میں نے کہا بابا جی فرمارہے تھے کہ آپ کے ہاں چار بچے پیدا ہونگے دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ان کے اندر روحیں تمہارے پہلے بچوں کی ہوں گی اور تمہاری بیوی میں بھی تمہاری پہلی بیوی کی روح حلول کردی جائیگی تاکہ تم ذہنی سکون حاصل کرسکو۔ اس کی خوشی کی

انتہا نہ رہی۔ اب زندگی کی رقم اس میں جوش مارنے لگی۔ وہ بولا بابا گرو آپ پر بہت مہربان ہیں۔ آپ کو درشن پہ درشن دیتے ہیں۔ میں نے کہا: اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ میں اہل بیت کا غلام ہوں۔ وہ بولا کیا آپ شیعہ مسلمان ہیں؟ میں نے کہا کہ ہرگز نہیں! میں کسی بھی مسلک کو نہیں مانتا۔ ایک اللہ کے ولی کا قول ہے کہ جب حضرت امام حسینؓ کی شہادت ہوئی تو دنیا میں صرف دو نظریے باقی بچے۔ ایک حسینیت اور دوسرا یزیدیت۔ ظاہر ہے میں حسینیت کو مانتا ہوں اور اہل بیت کا غلام ہوں۔ پھر میں نے اس کو دربار صاحب کے بند ہونے اور گرنتھی صاحب کے خود آ کر میرا استقبال کرنے کا واقع سنایا۔ وہ کار سے اتر کر ڈرائیور سیٹ کی طرف آیا۔ میرا دروازہ کھولا۔ پاؤں پکڑے کھڑا رہا اور حکم کی تعمیل کرنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

آج میں بہت خوش تھا کیونکہ میرا مشن پورا ہو گیا تھا۔ پھر میں اپنے جھمیلوں میں مصروف ہو گیا۔ سردار جی کی شادی ہو گئی۔ اللہ کی شان! ہم نے تو تکے لگائے تھے مگر اللہ نے اس کو چار بچے بھی عطا کئے۔ 1993ء میں وہ گیبرون کا سب سے بڑا ٹائر ڈیلر تھا۔ ہر قسم کی مشینری اس کے پاس تھی۔ 10/12 ملازم اس کے پاس کام کرتے تھے۔ ماشاء اللہ صحت مند، خوشحال اور سب سے بڑی بات لوگ اس کی شرافت اور ایمانداری کی قسمیں کھاتے تھے۔ ہمارے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ کار تھی، جس پر ہم نے جوہانسبرگ جانا تھا۔ میں نے بچوں سے کہا ٹائر اس قابل نہیں ہیں کہ ہائی وے پر سفر کیا جا سکے۔ اس کو سردار جی کے پاس لے جاؤ۔ چاروں ٹائر نئے ڈلوا کر ویل بیلنس، کیمبر اور الائنمنٹ کروا لاؤ۔ عمران بولا: میں گیا تھا مگر سردار جی نے کہا اگلے ہفتے تک میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ میں نے نوید سے کہا بیٹا! آپ عمران کے ساتھ جائیں اور سردار جی سے اپنا تعارف میرے حوالے سے کروائیں، اگر وہ پھر بھی ٹائم نہ دے تو میرے پاس واپس آ جانا۔ دونوں چلے گئے۔ نوید نے اپنا تعارف کروایا تو سردار جی بل بلے اوشیرا کہتے ہوئے اٹھے۔ سٹور سے فریش برج اسٹون کے ٹائر منگوائے اور ایک کاریگر سے کہا ہاتھ والا کام بھی چھوڑ کر پہلے یہ کار تیار کر دو۔ ایک گھنٹہ کے بعد ہر طرح سے مکمل کر کے کار بھجوا دی گئی۔ میں نے نوید سے بل پوچھا۔ تو اُس نے بتایا: سردار جی نے کہا ہے کہ بیٹا یہ دکان تمہارے پتا جی کی ہے، میں تو صرف سیوک ہوں۔

میں نے ابتدا میں کہیں لکھا تھا کہ مقامی مسلم خواتین کے شوہر اپنی بیوی یا بعض حالات میں بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر کیوں بھاگ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں عرض کرتا ہوں کہ وجہ یا وجوہات فیملی ٹو فیملی، شوہر ٹو شوہر، بیوی ٹو بیوی کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک وجہ ہر کیس میں مشترک ہے اور پاکستانی لڑکے تو خاص طور پر بھاگتے ہی اسی وجہ سے ہیں۔ جب وہ ان کے سنہری جال میں پھنستے ہیں تو انہیں علم نہیں ہوتا کہ شکاری نے نہایت خوبصورت پھندا لگایا ہوا ہے۔ کچھ جوانی کا زور، زلفوں کے اسیر ہونے کا شوق، پاکستان سے جمع پونجی خرچ کر کے یا قرض لے کر یا دیگر اثاثے فروخت کر کے ویزا، ائرٹکٹ اور دیگر خرچ اخراجات برداشت کر کے جھوٹ، سچ بول کر یہاں تک

پہنچے۔ پھر یہاں کا مقامی خرچ، کھانا پینا، رہائش، گھومنا پھرنا۔ چند دنوں میں ہی جیب خالی جبکہ پاکستان میں بہن بھائی، ماں باپ، بیوی بچے، عزیز واقارب اور دوست احباب آس لگائے انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب ان کا کماؤ بیٹا، شوہر، بھائی غیر ملک سے ڈالروں کی بارش برسائے گا اور وہ آسودگی حاصل کر سکیں گے۔

یہاں کا مقامی مسلمان خوشحال ہے۔ بڑے بڑے بزنسز کا مالک ہے۔ وسائل بہت زیادہ ہیں۔ کاروبار کا طریقہ کار، ایک سے پانچ اور پانچ سے دس بزنس کیسے قائم کرنے ہیں، سرمایہ فراہم کیسے کرنا ہے، بلڈنگ کا انتظام کیسے کرنا ہے، یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ اگر کسی چیز کی کمی ہے تو مین پاور کی کمی ہے۔

ہر مسلم فیملی جو بزنس میں ہے من حیث الخاندان کام کرتی ہے۔ سکول جانے والے بچوں کے علاوہ میاں بیوی، بالغ بیٹا، بیٹی سب کام کرتے ہیں۔ ان کے بزنس الگ بھی ہیں اور مشترک بھی ہیں۔ مردوں کی نسبت عورتوں کی تعداد زیادہ ہے۔ غالباً 40/60 کا فرق ہے۔ پورے افریقہ میں یہ فرق کمی بیشی کے ساتھ اسی طرح سے ہے۔ لڑکیوں کی شادی مسلمان مقامی لڑکوں کے ساتھ زیادہ کامیاب نہیں رہتی۔ اس کی زیادہ تر وجہ ان کا کمرشل ماحول ہے۔ شوہر بھی کام کرتا ہے۔ بیوی بھی کام کرتی ہے۔ نہ شوہر بیوی کا خرچ برداشت کرتا ہے نہ بیوی شوہر کی پرواہ کرتی ہے۔ شادی صرف شوق پورا کرنے اور Frustration مٹانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ پھر خاوند کی کیا مجال ہے کہ وہ اونچی آواز میں بات کرے۔ یہ لوگ یہاں تک بھی کمرشلائزڈ ہیں کہ سگی بیٹیاں بھی بزنس پر آ کر کام کریں گیا وران کو تنخواہ ملے گی۔ وہ اپنے ذاتی خرچ اخراجات خود کریں گی۔ مفت میں ان کو باپ کی طرف سے نہ خرچہ ملے گا اور نہ ہی دیگر مراعات۔ اس لئے وہ ذرا سی پروا بھی نہیں کرتیں۔ دن ہو یا رات، جلوت خلوت صرف اور صرف خاتونِ خانہ کی چلے گی اور آپ اس شعر کے موافق عمل کریں گے۔

جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا
کہیں سُن نہ لے زمانہ اے دل خاموش ہو جا

کچھ کیسز ایسے بھی تھے جن کے نہ حالات ٹھیک تھے اور نہ ہی آلات۔ ان کو بھی بھاگتے ہی بنی۔ اور جو مقامی لڑکے گھر داماد بن کر ان بزنس Icons کے ساتھ تمام دن گدھے کی طرح کام کرتے تھے ان کی حیثیت گھر کے پالتو کتے سے بہت کم تھی۔

اس تحریر میں سنہری جال کا ذکر آیا تھا، وہ سنہری جال کیا چیز ہے؟ مجھے عمران نے بتایا کہ Timba Trading Store کے مالک ایوب خان کے بڑے لڑکے نے مجھے آفر کی ہے۔ افریقن مال پر جو اس وقت گیبرون کا بزنس hub ہونے کے علاوہ گیبرون کا دل کہلاتا تھا کچھ رنگ بزنس برائے فروخت ہیں۔ میں بزنس

خرید کر تمہیں دے دیتا ہوں۔تم بزنس کرواور کما کر مجھے میری رقم دیتے جاؤ۔کچھ عرصہ کے بعد بزنس تمہارا ہو جائے گا۔میں نے پوچھا تمہیں کون سی دکان یا سٹور زیادہ پسند ہے اور اس کی قیمت اور شرائط کیا ہونگی؟ اس نے بتایا کہ دکان کا کرایہ دینا ہوگا، بزنس کی Goodwill پانچ ملین پولا ہوگی۔سٹاک کی لسٹیں بن جائیں گی۔ قیمت خرید دینا ہوگی۔جن ساؤتھ افریقن پارٹیوں سے سامان آتا ہے ان کے بل دینے ہونگے اور پارٹیاں مال کی ترسیل جاری رکھیں گی۔آپ کسی اور سے مال نہیں خرید سکیں گے۔ بزنس ہارڈ ویئر کا تھا۔یہ سچ تھا کہ یہ بزنس Prime Location پر تھا دیگر شرائط قابل عمل نہ تھیں۔

عمران نے نوید سے پوچھا کہ تمہارا کیا خیال ہے۔اس نے صاف انکار کر دیا۔ظاہر ہے وہ صرف ہائر سٹڈیز کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر آیا تھا۔جبکہ عمران تعلیم نہ حاصل کرنے کی وجہ سے وطن چھوڑ کر آیا تھا۔میں نے عمران سے کہا صبر کرو، اپنے طور پر معلومات حاصل کرتے ہیں۔میں نے عمران کو ڈاکٹر مکرم سے سلام دعا کرتے رہنے کی تاکید کی کیونکہ اس کو ہر بزنس اور اس کی ویلیو کا علم تھا۔بزنس ڈویلپمنٹ اس کا مضمون تھا اور پھر ایوب خان فیملی اور ڈاکٹر مکرم فیملی بہت قریبی تعلق بھی رکھتی ہیں۔

دوسرے روز مجھے عمران نے بتایا کہ ڈاکٹر مکرم نے اسے کہا ہے کہ یہ بزنس تمہیں مفت میں مل رہا ہے۔فوراً لے لو۔میں نے کہا صبر کرو کل تک دیگر ذرائع سے رپورٹ آجائے گی۔میں نے در پردہ ایوب خاں کی اہلیہ ہاجرہ کی چھوٹی بہن سے کہا تھا کہ یہ بزنس تمہارا بھانجا فروخت کرنا چاہتا ہے مجھے اس کی پوری فزیبلٹی چاہیے۔اس خاتون کی شادی بھی ایک پاکستانی کو سنہری جال میں پھنسا کر کی گئی تھی۔ایک لاکھ کی چیز اسے ایک کروڑ میں دی گئی۔پنجرے میں بند اس پرندے کو صرف پھڑ پھڑانے اور کبھی کبھی دانہ چگنے کی اجازت تھی۔دکان کی تمام سیل بینک میں جمع ہوتی یا خریداری کے واؤچر کلیر کرنے میں کام آتی۔ ہر ماہ کے بعد پہلے سے بھی زیادہ سامان آجاتا۔ شوہر نامدار کو عام سیلز مین کے برابر تنخواہ ملتی۔کبھی کسی ویک اینڈ پر بیوی بھی مل جاتی۔آخر وہی ہوا۔ایک دن پرندہ موقع محل دیکھ کر ہمیشہ کے لیے اپنے وطن پرواز کر گیا۔کچھ عرصہ تو اس کی نام نہاد زوجہ محترمہ نے بزنس سنبھالا۔کیونکہ وہ اس سنہری جال کے ہر دھاگے اور گانٹھ سے واقف تھی اس لئے کچھ عرصے بعد اس نے بھی انکار کر دیا۔اندر کی خبر جو ہاجرہ کی بہن نے دی وہ مندرجہ ذیل تھی۔

''دکان ایوب خاں کی ذاتی ملکیت ہے۔اس کا کرایہ صرف دس ہزار پولے ماہانہ ہے۔یہ ان کا اپنا بزنس ہے۔اس کو چلانے کے لیے ورکرز نہیں ہیں۔اس لئے مالک کا سنہری جال پھینک کر یہ لوگ ورکر تلاش کر رہے ہیں۔تاکہ اسے پھنسا کر یہ تمام عمر اس سے کام لیتے رہیں اور وہ نقلی مالک اور اصلی نوکر بن کر ان کے اشارے پر کام کرتا رہے۔میرا خاوند بھی انہوں نے ہی بھگایا ہے ورنہ وہ بہت اچھا تھا۔5/6 ملین کا یہ بزنس ہے۔صرف دکان

ان کی ہے بقایا تمام سٹاک ساؤتھ افریقہ سے ادھار آیا ہے۔ جو نیا نام نہاد مالک بن کر ملازم آئے گا وہ یہ ادھار اتارے گا۔ یہ ادھار وہ قبر میں جانے تک نہیں اتار سکے گا۔ جتنا مال وہ فروخت کرے گا اتنا ہی اور آ جائے گا۔ یہ تمام ڈیل انکل مکرم کے مشورے سے ہوگی اور اس کو کمیشن ملے گی۔ کیونکہ اس قسم کے مرغے اکثر ڈاکٹر مکرم ہی فراہم کرتا ہے۔ اور ذبیح ایوب خاں اور اس کے لڑکے کرتے ہیں۔ پھر کسی نہ کسی لڑکی کی شادی بھی اس کے ساتھ کر دی جاتی ہے۔ پاکستانی لڑکے بہت سمارٹ ہیں۔ جو ہر حالت میں اس سنہری جال کو کاٹ کر پرواز کر جاتے ہیں۔ میری مثال آپ کے سامنے ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ آپ کی ڈیل میں ملین کے حساب سے ایوب فیملی کو فائدہ ہے اور ایک یا 1/2 ملین کا فائدہ انکل مکرم کو بھی ہے۔''

یہ خاتون میری بہت اچھی دوست تھی۔ اس نے تمام راز کھول کر رکھ دیے۔ میں دل میں فیصلہ کر چکا تھا کہ جیسے ہی نوید کی یونیورسٹی سے کال آئے گی، سب کچھ چھوڑ کر اپنے وطن، اپنے بچوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ جبکہ میں صحت کے لحاظ سے بھی اب کمزور ہو چکا تھا اور میری ڈاکٹر نے میرا پاکستان جانا ضروری قرار دے دیا تھا۔ میں صرف اور صرف بیٹے کی خاطر رکا ہوا تھا۔

سنہری جال کے اصول وضوابط مندرجہ ذیل تھے۔

جہاں جوان، قبول صورت، صحت مند لڑکا دیکھو فوراً اسے چیک کرو کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کیا وہ روزگار کی تلاش میں ہے؟ اگر کوئی اخلاقی عیب نہیں ہے تو درمیانی سی صورت بھی ٹھیک ہے۔ اگر گریجویٹ و پوسٹ گریجویٹ یا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے تو ہرگز ہرگز اس کو کہیں اور نہ جانے دو۔ اگر امیر گھرانے سے ہے اور پاکستان سے سرمایہ منگوا کر اس ملک میں Invest کر سکتا ہے تو سونے پر سہاگہ۔ ان تمام خاصیتوں کے ساتھ اگر مسجد میں بھی نمازوں کے لیے آتا ہے تو مزید اچھا ہے۔

تبلیغی جماعت جن کا نیٹ ورک واقعی بہت بڑا ہے اس میں نیک لوگ بھی بہت ہیں لیکن اکثریت کم پڑھے لکھے یا جہلاء کی ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا لوگ بھی نماز کے پابند ہیں اور مسجدیں آباد ہیں لیکن ان کی نمازوں سے ان کا بزنس مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ ایک منٹ میں خون چوس کر باقیات پھینک دیتے ہیں۔ میں ان سے کہتا تھا یہ تمہاری عبادت نہیں بلکہ عادت ہے۔ اپنی اس عادت کے مطابق ڈھل کر اسلامی تاجر کا رول ادا کریں۔

ان تمام خاصیتوں کے مالک لڑکے کو سر راہ ملیں گے۔ اگر مسجد میں مل جائے تو بہت آسان شکار ہوگا۔ مال پر گھومتا ہوا مل جائے، ونڈو شاپنگ کرتا ہوا نظر آ جائے، مسلمان بھائی کے نام پر بہت پیار سے ملیں گے۔ ڈرنکس پلائیں گے، کھانے کے لیے گھر لے جائیں گے۔ پردیس میں گھر کا کھانا اور وہ بھی حلال، ایک نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ اس طرح پردیسی لڑکا بیچارہ آہستہ آہستہ دام میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ لڑکے کو کہا جاتا ہے سارا دن فارغ

گھومنے سے بہتر ہے کہ دکان پر آ جایا کرو۔ وہ آہستہ آہستہ عادی ہو جاتا ہے۔ مسلمان بھائی چارہ کے نام پر اس کو کھانا اور عام مزدور کی جو بھی یومیہ اجرت ہو دے کر اسے اپنا احسان مند کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس طرح اس کو اپنی لڑکی اور ایک ملین کی دکان، دس ملین میں دے کر قید کر لیتے ہیں۔ وہ تمام دن جتنا بھی کام کرے آخر میں اس کو صرف یومیہ اجرت کے برابر ہی بچت ہوتی ہے۔ جبکہ وہ مقروض بھی ہوتا ہے۔ کار کی قسط، گھر کی قسط، انشورنس کی قسط، سسرال کے لاکھوں کا بزنس کروا دینے کا احسان۔ اب وہ کرائے کے گھوڑے کی طرح ٹپ رپ، ٹپ رپ، ٹپ رپ کرتا بھاگتا رہے یا ماں باپ بہن بھائی کی فکر کرے۔ اگر اس دوران بچے پیدا ہو جائیں تو سمجھیں پہلے وہ گردن تک دلدل میں دھنس ہوا تھا، اب دلدل کی گہرائی میں غرق ہو کر دلدل کا حصہ بن گیا ہے۔ ایک آنکھوں دیکھا واقعہ اپنے قارئین کرام کی نظر کرتا ہوں۔

ایک گوجرانوالہ کا رہائشی، ٹھگ ٹائپ، اونچا لمبا آدمی کسی طرح گیبرون جا پہنچا۔ اس بچھائے گئے سنہری جال میں دانہ دنکا کھاتا بہت آرام سے شکار ہو گیا۔ ایک سیٹھ نے اپنی بھینس نما بیٹی سے شادی کر کے قریبی قصبے میں دکان بھی کھلوا دی۔ ہر سال ایک بیٹی پیدا ہوتی گئی اور پانچ بیٹیوں کا باپ بن گیا۔ ایک روز گیبرون سے اپنے رہائشی قصبے کی طرف جاتے ہوئے کچھ نیت میں فتور آ گیا۔ راستے سے گزرتے ہوئے اپنے سسرالی گھر چلا اور فریزر میں سے ایک چکن نکال کر اپنی بیوی کے لیے لے گیا۔ شاید بیوی نے بازار سے لانے کا کہا ہوگا اور اس نے سسرال کے گھر سے اٹھا لیا۔ اس کا سسر شام کو جب بزنس سے گھر آیا تو پتہ چلا محی الدین آیا تھا اور جاتے ہوئے ایک چکن لے گیا ہے۔ سسر نے فوراً فون کر کے پولیس کال کر لی۔ بڑی مشکل سے معافی تلافی ہوئی۔ چکن واپس رکھنا پڑا۔ سنہری جال سے شکار کئے گئے پنچھیوں کا آخر میں یہ حال ہوتا ہے۔ نوجوان لڑکے کو بزنس کروانا اور رشتہ دینا ایک سنہری جال ہے جو خوبصورتی اور پلاننگ بچھایا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی قید ہے جس میں سلاخوں کی بجائے مجبوریاں ہوتی ہیں۔ آدمی آزاد تو ہوتا ہے لیکن اس کی روح جکڑ کر رکھی جاتی ہے۔ دوسری صورت میں آپ اس کو غلام کہہ سکتے ہیں۔ اسی لئے پاکستانی لڑکے وہاں سے بیوی بچے چھوڑ کر بھاگ آتے ہیں۔ پھر بھی دوسرے ملکوں کی نسبت یہ لوگ اور ان کی لڑکیاں بھی پاکستانی لڑکوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر 90% شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔

آخر کار میرے بیٹے نوید کا شف کی یونیورسٹی سے کال آ گئی۔ اس کو سٹڈی پرمٹ بھی مل گیا۔ میں نے ہمیشہ کے لیے اپنے وطن عزیز واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے دنیا میں سب سے اچھا اپنا ملک پاکستان لگتا ہے۔ پھر اپنا شہر بہاولپور پیارا لگتا ہے اور پھر اپنا گھر، اہلیہ محترمہ اور اپنے سب بچے پیارے لگتے ہیں۔ اس لئے اثاثے، حسین جمیل دوست اور باقی سب کچھ چھوڑتے ہوئے مجھے ذرا برابر بھی تکلیف نہ ہوئی۔ میں اپنی ذات میں خود ایک انجمن ہوں۔ آپ مجھے جنگل بیابان میں چھوڑ جائیں، جب دوبارہ مجھے دیکھنے آئیں گے تو میں محفل سجائے نظر آؤں گا۔

صرف ایک خوف تھا کہ جب میں پاکستان واپس جاتے ہوئے نوید کواللہ حافظ کہوں گا تو میری ہمت، عزم وحوصلہ نہ ٹوٹ جائے۔ میری زندگی کا مشکل ترین لمحہ آنے والا تھا کہ مجھے اپنے سردار بیٹے کو جو ابھی صرف 17/18 سال کی عمر میں ہے پاکستان سے چھ ہزار میل دور اکیلا چھوڑ کر جانا تھا۔ یہ سوچ کر میں پورے کا پورا متزلزل ہو جاتا پھر نظر چرا کر نوید کی طرف دیکھتا تو اس کو پرسکون پاتا۔ جب وہ سو جاتا تو میں اس کا چہرہ دیکھتا رہتا۔ بس اسی کشمکش میں وقت گزرتا گیا۔

آخر ایک روز میں سب کچھ عمران کے حوالے کر کے بوٹسوانہ پر الوداعی نظر ڈالتا، اپنے نشان اپنے ہاتھوں سے مٹاتا، اپنے پیاروں سے نظریں چراتا، اپنے مخالفوں کے چہرے پر خوشی اور خاموشی کے آثار چھوڑتا، اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ جس کو عمران ڈرائیو کر رہا تھا اور شام تک ہم امتیاز بھائی کے گھر واقعہ اوکلے کورٹ پہنچ گئے۔ انہوں نے بہت خوش دلی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میری Air Booking یونائیٹڈ ائرلائن سے کنفرم ہو چکی تھی۔ ابھی ہمیں چار روز جوہانسبرگ میں ہی رہنا تھا۔ دوسرے روز نوید University of the witwatersrand, Johannesburg. گیا۔ اپنے کاغذات جمع کروا کر، کلاس رومز دیکھ کر اور متعلقہ لوگوں سے مل کر بہت مطمئن واپس آیا۔ جب میں اس کے چہرے پر طمانیت دیکھتا تو میری ہمت بڑھ جاتی۔ اگر نوید ایک بار بھی مجھے گلے لگ کر کہتا کہ ڈیڈی جان مجھے کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں یا اگر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تو میرا دل پھٹ جاتا۔ میں اپنے اس بہادر اور لائق فائق بیٹے پر ہمیشہ ناز کرتا رہوں گا۔ جب میں رات کو اٹھ کر نوید کو دیکھتا اور ماتھا چومتا تو امتیاز بھائی مجھے حیرانی سے دیکھتے۔ ایک روز وہ مجھے نوید کی غیر حاضری میں کہنے لگے۔ آپ پریشان نہ ہوں میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھونگا۔ آپ اس کو ہوسٹل میں داخل نہ کروائیں۔ اس کو یہاں میرے پاس ہی رہنے دیں۔ جب یہ اچھی طرح واقف ہو جائے گا پھر دیکھیں گے۔ بس میں روتا رہا اور وہ مجھے تسلیاں دیتے رہے۔ پھر بولے اگر آپ کی ہمت بطور باپ اس طرح آنسو میں بہہ گئی تو بچے کی تعلیم کا کیا بنے گا۔ میں نوید کے آنے سے پہلے منہ دھو کر T.V دیکھنے بیٹھ گیا۔ کبھی کبھی چوروں کی طرح اس کے چہرے پر نظر ڈال لیتا تھا۔ آخر یہ چار روز ایک لمحے کی طرح گزر گئے۔ میری دلی کیفیت یہ تھی کہ وقت تھم جائے اور یہ چار دن گزرنے نہ پائیں۔ لیکن وقت کو آج تک کون روک سکا ہے۔ وقت کی سب سے اچھی خاصیت یہی ہے کہ اچھا ہو یا بُرا، گزر جاتا ہے۔ یہ چار دن بھی گزر گئے۔ عمران کو ہم نے واپس گیبرون روانہ کر دیا تا کہ جا کر جشن منائے۔ امتیاز بھائی، نوید اور یہ غم کا مارا مسافر جوہانسبرگ ائرپورٹ کی طرف چل پڑے۔ ائرپورٹ پر نوید نے تمام فرائض سنبھالے ہوئے تھے۔ میرا ٹرالی بیگ، میرا بریف کیس (ان دنوں بریف کیس کا بہت کریز تھا) میرے کوٹ کی جیب میں میری ادویات، ہر چیز باری باری چیک کرتا رہا اور میں صرف اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ امتیاز بہانے بہانے سے مجھے باتوں میں لگا

کر کاؤنٹر تک لے گئے۔ابھی کچھ دیر تھی۔میں نوید سے باتیں کر رہا تھا اور اس کو سمجھا رہا تھا کہ Selfishness کی حد تک آپ نے نہ صرف اپنی پڑھائی بلکہ صحت کا بھی خیال رکھنا ہے۔آپ کی کامیابی کے ساتھ آپ کے ماں باپ اور بہن بھائی منسلک ہیں۔اسی اثنا میں فلائٹ اناؤنس ہوگئی۔ اس نے میری انگلی پکڑی ہوئی تھی اور باتیں کر رہا تھا ۔مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ بیٹے کو اللہ حافظ کہتے ہوئے اس کے ہاتھ سے اپنی انگلی چھڑوالوں۔آخر کار امتیاز بھائی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے مجھے اور نوید کو جلدی ہے۔صبح اس نے یونیورسٹی اور میں نے آفس جانا ہے ،اس لئے ہمیں اجازت دیں۔میرے دل پر ایک گھونسہ سا پڑا۔میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے نوید کا چہرہ پکڑا ۔ماتھا چوما اور صرف یہی کہہ پایا کہ میرے بیٹے میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں۔امتیاز بھائی نے نوید کو کھینچا اور بولے: ادریس بھائی ہمیں ذرا جلدی ہے، بس آپ لاؤنج میں چلے جائیں۔وہ نوید کو لے کر چلے گئے۔میں نے چاہنے کے باوجود مُڑ کر نہیں دیکھا کیونکہ آنکھوں سے غم کا مینہ برس رہا تھا۔بڑی مشکل سے مراحل طے کرتا ہوا لاؤنج میں جا کر صوفے پر گر گیا۔آج کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ نوید ابھی کہے گا ڈیڈی جان اور گلے میں بانہیں ڈال دے گا۔میں اپنے متعلقہ گیٹ کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔فلائٹ اناؤنس ہوتے ہی میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح جہاز میں سوار ہو گیا۔خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے تصور میں نوید کو سجالیا۔اس کے پیدا ہونے سے لے کر اب تک کے تمام حالات فلم کی طرح چلنے لگے۔اسکا بچپن، شرارتیں، میری ڈانٹ ڈپٹ، سکول جانا، کالج جانا، گھر سنبھالنا، ڈسپلن اور پڑھائی پر میری سختی اور مار پیٹ۔جب یہ خیال آیا تو میں اپنے آپ میں نادم ہوا کہ اتنے اچھے بیٹے کے ساتھ مار پیٹ۔پھر خیال آیا کندن بننے کے لیے تو آگ میں جانا پڑتا ہے۔

غرض ان ہی خیالوں میں ۱۱ گھنٹے کی فلائٹ ری یونین آئی لینڈ، پھر سیشیلز اور مڈغاسکر میں رکتی ہوئی دوبئ پہنچی۔ائر ہوسٹس ٹرالی لائی پوچھا کون سا ڈرنک لیں گے۔میرے No Thanks کہنے پر وہ آگے بڑھ گئی۔کھانا لے کر آئی۔No Thanks کہنے پر کچھ پریشانی ہوئی مگر خاموشی سے آگے چلی گئی۔اس کے بعد وہ کئی بار آئی ہمیشہ No Thanks کا جواب ملنے پر مایوسی کے عالم میں حیران ہوتی ہوئی چلی گئی۔آخر کار وہ چیف پرسر کو بلا لائی۔اس نے مجھ سے بہت دوستانہ طریقے سے پوچھا: سر کیا آپ کی طبیعت خراب ہے؟ اگر کوئی تکلیف ہے تو ہم فسٹ ایڈ دے سکتے ہیں۔ابتدائی ادویات بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔آپ صرف اپنی کیفیت بتائیں تا کہ ہم آپ کو Serve کر سکیں۔میں نے انہیں کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں بیمار نہیں ہوں۔تو ائر ہوسٹس جھٹ سے بولی آپ میرے ہاتھ سے کچھ تو لیں۔میں نے کہا مجھے اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔چیف پرسر بولا فلائٹ میں لیکوئڈ لینا بہت ضروری ہے، چاہے آپ پانی ہی لے لیں۔وہ ایک منرل واٹر کی بوتل کھول کر مجھے دے گئے۔میں

گھونٹ گھونٹ پیتا رہا۔جس سے مجھے کافی تسکین ملی۔نوید کے علاوہ کوئی خیال ہی نہیں رہا تھا۔11 گھنٹے سفر کرنے کے بعد کراچی جا پہنچا۔ یہ 11 گھنٹے میں تا زندگی کبھی نہیں بُھلا پایا۔ان 11 گھنٹوں میں نہ جیا نہ مرا۔کالو جی نے کراچی میں جب نوید کے بارے پوچھا تو میرے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔حوصلے پست ہو گئے اور میں بچوں کی طرح بلبلا اٹھا۔کالو جی نے مجھے بہت تسلی دی ، پیار کیا اور بولے فکر نہ کرو تم جب بھی کہو گے نوید کے پاس جوہانسبرگ چلیں۔دوسرے روز میری ملتان کے لیے فلائٹ تھی اور میں خیریت سے گھر پہنچ گیا۔

یہاں پر مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ پوسٹ گریجوایٹ ڈپلوما ان کمپیوٹر سائنس کا جب رزلٹ آیا تو پوری کلاس میں سے صرف تین لڑکے کلیر کر سکے جن میں نوید بھی شامل تھا۔اس کے بعد نوید کو خوش قسمتی سے University of Pretoria نے BSC آنرز میں داخلہ کی پیشکش کی۔کیونکہ اس کی پرفارمنس سب سے اچھی تھی۔نوید نے فوراً یونیورسٹی کو جوائن کرلیا۔یہی بچہ جس نے آنرز Pretoria یونیورسٹی سے کیا۔مختلف عہدوں پر کام کرتے کرتے ڈائریکٹر DSL(Digital Subseriber Line) ورلڈ وائڈ بن گیا اور پھر صرف چالیس سال کی عمر میں Vice President of Alcatel- Luccnt. بنا۔اس نے اپنی کمپنی کے سکالرشپ پر بلجیم سے MBA کیا اور آج کل C.E.O Southern Africa ہے۔

میرے بیٹے نوید کاشف،تمہارے ڈیڈی جان تمہیں ہدایت کرتے ہیں کہ اس سے آگے کی روداد آپ خود لکھیں۔جب ائرپورٹ پر میں نے اپنی انگلی آپ کے ہاتھ سے کھینچ لی تھی اور آپ امتیاز بھائی کے ساتھ چلے گئے اس سے آگے صرف اور صرف آپ کا حق اور فرض بنتا ہے۔آپ نوجوان نسل کی رہنمائی کرتے ہوئے اپنی آگے کی داستان ازخود رقمطراز کریں۔

اب کچھ ذکر اُن لوگوں کا جنہوں نے دوستی کی آڑ میں دشمنی کی اور بزنس کو نقصان پہنچایا۔مجھے اور میرے بیٹے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

(۱) حسن نانک: اس نے ڈاکٹر مکرم کی فراہم کردہ سہولت کو استعمال کرتے ہوئے میرے BCCI بینک اکاؤنٹ سے بیس ہزار ڈالرز کیش کرائے اور دونوں اس رقم کو اپنے ذاتی استعمال میں لائے۔جس کی وجہ سے ابتدائی طور پر میرے بزنس کو نقصان پہنچا۔یہ شخص زبان کا بہت میٹھا اور دل کا بہت کالا تھا۔جتنا یہ شخص اپنی جلد کا کالا تھا اس سے کہیں زیادہ یہ دل کا کالا تھا اور منافقوں کا سردار تھا۔لعنت اللہ المنافقین۔

(2) عمران :اس کو میں اپنا بیٹا خیال کرتا تھا کیونکہ یہ میرے اچھے بُرے وقت کے دوست کا بیٹا تھا۔یہ لڑکا تعلیمی، دماغی، معاشرتی اور وفاداری کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا جاہل، بیوقوف، بے عزت اور غدار ثابت ہوا۔پہلے وہ ڈاکٹر مکرم کا مخبر بنا پھر حسن نانک کا مخبر بنا۔حسن نانک کا مخبر اس کو ڈاکٹر مکرم کی ہدایت پر بنایا گیا۔وہ

میری تمام مصروفیات، بزنس پلان اور دیگر ہر قسم کی اطلاعات رات کے کھانے پر تازہ بہ تازہ روزانہ کی بنیاد پر حسن نانک کو دیتا تھا۔ سارا دن وہ میرے ساتھ بزنس کے لیے ہوتا تھا۔ ویئر ہاؤس بند کرتے ہی مجھے اور نوید کو ہماری رہائش گاہ پر چھوڑ کر حسن نانک کے گھر چلا جاتا۔ رات کا کھانا ان کے ساتھ انجوائے کرتا۔ تمام دن کی رپورٹ پیش کرتا اور ہمارے پاس آ جاتا۔ دوسرے روز حسن نانک تمام رپورٹ بذریعہ فون یا کبھی از خود ڈاکٹر مکرم کو دیتا۔ عمران سے زیادہ کمزور شخصیت، گندی ذہنیت اور معمولی قیمت پر اپنی وفاداری فروخت کرنے والا لڑکا میں نے اپنی 75 سالہ زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔

میرے بوٹسوانہ چھوڑنے کے بعد کچھ عرصہ اس نے بزنس چلایا۔ پھر بزنس اونے پونے فروخت کر کے وہ امریکہ بھاگ گیا۔ بدقسمتی سے 9/11 ہو گیا۔ روٹین کی پکڑ دھکڑ میں وہ بھی آ گیا۔ کچھ عرصہ امریکن ایجنسیوں کے زیر تفتیش رہنے کے بعد جو گروپ پاکستان ڈی پورٹ کئے گئے وہ بھی ان میں شامل تھا۔ میں TV دیکھ رہا تھا کہ اتفاقاً ڈی پورٹ کئے جانے والے گروپ کو دکھایا گیا۔ ہتھکڑیاں لگیں ہوئیں، لاؤنج سے ہوتے ہوئے جہاز تک لائے گئے اور پھر ایک ایک کر کے ہتھکڑی کھول کر ان تمام لڑکوں کو جہاز میں دھکیل دیا گیا۔ دروازے بند ہونے تک پولیس جہاز کی سیڑھیوں کے پاس کھڑی رہی۔ عمران اس گروپ میں صاف پہچانا جا سکتا تھا۔

(3) ایک اور پاکستانی جو کراچی کے رہنے والے لفت کلام تھے۔ گیبرون سے لوباسٹی اور لوباسٹی سے کچھ کلومیٹر اور آگے ایک قصبہ میں Gram کے نام سے ایک سپر سٹور کھول کر بزنس کر رہے تھے۔ ان کی بیوی بھی شاید مقامی مسلم تھی۔ اس نے Gram نام کیوں رکھا تھا یہ تو اپنے تجربے کی روشنی میں وہی بتا سکتا ہے کہ اس کو پنجابی والے Gram کی روشنی میں افریقن Gram کا تجربہ ہوا تھا یا انگلش Gram کی خاصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے یہ نام رکھا تھا۔ اب یہ تو کوئی ٹھیٹھ لاہوری ہی بتا سکتا ہے کہ پنجابی میں Gram کا کیا مطلب ہے۔ اس Gram سٹور کے مالک نے مجھے ایک روز فون کیا اور کہنے لگا میں نے سُنا ہے کہ آپ ویئر ہاؤس فروخت کر کے پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے یہ بھی کہنے لگا کہ میرے خیال میں آپ نے ابتدا میں ہی اتنا بڑا بزنس کھول کر غلطی کی۔ اب یہ اونے پونے فروخت ہو گا اور آپ کو نقصان ہو گا۔ جس کا مجھے بہت افسوس ہے اور اگر آپ نے بزنس فروخت کرنا ہی ہے تو بمعہ لائسنس میں خریدار ہوں۔ میں پرسکون ہو کر یہ سب سُنتا رہا۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو میں نے اسے کہا Mr. Gram میں نے آپ کو کوئی سندیسہ بھیجا ہے کہ میں یہ بزنس فروخت کر رہا ہوں؟ میرے نقصان کی آپ کو فکر کیونکر ہونے لگی ہے۔ مجھے تو ذرا برابر بھی افسوس نہیں ہے۔ جب میں نے اس کو مخاطب کرنے کے لیے تین چار بار Mr Gram کہہ کر پکارا تو وہ کہنے لگا گرامہم تو انگلش یا امریکن نام ہوتے ہیں آپ ایک مسلمان سے مخاطب ہیں۔ میں نے اسے ترنت جواب دیا کہ مجھے علم ہے آپ کو قصوری Gram نے لکھایا پڑھایا

ہے۔اچھی طرح جان لیں Gram سے جو مطلب لاہوری پنجابی لیتے ہیں وہی مطلب میں نے آپ کے لیے اور اس قصوری بدمعاش کے لیے لیا ہے۔مسٹر Gram یہ اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ آپ کی اوقات کیا ہے۔ابھی میں مزید اس کو Gram کا Circumference بتانے ہی لگا تھا کہ اس نے فون بند کر دیا۔شام میں عمران نے مجھے بتایا کہ حسن نانک کہہ رہا تھا: ڈاکٹر مکرم میرے پاس روتے ہوئے آئے اور کہہ رہے تھے کہ میری اور میرے دوست کی آج بہت بے عزتی کی گئی ہے۔

(4) ڈاکٹر ایم ایم مکرم شیخ جس کی وجہ اور Instigation سے میں بوٹسوانہ گیا تھا۔تمام حالات انہوں نے پیدا کیے اور باری باری آپس میں سب کو علیحدہ کیا اور لڑوایا۔کسی کو واپس پاکستان بھجوا رہے ہیں، کسی کو بلوا رہے ہیں، کبھی اپنا سر ایک کے کندھے پر رکھا تو کبھی دوسرے کے کندھے کا سہارا لیا۔رحمان بھائی کو باپ بنایا، مجھے بڑا بھائی بنایا،لڑکوں کو بھتیجے بنایا، ہر وقت سازش تیار کرنا، لمبی لمبی گفتگو اور وہ بھی نہ صرف بے تکی اور بے محل بلکہ خودنمائی سے بھرپور۔شیخی خوردہ تو یہ شخص کمال کا تھا۔میں جب پاکستان آیا ہوا تھا تو ایک لال رنگ کی گاڑی ہمارے لئے ایک پاکستانی سے سات ہزار پولے میں خرید کی اور عمران کو دس ہزار پولے بتا کر رقم وصول کر لی۔میرے واپس بوٹسوانہ جانے پر مجھے پتہ چل گیا۔کیونکہ وہ پاکستانی اکثر میرے پاس ویئر ہاؤس آیا کرتا تھا۔اس نے مجھے بتایا کہ یہ گاڑی پہلے میرے پاس ہوتی تھی۔میں نے سات ہزار پولے میں فروخت کی تھی۔میں نے اسی وقت ڈاکٹر مکرم کو فون کیا کہ آپ تین ہزار پولے مجھے فوراً بھجوائیں آپ نے لڑکے کو کیوں ٹھگ لیا ہے۔مجھے انہوں نے دوسرے روز ایک خط لکھا کہ آپ تین ہزار پولے کی Recovery ابھی مؤخر کر دیں، میں آج کل بہت تنگ ہوں۔یہ تادم تحریر مؤخر ہے۔

ڈاکٹر مکرم ایک بزدل، کینہ پرور، پشت سے وار کرنے والا، مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے بہروپیہ، شیخی خورہ، ناقابل بھروسہ، نہایت بیوقوف شخص کا نام ہے۔جو دوستی تو کیا، دشمنی کرنے کا سلیقہ اور حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ایک روز خود بتا رہا تھا کہ کچھ عرصہ میرے حالات ایسے رہے کہ میں خدا کے وجود سے بھی انکاری ہو گیا تھا (نعوذ باللہ من ذالک)۔کبھی کبھی جب ہم اس کی بہت تعریف کر دیتے اور پُھل ہوا بھر کر بلاسٹ ہونے والا کر دیتے تو شرما شرما کر بتایا کرتا تھا کہ میری ایک وائٹ لیڈی سے بھی دوستی رہی ہے۔جو میرے ساتھ U.N.D.V.P میں کام کرتی تھی اور آج کل پریٹوریہ میں ہوم آفس آف ساؤتھ افریقہ کے امیگریشن ونگ کی ڈائریکٹر جنرل ہے۔U.N.D.V.P سے مراد United Nations Development Voluntary Program. ہے۔پاکستان سے وہ UNDVP میں بھرتی ہو کر بوٹسوانہ چلا گیا۔یہ ملک نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ان کو Man Power کی اشد ضرورت تھی۔ادھر UNDVP کا کنٹریکٹ بھی پورا ہو چکا تھا۔گورنمنٹ آف بوٹسوانہ نے اس کو بزنس ڈویلپمنٹ کے لیے منٹری آف کامرس میں ہائر کر لیا۔جس کو یہ مختلف انداز میں بڑھا کر بڑھکیں ہانکتا رہا۔اس کا سب سے زیادہ

سیاہ ترین کارنامہ عرض کرتا چلوں۔نوید پوسٹ گریجوایٹ ڈپلومہ ان کمپیوٹر سائنس کرنے کے بعد یونیورسٹی آف پریٹوریہ میں داخل ہوکر اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھا۔میری دلی خواہش تھی کہ نوید اپنی بڑی بہن کی شادی میں شرکت کرے۔میں نے شادی کی تاریخ طے کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ شادی ان دنوں میں کی جائے جب یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوں تا کہ میں اپنے بیٹے کو شادی میں شریک کرسکوں۔تمام پروگرام میں نے نوید کی شمولیت کو مدِ نظر رکھ کر ترتیب دیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میری خواہش کے مطابق تمام مراحل طے ہوگئے اور نوید چند دن مزید قیام کر کے واپس چلا گیا۔جب وہ واپس یونیورسٹی گیا تو اسے ایک لیٹر ہوم آفس کی طرف سے موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ آپ کا سٹڈی پرمٹ کینسل کر دیا گیا ہے۔لہٰذا آپ فلاں تاریخ تک ملک چھوڑ دیں۔اس نے مجھے فون کر کے بتایا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔

مگر یہ گدھے ایسی حرکت کرتے یہ بھول گئے تھے کہ نوید کا مطلب ہے ''خوشی کی خبر'' اور نوید اس وقت تک اپنے سوشل تعلقات اتنے بنا چکا تھا کہ اس نے جس پہلے شخص کو جا کر اپنی پرابلم بتائی وہ ممبر پارلیمنٹ تھا۔اس نے کہا سٹڈی پرمٹ کیا ہوتا ہے، میں تمہیں نیشنلٹی دلواتا ہوں۔دوسرے روز نوید کو سٹیزن آف ساؤتھ افریقہ کے کاغذات مل گئے۔ساتھ ہی پاسپورٹ اور نیشنل کارڈ کے لیے فارم مکمل کر کے جمع کرا دیے گئے۔آنے والے 15/20 دنوں میں پاسپورٹ اور نیشنل کارڈ مل گئے۔ پاکستانی ڈرائیونگ لائسنس ہولڈر ہونے کی وجہ سے ساؤتھ افریقہ کا ڈرائیونگ لائسنس بھی مل گیا۔اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آنرز بھی امتیازی نمبروں سے کلیر ہوگیا۔نوید آئندہ سالوں میں بہت اچھے انٹرنیشنل عہدوں پر فائز ہوکر ساؤتھ افریقہ کے سابق وائیٹ صدر مسٹر پال کروگر کی پڑپوتی کا خاوند بن کر ساؤتھ افریقہ کی بہت مشہور Aristocratic فیملی کا داماد بنا۔ یہ شادی بہاولپور میں ہوئی اور بہاولپور کی تاریخ کی مشہور ترین شادی قرار پائی۔مگر ڈاکٹر مکرم تمہاری یہ کمینگی تمہارے منہ پر کالک ہے اور ہمیشہ رہے گی۔تم ایک خائن اور سخت ناقابلِ اعتبار شخص ہو۔ڈاکٹر مکرم کو صرف ایک لائن دے کر اگر مشورہ کرو تو وہ اس کا فوراً سیکنڈل بنا دے گا اور اس ایک لائن کو کتاب میں بدل دے گا۔دن میں اس شخص کو کئی بار دورہ پڑتا ہے جب وہ اپنے DNA کے مطابق رویہ اپنا کر بات چیت کرنے لگتا ہے۔

ایک اور بدتمیزی جو خلافِ آداب محفل و دیگر آداب کا مرتکب ہوتا تھا وہ کسی کی پرواہ کیے بغیر ریح (Farting) کی آوازیں نکالتا تھا۔شکل بڑی مسیّع مشیع۔عبادت زیرو۔کبھی کبھار اگر مسجد چلا جاتا تو عبادت نہیں عادت جان کر عمل کرتا۔

جب ان لوگوں نے نوید کا سٹڈی پرمٹ منسوخ کروانے کے لیے اپنی داشتہ سے کہا اور سٹڈی پرمٹ منسوخ ہوگیا تو میرے دل میں خیال آیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے شیطان کے ساتھی کو جہنم سے آزاد کر دیا ہے۔

کائنات کی سب سے بڑی غلطی ہی یہ تھی کہ 'میں اس سے بہتر ہوں' جو شیطان نے کی۔ یہ شخص اپنے آپ کو عقلِ کُل خیال کرتے ہوئے یہ غلطی ہر منٹ کے بعد کرتا ہے اور سب سے پہلے یہ غلطی کرنے والے کا چیلہ ہے۔

ایک ذرا ذائقے میں ہی کڑوا ہے
ورنہ سچ کا کوئی جواب نہیں

ہاں جی شیخ صاحب:

لفظوں کی دسترس میں مکمل نہیں ہوں میں
لکھی ہوئی کتاب کے باہر بھی مل مجھے

قارئین کرام! سوچیں گے کہ اس آدمی سے اتنے تعلقات تھے یہ شخص میرے بوٹسوانہ جانے کی وجہ بنا پھر ایسا کیا ہوا کہ حالات اس نوبت تک جا پہنچے۔ جو کچھ میں نے تحریر کیا وہ تمام چیدہ چیدہ نکات ہیں۔ حرفِ آخر کے طور پر صرف یہ کہنا ہے کہ میں اس شخص کی دل و جان سے عزت کرتا تھا۔ جس دن اس نے اپنے DNA کے مطابق حرکتیں شروع کیں تو میں حیرانی کے عالم میں اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ دراصل جس کا یہ چیلہ ہے اسلامی کتب میں جو اس کے حالات لکھے گئے ہیں وہ مختصراً میں عرض کرتا ہوں پھر آپ اس کی شخصیت کا تقابلی جائزہ لے سکتے ہیں۔

80 ہزار سال تک وہ فرشتوں کا ساتھی رہا۔
40 ہزار سال تک وہ جنت کا خزانچی رہا۔
30 ہزار سال تک وہ مقربین کا سردار رہا۔
14 ہزار سال تک وہ جنت کا طواف کرتا رہا۔
پہلے آسمان پر اس کا نام عابد تھے
دوسرے پر زاہد
تیسرے پر عارف
چوتھے پر ولی
پانچویں پر تقی
چھٹے پر خازن
ساتویں پر عزازیل
اب قیامت تک اس کا نام ابلیس ہے۔

بس کوئی غلطی جیسے لالچ، بغض محرم سے مجرم بنا دیتی ہے۔ آج اُنتیس سال گزرنے کے بعد بھی میرے زخم مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ لہٰذا میں نے ہر چیز قربان کر دی۔ دوبارہ اس ملک میں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور آج تک قائم ہوں۔ اب میں 75 سال کا ہو گیا ہوں اور مثل مندرجہ ذیل الفاظ کے!

معصوم بچپن

گمراہ جوانی

محتاج بڑھاپا

اور بے رحم موت، بس یہی زندگی ہے۔

اس کے باوجود بھی اس قماش کے لوگ مُوروثی اور پُشتنی غیریت سے خالی ہوتے ہیں۔ پُشتنی خوبی، موروثی غیرت اور شرم وحجاب نام کو بھی نہیں ہوتا۔ وہ اس لئے کہ مورثِ اعلیٰ بلکہ تمام دیگر پُشتیں، عزت وغیرت، شرم وحیا، حجاب اور دیگر کسی بھی خوبی سے عاری تھے۔ صرف داڑھی رکھنے، لمبی لمبی ہانکنے، گدھے کی طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے اور مدمقابل کے زور آور ہونے کی صورت میں، مگرمچھ کے آنسو بہانے اور چُھپ کر وار کرنے کی عادت سے اگر کوئی انٹلیکچوئل (Intellectual) کہلواتا ہے تو اس کو شرم آنی چاہیے۔

باب 9: ایتھوپیا(2000)

دنیا کی سیر بھی انہی راہوں میں ہو گئی
حالانکہ میں نے تجھ سے تجھی تک سفر کیا
(سلیم احمد)

ایتھوپیا

(2000)

دوبئ کے انٹرنیشنل لاؤنج میں ایتھوپین ائرلائن کے کاؤنٹر کھلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ فلائٹ شیڈول کے ڈیجیٹل بورڈ نے اپنی برقی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عوام کو دنیا بھر سے دوبئ آنے والی فلائیٹس کے شیڈول سے مطلع کرنا شروع کر دیا۔ میں بورڈ پر متواتر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ جیسے ہی میری مطلوبہ فلائٹ کا شیڈول ڈسپلے ہوا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ میری فلائٹ کے خانے میں صرف "Delayed" کا لفظ نظر آ رہا تھا۔ اس وقت رات کے 8 بج چکے تھے اور میں تمام لاؤنج گھوم چکا تھا۔ لاؤنج میں مصری، فلسطینی، مراکشی اور اریٹیرین خواتین قابل ذکر تھیں۔ مگر ایک خاص بریڈ جو عرب اور حبشہ کے ملاپ سے وجود میں آئی کمالِ قدرت تھی۔ ان کی ظاہری خوبصورتی اور قدرت کی مصوری پر اظہار رائے نہ کروں تو اپنے آپ پر کافرِ حُسن ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے جنوبی عرب کے دو قبیلے کبھی پرانے وقتوں میں اپنے وطن کو خیر باد کہتے ہوئے ''حبشہ''، آج کے ایتھوپیا میں آ بسے۔ اس وقت عرب دنیا میں حبشہ کو ابی سینیا (Abyssinia) کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ عربوں اور مقامی خواتین کے ملاپ سے ایک نئی نسل عالمِ وجود میں آ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے جو ظاہری حُسن ان کو عطا کیا اس کی ایک سادہ سی مثال کچھ یوں ہے کہ عام سے آم کے پودے کو جب پیوند کیا جاتا ہے تو انور رٹول، سمر بہشت، دسہری، لنگڑا جیسے آم پیدا ہوتے ہیں جو دنیا بھر میں اپنا مقام، نام اور دام رکھتے ہیں۔ اسی طرح دیگر اقسام کے پھل بھی عالم وجود میں آئے جو اپنی افادیت، خوشبو اور ذائقہ میں منفرد ہیں۔ عربوں نے بھی نسلِ انسانی کے لیے یہ پیوند کاری کی اور بے حد کامیاب رہے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

بڑی بڑی مست آنکھیں، قدرتی طور پر جوانی کے نشے میں مخمو، رسرخ ڈوروں سے سجی سجائی۔ اگر بادہ کش دیکھ لے تو جام توڑ ڈالے کیونکہ ان میں ڈوبنے کے بعد کسی دیگر نشے کی ضرورت نہیں رہتی۔ دلکشی ایسی کہ انسان جمال کے طوفان میں گُم ہو کر اپنوں سے بیگانہ ہو جائے۔ اندھیری رات میں اگر اپنے چہرے سے زلفیں ہٹا لے تو رات ڈھلتی جائے اور چاند طلوع ہو جائے۔ اگر اپنی بے خود مستی میں دائیں بائیں سے بے پرواہ ہو کر انگڑائی لے لے تو کمان کس کر پھینکا ہوا تیر سیدھا دل میں پیوست ہو جائے۔ چال ڈھال و زلفوں کا کندھوں پر کھیلنا اور رُخساروں کو چھونا ایسا ہی تھا جیسے کہ اِچھا دھاری ناگن اماوس کی رات مستی میں ہوتی ہے۔ جو شخص بادکش نہ بھی ہو وہ بھی اس بہتی شراب کے سامنے ہار مانے گا۔ انتہا تو یہ ہے کہ ایسی حسینہ بن سنور کر جدھر سے بھی گزرے تو عابد و زاہد، پردیسی، غیر الوطن، بڑے بڑے پارسا کسی کی بھی خیر نہیں۔ ان کو ہار ماننی ہی پڑے گی۔ ان سانولی سلونی حسیناؤں کا دیس ایتھوپیا کے علاوہ اریٹیریا بھی ہے کیونکہ پہلے یہ دونوں ایک ہی تھے جیسے کہ انڈیا اور پاکستان۔ اریٹیریا میں

اگر کوئی آدمی دوسری شادی سے انکار کرے تو اس کو جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے کیونکہ مردانہ آبادی خطرناک حد تک کم ہے۔نوآزاد ملک ہے۔معاشی مسائل میں صنف نازک کے علاوہ ہر چیز مہنگائی کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔

رات دو بجے تک میرا اوران کا ساتھ رہا۔رات 2:45 پر تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جہاز میں داخل ہوکر اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔دوسرے لوگ بھی جن کی منزل عدیس آبابا تھی تشریف لاکر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔یہ ایک بڑا جہاز تھا جو مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی اور دیگر دو سیٹوں پر دو خواتین تشریف فرما تھیں۔میں اپنا سامان سیٹ کرنے کے بعد اپنی ونڈو سیٹ پر جا بیٹھا۔نیا ملک، نیا کلچر اور نئے لوگوں کو دیکھتا رہا جو اپنی مقامی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ بہت ساری چڑیاں اور کوے مل کر شور مچا رہے ہوں۔ایک خوشبو کا جھونکا آیا تو میں نے نیند کے خمار سے بھری ہوئی آنکھیں نیم وا کیں۔محسوس ہوا کہ ہمسائی حسینہ مجھے کچھ کہہ رہی ہے۔میں نے توجہ مبذول کی تو معلوم ہوا وہ ونڈو سیٹ پر آنا چاہتی ہے۔میرے انکار کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے بلا تکلف میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سیٹ میں پھنسے ہوئے کو کھینچ لیا اور میں کونے والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔میرے آگے وہ دونوں سیٹ میں دھنس کر بیٹھ گئیں۔میرے علاوہ 4/5 پاکستانی اور بھی اس فلائٹ میں سفر کر رہے تھے۔آخر کار تمام مراحل سے گزرتے ہوئے جہاز نے اڑان بھر لی۔میں پہلے تو آنکھیں بند کر کے تمام رات کی بے آرامی کو سکون میں بدلنے کی کوشش کرتا رہا۔مگر فلائٹ میں شور وغل بہت تھا۔ہر آنے جانے والا میرے کندھے یا سر سے ضرور مس ہوتا۔دائیں بائیں سے شراب کی بو بھی آ رہی تھی۔میں نے اپنے ہینڈ بیگ سے ڈن ہل ڈیزائر پرفیوم نکال کر اپنے اوپر سپرے کیا۔بلکہ اپنی ہمسفر دونوں خواتین کو بھی بوتل دکھاتے ہوئے اشارے سے آفر کی کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ کو سپرے کر دوں۔دونوں نے بے تکلفی سے میری آفر کو قبول کر لیا۔میں نے 3/4 پف سپرے کر دیے۔وہ دونوں بہت خوش ہوئیں اور ہمسائیوں کی خوشی میں میری خوشی مضمر تھی۔سفر جاری تھا۔ہمسائیاں بھی مجھ سے اور میں ہمسائیوں سے خوش تھا۔سوتے جاگتے سفر کرتے جہاز عدیس آبابا کے Addis Ababa Bole International Airport. پر لینڈ کر گیا۔یہ ایتھوپیا کے Bole ڈسٹرکٹ میں واقع ہے۔اس لئے اس کا نام اس کے ڈسٹرکٹ کے نام پر رکھا گیا ہے جبکہ اس کا پرانا نام ایتھوپیا کے سابق بادشاہ شاہ ہیل سلاسی کے نام پر Haile Selassie International Air Port. تھا۔ایتھوپیا یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے جلا ہوا چہرہ۔980 قبل مسیح میں دریافت ہونے والا یہ ملک دنیا کی قدیم تہذیبوں میں شمار ہوتا ہے۔

شاہ ہیل سلاسی 23 جولائی 1892ء میں Ejersogora Ethiopia کے مقام پر پیدا ہوا۔1930ء سے 1974ء تک ایتھوپیا کا مطلق العنان حکمران رہا۔27 اگست 1975ء میں ایک عوامی انقلاب کی وجہ سے اس کو نہ

صرف حکومت سے بلکہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ 1962ء میں اس کی ملکہ Menen Asfaw فوت ہوگئی تھی جبکہ اس کی اولاد مندرجہ ذیل تھی۔

(1) Prince Makonnen.

(2) Amha Selassie.

(3) Prince Sahle Selassie.

(4) Princess Romanework.

(5) Princess Isehai

(6) Princess Tenagnewo

(7) Princess Zenebework.

اس عوامی انقلاب کی ابتدا ایک پٹرول پمپ سے ہوئی۔ پٹرول کی طلب میں لمبی لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں ایک کار جس میں دو لوگ سوار تھے اور جن کو گھنٹوں انتظار کے بعد اپنی باری پر پٹرول نہ ملا تو انہوں نے احتجاجاً شور مچانا شروع کر دیا۔ لمبی لائن میں سے کسی نے کہا پٹرول تو ہے مگر قیمت میں اضافہ کا اعلان ہونے کے بعد ہی دوبارہ پٹرول ملے گا۔ بس پھر کیا تھا عوام بپھر گے۔ توڑ پھوڑ شروع ہوگئی۔ پٹرول پمپ جلا دیا گیا۔ آہستہ آہستہ تمام عدیس آبابا اور پورے ملک میں یہ آگ پھیل گئی۔ بادشاہ کے خلاف مظاہرے ہونے لگے اور عوام کا مطالبہ مان لیا گیا۔ بادشاہ سلامت کو تخت سے اتار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ایک سترہ رکنی کمیٹی نے شاہ سیل سلاسی کو قتل کر کے عوامی مطالبہ پورا کیا۔ اس کمیٹی کا کمانڈر Colonel Danial Asfaw تھا۔ شاہ ہیل سلاسی کو بادشاہ سلمان اور ملکہ شیبا کی اولاد مانا جاتا ہے۔ اور اس طرح حضرت داؤدؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کا وارث قرار پاتا ہے۔ کبھی ایتھوپیا کے عوام اس کو Divine King کا درجہ دیتے تھے مگر آج اس کا نام لینا بھی دشوار ہے۔ یہ سب گفتگو ہم دوران سفر کرتے رہے۔ دونوں خواتین یونیورسٹی کی پروفیسرز تھیں۔ سیاحت اور شاپنگ کے لیے دوبئ کا وزٹ کر کے واپس آ رہی تھیں۔

امیگریشن ونڈو پر ایک لمبی لائن تھی۔ میں بھی ایک طرف کھڑا تھا۔ آفیسر گھور گھور کر ہر مسافر کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہ رہا ہو کہ مجھ سے ڈرو میں ایک خوفناک درندہ ہوں لیکن بیچارہ 10 ڈالرز کی مار تھا۔ ڈالر کا نوٹ پاسپورٹ سے نکال کر اپنے قبضے میں کرتے ہوئے ٹھاہ سے انٹری سٹمپ لگا دیتا۔ میں ابھی لائن سے باہر تھا صرف آبزرو کر رہا تھا کہ میری نظر ایک کاؤنٹر پر پڑی جس پر ایک درمیانی عمر کی خاتون بیٹھی تھی۔ وہ یونیفارم میں ہونے کے باوجود زندگی سے بیزار معلوم ہوتی تھی اور اس کی پشت والی دیوار پر لکڑی کی پلیٹ پر لکھا تھا Diplomatic Possport

Only۔ میں ڈپلومیٹک پاسپورٹ پر ہی سفر کر رہا تھا۔ جھٹ سے کاؤنٹر پر گیا اور اپنا پاسپورٹ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے نیم واہ آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پاسپورٹ لے کر اس پر انٹری کی مہر لگا دی۔ Welcome Sir کہتے ہوئے میرا پاسپورٹ واپس کر دیا۔ میں ابھی کسٹم ہال کی طرف جا ہی رہا تھا کہ ایک اور لگڑ بگی نما عورت مجھے روک کر بولی How many U.S. dollars do you have۔ میں نے غصے سے اپنا پاسپورٹ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا اور کہا What do you mean۔ جیسے ہی اس نے Diplomatic Passport دیکھا، Sorry Sir کہتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئی اور میں اسے گھورتا ہوا اپنے ٹرالی بیگ کو تلاش کرنے لگا۔ سامان تلاش کرنے کے بعد وہاں جو انچارج آفیسر کھڑا تھا اسے میں نے اپنا پاسپورٹ دکھایا۔ فوراً ہی اس نے ایک پورٹر کو طلب کر کے اپنی مقامی زبان میں کچھ کہا۔ پورٹر نے سامان کی ٹرالی لے کر باہر کی طرف چلنا شروع کیا۔ کسٹم آفیسر نے مجھے Welcome Sir کہتے ہوئے شیشے کا دروازہ کھول دیا اور میں ائرپورٹ بلڈنگ سے باہر آ گیا۔

باہر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور، کرنسی کا بزنس کرنے والے، لوگوں کے عزیز و اقارب، دیگر ٹھگ قسم کے لوگ جو شکار کی تلاش میں تھے۔ ابھی ٹیکسی ڈرائیورز کے ہجوم نے مجھے گھیرا ہی تھا کہ پورٹر نے ان کو مقامی زبان میں کچھ کہا۔ وہ مجھ سے دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں میری نظر ایک اور لڑکے پر پڑی جس نے گارڈن ہوٹل کا یونیفارم پہنا ہوا تھا اور میرے نام کا کارڈ اٹھا رکھا تھا۔ میرے اشارہ کرنے پر اس نے پورٹر سے ٹرالی پکڑ لی اور کار سٹینڈ کی طرف چل پڑا۔ سامان ڈگی میں رکھا اور کار شہر کی طرف چل پڑی۔ ائرپورٹ کے اندر کا ماحول ہر شخص کی غربت کی تصویر تھا۔ باہر کا ماحول بھی خراب تھا۔ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی، سڑک کے دونوں طرف خستہ حال پرانی طرز کے بنگلے جن پر چمکتی ہوئی نیم پلیٹیں بتا رہی تھیں کہ یہ مختلف ممالک کے سفارت خانے ہیں۔ سڑک چونکہ بہت خراب تھی اس لئے کار اچھلتی کودتی آہستہ رفتار سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہماری منزل تھی گارڈن ہوٹل آف عدیس آبابا جو ائرپورٹ سے تقریباً تین کلومیٹر دور، شہر کے دل میں واقع تھا۔ یہ تین کلومیٹر کا سفر ہم نے 40 منٹ میں کیا۔ گارڈن ہوٹل ایک گارڈن میں ہی بنایا گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا ایریا تھا۔ اگر اس کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو Fortress Stadium لاہور سے بڑا ایریا ہوگا۔ دیگر ضروری عمارات مثلاً کانفرنس ہالز، ہوٹل کی انتظامیہ کے آفسز، ڈائننگ ہالز، ٹک شاپس اور دیگر بلڈنگز کا بلاک الگ تھا۔ باغیچے کے علاوہ مہمانانِ گرامی کے لیے چھوٹے چھوٹے بنگلے تعمیر کیے گئے تھے جو خود کفیل یونٹ تھے۔ ایک، دو اور زیادہ کمروں والے یونٹ بھی تھے۔ ایک دوسرے سے مناسب فاصلے پر تھے۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ عمارتوں کا جنگل کھڑا کر دیا گیا ہو۔ ترتیب کچھ اس طرح تھی کہ ہر بنگلے کا مکین یہ ہی خیال کرتا تھا کہ وہ جس بنگلے میں قیام پذیر ہے بس وہ بنگلہ اس گارڈن میں ایک ہی ہے۔ انتظامی

بلاک سے میرے بنگلے تک جانے کے لیے کار کا استعمال کیا گیا تھا۔ آپ اس Five star گارڈن ہوٹل کی وسعت کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں۔ شاور لے کر تازہ دم ہونے کے بعد بوفے ناشتہ کیا جو ایک صاف ستھرے ڈائننگ ہال میں چاک و چوبند، باوردی، مقامی نازنینوں کے جھرمٹ میں پیش کیا جا رہا تھا۔

ہوٹل کی شاپ سے گھر ای میل کے ذریعے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔ یہ ٹک شاپ دو خواتین کے زیر انتظام تھی۔ ایک درمیانی عمر کی تھی جبکہ دوسری 19/20 سال کی ہوگی۔ دونوں مسلمان تھیں اور خوش مزاج بھی۔ میں گزشتہ ساری رات نیند اور رنگین سپنوں سے محروم رہا۔ اس لئے اپنے عارضی بنگلے میں جا کر سو گیا۔ یہ بنگلہ دو کمروں، اٹیچ باتھ روم، کچن اور دیگر تمام لوازمات مثلاً TV لاؤنج، ٹیلی فون، ریفریجریٹر وغیرہ سے مزین تھا۔ غرض یہ کہ کسی بھی سہولت کی کمی نہ تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے گھر میں ہی گھوم رہا ہوں۔ آرام دہ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا اور چار بجے شام تک سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو شاور لے کر پھر سے تازہ دم ہو کر ٹک شاپ پر آ گیا۔ گھر سے بیٹے کا ای میل آیا ہوا تھا جسے پڑھ کر طبیعت مطمئن ہوگئی۔ مجھے خوش دیکھ کر دکاندار لڑکی نے پوچھا کافی پئیں گے؟ میں نے جواب دیا ایتھوپیا پوری دنیا کو کافی ایکسپورٹ کرتا ہے اور آج میں بذاتِ خود عدیس آبابا میں موجود ہوں۔ کافی ضرور لونگا۔ اس کے استفسار پر بتایا کہ پاکستان سے ہوں۔ یہ سنتے ہی ہوخوشی سے بولی: Oh. You Cricketer۔ کرکٹ کی وہ پاگل پن کی حد تک شیدائی تھی۔ بولی کرسی پر بیٹھ جاؤ میں تمہیں مشین والی کافی کی بجائے Beans والی کافی بنا کر دیتی ہوں۔ اس نے 20/25 منٹ محنت کرتے ہوئے جھاگ اڑاتی خوشبودار کافی کے دو مگ تیار کئے۔ ایک میری طرف بڑھا دیا بولی چینی کے ساشے میز پر رکھے ہیں۔ اپنے ذائقے کے مطابق لے لیں۔ میں نے پہلا تیر پھینکا اور کہا آپ نے اپنے ہاتھوں سے نہایت خوبصورت انداز سے یہ کافی بنائی ہے۔ قدرتی طور پر یہ شہد کی طرح میٹھی ہوگی۔ وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگی۔ بولی آپ نے کیا کہا؟ دوبارہ کہیں۔ میں نے اس کو اپنے کہے ہوئے جملے دُہرا کر کہا میں نے یہ جملے آپ کی شان اور تعریف میں کہے ہیں۔ ایک نوجوان خوبصورت لڑکی ہونے کے ناطے آپ نے ایک اجنبی مرد کو جس مہمان نوازی کے جذبے سے کافی بنا کر دی ہے اس کے لیے یہ اظہارِ احسان مندی اور آپ کی خوبصورت انگلیوں کی تعریف ہے۔ جب خوبصورت ہاتھوں سے آپ کافی بنا رہی تھی تو میں سوچ رہا تھا کافی اتنی میٹھی ہو چکی ہے کہ چینی ملائے بغیر ہی بے حد میٹھی ہوگی۔ حیرانی سے اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ بولی آپ کے ملک میں عورت کی اتنی عزت ہے۔ میں نے کہا میرے ملک میں اور میرے مذہب کے مطابق والدہ ماجدہ کے قدموں کے تلے جنت ہے۔ اس سے مراد ہے کہ ماں کی بے لوث خدمت کرو۔ اس سے اونچی آواز میں بات نہ کرو۔ اس کی ہر ضرورت پوری کرو۔ کیونکہ والدہ کی طرف عزت، احترام، پیار کے جذبے کے تحت دیکھنا بھی عبادت ہے اور والد بابِ جنت ہے۔ بہن بے حد احترام اور پیار کا

ساگر ہے۔ بیٹی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔وہ بولی کیا آپ مسلمان ہو۔ میں نے کہا الحمدللہ، بولی میں بھی ہوں تو مسلمان مگران باتوں کا مجھے علم نہیں ہے۔کافی کا مزیدار مگ ختم ہوگیا۔میں نے کافی اورای میل کا بل دینے پر اصرار کیا مگر وہ صاف انکاری ہوگئی۔اس کے بعد میں عدیس آبابا دیکھنے ہوٹل سے باہر مین روڈ پر آ گیا۔ابھی 15/20 قدم ہی چلا تھا کہ ایک مقامی کالا میرے دائیں اور ایک بائیں ساتھ چلنے لگے۔مطالبہ تھا کہ Boss میں بھوکا ہوں۔میں بائیں طرف گھوم کر واپس ہوٹل کے گیٹ میں داخل ہوگیا اور گارڈ کو بتایا کہ میرے پیچھے جو دولڑکے کھڑے ہیں اور سامنے چورا ہے پر جو غول کا غول کھڑا ہے انہوں نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی ہے۔گارڈ مقامی زبان میں انہیں کچھ کہہ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی سٹین گن کی طرف بھی اشارہ کر رہا تھا۔میں ٹک شاپ میں واپس آ گیا اور تمام ماجرا لڑکی کو سُنایا وہ بولی پورے ملک میں قحط کی کیفیت ہے۔ایک ڈالر کے بدلے انسان قتل ہو جاتا ہے۔بھوک میں لوگ بلبلا رہے ہیں۔آپ نے اگر کہیں جانا ہو تو ہوٹل سے ٹیکسی لیں اس کے ساتھ جائیں اور اس کے ساتھ واپس آئیں۔پیدل ہرگز نہ جائیں اور عام سڑک پر گھومتی ہوئی ٹیکسی بھی نہ لیں کیونکہ وہ بھی سیف نہیں ہے۔میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہوٹل کے ٹورازم کاؤنٹر سے لٹریچر لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔کافی دیر تک لٹریچر سے مفید معلومات حاصل کرتا رہا۔جس کے مطابق اس ملک کا سرکاری نام

The Federal Democaratic Republic of Ethoiopia.

ہے۔یہ ایک Land Locked ملک ہے۔براعظم افریقہ میں دوسرا زیادہ آبادی والا ملک جس کا بارڈر جبوتی، اری ٹیریا، صومالی لینڈ، صومالہ، کینیا اور سوڈان سے ملتے ہیں۔ایتھوپیا کا کل رقبہ گیارہ لاکھ مربع کلومیٹر اور آباد 117 ملین ہے۔

اس کا سب سے بڑا شہر اور دارالخلافہ Addis Ababa ہے۔یہ افریقہ کا واحد ملک ہے جو سب سے پہلے لیگ آف نیشنز اور پھر UNO کا ممبر بنا۔انیسویں صدی کے آخر میں عیسائی اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں ایتھوپیا کو غیر ملکی آقاؤں سے آزادی نصیب ہوئی جو اِن کی قومی اور تاریخی شناخت بن گئی۔ایتھوپیا میں تقریباً 80 علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں مندرجہ ذیل چار زبانیں اکثریت کی پہچان ہیں۔

Oromo, Amhara, Somali, Tigrayans۔اس کے علاوہ چھوٹے گروپ میں جو بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں آبادی کی اکثریت Orthodox Christianity پر یقین رکھتی ہے۔جن کا سب سے بڑا چرچ Tewahedo اور D'emt'ay ہے۔دوسرا بڑا مذہب اسلام ہے اور لوگ سُنی العقیدہ مسلمان ہیں۔ حضرت بلال حبشیؓ کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔جب یہ حبشہ کے نام سے پکاری جاتی تھی۔اسی نسبت سے حضرت بلالؓ کو حبشی کہہ کر پکارا جاتا تھا جس کا مطلب تھا ملک حبشہ کا رہنے والا۔ U.N.E.S.C.O

WORLD HERITAGE نے اس ملک کو خطہ کا سب سے بڑا HERITAGE والا ملک قرار دیا ہے خاص طور پر SOF OMARCAVES اس براعظم کے سب سے بڑے غار قرار پائے۔

ایتھوپیا اپنی اہمیت کے لحاظ سے مندرجہ ذیل آرگنائزیشنز کا ممبر ہے۔

(1) G24

(2) G77

(3) ORGANISATION OF AFRICANUNITY

(4) AFRICAN UNION.

(5) THE PAN AFRICAN CHAMBER OF COMMERCE AND INDUSTRY.

(6) THE UNITED NATIONS ECONOMIC COMMISSION FOR AFRICA.

(7) AFICAN STAND BY FORCE.

(8) GLOBE.S N.G.Os.

ان سب کا ہیڈ کوارٹر عدیس آبابا ہے۔ 1970ء سے 1980ء تک یہ ملک سول وار لڑتا رہا جس کے نتیجے میں اری ٹیریا آزاد ہوا۔ اکانومی برباد ہوئی۔ کچھ جنگ کی وجہ سے اور کچھ قحط کی وجہ سے لوگ ہلاک ہوئے۔ آجکل یہ ملک اپنی GDP کے لحاظ سے ایسٹ افریقہ کی سب سے بڑی اکانومی ہے لیکن پھر بھی یہ ملک دنیا کا غریب ترین ملک ہے جو غربت، بھوک، کرپشن، انسانی حقوق کی پامالی، صحت اور تعلیم کے شعبوں میں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر اپنے عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا Literacy rate صرف 49% ہے جو Human Development Index. کے مطابق چوتھائی سے بھی کم ہے۔

خطے میں اس ملک کی اہمیت اپنی جگہ مگر میری منزل تو ٹوگو، ویسٹ افریقہ کا دارالخلافہ لومے تھا اور میں خود اپنی فرمائش پر 3 دن کے لیے ٹرانزٹ میں عدیس آبابا دیکھنے اور گھومنے آیا تھا۔ خاص طور پر مجھے آشامہ ابن ابجار نجاشی کے دربار کے کھنڈرات دیکھنے تھے جو شاہ نجاشی کے نام سے مشہور تھا۔ اس کو شاہِ Axum بھی کہتے ہیں۔ آج کے ایتھوپیا میں Axum ایک شہر کا نام ہے جہاں پر ہمارے اولین مسلمان رہنماؤں نے ہجرت کی تھی۔ مگر میرا یہ خواب پورا نہ ہوسکا۔ جیسے ہی ہوٹل سے باہر نکلتا زندگی کو خطرات لاحق ہو جاتے۔ ہوٹل کی انتظامیہ، کافی پلانے اور ای میل پرنٹ کر کے دینے والی لڑکی اور میڈم (جس کا ذکر آگے آئے گا) مجھے ہر وقت وارننگ دیتے رہتے تھے کہ

باہر نہ جانا۔Axum جانے اور کھنڈرات دیکھنے کا مطلب یہ تھا کہ شکار خود بھیڑیوں کے غول کو کھنڈرات میں لے جا کر اپنا آپ پیش کر دے۔اس ملک کو اللہ تعالیٰ نے بہت وسائل دیے ہیں۔مگر حکمران اپنا ذاتی مفاد چھوڑ کر اپنے وسائل کا صحیح اور بھرپور استعمال کریں تو عوام کی غُربت اور بے چینی دور ہو سکتی ہے۔اس ملک میں 14 بڑے دریا ہیں جس میں دریائے نیل بھی شامل ہے۔افریقہ میں پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ ان دریاؤں کی شکل میں ایتھوپیا کے پاس ہے۔یہ ملک اپنی بجلی کی 84% ضرورت Hydro Electric سے پوری کرتا ہے۔براعظم میں سب سے زیادہ دنیا کو کافی ایکسپورٹ کرتا ہے۔دنیا میں لائیوسٹاک کا پانچواں بڑا ملک ہے۔سونا، چمڑا، تیل دار اجناس، کے علاوہ پھول اور پودے دیگر ممالک کو ایکسپورٹ کئے جاتے ہیں۔پھول اور پودوں میں دنیا کا سب سے بڑا ایکسپورٹر ایتھوپیا ہے۔آپ حیران ہوں گے کہ عیسائی دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہونے کے باوجود اس ملک میں Pork اور Shell Fish نہیں کھائے جاتے۔آرتھوڈوکس عیسائی، مسلمان اور یہودی اس بات پر متفق ہیں یہ ملک Pork کی خباثت سے پاک صاف ہے۔

اس ناپاک جانور کے بارے میں ڈاکٹر محمد امجد خان، میڈیکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ، یو۔ایس۔اے کی ایک رپورٹ کا حوالہ ضرور دوں گا کیونکہ ہر مسلمان اور خاص طور پر نوجوانان پاکستان کا مذہبی، اخلاقی اور صحت کے لحاظ سے اس نجس جانور (سُور) کے متعلق جاننا بہت ضروری ہے۔اس کے گوشت اور چربی سے بنائی ہوئی ہر چیز حرام ہے۔

میں کچھ کوڈ لکھ رہا ہوں جس پروڈکٹ پر مندرجہ ذیل کوڈز میں سے کوئی بھی کوڈ لکھا ہوا ہوگا وہ حرام ہے۔

E 100 E110 E120 E140 E141 E153 E 210 E213 E214 E216
E234 E252 E270 E280 E325 E326 E327 E334 E335 E336
E337 E422 E41 E431 E432 E433 E434 E435 E336 E440
E470 E471 E472 E473 E474 E475 E476 E477 E478 E481
E482 E483 E491 E492 E493 E494 E549 E542 E572 E621
E631 E635 E904

سُور کی چربی کی کہانی، تاریخ اور کمرشل حوالے سے، پوری اقوام کی بے حسی اور بطور اسلاف ہم اپنی آنے والی نسلوں کو آگاہ نہیں کریں گے تو یہ ایک مذہبی و معاشرتی جرم ہوگا جس کی سزا اس جہان میں بچوں کی مذہبی و اخلاقی خرابی کی صورت میں تو ملے گی ہی مگر مالک و خالق کے پاس جا کر بھی سخت پوچھ پریت کا سامنا کرنا پڑے گا۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے بچوں کو ہر حرام چیز سے محفوظ رکھ سکیں۔آمین! اسلامی ممالک کے علاوہ دنیا کے تمام ممالک میں گوشت کے لیے بنیادی انتخاب سُور ہے۔اس جانور کے بڑے بڑے فارمز بنا کر اس کی

پرورش کی جاتی ہے۔صرف فرانس میں 42000 فارمز ہیں۔کسی بھی جانور کے مقابلے میں سُور میں بہت زیادہ چربی ہوتی ہے۔ یورپی اور امریکی اس مہلک چربی سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔اس چربی کو ضائع کرنا محکمہ خوراک کا سب سے مشکل کام تھا۔اس کو ختم کرنے کے لیے باضابطہ طور پر اس کو جلایا جاتا۔لگ بھگ 60 سال تک یورپ اور امریکہ کا محکمہ خوراک اس کو جلاتا رہا۔پھر اس کو صابن بنانے میں استعمال کیا جانے لگا۔شروع شروع میں سُور کی چربی سے بنی ہوئی مصنوعات پر Contents کی تفصیل میں Pig Fat واضح طور پر لیبل پر درج کیا جاتا تھا۔ان مصنوعات کے خریدار تمام مسلم ممالک ہیں۔لہٰذا ان ممالک نے ایسی مصنوعات پر پابندی لگا دی۔ 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہونے کی وجہ بھی سُور والے چربی کے کارتوس ہی تھے۔پھر ان مصنوعات پر FIM لکھنا شروع کر دیا گیا تاکہ تجارتی خسارے پر قابو پایا جا سکے۔1970ء کے بعد جب مسلمان ممالک نے پوچھا کہ کیا ان مصنوعات میں جانور کی چربی استعمال کی گئی ہے، اگر کی گئی ہے تو کون سے جانور کی؟ جواب ملا گائے اور بھیڑ کی چربی۔مسلمان ممالک نے یہ کہتے ہوئے پھر پابندی لگا دی کہ یہ جانور اسلامی طریقہ سے ذبح نہیں کیے گئے۔آخر کار ایکسپورٹرز ممالک نے کوڈ زبان استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ان ممالک کے محکمہ فوڈ کو ہی پتہ چل سکے۔عام آدمی لاعلم ہی رہتے۔اس طرح E کوڈ کا آغاز ہوا۔آجکل یہ کثیر القومی کمپنیوں کی مصنوعات پر لیبل کے اوپر لکھا ہوا ہوتا ہے اور اس کو E-Ingredients کا نام دیا گیا ہے۔ان مصنوعات میں ٹوتھ پیسٹ، ببل گم، چاکلیٹ، ٹافیاں، بسکٹ، سویٹس، کینڈیز، فوڈ، ملٹی وٹامنز، کارن فلاکس اور بہت سی ادویات شامل ہیں۔چونکہ یہ سارا سامان پاکستان اور دیگر مسلمان ممالک میں اندھا دھند استعمال کیا جا رہا ہے۔اس لئے سُور کے اجزا کے استعمال سے ہمارے معاشرے میں بے شرمی، بے رحمی اور جنسی استحصال کے رجحان میں بے پناہ اضافہ دیکھنے میں آ رہا ہے۔آپ روزانہ خریداری کرتے وقت آئٹم کے Content کو لازمی چیک کریں اگر مندرجہ بالا E Code کی لسٹ سے مماثلت پائیں تو یقین کریں کسی نہ کسی صورت میں اس آئٹم میں سُور کی چربی یا دیگر پروڈکٹ موجود ہے۔

ایک ہوٹل کے قریب ہی میں شاہراہ پر ہوٹل کی کار میں گھوم رہا تھا کہ ایک سپر مارکیٹ کے باہر ماشاءاللہ لکھا ہوا دیکھا۔میں کار روکوا کر مارکیٹ میں داخل ہو گیا۔مارکیٹ کیا تھی ایک بڑی دکان تھی جس کو آپ سٹور کہہ سکتے ہیں۔اندر صرف خواتین سیلز گرلز کے طور پر کام کر رہی تھیں۔میں سٹور میں گھومتا رہا۔دالیں، مرچیں، گرم مصالحہ اور دیگر کئی آئٹم پاکستانی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ اس بزنس کا مالک کون ہے تو اس نے ایک شیشے کے کیبن کی طرف اشارہ کر دیا۔میں اس طرف چلا گیا۔دروازہ کھول کر میں نے اندر آنے کی اجازت چاہی جو خوش دلی سے دے دی گئی۔میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں گارڈن ہوٹل میں قیام پذیر ہوں، کل رات 11 بجے میری لومے کے لیے فلائٹ ہے۔آپ کے سٹور کے ماتھے پر لکھے ماشاءاللہ نے مجھے سٹور کے اندر آنے پر مجبور کیا۔سب

اس خاتون کو میڈم کی کی کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ 50/55 کے قریب زندگی کی پُر شباب بہاریں دیکھ چکی ہوگی۔ بڑی پُر وقار اور بارعب مسلمان خاتون تھی۔ وہ بولی آپ لومے کیوں جا رہے ہیں؟ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ میں انٹرنیشنل پارلیمنٹ فار سیفٹی اینڈ پیس کے Envoy at Large کی حیثیت سے چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری، لومے کی دعوت پر کانفرنس میں شرکت کے لیے جا رہا ہوں۔ وہ متاثر ہوتے ہوئے بولی کہ کل ہوٹل ہلٹن میں Lions کی طرف سے ایک سیمینار ہے۔ اگر آپ جیسی شخصیت اس میں شمولیت کرے تو میرے لئے بہت فخر کی بات ہوگی۔ میں Lions کی گورنر ہوں۔ ہم نے امریکن سفیر کو بطور چیف گیسٹ مدعو کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہم نے دیگر Dignitaries کو بلا رکھا ہے۔ میں نے میڈم کی کی سے کہا آپ کے ساتھ سیمینار میں شرکت میرے لئے اعزاز بھی ہے اور میرے علم میں اضافے کا باعث بھی ہوگا۔ وہ یہ سُن کر خوش ہوئی اور لڑکی سے کافی لانے کا کہہ کر میرے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوگئی۔ بات چیت کے دوران مندرجہ ذیل معلومات میرے علم میں اضافہ کر گئیں۔

عدیس آبابا کا مطلب ہے نیا پھول۔ ایتھوپیا میں جڑواں بچوں کا پیدا ہونا منحوس تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ دیگر لوگ اس خاندان سے ملنا جلنا، لین دین، معاشرتی اور سوشل تعلقات سب ختم کر دیتے ہیں۔ میں نے از راہِ تفنن کہا میڈم ہمارے ہر محلے میں جڑواں بچے ضرور ہوتے ہیں۔ بعض گھرانوں میں 4 اور ملک کے کسی نہ کسی حصے میں 6/7 بچوں کا اکٹھے پیدا ہونا عام سی بات ہے۔ ہر سال ملک کے کسی نہ کسی شہر میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر لوگ بے انتہا خوشی مناتے ہیں۔ TV پر دکھایا جاتا ہے۔ بچوں کی لائن لگی ہوئی ہوتی ہے۔ ہم نے تو کبھی بھی اس امر کو منحوس نہیں پایا۔ یہ صرف ضعیف الاعتقادی ہے۔ آپ ایک سوشل خاتون ہیں اور قوم کی لیڈر ہیں۔ آپ لوگوں کو اپنی گفتگو اور تقاریر میں مذہبی حوالے سے سمجھائیں۔ ایتھوپیا میں خاتون کی خوبصورتی کا معیار اس کے موٹے ہونٹ ہیں۔ یہ ایک قدیم مسیحی ملک ہے۔ تقریباً تین ہزار سال پرانی تہذیب کا وارث۔ ایک ہزار سال سے پہلے بحیرہ احمر عبور کر کے آنے والے جنوبی عرب کے دو قبائل نے اس خطے کو اپنایا۔ ان کے بطن سے جو قوم پیدا ہوئی اسے حبشان اور علاقے کو حبشہ کہا جاتا رہا۔ انہوں نے ہی اس خطے کا نام ابی سینیا رکھا اور حبشہ بھی۔

ایتھوپیا میں نام لکھواتے وقت باپ کا نام پہلے آتا ہے۔ یہاں کے قبائل میں مُرسی قبیلہ سب سے زیادہ خطرناک وخونخوار ہے۔ وہاں جانے والے کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ ایتھوپیا میں قبائل کے درمیان اور دیہات میں اکثر مال کے بدلے مال کا بہت مضبوط رواج ہے جس کو انگلش میں باٹر سسٹم "Barter System" کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں آپ کو گندم دیتا ہوں آپ مجھے گھی دے دیں وغیرہ۔ ایتھوپیا کے ایک شہر میں لگڑ بگوں "Hyenas" کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلانے کو ثواب سمجھا جاتا ہے۔ رات ہوتے ہی لائٹ

دکھانے پر لگڑ بگے آنا شروع ہو جاتے ہیں اور لوگ اپنے گناہ بخشوانے کے لیے اس خطرناک اور غلیظ جانور کو اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتے ہیں۔ یہاں ایک لاکھ کے قریب قدیم یہودی بھی آباد تھے جن کو اسرائیل میں آباد کیا گیا۔ 1980ء ایک خفیہ آپریشن کے ذریعے جہاز کی سیٹیں نکال کر اس میں 600 کی جگہ 1086 ایتھوپین یہودیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بھر کر اسرائیل لے جایا گیا۔ جب جہاز اسرائیل پہنچا تو اس میں 1086 کی بجائے 1088 مسافر تھے۔ کیونکہ دوران پرواز دو خواتین نے دو بچوں کو جنم دیکر مسافروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ ایک جہاز میں 1086 مسافروں کو لے جانا ایک ورلڈ ریکارڈ ہے۔ اب یہ یہودی کالے ہونے کی وجہ سے اسرائیل کے سیکنڈ کلاس شہری ہیں۔ جو کام سفید چمڑی والے یہودی نہیں کر سکتے، وہ ان کالے یہودیوں سے لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کے طیش میں آکر فلاشانسل کے ایک یہودی کو سفید نسل کے سپاہی نے قتل کر دیا۔ صرف اس لئے کہ تم کالے ہو کر ہماری برابری کرتے ہو۔ کسی کالے یہودی کا ہسپتال میں خون کا عطیہ نہیں لیا جاتا۔

قارئینِ کرام کو یہ بات ورطہ حیرت میں مبتلا کر دے گی کہ براعظم افریقہ کے کم وبیش 54 ممالک میں سے ایتھوپیا ایک ایسا ملک ہے جہاں آج بھی mysterious قبائل آباد ہیں۔ دو صدیوں سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے جب دریائے نیل کے کنارے آباد surma قبائل جن کی ذیلی شاخیں مُرسی، سُوری اور معین کے نام سے بھی جانی جاتی ہیں، نقل مکانی کر کے ایتھوپیا کے جنوب مغربی جنگلات میں آکر آباد ہو گئے۔ کچھ جنوبی سوڈان کی طرف چلے گئے۔ یہ لوگ سیاہ فام اور ستر پوشی سے نابلد ہیں۔ تیز دھار اوزاروں اور جنگلی نوک دار کانٹوں سے اپنے چہرے اور جسم کو چھلوا کر مختلف خاکے بنوا کر خوبصورت بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونے کا لیپ بنا کر چہرے اور جسم پر لگا لیتے ہیں۔ ان میں امیری وغریبی کا تصور بھی موجود ہے۔ جس کے پاس زیادہ جانور ہوں وہ امیر، کم جانور والا غریب اور جس کے پاس کوئی جانور نہیں وہ قابلِ رحم اور پھکڑ ہے۔ ایک جنگلی کی بیویوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد چالیس ریکارڈ کی گئی ہے۔ توما نامی آسمانی خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔ ان کی رسمیں بھی عجیب وغریب ہیں۔ مثلاً ان کی خواتین اپنی نچلے دانت نکلوا کر مٹی کی گول پلیٹیں لگا لیتی ہیں جن کا قطر "6 سے "16 تک ہوتا ہے جس کے بعد یہ دنیا کی بدصورت ترین مگر اپنے قبیلے کی خوبصورت ترین شکلیں ہوتی ہیں۔ بدصورت میں نے اس لیے لکھا کہ قدرت نے انسانی جسم کو لطیف ومرمریں بنا کر ستر ڈھانپنے کا حکم فرمایا ہے۔ نسوانیت ڈھکی چھپی، شرمائی لجائی روح کش ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا انعامِ عظیم ہے۔ قرآنِ پاک کی سورۃ الاعراف آیت نمبر 25 لباس اور ستر کے بارے میں ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح احادیث مبارکہ 698 سے 715 تک، صفحہ 98 سے 201 اُردو عربی - جلد اول میں بھی یہی ذکر ہے۔

یہ قبائل اپنے روحانی پیشوا کی قیادت میں توما کی پرستش کرتے ہیں۔ مرد وزن شراب نوشی کرتے ہیں اور آگ

کے گرد ناچتے ہیں۔ اگر اس ناچ کو رقصِ ابلیس اور ان کی عبادت گاہ کو جہنم زار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ لوگ گائے کا دودھ کم اور خون پینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ زندہ گائے کا خون نکال کر پیا جاتا ہے۔ کسی کی موت کی صورت میں میت کی تمام رسومات بخوشی پوری کی جاتی ہیں۔ پھر ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس دعوت میں اسی میت کا گوشت ذوق وشوق سے کھایا جاتا ہے۔ اگر گائے مر جائے تو رونے دھونے کا سلسلہ کئی روز تک چلتا ہے اور قیامت کا سماع ہوتا ہے۔ یہ لوگ عقیدہ عداوت پر مضبوطی سے کاربند رہتے ہیں۔ ان کا دیگر قبائل سے دشمنیوں کا سلسلہ طویل چلتا ہے۔ جنگ وجدل پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ دشمنوں کی لاشوں پر جشن مناتے ہیں اور جنگ میں کام آ جانے والے اپنے ساتھیوں اور دشمنوں کی لاشوں کو کھانے کے بعد ہی ڈکار لیتے ہیں۔

بقول شاعر:

تماشے یہاں سب عشق ہی نہیں کرتا
اس پیٹ نے بھی دی ہیں رسوایاں بہت

میڈم کی کی کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ میں ٹیکسی واپس بھجوا چکا تھا اس لئے میڈم کی کی کمال مہربانی سے مجھے ہوٹل تک ڈراپ دیکر چلی گئی۔ طبیعت بے چین تھی کیونکہ سکیورٹی کے پیشِ نظر کہیں وزٹ پر جا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے ہوٹل میں گھوم پھر کر ٹائم پاس کیا۔ کمرے میں آ کر اپنی لکھی ہوئی تقریر کی نوک پلک ٹھیک کرنے بیٹھ گیا جو لومے چیمبر آف کامرس میں کرنی تھی اور پھر لومے T.V پر کرنی تھی۔ اس کے بعد T.V دیکھتا رہا اور آخر کار تھک ہار کر سو گیا۔ بہت گہری نیند سویا ہوا تھا کہ ایسا معلوم ہوا جیسے بہت زیادہ وزن کے نیچے آ گیا ہوں۔ اپنے آپ کو وزن کے نیچے سے نکالنے کے لیے بہت زور لگایا مگر کچھ نہ بن پڑا۔ جب حسبِ عادت درود پاک کے بعد سورۃ الناس اور سورۃ الفلق کا وِرد زبان پر آیا تو اپنے اوپر وزن کم ہوتا میں صاف محسوس کر رہا تھا۔ پھر کسی نے مجھے زور سے دھکا دیا اور میں پلنگ سے نیچے قالین پر جا گرا۔ ایک منٹ یا کم میں قالین پر ہی لیٹا، لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ پھر میں اُٹھ کر T.V لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گیا اور اپنے آپ کو چیک کیا۔ دل کی تیز دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے وِرد جاری رکھا۔ مجھے ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی ہے کیونکہ مجھے Movement محسوس ہو رہی تھی۔ اتنے میں صبح کی آذان کی آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ میں نے شاور لینے کے بعد نماز ادا کی اور درمیانی آواز میں تلاوت کرتا رہا۔ پھر ناشتہ کرنے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف پیدل ہی چلتا گیا۔ ہلکی ہلکی نسیمِ سحر، جھومتے پودے، رنگ برنگے پھول، نازنینوں کی طرح ہوا کے جھونکوں سے اٹھکیلیاں کرتے پائے گئے۔ میں درختوں، پودوں، پھولوں کو دیکھتا، ان سے تراوٹ حاصل کرتا خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ مگر میرا دماغ گزشتہ رات کے واقعے کو سوچ رہا تھا۔ میں نے کئی بار اس کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش بھی کی۔ مگر میری سوچ اِدھر اُدھر

بھٹک کر پھر واپس اسی حادثے پر آ جاتی۔ اسی کشمکش میں گرفتار میں ڈائننگ ہال میں داخل ہو گیا۔ آرام اور سکون سے ناشتہ کیا اور اسی طرح واپس آ گیا۔ ۱۱ بجے میڈم کی کی تشریف لے آئی اور مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔

یہ ہلٹن عدیس آبابا کا ہال تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ آنے شروع ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں ہی تمام کرسیاں مہمانوں سے پُر ہو گئیں۔ امریکن سفیر کی تقریر کے دوران لوگ دروازوں میں کھڑے بھی نظر آئے۔ امریکن سفیر سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ انگور کی بیٹی اس کے دماغ پر سوار تھی۔ میڈم کی کی نے میرا تعارف بہت زور دار طریقے سے کروایا اور پاکستان سے میری شمولیت کو ایک بہت بڑا اعزاز قرار دیا۔ اپنی باری پر میں نے اپنی شمولیت پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا ''اگرچہ یہ شمولیت نان شیڈول ہے مگر آپ نے جس فراخدلی سے ایک مسافر کو برداشت کیا اور اس کا حوصلہ بڑھایا میں اس کے لئے بہت ممنون ہوں اور میڈم کی کی کا خاص طور پر شکر گزار ہوں جس کی فراخدلی نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔ شکریہ!'' لنچ بہت زبردست تھا۔ لوگوں اور پری وشوں نے اپنے اپنے برانڈ کے مطابق شراب خوب اُڑائی۔ میڈم کی کی نے کہا میں حیران ہوں آج 2000 میں بھی آپ کا رویہ اور عادات واطوار قرونِ اولا جیسا ہے۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے ایک پیمانہ اٹھایا اور اسے لیمنیڈ سے لبریز کیا۔ جام سے جام ٹکرایا، For your Health کہا اور جا کر اپنی ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ چار بجے کے قریب میڈم کی کی مجھے ہوٹل چھوڑ کر جب جانے لگی تو بولی کہ بظاہر اب ہم کبھی نہیں مل سکیں گے۔ مگر جب بھی آپ اس ملک میں تشریف لائیں تو آپ کا پہلا فون مجھے آنا چاہیے۔ Good Bye اور وہ چلی گئی۔ میں نے کچھ دیر آرام کیا، سامان پیک کیا، کاؤنٹر پر چابی واپس کی، کلیرنس لی اور ائرپورٹ کی راہ لی۔

ائرپورٹ پر ہر قسم کی خباثت سے بچنے کے لیے اپنا پاسپورٹ دکھا کر VIP لاؤنج میں جا کر بیٹھ گیا۔ چائے، کافی، سنیکس سب Complementary تھا۔ فلائٹ اپنے شیڈول کے مطابق بروقت تھی۔ تمام مراحل بخیر وخوبی طے کرتا جہاز میں پہنچ گیا۔

لاؤنج میں ایک ڈیجیٹل بورڈ پر لکھا تھا.32 years old young air line۔ اب ایک نئی منزل، نیا جہان، نیا تجربہ۔ میرے اندر کا آوارہ گرد ویسٹ افریقہ کا جہانِ حیرت دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے کہ ایتھوپین ائرلائن دیگر کئی ملکوں کی ائرلائنز سے بہت بہتر ہے۔ بتیس سال کی عمر میں بھی وہ 16 سالہ حسینہ کی طرح جوان اور بھرپور انرجی کے ساتھ اپنے چاہنے والوں کو اپنی خدمات سے مستفید کر رہی تھی۔ سفر جاری رہا۔ موسم کے مطابق جہاز کا موڈ مزاج بدلتا رہا۔ کیونکہ ہم سہارا ڈیزرٹ پر سفر کرتے ہوئے اس کے پار جا رہے تھے۔ جب ایتھوپین زبان میں کوئی اعلان ہوتا تو صرف ائرپلینو سمجھ آتا جس کا مطلب ہوائی جہاز تھا۔ اس کے علاوہ کچھ سمجھ نہ آتا جب تک انگلش میں اس اعلان کو دوہرایا نہ جاتا۔

آخر کار منزل کے قریب آنے کا اعلان ہوتے ہی ذوق شوق میں ایک نئی منزل پر پہنچنے کی وجہ سے اضافہ ہوگیا۔ تھکاوٹ اور بے آرامی کے باوجود چاک و چوبند ہو کر بیٹھ گئے ۔ جہاز اب لینڈنگ کے پراسس میں تھا۔ پورے جہاز میں خاموشی طاری تھی اور آخر کار جہاز Lome International Air Port پر لینڈ کر گیا۔

باب 10: ٹوگو (2000ء)

کون ہے جس نے مئے نہیں چکھی
کون جھوٹی قسم اُٹھاتا ہے

مئے کدے سے جو بچ نکلتا ہے
تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے
(عدمؔ)

ٹوگو

(2000ء)

لومے (Lome) انٹرنیشنل ائرپورٹ کا نام فرنچ میں کچھ اس طرح لکھا ہوا تھا۔

AEROPORT DE LOME-GNASSINGBE EYADEMA LOME, TOGO

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی Mr. Keoula Kodjo سے ملاقات ہوگئی جو Mr. Aftab کا کارڈ ہاتھ میں لے کر سر سے بلند کیے ہوئے تھے۔ میرے Yes کہنے پر آ کر میرے گلے لگ گئے اور اونچی آواز میں خوشی کا اظہار کرنے لگے جس سے دوسرے لوگ بھی متوجہ ہوئے۔ مجھ سے میرا پاسپورٹ اور Tag لے کر اپنے ساتھ موجود پرسنل اسسٹنٹ کے حوالے کیا اور اُسے فرنچ زبان میں ہدایت دے کر میرا ہاتھ پکڑے VIP لاؤنج میں آ گئے۔ اچھی سی کافی اور چاکلیٹ وغیرہ سے تواضع کی گئی۔ اتنے میں میرے سامان کی ٹرالی اور پاسپورٹ بھی stamp ہو کر آ گیا۔ میں نے اپنا مکمل تعارف کرانے کے بعد Keoula سے کہا کہ میں اپنے مہربان میزبان کا مکمل تعارف چاہتا ہوں۔ نہایت خوش دلی سے اس نے اپنا نام بتانے کے بعد کہا کہ وہ سیکرٹری، لومے چیمبر آف کامرس ہے اور سامنے اشارہ کرتے ہوئے بولا کہ یہ میرا پرسنل اسسٹنٹ (PA) ہے۔ جب آپ کی طرف سے آپ کے آنے کی کنفرمیشن بذریعہ FAX موصول ہوئی تو سیکرٹری جنرل نے مجھے آپ کا پروٹوکول آفیسر مقرر کیا ہے۔ آپ کی واپسی تک میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ مسٹر کیولا ذہین، خوش مزاج اور صحت مند آدمی تھے۔ ائرپورٹ سے ہم سیدھے پام بیچ ہوٹل آئے۔ میرا سامان کمرے میں رکھوا کر صبح 8 بجے آنے کا کہہ کر چلے گئے۔ میں بھی شاور لے کر ہوٹل کے ڈائننگ روم میں آ گیا۔ مگر حلال کھانے کی تلاش میں بھوکا ہی رہنا پڑا کیونکہ بوفے میں ورائٹی تو بہت تھی مگر حلال ہونے کی ضمانت نہ تھی اور میں ایک سابقہ فرنچ کالونی میں نووارد تھا۔ شراب، پورک، بیف، چکن، لیمب سب حرام تھا۔ میں نے صرف کیلے، peanuts اور کافی وغیرہ سے گزارہ کیا۔ صبح ٹھیک 8 بجے ریسیپشن سے کیولا کا فون آ گیا کہ میں ریسیپشن پر آپ کا منتظر ہوں۔ میں تو وقت سے پہلے ہی تیار ہو کر موقع پر پہنچنے کا عادی تھا۔ فوراً لفٹ کے ذریعے نیچے آ گیا اور ہم لومے چیمبر کے آفس میں آ گئے جو زیادہ دور نہیں تھا۔ میرے ہوٹل سے چیمبر کے آفس تک جہاں اس وقت میں موجود تھا اگر بذریعہ کار ہم لومے شہر کی مین روڈ سے گزرتے تو سمندر ہمارے ساتھ ساتھ ہوتا یہ ایک خوبصورت منظر تھا۔

سیکرٹری جنرل نے مین گیٹ پر استقبال کرتے ہوئے مجھے ویلکم کہا اور اپنے آفس میں لے گئے۔ ٹوگو میں چیمبر آف کامرس سنٹرل گورنمنٹ کا ادارہ ہے جس کو ایک سیکرٹری لیول کا آفیسر ہینڈل کرتا ہے۔ اس لئے چیمبر کے

جھنڈے کے علاوہ ٹوگو کا جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔سیکرٹری جنرل سے پاکستان کے I.T.C. یعنی Import Trade Control پر بات ہوتی رہی۔وہ ٹوگو سے Coffee کی ایکسپورٹ میں دلچسپی رکھتا تھا۔میں پاکستان سے Non Traditional Items کی ایکسپورٹ کو بڑھانا چاہتا تھا۔اس نے کہا ہمارے ملک میں غربت ہے اور ہم اری 6 قسم کے سستے چاول خریدنا چاہتے ہیں۔ہم کافی دیر باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت کرتے رہے۔اس کے بعد ایک اور کمرے میں لے جایا گیا جہاں چائے اور کافی وغیرہ کا بندوبست تھا جس کو یہ لوگ High Tea کہہ رہے تھے۔باقی تمام سٹاف سے میرا تعارف کرایا گیا۔سیمینار کل سے شروع ہونا تھا جس کے لئے بریف کیا گیا۔جب ہم چیمبر کے آفس سے باہر نکلے تو مسٹر کیولا کہنے لگے اب ہم سیکرٹری خارجہ سے ملنے جا رہے ہیں کیونکہ آپ کے ویزا کی اجازت اس نے دینی ہے۔کل ائرپورٹ پر ہم نے آپ کو ویزا سپانسر کیا تھا۔اب سیکرٹری خارجہ سے اجازت لے کر آپ کے پاسپورٹ پر آپ جتنا بھی ویزا کی معیاد بڑھانا چاہیں بڑھا سکتے ہیں۔مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا لہٰذا ہم سیکرٹریٹ کی طرف چلے گئے۔ 10 منٹ کے انتظار کے بعد سیکرٹری صاحب نے درشن دیے۔ مسٹر کیولا نے میرا تعارف فرنچ میں کرواتے ہوئے میرے آنے کا مقصد بیان کیا اور کہا کہ مسٹر آفتاب کیونکہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہولڈ کرتے ہیں اس لئے آپ کی اجازت ضروری ہے تاکہ ویزا اینڈ امیگریشن آفس سے ان کا ویزا لگوایا جاسکے۔جب مسٹر کیولا یہ سب کچھ فرنچ میں بڑی تفصیل کے ساتھ سیکرٹری خارجہ کو بتا رہے تھے تو میں ان کے سامنے صوفے پر ہی بیٹھا تھا۔انہوں نے مسٹر کیولا کے پیش کردہ کاغذوں پر دستخط کر دیے جو ایک فائل کی شکل میں تھے۔اس کے بعد کیولا میرے ساتھ آ کر بیٹھ گیا اور بولا سیکرٹری صاحب کا تعلق ایک قبیلے سے ہے جس کی روایت کے مطابق نذرانے کے طور پر آپ سیکرٹری صاحب کو کچھ پیش کریں اور ساتھ ہی مجھے ایک خالی لفافہ تھما دیا۔میں نے اس میں 20 ڈالر کا نوٹ ڈال کر لفافہ میز پر اپنے پاس رکھ لیا۔کیولا پھر سیکرٹری صاحب کے پاس گیا اور فرانسیسی زبان میں اسے کچھ کہا۔جس سے سیکرٹری کے منہ پر رونق آ گئی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔کیولا نے مجھے اشارہ کیا تو میں سیکرٹری کی ٹیبل تک چلا گیا۔سیکرٹری نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔جب میں نے لفافہ پیش کیا تو اس نے بخوشی قبول کر لیا۔میرا ہاتھ پکڑے رکھا اور بولا میں اپنے ملک میں آپ کو ویلکم کہتا ہوں۔اس طرح یہ مرحلہ بھی طے ہوا اور واپسی پر ہم امیگریشن آفس آ گئے۔یہاں کے انچارج ایک کرنل صاحب تھے۔میرا پاسپورٹ جمع کرا دیا گیا اور دوسرے روز واپسی کا عندیہ دیا گیا۔اس طرح آج کی مصروفیت سے ہم فارغ ہو گئے۔کیولا فرانسیسی، انگریزی، رشین اور مقامی زبانوں کا ماہر تھا اور روانی سے لکھتا اور بولتا تھا۔کیولا نے مجھے ہوٹل چھوڑ دیا اور خود صبح 10 بجے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

میں کمرے میں جا کر سو گیا۔شام 7 بجے تیار ہو کر نیچے لاؤنج میں آ گیا۔یہ ہوٹل لبنانیوں کا تھا۔ہوٹل کے

اندر بار برائنڈ ہیلتھ شاپ تھی۔ جو اخانہ تھا اور بار بھی تھا جو لبنانی خواتین چلا رہی تھیں۔ رات دیر تک جو اخانے میں اور بار روم میں دھما چوکڑی دیکھنے کے قابل ہوتی تھی کیونکہ لوے میں دیگر کاروباری لبنانی بھی جو اخانے میں آ جاتے ہیں۔ مرد و خواتین، بوڑھے، جوان جب تک جوانہ کھیلیں رات کو سو نہیں سکتے۔ دیگر رات کے کام بھی یہ ہائی سکیل پر کرتے ہیں۔ خواتین خوبصورت، سنہری بال، سُرخ و سفید جلد، رُخسار لبنانی سیب کی طرح۔ دنیا میں ان کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ بالوں کی تراش خراش بھی لبنانی خواتین خوب کرتی ہیں۔ مجھے لوے اور کینیڈا کے شہر London Ontario میں اس کا تجربہ ہوا۔

جب سے میں آیا تھا کاجو، کیلے، افریقن بلیک شہد، ٹماٹر وغیرہ پر گزارہ تھا۔ مونگ پھلی بھی کافی مددگار ثابت ہوئی۔ کیونکہ ابھی تک حلال کھانا نہ مجھے ملا نہ میں نے کھایا۔ دوسرے روز سیمینار شروع ہوا۔ ٹوگو دنیا کے دوسرے ممالک سے بزنس کے رشتے جوڑنا چاہتا تھا۔ دیگر ممالک کے نمائندے بھی موجود تھے۔ زیادہ تر افریقن ممالک سے تھے۔ یورپین ایک بھی نہیں تھا۔ اپنی تقریر میں منسٹر کامرس آف ٹوگو نے جہاں زیادہ سے زیادہ مراعات دینے کی پُرکشش تقریر کی وہاں انہوں نے جنرل ضیاء الحق، صدر پاکستان کے ایک دورے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب صدر محترم تشریف لائے تو ان سے درخواست کی گئی کہ اگر پاکستان ہمیں شوگر مل لگانے کے لیے مکمل مشینری فراہم کر دے تو ہمارا گنا ضائع ہونے سے بچ جائے گا۔ صدر محترم نے وعدہ بھی فرمایا مگر ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہماری درخواست آج تک کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ جب میری باری تو میں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے پاکستان گورنمنٹ کے منظور شدہ شیڈول کے مطابق جو آرٹیکل افریقہ ایکسپورٹ کئے جا سکتے تھے ایک ایک کا نام لے کر بتا دیا۔ میں نے کہا کہ باقی رہا شوگر پلانٹ آپ میرے ساتھ (Memorandum of Understanding) MOU دستخط کریں، میرے نام سے L.C (Letter of Credit) کھولیں جو بینک آف امریکہ سے کاؤنٹر سائن ہونی چاہیئے۔

شوگر پلانٹس آپ اپنی ضرورت کے مطابق جتنے مرضی لیں۔ میں نے انہیں یہاں تک بھی آفر کی کہ اگر آپ چاہیں تو میں یہاں لوے میں اپنے ایکسپرٹ لا کر موقع پر بھی پلانٹ مینوفیکچر کرا سکتا ہوں۔ اس پر بہت زبردست تالیاں پیٹی گئیں۔ دیگر باہمی امور کی دلچسپی پر بہت بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ کھانا افریقن کلچر کے مطابق اچھا ہوگا۔ پینا پلانا بھی خوب تھا۔ حسینائیں بھی تھیں۔ کچھ خوب سے خوب تر بھی تھیں اور قدرت نے جو کچھ بھی ان کو عطا کیا تھا وہ انہوں نے کسی سے چھپا کر نہیں رکھا تھا۔ اس طرح یہ سیمینار اختتام پذیر ہوا۔

اس قسم کے سیمینار ایک ملٹی نیشنل اجتماع (Gathering)، اچھا کھانا، پینا پلانا، میل ملاقات کا سبب تو ہو سکتا ہے لیکن ملک کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ ہر ترقی پذیر ملک میں راجہ رینٹل اور مسٹر 10% ترقی کر کے سینٹ

پرسینٹ ہوگئے۔ دھیلے کی بھی کرپشن نہ کرنے والے گروہ کھربوں لوٹ کر بھی پھر امیدوار ہوں۔ بھولے بھالے، بیوقوف عوام، ذاتی مفاد کو مقدم رکھنے والے لوگ، ذات برادری کی بنیاد پر ووٹ دینے والے لوگ، سنہری خواب دیکھ اور سن کر ووٹ دینے والے لوگ اور سابقہ کرتوت اور کارکردگی بھول کر دوبارہ پھر اسی نام ونہاد کو ووٹ دینے والے لوگ ضرور ہوتے ہیں۔ وطن عزیز اور تمام افریقن ممالک ایشیائی ممالک اور دیگر ترقی پذیر ممالک سب اس منافقت کا شکار ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک بھی یہی چاہتے ہیں۔ یورپ اور خاص طور پر برطانیہ دنیا میں سب سے زیادہ دوسرے ممالک کے بھگوڑوں، غداروں، کرپٹ اور نام نہاد لیڈروں کو پناہ دیتا ہے۔ ٹوگو میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایک آرڈر مل سکتا تھا مگر کمیشن بہت زیادہ اور ایڈوانس کی خواہش کی جارہی تھی۔ ایسا بزنس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میری تقریر ریڈیو لومے اور ٹیلی ویژن والوں نے فوراً ہی نشر کردی۔ اس کے بعد مسٹر کیولا نے اس کا فرانسیسی ترجمہ خود ٹیلی کاسٹ کیا۔

تقریر کے نشر ہونے کے بعد ہوٹل کے ریسپشن سے فون آیا کہ دو لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا لاؤنج میں تشریف رکھیں۔ میں 10 منٹ کے بعد آتا ہوں۔ یہ دو لمبے تڑنگے آدمی تھے۔ جن میں سے ایک عبدالستار میمن آف کراچی دوسرا محمد آف ٹمبکٹو مالی تھے۔ دونوں نے اپنا تعارف بزنس پارٹنر کے طور پر کرایا۔ وہ اَری 6 چاول خریدنا چاہتے تھے اور پورے ایک Ship کی خواہش رکھتے تھے۔ میں نے ان کو چائے وغیرہ بھی آفر کی جو انہوں نے بصد شوق قبول کی۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے پوچھا کہ لومے میں حلال گوشت اور چکن وغیرہ سے پکا ہوا ایشین کھانا کہاں سے ملتا ہے۔ وہ ہنستے ہوئے بولے ایک بنگالی مسلمان کا Peri Peri کے نام سے ہوٹل ہے مگر اس کا اعتبار نہیں ہے۔ اوباش نوجوان ہے۔ Peri Peri مقامی زبان میں مرچوں کو کہتے ہیں۔ یہاں سے 40/50 میل دور ہائی وے پر ایک پاکستانی نے ہوٹل کھول رکھا ہے۔ اس کا کھانا 100% حلال طریقہ کار کے مطابق ہوتا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جس دن سے میں لومے آیا ہوں میں نے کھانا نہیں کھایا۔ وہ بے حد حیران ہوئے اور بولے صبح ہم آپ کو پورٹ وزٹ کرائیں گے جہاں پر ہمارے جہاز سے چاول آف لوڈ ہو رہا ہے۔ یہ چاول ہم نے کمبوڈیا سے منگوایا ہے۔ آپ وزٹ کریں پھر بزنس کی بات کریں گے اور کل کا لنچ بھی ہم لائیں گے۔ آپ صرف یہ بتادیں کہ کیا کھانا پسند کریں گے۔ میں نے پھر بھی گوشت کا رسک نہیں لیا اور انہیں فش کری کا کہہ دیا دونوں خوشی خوشی واپس چلے گئے۔ میرا بھوک سے بُرا حال تھا۔ پی نٹ، کیلے اور کاجو کھانا تو درکنار دیکھنے کو بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا رات کے 8 بج چکے تھے۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ نیچے لبنانی خواتین کے پاس جاتا ہوں اور انہیں اپنی مشکل بتا کر مدد کی درخواست کرتا ہوں کہ ریسپشن سے فون آیا۔ عبدالستار میمن بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے بے دلی سے ہیلو کہا تو عبدالستار نے کہا سر ہم تو پریشان ہوگئے تھے کہ آپ نے

4/5 دنوں سے کھانا نہیں کھایا۔ میں آپ کے لئے مچھلی کری اور چاول خود پکا کر لایا ہوں۔ ساتھ لبنانی نان بھی لایا ہوں۔ میں نے عبدالستار صاحب کا شکریہ ادا کیا اور لفٹ کے ذریعے نیچے لاؤنج میں آ گیا۔ اس نے کھانے کا ایک ہاٹ پاٹ اور ٹفن میرے حوالے کیا اور بولا مجھے کہیں جانا ہے میں اجازت چاہوں گا۔ میں نے جزاک اللہ خیر احسان الجزا کہتے ہوئے دروازے تک اس کو رخصت کیا اور کمرے میں آ گیا۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانا مزیدار اور خالص پاکستانی طرز پر تیار کیا گیا تھا۔

دوسرے روز دونوں بزنس مین تشریف لے آئے اور ہم پورٹ چلے گئے۔ اس وقت ویت نام، کمبوڈیا، چین اور تھائی لینڈ کے جہاز اپنی اپنی برتھ سے چاول آف لوڈ کر رہے تھے۔ مجھے عبدالستار میمن نے بتایا اگر پاکستانی چاول مارکیٹ میں دستیاب ہو تو پھر دوسرے ممالک کے چاول لوگ نہیں خرید کرتے کیونکہ خوشبو اور ذائقے میں پاکستانی چاول نمبر 1 ہیں۔ انہوں نے میری ملاقات ایک افریقی حسینہ سے کرائی جو اس پورٹ کی ڈائریکٹر جنرل تھی۔ حسیناؤں والے تمام انگ اور رنگ اُس میں موجود تھے۔ صرف آنکھیں اور دانت سفید رنگ کے تھے۔ باقی بالکل بلیک تھی۔ وہ مجھے اپنے آفس میں لے گئی۔ خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہنے لگی کہ آپ کی تقریر کا فرانسیسی ترجمہ سن کر میں بہت متاثر ہوئی ہوں۔ میں پاکستان سے اری 6 اور اری 9 قسم کا چاول امپورٹ کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کیا مدد کر سکتے ہیں، میں نے اسے تمام لیگل طریقہ کار سمجھایا اور L.C پر زور دیا وہ بھی امریکن بینک کی ضمانت پر جسے سن کر وہ بہت مایوس ہوئی اور بولی کیوں ناں ہم دونوں ایک بزنس کنشوریم بنا کر ایک شپ چاول اری 6 اور اری 9 کوالٹی کا امپورٹ کریں؟ میرے پاس برکینا فاسو اور بینن سے بھی آرڈر ہیں اور ہمارے ملکی ہول سیلرز بھی ہر وقت ڈیمانڈ کرتے رہتے ہیں۔ میں نے جان چھڑانے کی خاطر کہا ایک جہاز نہیں آپ جتنے مرضی جہاز امپورٹ کریں میں بندوبست کر دونگا۔ مگر کیش ایڈوانس دینا ہوگا وہ بھی US ڈالرز میں۔ ساتھ ہی میں نے جانے کی اجازت طلب کی تو مایوسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اتنے میں میرے دونوں میزبان بھی واپس آ گئے اور ہم لوے شہر گھومنے نکل پڑے۔ میں نے دیکھا کہ ایک دکان پر کونسل جنرل آف گنی بساؤ (Guinea-Bissau) کا بورڈ آویزاں ہے۔ میں بہت حیران ہوا۔ دونوں میزبان مجھے ہوٹل چھوڑ کر لنچ لینے کے لیے چلے گئے جو انہوں نے گھر پر ہی خاص طور پر میرے لئے تیار کرایا تھا۔ لنچ کے بعد دونوں میزبان برتن سمیٹ کر چلے گئے۔ میں اکیلا ہی پیدل دوبارہ مارکیٹ میں پہنچ گیا۔ میں نے کچھ ہی دیر میں وہ دکان تلاش کر لی جس پر گنی بساؤ کے کونسل جنرل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ وہاں 60/65 سالہ ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی جینز اور کُرتی میں پھنسی ہوئی بیٹھی تھی اور ایک چھوٹی سے میز پر ایک نوجوان لڑکا بھی موجود تھا۔ ہیلو ہائے کرنے کے بعد میں نے کہا His Excellency کونسل جنرل سے ملنا ہے۔ عمر رسیدہ شخص نے لڑکی کی طرف دیکھ کر فرانسیسی میں کچھ کہا تو لڑکی نے مجھے ہاتھ سے

اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ آپ His Excellency کونسل جنرل سے ہی مخاطب ہیں۔ میں نے اپنا ڈپلومیٹک پاسپورٹ ان کو دیتے ہوئے کہا کہ مجھے گنی بساؤ کا ویزا درکار ہے۔ میرا پاسپورٹ مسٹر کیولا نے کل ہی مجھے واپس کیا تھا جس پر تین سال کا Stay گورنمنٹ آف ٹوگو نے لگا دیا تھا۔ کونسل جنرل صاحب نے بڑی توجہ سے میرا پاسپورٹ دیکھا۔ تین سال کا Stay لگا ہوا بھی بہت غور سے دیکھا۔ پھر اپنی اسسٹنٹ کو فرانسیسی میں کچھ کہا۔ اس نے اپنے رجسٹر میں پاسپورٹ کے کوائف لکھے۔ ایک فارم مجھے دیا کہ دستخط کر دو۔ پھر سٹیکر نکال کر لگایا۔ مہریں لگائیں۔ کونسل جنرل نے دستخط کئے۔ اسسٹنٹ نے پاسپورٹ پر دستخط کی جگہ سیل لگائی اور پاسپورٹ میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اخلاقاً پوچھا اگر ویزا فیس چارج کرنا چاہیں تو۔۔؟ ابھی میرا فقرہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ کونسل جنرل نے کہا: ڈپلومیٹ کے لیے ویزا فری ہے۔ یہ ویزا کے اوپر بھی لکھا ہوا ہے۔ میں شکریہ ادا کر کے واپس آنا چاہتا تھا مگر کونسل جنرل نے میرا تعارف پوچھا۔ جب میں نے پاکستان کا نام لیا تو بہت خوش ہوا اور بولا الحمدللہ مسلمان۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی انگلش سے پتہ چلا کہ وہ گنی بساؤ کا مسلمان ہے اور لومے میں کونسل جنرل ہے۔ ساتھ بزنس بھی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ میری اچھی ہیلو ہائے ہوگئی۔ اکثر شام کو وہ میرے ہوٹل آ جاتا۔ لاؤنج میں بیٹھ کر ہم کافی پیتے رہے۔ میں ٹوگو، گنی بساؤ، برکینا فاسو، گھانا اور بینن کے بارے میں سوال جواب کرتا رہتا جبکہ وہ پاکستان کے بارے میں سوال کرتا رہا۔ اس کے پاس (CD) کور آف ڈپلومیٹ کا نمبر لگی نئی نویلی مرسیڈیز کار تھی۔ مجھے اس نے بڑی فراخدلی سے آفر کی کہ آپ کو جہاں بھی جانا ہو آپ مجھے فون کر کے گاڑی منگوا سکتے ہیں۔ اور جب میں نے فون کیا اس نے اپنی سیکرٹری سمیت جو اس کی ڈرائیور بھی تھی، فوراً گاڑی بھجوا دی۔

مسلمان ہونے کے باوجود نہ حرام حلال اور نہ ہی اسلام کے طور طریقے جانتا تھا۔ اس کے باوجود جھوٹ، نمود ونمائش اور Hypocrisy سے پاک صاف تھا۔ طبیعت میں سادگی اور سچائی تھی۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میں حرام کھانا نہیں کھا سکتا تو وہ فوراً بولا مٹن، بیف اور چکن کیسے حرام ہوا وہ تو آپ کھا سکتے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ مسلمان باوضو ہو کر، بسم اللہ پڑھ کر، تکبیر کہتے ہوئے ذبح کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرے لوگ ایک جھٹکا دے کر گردن کاٹ دیتے ہیں۔ بطور مسلمان میں جھٹکا کیا ہوا نہیں کھا سکتا اور میں کیا کوئی مسلمان اور آپ بھی نہیں کھا سکتے۔ وہ بہت حیران ہوا۔ بولا آج میں آپ کو ایک آفر کرتا ہوں کیونکہ آپ بہت نفیس انسان ہیں۔ آپ کے پاس آ کر نہ تو دل اداس ہوتا ہے اور نہ ہی میں بوریت محسوس کرتا ہوں۔ ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ میں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا آپ کچھ آفر کر رہے تھے یور ایکسی لنسی۔ وہ بولا آپ اکیلے ہوتے ہیں اپنی سیکرٹری کو آپ کی خدمت کے لیے آپ کے پاس بھیج دیا کروں؟ میرا ہنس کر اس کو نفی میں جواب دینا پریشان کر گیا۔ میں نے اسے کہا کل جمعہ ہے۔ آپ ایک بجے تک اپنی سیکرٹری کیساتھ میرے پاس آ جائیں اور ہاں شاور لے کر، اچھے کپڑے پہن کر، خوشبو

لگا کر تشریف لائیں۔اس کی حیرانی دیکھ کر میں نے اسے کہا مجھے آپ کو مسلمان بھائی ہونے اور اب تو میرے ذاتی دوست ہونے کی وجہ سے کچھ تحائف دینے ہیں۔وہ بہت خوش ہوا۔دراصل مجھے علم ہو چکا تھا کہ یہاں سے 3/4 کلومیٹر کے فاصلے پر مسلمانوں کی آبادی میں ایک مسجد ہے اور وہاں پر پانچ وقت نماز اذان کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔اور جمعہ اور عیدین کی نمازیں بھی بڑے اہتمام کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔اس دن دونوں کو نماز جمعہ ادا کرانے کے لیے لے جانا چاہتا تھا۔میں ایکسپورٹ سیمپل پاکستان سے لایا تھا جو ابھی تک میرے کمرے میں ایک ڈھیر کی شکل میں موجود تھے۔میں نے کونسل جنرل آف گنی بساؤ اور اس کی سیکرٹری کے لیے الگ الگ پیکٹ بنائے اور ہوٹل کے کاؤنٹر پر رکھوا دئے تا کہ وقتِ ضرورت وہاں سے لئے جاسکیں۔شام کو کیولا تشریف لے آئے۔بولے میری مسز آپ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کئی بار کر چکی ہے۔میں آپ کو لینے آیا ہوں۔وہ گھر پر آپ کا انتظار کر رہی ہے۔اگر آپ مہربانی فرما کر وزٹ کر لیں تو ہماری عزت افزائی ہوگی۔میں نے کہا مسٹر کیولا نو پرابلم چلتے ہیں۔آپ تشریف رکھیں۔میں کمرے سے ہو کر ابھی آتا ہوں۔میں کیولا کو لاؤنج میں بیٹھا کر کمرے میں آیا۔جلدی سے کچھ گفٹ ساتھ لئے۔اپنے آپ کو فریش کیا اور اپنے اولین میزبان کے ساتھ اس کے گھر چلا آیا۔یہ ایک صاف ستھری کالونی کا بنگلہ تھا جس کو یہ لوگ آفیسرز ٹاؤن کہتے تھے۔جب پورچ میں گاڑی رکی تو ایک خاتون اور 6 بچے میرے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔سب نے باری باری ہاتھ ملایا اور بہت ڈسپلن کے ساتھ جیسے آئے تھے ویسے ہی گھر کے اندر چلے گئے۔مسٹر اینڈ مسز کیولا میرے ساتھ سٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔میں نے تحائف پیش کیے۔تحائف پا کر وہ بے حد خوش ہوئے۔کئی بار جُھک جُھک کر میرا شکریہ ادا کیا گیا۔ایک عمر رسیدہ شخص بھی تشریف لائے۔کیولا نے کہا یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔کالج سے بطور پرنسپل ریٹائرڈ ہوئے ہیں اور آپ سے ملنے آئے ہیں۔انہوں نے مجھے افریقن بلیک ہنی کی ایک بوتل پیش کی۔افریقن بلیک ہنی صرف افریقہ میں ہی ہوتا ہے۔اس کی مکھی بالکل کالی اور پاکستانی کالی 'بھڑ' Hornet کے برابر ہوتی ہے۔مزاج کے لحاظ سے بہت ظالم اور زہریلی ہوتی ہے۔اگر ڈنک مار دے تو انسان کی موت واقع ہوسکتی ہے۔اس کا شہد اپنی تاثیر کے لحاظ سے دنیا کا نمبر 1 اور مہنگا ترین شہد ہوتا ہے۔اس کی فارمنگ نہیں ہوسکتی یہ صرف اور صرف افریقن جنگلوں میں ہی پروان پاتی ہے۔میں نے 25/30 منٹ کے بعد اجازت چاہی۔مسٹر کیولا مجھے ہوٹل چھوڑ کر چلے گئے۔

دوسرے روز کونسل جنرل اپنی سیکرٹری کے ساتھ تشریف لے آئے۔میں نے انہیں کہا پہلے مسجد چلتے ہیں۔آج جمعۃ المبارک ہے۔اللہ تعالیٰ کے حضور تجدیدِ وفا کرتے ہیں۔پھر اکٹھے پاکستانی ہوٹل جا کر لنچ کریں گے اور آج کا لنچ میری طرف سے ہوگا۔وہ OK کہتا ہوا مجھے ساتھ لے کر مسجد کی طرف روانہ ہوگیا۔مسجد کافی بڑی اور خوبصورت تھی۔لیکن ابھی نامکمل تھی۔سیکرٹری کو خواتین کے پورشن میں بھیج دیا گیا۔میں نے کونسل جنرل سے کہا آؤ

وضو کرتے ہیں تو وہ حیران ہوا کہ یہ وضو کیا ہوتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ آپ کی سیکرٹری وہ سامنے کسی اور خاتون سے باتیں کر رہی ہے۔ اس کو ذرا بلائیں۔ اس نے فرنچ میں کچھ کہا تو وہ بھاگی ہوئی آ گئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم ہے وضو کیسے کیا جاتا ہے؟ وہ بولی وضو کیا ہوتا ہے۔ میں نے اسے کہا پہلے اپنا تمام جسم کپڑوں کے اندر کرو جیسے دوسری مسلمان خواتین جوق در جوق شریف لا رہی ہیں۔ اس نے کسی اور خاتون سے چادر لے کر اپنا جسم ڈھانپ لیا۔ پھر میں نے ان کو انگلش میں سمجھایا کہ وضو یعنی "Ablution" نماز سے پہلے ضروری ہے۔ میں وضو کرتا ہوں آپ بھی میرے ساتھ وضو کریں۔ حالانکہ میں اپنے کمرے سے شاور لے کر وضو کر کے آیا تھا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ وضو کرتے رہے۔ سیکرٹری خواتین میں چلی گئی اور ہم دونوں مسجد کے مین ہال میں چلے آئے۔ تمام لوگ مقامی افریقن تھے۔ میں واحد پاکستانی اور سفید شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ امام صاحب بھی مقامی افریقن تھے۔ انہوں نے پہلے تو فرانسیسی زبان میں تقریر کی۔ پھر خطبہ عطا کیا اور نماز کی امامت کی۔

نماز کے بعد میں نے دیکھا کہ کونسل جنرل، امام صاحب سے کچھ گفت وشنید کر رہا ہے۔ پھر دونوں میرے پاس آئے۔ حلال گوشت کے بارے میں جو کچھ میں نے گزشتہ کل ان کو بتایا تھا وہ انہوں نے امام صاحب کو بتایا کہ ہمارا پاکستانی مسلمان بھائی یہاں کا گوشت حرام قرار دے کر نہیں کھاتا ہے تو انہوں نے کہا وہ سچ کہتا ہے۔ امام صاحب نے کہا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس لئے دونوں میرے پاس آ گئے۔ امام مقامی زبان کے علاوہ صرف فرنچ جانتے تھے۔ اس لئے میرے ساتھ ہاتھ ملانے اور السلام علیکم کے علاوہ مزید گفتگو نہ کر سکے۔ میں نے امام صاحب سے کونسل جنرل کے توسط سے درخواست کی کہ آپ اپنے نمازی لوگوں کو ہر نماز کے بعد حلال کی افادیت اور حرام کے نقصانات، ثواب وگناہ کے متعلق تفصیل سے بتا کر ہدایت فرمایا کریں۔

جواب میں اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے منبر تک لے آیا۔ اپنے پاس بٹھا کر فرنچ میں تقریر شروع کر دی۔ جو ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ دیر تک جاری رہی۔ تقریر کے دوران بار بار وہ میرا بازو کلائی سے پکڑ کر بلند کرتا اور اللہ اکبر کی صدا بلند کرتا۔ تمام لوگ اس کی تقلید کرتے ہوئے اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے۔ اس کے بعد کوئی نمازی بھی ایسا نہ تھا جس نے جزاک اللہ کہتے ہوئے مجھ سے ہاتھ نہ ملایا ہو۔

اس کے بعد ہم ہوٹل واپس آئے۔ میں نے دونوں کو تحائف پیش کئے۔ دونوں خوش سے نہال ہو گئے۔ اس کے بعد ہم اپنے پروگرام کے مطابق ہائی وے پر پاکستانی ڈھابے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈھابے پر بہت رش تھا۔ بہت ساری کاریں کھڑی تھیں۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ گوجرانوالا کے پکوان، کچی باسمتی سپر کرنل چاول کی خوشبو چار سُو پھیلی ہوئی تھی۔ مٹن کڑائی بنائی جا رہی تھی۔ آج میں جمعۃ المبارک کی وجہ سے شلوار قمیض میں تھا۔ مجھے دیکھ کر ڈھابے کا مالک پہلوان صدیق سیدھا ہمارے پاس آ گیا۔ تعارف اور علیک سلیک کے بعد میں نے اس کو

مبارکبادی کہ آپ نے اس کافرستان میں حلال کھانے پیش کر کے دنیا تو کمائی ہی ہے مگر آخرت بھی سنواری ہے۔ میں نے حلال گوشت کے بارے میں استفسار کیا تو وہ مجھے ایک طرف لے گیا اور اپنا سلاٹر ہاؤس دکھایا۔ اُس نے بتایا کہ ہم خود زندہ جانور خرید کر ذبح کرتے ہیں۔ چاول صرف پاکستانی سپر کرنل باسمتی استعمال کئے جاتے۔ زردہ، قلفی اور دیگر پاکستانی روایتی کھانے بھی پہلوان نے اس علاقے میں متعارف کروائے جو لوگوں نے بہت پسند کیے اور پہلوان اور اس کے 3 جوان بیٹوں کے بزنس کو چار چاند لگ گئے۔ ہم رات 8 بجے تک پہلوان کے ڈھابے پر انواع واقسام کھانے انجوائے کرتے رہے اور واپس ہوٹل آ گئے۔ کونسل جنرل نے وعدہ کیا کہ آج کے بعد وہ حرام کھانا نہ کھائے گا اور نہ ہی اپنے حلقہ احباب کو کھانے دے گا۔ دوسرے روز جب وہ مجھے ملنے آیا تو میں نے اس کو سارا سامان دکھایا اور بتایا کہ یہ میں بطور سیمپل لایا تھا مجھے یہاں پر اس معیار کا بزنس نظر نہیں آیا۔ سب ''نشستن گفتن برخاستن'' تھے جس کو میں نے انگلش میں کچھ اس طرح بیان کیا تا کہ یہ سمجھ سکے۔ "Sit, Talk and Leave"

مثال کے طور پر آج کل کشمیر کے مسئلے پر نہ صرف UNO بلکہ عالمی طاقتوں کا رویہ بھی بہت مایوس کن ہے۔ جبکہ دونوں ملک ایٹم بم کے اوپر بیٹھے ہیں۔ اس نازک مسئلے پر چشم پوشی اور شطرنج کی چالیں چل کر اپنے اپنے مفادات حاصل کر کے کیا وہ اپنے اپنے ملکوں کو تباہی بربادی سے بچا سکیں گے۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو تم یہ سب جان لو کہ صرف تین سے چار دن تک ہی بچ پاؤ گے پھر موت، بدنصیبی، نہ ختم ہونے والی تباہی اور نہ ختم ہونے والا قحط ہمارا تمہارا مقدر ہوگا۔ کشمیر، فلسطین اور دیگر مسائل پر اقوام عالم کی مجرمانہ خاموشی اور "Sit, Talk and Leave" کا رویہ ایک دن بڑی تباہی لاسکتا ہے (خدانخواستہ) اور UNO کا حشر اس کی والدہ ماجدہ لیگ آف نیشن جیسا ہوسکتا ہے۔ جبکہ اس کے دلال (Pimps) دنیا جہان سے نیست و نابود ہو کر قصہ پارینہ بن چکے ہونگے۔ یہ سب Pimps جہنم واصل ہونے کے حقدار بھی ہیں کیونکہ لگ بھگ آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی یہ سُلگتے ہوئے مسائل جو دنیا کے معصوم لوگوں کو ایٹمی بھٹی کا ایندھن بنا سکتے ہیں نہ یہ حل کرنا چاہتے ہیں اور نہ کرینگے کیونکہ ان کے ذاتی مفادات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ میں ان سب سے پھر درخواست کرتا ہوں کہ ملکوں کی طاقت، مزاج اور تاریخ پر بغیر کسی تعصب کے غور کریں اور ان مسائل کو حل کریں تا کہ آپ کا نام تا قیامت لیا جاتا رہے۔

سامان کونسل جنرل اور اس کی سیکرٹری کو بے حد پسند آیا۔ دیکھ دیکھ کر ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور صرف دو دن کے اندر ہی تمام سامان انہوں نے فروخت کر کے مجھے رقم لا دی۔ میں نے دو لفافے تیار کئے جن میں کرنسی نوٹ تھے۔ وہ میں نے دونوں کو بطور تحفہ پیش کر دیے۔ تحائف پا کر ان کی خوشی دیدنی تھی۔ صرف چند الفاظ ہی وہ بول سکا جو کچھ اس طرح تھے "Your Excellency" مجھے آپ کی دوستی پر فخر ہے۔ میں اپنی واپسی کی Booking کلیم کر چکا تھا۔ جو کہ عدیس آبابا (Addis Ababa) سے کنفرم ہونی تھی اور لومے، عدیس آبابا،

کراچی تک تھی۔ لومے شہر کے حالات خالص افریقی کلچر کے مطابق تھے۔ کچھ لبنانی لوگ بزنس کو ماڈرن بنائے ہوئے تھے۔ سٹارز ہوٹل کی وجہ سے لومے کو تقویت مل رہی تھی۔ ہمسایہ ممالک کے بارڈرز جن میں گھانا، بنین اور برکینا فاسو (Ghana, Benin, Burkina Faso) قابل ذکر ہیں کے دراور دل دونوں فراخدلی اور علاقائی بھائی چارے کی وجہ سے کھلے تھے۔ جو مرضی آئے جائے۔ کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

TOGO کا سرکاری نام TOGOLESE REPUBLIC ہے اور LOME اس کا سب سے بڑا شہر اور دارالخلافہ ہے۔ اس ملک کا کل رقبہ بائیس ہزار مربع میل ہے۔ اس طرح یہ افریقہ کا سب سے چھوٹا ملک ہے۔ اس کی آبادی 80 لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ دنیا بھر میں یہ ملک تنگ ترین (Narrowest) کے طور پر جانا جاتا ہے۔ جس کی چوڑائی صرف 71 میل ہے۔ اس جنگل بیابان میں گیارھویں صدی سے سولہویں صدی تک ہر طرف سے قبائل آ کر بستے گئے۔ سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک یورپین نے اس کی ساحلی پٹی کو غلاموں کی تجارت کا گڑھ بنا دیا۔ ٹوگو کا ساحلی علاقہ اور مُلحقہ علاقہ The Slave Coast کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جہاں سے غلاموں کی تجارت یورپین کا ایک بڑا بزنس تھا۔ یہ یورپین جن کا باپ ہی نہیں ہوتا یا جن کو اپنے باپ کا علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کون تھا ان کی اکثریت سنگل (Parent) یعنی صرف ماں کو مانتی ہے۔

انسانوں کو زبردستی طاقت کے طور پر اغوا کر کے لے جاتے اور غلاموں کی منڈیاں لگا کر انسانوں کو فروخت کر دیتے تھے۔ آخر کار 1884ء میں جرمنی نے اس پورے علاقے اور آج کے ٹوگو کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور اس کا نام ٹوگولینڈ رکھا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ٹوگو فرانس کو ٹرانسفر کر دیا گیا اور 1960ء میں ٹوگو نے فرانس سے آزادی حاصل کر لی۔ 1967ء میں ایک کامیاب فوجی بغاوت کے ذریعے MR. Gnassingbe Fyedema ملک کے صدر بن گئے اور 38 سال تک ملک کے صدر رہے۔ افریقہ میں یہ سب سے طویل صدارت کا دورانیہ ہے۔ جیسا کہ ضیاء الحق نے کیا تھا۔ 90 دن اور پھر تو کون میں کون! دونوں حضرات صدر بنے اور پھر صدر ہی فوت ہوئے۔

لمحوں کی غلطی کی صدیوں نے سزا پائی

2005ء میں ٹوگو کے مرحوم صدر کا بیٹا صدر بنا جس کا نام MR. Faure Gnassingble ہے اور وہ بھی آج تک صدر ہی ہے۔ یعنی 2021ء میں بھی اس کی صدارت قائم ہے۔ شائد حضرت جبرائیل علیہ السلام ہی اسے کرسی صدارت سے اٹھا کر عالمِ برزخ میں پہنچائیں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ٹوگو ایک زرعی ملک ہے اس کی سرکاری زبان فرنچ ہے۔ دیگر مقامی زبانیں بھی بولی جاتیں ہیں۔ مسلمان اقلیت میں ہیں۔ کرسچن اور

Indigenous Beliefs (مقامی مذاہب) کے لوگ اکثریت میں ہیں۔
یہ ملک مندرجہ ذیل عالمی اور ریجنل تنظیموں کا ممبر ہے۔

(1) United Nations Organisation. (UNO)

(2) African Union.

(3) Organisation of Islamic Cooperation.

(4) South Atlantic Peace and Cooperation Zone.

(5) Framcophonie, and Economic Community of West Aftican States.

ٹوگو کا مطلب ہے 'دریا کے عقب میں'۔ یہاں کے قدیم لوگ مٹی کے برتن بناتے تھے یا پھر لوہے کو ڈھال کر ضرورت کے آرٹیکل بناتے تھے۔ یہ بھی 1490ء میں پرتگالیوں کے آنے کی وجہ سے انہوں نے سیکھے ورنہ اس سے پہلے صرف کھیتی باڑی کر لیتے تھے۔ ٹوگو میں پہلے صدارتی الیکشن 1961ء میں ہوئے جس کے نتیجے میں 100% ووٹوں سے MR Sylvanus Olympo ٹوگو کے پہلے صدر قرار پائے اور 1967 میں ایک فوجی بغاوت کے نتیجے میں یہ 100% ووٹ لے کر آنے والا صدارتی کرسی سے گھسیٹ کر اتار دیا گیا۔ ٹوگو زرعی اجناس لائیوسٹاک اور مائننگ میں خود کفیل ہے اور اپنے عوام کو روزگار فراہم کرتا ہے۔ ٹوگو کے پاس دنیا کا چوتھا بڑا ذخیرہ Phosphate کا ہے۔ نمک، ماربل اور لائم سٹون کے ذخائر بھی پائے جاتے ہیں۔ فری لانسنگ Beaches ٹوگو کو سیاحوں کا مرکز بناتی ہیں۔ یہاں کی Beaches صاف ستھری، خوبصورت اور مکمل پرائیویسی کے ساتھ سیاحوں کو پرکشش ماحول فراہم کرتی ہیں۔

(1) Lome Coco Beach.

(2) Saint James Beach Lome.

(3) Boma Beach Avepozo Lome.

(4) Pure Beach Lome.

(5) Aneho Beach.

Beaches کا رنگ ڈھنگ ماحول جیسا بھی ہوتا ہے آپ سب بہت اچھی طرح جانتے ہیں لیکن افریقن Beaches کے رنگ کم لوگ ہی جانتے ہیں ۔ Beach پر کالی حسیناؤں کی بہار تھی۔ سوئمنگ کا لباس یعنی سوئمنگ کاسٹیوم مختصر ہوتا ہے۔ اس لئے یہ مختصر لباس ان کے جسم کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہا۔ بھاگ دوڑ میں

نظارے اپنا رنگ اور انگ بدلتے رہتے۔جس کا اندازہ صاحبِ نظارہ کو تو نہ تھا البتہ جمال کا نظارہ دیکھنے والوں کی کیفیت صرف محسوس کی جاسکتی تھی۔افریقہ اب ماڈرن دور سے گزر رہا ہے۔تعلیم عام ہے مگر اقلیت میں ہے لیکن قبائل،علاقائی،جنگلی(DNA (Deoxyribo Nucleuc Acid کا کیا کریں۔

لوگ جنگلی حیات کے ساتھ جنگلوں، پہاڑوں، دریائی ڈیلٹاؤں میں زندگی گزار کر جانوروں کا کلچر دیکھ کر کچھ نہ کچھ اور بعض جنگلی تو بہت کچھ اپنا چکے ہیں۔جو گوشت انہوں نے جنگلی جانوروں کا کھایا اور جو خون پیا ہے وہ ان کے DNA میں اپنا خاص اثر رکھتا ہے۔اس لئے اکثریت اخلاقی اور مذہبی قدروں سے نابلد ہے اور جنسی آزادی کو یہ بُرا خیال نہیں کرتے۔نوآبادیاتی نظام سے پہلے جو کچھ یہ جنگلوں میں جنگلی حیات کے ساتھ رہ کر اپنا چکے تھے نوآبادیاتی کے بعد اس کو مزید تقویت ملی۔کیونکہ آنے والے یورپین لُٹیروں نے ان کے وسائل لوٹنے کے علاوہ ان کو جنسی طور پر بھی دل کھول کر لوٹا اور یہ بھولے بھالے جنگلی اپنے سفید فام آقاؤں کے کرتوت دیکھ کر ان کی تقلید کرنا ضروری خیال کرتے اور یہ ہی ان کا احساس کمتری "Inferiority Complex" تھا۔

دوسری طرف ان کے سفید فام آقا Superiority Complex میں مبتلا تھے اور ان کو کیڑے مکوڑے تصور کرتے تھے۔اس طرح بطور انسان ان کی بربادی ہوئی اور عورت کی اہمیت ایک پروڈکٹ کی طرح یا اس سے بھی کم ہوگئی۔یہ جو کچھ میں Beach پر لکھ رہا ہوں۔یہ اپنا کلچر چھوڑ کر بحری قذاق، غاصب لُٹیروں اور ڈاکوؤں کا کلچر اپنانے کا نتیجہ تھا۔بحری قذاق سے یاد آیا "Hotel 2 Fevrier Lome' میں چیمبر آف کامرس کی طرف سے دیے گئے ایک ڈنر میں صومالیہ کے نائب صدر سے ملاقات ہوئی۔ویل ڈریس،شراب کے نشے میں دھت، بغل میں سیکرٹری کے نام پر داشتہ جو بظاہر پری جمال تھی۔10/15 منٹ مجھ سے محوِ گفتگو رہا اور ایک جہاز چاولوں کا خریدار بھی تھا۔میرے ہوٹل مجھے آرڈر Book کرانے بھی آیا۔پھر آرڈر کے کاغذات دے کر اپنی سیکرٹری کو بھی بھیجتا رہا۔کاغذ میرے پاس دستخطوں کے لیے پڑے رہے۔اس کی سیکرٹری کئی بار کاغذ لینے آئی۔ہر بار میں نے کہا ابھی انتظار کریں کیونکہ پاکستان سے ریٹ کنفرم ہو کر نہیں آئے۔میری سیٹ کنفرم ہو کر ٹکٹ آچکی تھی۔آخری دن میں نے کاغذوں کے کونے پر لال پین سے آبزرویشن لکھ دی کہ چاول اس ریٹ پر بہت اعلیٰ کوالٹی کے بھجوا سکتے ہیں مگر صرف 100% ایڈوانس پے منٹ پر۔یہ کاغذ میں نے اپنے دوست کونسل جنرل آف گنی بساؤ کے حوالے کر دیے کہ صبح ہوٹل جا کر بحری قذاق نائب صدر کو واپس کر آئے جو اس نے بخوشی قبول کر لیے اور بے حد خوش بھی ہوا۔وہ بولا صبح سب سے پہلے میں یہ کام کرونگا۔رات 11 بجے میری فلائٹ تھی۔میری واپسی پر سب سے زیادہ اداس میرا دوست کونسل جنرل تھا۔محترم قارئین کرام سوچ رہے ہونگے کہ میں نے اپنے دوست کا نام کیوں نہیں لکھا۔ہر جگہ اس کے عہدے سے ہی اس کو مخاطب کیا اور لکھا۔

اس گنی بساؤ کے شہری کا نام Abdoul Moccter اور اس کی سیکرٹری کم دوست کا نام Miss Sanira Mohammed تھا۔ بقول اس کے وہ گنی بساؤ کے صدر کا بڑا بھائی ہے۔ پہلے مسٹر کیولا آف چیمبر آف کامرس، لومے تشریف لائے۔ اور میرا سامان کار میں رکھوایا۔ پھر مسٹر کونسل جنرل تشریف لائے اور فرمائش کر کے مجھے اپنی گاڑی کا دروازہ خود کھول کر بٹھایا اور ائرپورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم VIP لاؤنج جا کر نشست افروز ہو گئے۔ مسٹر کیولا ٹکٹ اور پاسپورٹ لے گئے اور تمام کارروائی مکمل کر کے لے آئے۔ فلائٹ کچھ لیٹ تھی اس لئے میں نے مسٹر کیولا سے کہا کہ آپ جا سکتے ہیں۔ آپ نے اپنے تمام فرائض بخوبی انجام دیے ہیں۔ جس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ وہ کچھ پس وپیش کے بعد مان گئے اور ایک زوردار جپھا مار کر چلے گئے۔ اب میں اور میرا دوست رہ گئے۔ وہ بار بار اپنی اداسی کا اظہار کر رہا تھا۔ اور پوچھ رہا تھا کہ پھر کب آؤ گے مگر اس کی خواہش تھی کہ میں گنی بساؤ وزٹ کروں۔ وہ میزبان بننے کو تیار تھا۔ اور اپنی گورنمنٹ کی طرف سے ٹورسپانسر کرانے کو بھی تیار تھا۔ میں نے اپنی آمادگی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ جس سے وہ بہت مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا۔ بار بار وہ اظہار تشکر کے ساتھ میری تعریف میں ایسے کلمات کہہ رہا تھا کہ اگر میں وہ کلمات یہاں لکھوں تو سخت خودنمائی ہوگی۔

2001ء میں گورنمنٹ آف گنی بساؤ کی طرف چاول کی خریداری میں دلچسپی اور وزٹ کرنے کا ایک دعوت نامہ موصول ہوا جبکہ میں اپنے تین بچوں کی شادیوں میں بے حد مصروف تھا۔ میں نے اپنے دوست کونسل جنرل کو شادی کا دعوت نامہ بھی بھجوایا مگر بروقت اس کو نہ مل سکا۔ ورنہ شاید وہ شامل ہو جاتا۔ افریقہ میں عام طور پر اور ٹوگو میں خاص طور پر ہر عام و خاص نے مجھے چاول بھجوانے کے لیے آرڈر دینا چاہا مگر L.C کا طریقہ کار سن کر سب خاموش ہو جاتے یا مجھے سبز باغ دکھانا شروع کر دیتے۔ میں مستقبل کے ایکسپورٹرز کو مشورہ دوں گا کہ پوری دنیا میں کبھی بھی کسی کو بھی ادھار پر ایکسپورٹ نہ کریں۔ سعودی عرب کو بھی نہیں۔ ورنہ اپنی اصل رقم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور قانونی ذمہ داری بھی عائد ہو جائیں گی۔ آخر کار فلائٹ اناؤنس ہو گئی ہم دونوں بوجھل دل سے جُدا ہوئے۔

سفر کے تمام مراحل طے کرتے ہوئے دوسرے روز رات 8 بجے کراچی لینڈ کر گیا۔ کالو جی حسبِ معمول بذاتِ خود مجھے لینے تشریف لائے تھے۔

ان دیکھے دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

(شفیق سلیمی)

باب11: توجہ فرمائیں مجھے کچھ کہنا ہے

صرف کچھ ماہ چینی کی بجائے گُڑ استعمال کر لیں
آپ کا پیسہ پندرہ خاندان (شوگر مافیا) کی بجائے پچاس لاکھ
کسانوں کے پاس جائے گا
قومیں خود کو بدلتی ہیں اگر قومی غیرت سے سرفراز ہوں تو؟

توجہ فرمائیں مجھے کچھ کہنا ہے

بقول شاعر:

رہزن سے میرا رہبر منصف سے میرا قاتل
سہہ لوں تو قیامت ہے اور کہہ دوں تو بغاوت ہے

میری بہت قریبی عزیزہ میری عیادت کے لیے تشریف لائیں تو ان کا بیٹا بھی ہمراہ تھا۔ میرے کمرے کی ٹیبل پر حسب معمول کُتب کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ وہ بچہ کُتب کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک کتاب اٹھا کر اس کو دیکھا اور ذرا زور سے رکھ دی۔ پھر دوسری، تیسری اور اس طرح ایک کے بعد ایک۔ کتابوں کی ترتیب بے ڈھنگی۔ کسی کا ٹائٹل نیچے کی طرف چلا گیا اور کسی کی پُشت اوپر کی طرف ہوگئی۔ یہاں تک تو میری قوت برداشت قائم رہی۔ اس کے بعد اس نے میری ہی تصنیف ''فرشتے کی ایف آئی آر'' اٹھا کر اس کو اُلٹا پلٹا کیا اور کتاب پر میری تصویر دیکھ کر بولا یہ کتاب آپ نے لکھی ہے؟ میں خاموش رہا۔ اس کی والدہ محترمہ نے اس کو بتایا کہ یہ کتاب ماموں نے لکھی ہے۔ پھر نہایت ہی جاہلانہ انداز میں وہ کتاب کے ساتھ عجیب سا سلوک کرتا رہا اور مجھ سے مخاطب ہوا'' یہ کتاب کس ٹاپک پر ہے''؟ میں نے کہا بیٹا یہ تو کتاب پڑھنے کے بعد آپ ہی بتائیں گے کہ اس کتاب کا ٹاپک کیا ہے۔ اس نے جھٹ سے کتاب میز پر پھینک دی۔

عرصہ دو ماہ کے بعد اتفاق سے وہی لڑکا اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ مجھے دوبارہ وزٹ کر رہا تھا۔ اس دوران میری دوسری تصنیف ''مشرق کا موتی حوروں کا مسکن'' لاہور سے نستعلیق مطبوعات نے بڑے خوبصورت انداز میں پرنٹ کر کے بھجوا دی تھی۔ حسبِ ضرورت کچھ کتابیں میری سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھیں۔ حسبِ عادت اس لڑکے نے کتاب اٹھائی، اس کا سرِورق کھولا، ورق گردانی کی اور بولا انکل یہ کتاب کس ٹاپک پر ہے؟ میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا: ہر بار تمہارا گھِسا پٹا ایک ہی سوال ہوتا ہے۔ تم کتاب لے جاؤ۔ اس کو پڑھنے کے بعد آ کر مجھ سے مکالمہ کرو تو مجھے بھی احساس ہو کہ آپ ایک پڑھے لکھے لڑکے ہو۔ وہ بولا میں ''ایم ایس سی کمپیوٹر سائنس ہوں'' ۔ میں نے کہا بیٹا! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم ایک پڑھے لکھے جاہل ہو۔ اس نے جھٹ سے کتاب میز پر پھینک دی اور دونوں ہاتھوں کے اشارے سے کہنے لگا میں کتاب نہیں پڑھ سکتا۔ پھر وہ واپس جانے تک اپنے موبائل فون سے کھیلتا رہا۔ اس دوران صرف ایک بار وہ اپنی والدہ سے مخاطب ہوا۔ امی اب چلو میری کسی کے ساتھ Commitment ہے۔ یہ لڑکا پوسٹ گریجویٹ ہے۔

اس کی والدہ صاحبہ نے مجھے ایک بار کہا کہ اگر کہیں مناسب جاب ہو تو اس کے لئے کوشش کریں۔ ایک ادارے کے سربراہ وزٹ پر تشریف لائے تو میں نے ان کی خدمت میں درخواست پیش کی۔ انہوں نے کہا اس بچے کو میرے آفس بھیجنا میں غور کروں گا۔ جب میں نے اس لڑکے سے ان سب باتوں اور اگلے پروگرام کا ذکر کیا تو بغیر سوچے سمجھے اس لڑکے نے جواب دیا۔ ''پھر مجھے کیا فائدہ ہوگا''؟ ظاہر ہے ایسی بیہودہ گفتگو کے بعد مجھے خاموش

ہی ہو جانا تھا۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیں۔

پروفیسر ڈاکٹر شہزاد رانا اکثر و بیشتر میرے گھر تشریف لا کر مجھے سرفراز فرماتے ہیں۔ان سے اکثر ادبی مشورے ہوتے ہیں۔آنے والی کتاب کے ٹائٹل کے کلرنگ، کاغذ اور دیگر علمی امور پر ان کے مشوروں سے میں اکثر مستفید ہوتا ہوں۔اس بار جب تشریف لائے تو ان کا بیٹا حافظ عبدالرافع شہزاد، کلاس دہم، عباسیہ ہائی سکول بہاولپور، ان کے ہمراہ تھا۔جبکہ ڈاکٹر شہزاد رانا کا بھانجا عبدالمہیز بھی اس محفل میں شریک تھا۔یہ لوگ تشریف لائے تو باغیچے میں تیز دھوپ کے باعث ہم لوگ لائبریری میں جا بیٹھے۔دونوں لڑکے کتابوں کی الماریاں دیکھتے رہے۔ میں اور ڈاکٹر صاحب اس وقت جو کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے اس پر صلاح و مشورہ کرنے لگے۔ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا آپ اس کتاب کا پہلا باب جس کا عنوان نائیجیریا 1981 ہے اس کے چند پیراگراف پڑھ کر سنائیں۔

میں نے ان کی فرمائش کے احترام میں پڑھنا شروع کیا۔دونوں لڑکے پہلے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔پھر میرے دائیں اور بائیں آ کر بیٹھ گئے۔جب میں نے کچھ پیراگراف پروفیسر صاحب کو سُنا دیے اور پوچھا بس یا کچھ اور.....؟ دونوں لڑکے فوراً ہی چلائے :انکل آپ مزید پڑھیں اور یہ باب مکمل کریں۔بچوں کی دلچسپی محسوس کرتے ہوئے مجھے بھی روحانی خوشی سی محسوس ہوئی۔میں ہمیشہ نوجوان بچوں کی ہمت افزائی کرتا ہوں۔یہ لوگ وطن عزیز کا مستقبل ہیں۔پاکستان ایک خوش قسمت ملک ہے کیونکہ اس کی آبادی کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے۔

میں نے پڑھنا جاری رکھا لیکن درمیان میں کئی بار میں جب بھی سانس لینے کے لیے رکتا تو نوجوانوں سے ضرور پوچھتا کہ اگر آپ سن چکے تو میں خاموش ہو جاؤں۔لیکن ان کا ذوق شوق دیکھ کر مجھے دوبارہ پڑھنا پڑتا۔جب تک باب ختم نہیں ہو گیا دونوں لڑکے بے حد دلچسپی سے سنتے رہے۔اس کے بعد سوال جواب کا سیشن ہوا۔لڑکوں نے تجسس بھرے دلچسپ سوالات کئے۔یہ ان کی مہم جوئی علم و ادب سیکھنے اور سمجھنے کی لگن کے غماز تھے۔چند دن کے بعد بذریعہ وٹس ایپ ایک تبصرہ موصول ہوا جو کچھ اس طرح سے تھا۔

''منفرد خیالات کی حامل شخصیت'' (ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب)

آپ نے ہمیں اپنی نئی آنے والی کتاب جو افریقہ کے اسفار پر مشتمل تھی متعارف کروائی۔جبکہ اپنی شائع شدہ تصنیف ''مشرق کا موتی حُوروں کا مسکن'' میرے والدِ محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد شہزاد، میڈیا سٹڈیز اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور کو پیش کی جسے اب میں غور سے پڑھوں گا۔ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب نے خاطر تواضع کے بعد اپنی زیر طبع کتاب سے چیدہ چیدہ پیراگراف میرے والدِ محترم کی فرمائش پر پڑھ کر سنائے۔جو حیران کر دینے والے مختلف

واقعات اور نا قابلِ فراموش حادثات پر مشتمل تھے۔ منظر کشی اس قدر لاجواب کہ سب واقعات گویا ہمیں اپنے ساتھ پیش ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ آپ نے نائجیرہ کا سفر نامہ سُنایا جو مہم جوئی سے مالا مال تھا۔ اس غیر رسمی ملاقات میں میرے پھوپھی زاد بھائی عبدالمہیز بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کی لائبریری کے شیلفوں میں متنوع موضوعات سے متعلق دنیا جہاں کی کُتب کو نہایت سلیقہ اور ادبی انداز میں سجایا گیا تھا۔ جو ڈاکٹر ادریس احمد آفتاب کے اعلیٰ ذوق کا غماز تھا۔ ادبی ذوق وشوق کا ماحول اور مصنف کے پُرکشش انداز کی وجہ سے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

میرا یہ وقت جو میں نے ڈاکٹر صاحب کی رفاقت میں گزارا میری زندگی کے بہترین لمحات تھے۔ آج میں نے اپنے خیالات اپنے ہی سامنے انسانی روپ میں دیکھے جس کی تفصیل میرے لیے اس وقت بیان کرنا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کچھ دیر کے بعد لازمی پوچھتے: بچو! بور تو نہیں ہو رہے۔ جہاں آپ دونوں کی دلچسپی دم توڑ دے مجھے بتا دیں۔ میرے ساتھ ساتھ میرے کزن محترم کی توجہ اور دلچسپی دیدنی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں مختلف حقائق سے آگاہ کیا اور ساتھ ساتھ ہر ایک واقعہ کی وضاحت بھی کرتے جاتے۔ اسی سبب ہماری معلومات اور علم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ تاریخی شخصیات سے لے کر جنگی حالات تک تمام ادوار کے بارے میں مثال دے دے کر سمجھایا اور نصیحت کی کہ بیٹا کبھی بھی فرقہ واریت میں نہ پڑنا۔

ڈاکٹر صاحب بلاشبہ آپ ایک خوبصورت، پُروقار شخصیت کے حامل خوش اخلاق انسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی والی زندگی عطا فرمائے اور آپ کا سایہ شفقت ہم پر قائم ودائم رکھے (آمین ثم آمین)۔

اب آپ دونوں بچوں کا تقابلی جائزہ لیں۔ ایک کا تعلق ہائیر ایجوکیشن سے مگر ادبی اور تعلیم یافتہ ماحول سے نہیں۔ کتاب سے عداوت۔ نہ کتاب اٹھانے کی تمیز نہ رکھنے کا سلیقہ۔ آدھا گھنٹہ ورق گردانی کے باوجود بھی اس کو ٹاپک اور مفہومِ کتاب کا علم نہ ہو سکا۔ اس لئے وہ اپنی تعلیم کا بھرم نہ رکھ سکا۔ دوسرا بچہ صرف ثانوی تعلیم کے درجے میں زیرِ تعلیم ہے۔ ماشاءاللہ پکا حافظ قرآن پاک ہے۔ دیگر بہن بھائی حافظ قرآن ہونے کے ساتھ اپنی اپنی عمر کے حساب سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ادبی ذوق قابل تحسین ہے۔ اگر انصاف پسندی سے جائزہ لیا جائے تو میٹرک میں زیرِ تعلیم بچے کا معیار یا آئی کیو، ایس کیو اور ای کیو دوسرے بچے سے بہت بلند ہے۔

IQ-Intelligence Quotient, SQ-Spiritual Quotient, EQ-Emotional Quotient

یہ نہایت ہی افسوس کا مقام ہے۔ اس کی وجہ یونیورسٹی چوک سے فوٹو سٹیٹ کی دکانوں سے نوٹس (Notes) خرید کر یاد کر کے امتحان دینا ہے۔ جس کو عام فہم زبان میں رٹہ لگانا کہتے ہیں۔ اس قسم کی تعلیم نہ تو معیاری ہوتی ہے اور نہ ہی تخلیقی ہوتی ہے۔ آپ اس کو فارمولا تعلیم کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کے طالب علم کتاب سے ایسے بھاگتے ہیں

جیسے کو اغلیل سے بھاگتا ہے۔مگر نتیجتاً زندگی کے ہر تعلیمی ٹیسٹ اور انٹرویو میں ناکام رہتے ہیں۔نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ان کی ڈگری کی حیثیت ایک کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں ہوتی۔انہوں نے ماں باپ کا سرمایہ،حسرتیں،تمنائیں اور دعائیں،انٹرنیٹ موٹر سائیکل سواری،موبائل،سوشل میڈیا اور دیگر خرافات میں غرق کردی ہوتی ہیں اور ناکامی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔آج کل لائبریریوں کا فقدان ہے اور ہوٹلوں کی بھرمار ہے۔ جس کی وجہ سے پیٹ نمایاں ہوتے جارہے ہیں اور دماغ سکڑتے جارہے ہیں۔یہ چلن اولاد آدم کا نہیں۔پیٹ پالنا صرف جانوروں کا ہی حوصلہ ہے۔میرے وطن کے جوانو!اپنے طریقہ تعلیم پر غور کرو۔نوٹس خرید کر رٹہ لگانے کی بجائے اپنی ریسرچ خود کریں۔اس طرح آپ کی قابلیت میں چار چاند لگ جائیں گے۔علم میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔کتاب کا ساتھ کسی بھی حالت میں نہ چھوڑیں اور اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو آپ خودکشی کررہے ہیں۔اپنی قابلیت کو موت کی نیند سُلا رہے ہیں۔اپنی صبح کی ابتدا نماز اور دعا سے کریں۔دنیا میں دعا ہی سب کچھ ہے۔اگر قبول ہوجائے تو موت کا وقت بھی ٹل سکتا ہے۔اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں سے شارٹ کٹ کا لفظ نکال دیں۔تفصیل سے ریسرچ کریں۔کتابیں بطور حوالہ جات استعمال کریں۔اس کے علاوہ ادبی،سفرنامے،خودنوشتیں،مہم جوئی، شکاریات،رومانس کی کتابیں پڑھیں اور قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھیں۔ہرگز ہرگز سُنی،شیعہ،اہلحدیث، بریلوی،دیوبندی،اور دیگر تمام مسالک کے چکر میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہ کریں۔شکل سے مسلمان نظر آنے کے بجائے دل ودماغ اور اپنے عمل سے مسلمان نظر آئیں۔

ہم امریکہ اور یورپ کے کلچر کی تقلید کرتے ہیں۔ان ممالک کی طاقت ان کی چھ ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔جس میں سے 500 دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں شامل ہیں۔دورِ حاضر میں قوموں کا عروج علم،کتاب اور ریسرچ سے وابستہ ہے۔جبکہ ہمارے ملک میں لوگ علم وتحقیق کی بجائے پراپرٹی کے کام سے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم اپنی امت کی ہدایت اور بخشش کے لیے دعا فرماتے تھے۔ایک مثال پیش کرونگا۔بمطابق مشکوۃ شریف حدیث نمبر 2352،ترمذی شریف حدیث نمبر 3434،ابوداؤد حدیث نمبر 1516، ابن ماجہ حدیث نمبر 3814۔حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان فرماتے ہیں:ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک مجلس میں سومرتبہ یہ فرماتے ہوئے سُنا۔''میرے رب!مجھے بخش دے،میری توبہ قبول فرما،بے شک تو توبہ قبول کرنے والا بخشنے والا ہے۔''ہم شمار کیا کرتے''۔

ہمارے نام نہاد علماء جو لاکھوں کی صرف لسی پی جاتے ہیں۔کروڑوں عربوں کے فائدے،بلیک میلنگ،وطن عزیز کے اثاثوں پر قبضہ کرنا،خودساختہ رہنما بن کر،لوگوں کے معصوم بچوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے دے کر،سڑکوں پر کھڑے کرنا اور حکومتِ وقت کو بلیک میل کرنا۔مدرسوں میں مستقبل کے علماء تیار ہورہے ہیں یا غنڈہ گردی کے

لیے فورس تیار ہو رہی ہے۔ یہ کس شرعی، اخلاقی، قانونی جواز کے تحت ہو رہا ہے۔ دراصل ہم اپنا اور صرف اپنا فائدہ سوچتے اور دیکھتے ہیں۔ ہمیں وطن عزیز کا نہ تو خیال ہے اور نہ ہی احترام ہے۔

پاکستان دشمن قوتیں روز اول سے ہی اس بات پر مُتفق ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے۔ ہم اس کو اسلام کے نام پر ہی ختم کر دیں گے۔ ہزار ہا سازشوں کے باوجود یہ اللہ تعالیٰ کا انعام خاص، محمدؐ عربی کے نام لیوا غلاموں کا خطہ زمین انشاء اللہ تا قیامت قائم و دائم رہے گا۔ مذہبی انتشار پھیلانے، مسلکوں کی جنگ کروانے، نفرت انگیز جذباتی تقاریر کر کے عوام کو کشت خون میں نہلانے اور اپنے بڑے بڑے پیٹ، موٹی موٹی اکڑی ہوئی گردنیں، اونٹ پٹانگ اور مفروضوں سے بھرپور تقاریر، سمیت یہ لوگ ملک و قوم کے خیر خواہ نہیں ہیں۔ میں اللہ کا ولی، تم کافر، وہ کافر، غیر مسلک کا ہر فرد کافر کے علاوہ اور ان کے پاس کہنے کو ہے ہی کیا۔ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں کیوں کہتے ہیں صرف ایک مثال ہی کافی ہوگی۔ اگر آپ فراخدلی سے کام لیتے ہوئے مذہبی برداشت، رواداری اور نبی کریمؐ کے فرمان پر عمل کریں تو نہ صرف مذہبی امن قائم ہوگا بلکہ ان کمرشل نام نہاد علماء اور قوم کے غم میں گُھل گُھل کر بھینسوں کی طرح کمزور ہوتے ہوئے خود ساختہ رہنماؤں سے بھی جان چھوٹ سکتی ہے۔ یورپ کی عیاری اور وطن عزیز کو مذہب کے نام پر کشت خون میں نہلانے کے لیے ہزر ہا جتن کیے جاتے ہیں۔ میں اپنے تمام مسلمان بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 1400 سال سے ہمارے دلوں میں زندہ ہیں اور آج بھی کائنات کی خوبصورت ترین ہستی ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ پھر ہم محبوب باری تعالیٰ کے فرمان پر عمل کرنے کی بجائے ان کمرشل مولویوں پر یقین کیوں کرتے ہیں۔ ذرا سوچیں یہ آپ کو کس طرف لے جا رہے ہیں۔ نہ یہ ایمانی ہیں اور نہ ہی یہ روحانی ہیں۔ جس دن ہمیں قرآن سمجھ آ گیا اس دن نہ کوئی مسلک ہوگا نہ فرقہ۔ دنیا کے سب سے خوبصورت قائد، سب سے افضل لیڈر، سب سے بڑے معلم ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ کائنات کا پہلا گناہ نہ شرک تھا نہ کفر بلکہ پہلا گناہ تھا میں اس سے بہتر ہوں۔ اور یہ حرکت یہ پل پل کرتے ہیں۔ لہٰذا اب آپ خود ہی فیصلہ کریں۔

قرآن کریم میں جتنی بھی قوموں کی تباہی کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک بھی قوم کی تباہی کی وجہ روزہ، حج، زکوٰۃ چھوڑنا نہیں تھا۔ بلکہ کم تولنا، رشوت ستانی، انصاف نہ کرنا، کسی کا حق کھانا، ناحق قتل کرنا تھا۔ تقریباً اٹھارہ ہزار مخلوقات میں سے صرف انسان ہی پیسہ کماتا ہے۔ دیگر مخلوق کبھی بھوکی نہیں رہتی جبکہ حضرت انسان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ صرف قبر کی مٹی ہی انسانی پیٹ بھر سکتی ہے۔

میرے بچو! میں آپ کی ہمت افزائی اور رہنمائی کے لیے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک سکول ٹیچر 1996ء میں اپنی کلاس کو لیکچر دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ہمیشہ اپنا Vision بلند رکھیں۔ خواب میں بھی بلند مقصدِ حیات

دیکھیں ۔ پھر وہ باری باری ہر طالب علم سے پوچھتا کہ تمہارے خواب کیا ہیں ۔ ہر لڑکا اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق جواب دے رہا تھا کہ ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر ایک سوال کر دیا۔

''سر آپ کا مقصدِ حیات یا خواب زندگی کیا ہے۔''

ٹیچر نے جواب دیا میرا خواب ہے کہ میں امریکہ کا صدر بنوں ۔ بارک اوبامہ جو ایک ٹیچر تھا، دو مرتبہ امریکہ کا صدر بنا۔ یہ ہوتا ہے مقصدِ حیات۔

خواب، خیال، مقصد حیات ہمیشہ بلند ہونے چاہییں ۔ کبھی بھی کتاب، مطالعہ، اچھی سوسائٹی، عبادت اور دعا کا ساتھ نہیں چھوٹنا چاہیے۔ دعائیں مانگیں، دعائیں لیں اور دعائیں دیں ۔ پھر اللہ رب العزت کا رحم اور کرم دیکھیں۔ شارٹ کٹ راستے آپ کو زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے لے جائیں گے۔ جتنی کوشش، بھاگ دوڑ اور جوش جذبہ آپ اپنے پیپرز میں نمبر لگوانے میں کرتے ہیں اگر اس سے آدھی محنت آپ پڑھنے اور ریسرچ پر کر لیں تو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہو سکتے ہیں۔ پاکستان اور بھارت میں آج کل اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین و حضرات میں طلاق کی شرح 80% ہے۔

بقول شاعر:

سُندر سُندر میرے سپنے
بہہ بہہ جاتے ہیں کاجل میں
رقص کریں یہ کیسے مل کر
فرق ہے گھنگرو اور پائل میں

یہ ایک خطرناک ترین رجحان ہے۔ جو بچے مخلوط تعلیم حاصل کرنے کے بعد یونیورسٹی میں پہنچ جاتے ہیں وہ عادات، اطوار کے لحاظ سے نہ شرمیلے ہوتے ہیں اور نہ جھجک محسوس کرتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب یہ بچے اپنی عملی زندگی شروع کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر اپنی اپنی تعلیم اور قابلیت کی وجہ سے عمومی طور پر اور رشوت، سیاسی نام و نہاد لیڈروں کی وجہ سے خصوصی طور پر چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔ پھر شادی یا شادیاں کر کے اپنی عائلی زندگی کی شروعات کرتے ہیں۔ خوشیوں سے سرشار ماں باپ، بہن بھائی اور دیگر فیملی کے لوگ خود دلہن دلہا بھی کچھ ہفتے یا مہینے دل بہار کیفیت میں رہتے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ حالات بدلنا شروع ہوتے ہیں اور شروعات موبائل فون، فیس بک، لیپ ٹاپ، وٹس ایپ، یوٹیوب اور ٹک ٹاک سے ہوتی ہے۔ ذوق شوق اپنا اپنا لیکن گھر کے حالات بگڑنا شروع ہو جاتے ہیں ۔ خاوند موبائل فون پر ہے تو بیوی دوسرے کمرے میں لیپ ٹاپ پر مصروف ہے یا موبائل پر لمبی لمبی باتیں ہو رہی ہیں۔ انٹرنیٹ فری کالز نے بھی طلاق کی شرح بڑھانے میں

اہم رول ادا کیا ہے۔اب یہ ایک دو دن کی بات ہو تو قربانی دی جا سکتی ہے مگر یہ تو روز کا وطیرہ بن گیا۔جو لڑکی تمام رات لیپ ٹاپ یا فون پر مصروف رہے گی وہ صبح خاوند کے دفتر جانے کے امور میں مدد کیسے کرے گی۔انتہا تو یہ ہے کہ خاوند کی دفتر سے واپسی پر بھی وہ خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی ہوتی ہے۔اس کو وہ آج کل کا ماحول اور برابری کا درجہ دیتی ہے۔اگر زوجہ محترمہ خود بھی ملازمت کر رہی ہیں تو نخرہ اور شان شوکت آسمان کو چھو رہی ہوتی ہے۔مشترکہ خاندانی نظام میں اپنے آپ کو مِس فٹ قرار دیکر واپس لوٹ جاتی ہے۔اگر صرف اپنے خاوند کے ساتھ قیام پذیر ہو تو اس کو خاک کے برابر بھی نہیں خیال کرتی اور اس کی مٹی پلید کرتی رہتی ہے۔میں ایم فل ہوں اور تم صرف Msc ہو۔میرے ساتھ ذرا تمیز سے بات کیا کرو وغیرہ۔یہ عام سی باتیں ہیں۔لڑائی عروج پر اس وقت ہوتی ہے جب خاوند اعتراض کرتا ہے کہ تم ساری رات لیپ ٹاپ یا موبائل فون پر کیا کرتی رہتی ہو۔مجھے اپنا کوڈ یا I.D بتاؤ۔بس پھر کیا چنگاری پر پٹرول ڈال دیا گیا اور شعلے اپنا رقص کرنے لگے۔صرف لڑکیوں میں ہی نہیں بلکہ لڑکوں میں بھی یہ مرض بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔نتیجتاً نہ بیوی خاوند پر اعتبار کرتی ہے اور نہ ہی خاوند بیوی پر بھروسہ کرتا ہے۔لڑائی جھگڑا روز بروز بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔پھر تم اپنے گھر اور میں چلی میکے۔اس کے بعد دونوں عدالتوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔خاوند شور مچاتا ہے کہ یہ تمام رات انٹرنیٹ پر نہ جانے کس سے مصروف رہتی ہے۔زوجہ محترمہ فرماتی ہیں میں اس شخص کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی نہ اس کے حالات ٹھیک ہیں اور نہ ہی آلات۔لہٰذا عدالت بھی مجبور ہو کر مقدمہ لڑکی کے حق میں ڈگری کر دیتی ہے۔

اس تمام کہانی میں وکیل صاحبان کی مہارت اور رائی کو پہاڑ ثابت کرنے کا نتیجہ طلاق ہے۔آج کل اپنوں میں سے اپنوں کو ڈھونڈنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔یہ تو تھا آج کل کی انفارمیشن ٹیکنالوجی کا کمال۔کچھ گھروں کا ماحول بھی فرسودہ اور غیر مذہب ہوتا ہے جہاں پڑھی لکھی بچی کا گزارہ ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔کچھ ماں باپ اپنی بیوقوفی اور جہالت کی وجہ سے اپنی بیٹی کو بسنے نہیں دیتے۔ذرا ذرا سی بات پر اس کے گھر میں مداخلت کریں گے اور اس کو باور کرائیں گے ''بیٹا ہم مر تو نہیں گئے۔ہم تمہیں کھلا سکتے ہیں۔تم کسی کی پروانہ کیا کرو۔تم جیسے ہی فون کرو گی ہم تمہیں لینے آ جائیں گے''۔لڑکی بیچاری ناتجربہ کار ہونے کے ناطے ماں باپ کے احترام میں اور ماں بہنوں کی لگی لپٹی باتوں میں آ کر اپنا گھر اجاڑ دیتی ہے۔کچھ ہی عرصہ بعد ماں باپ کے گھر میں اس کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔باوقار ماں باپ اپنی خاندانی روایت کے مطابق اپنی بیٹیوں کو نصیحت کرتے ہوئے سمجھاتے ہیں کہ دیکھو بیٹی! اب تمہارے شوہر کا گھر ہی تمہارا گھر ہے۔اپنا گھر آباد کرو۔اللہ تمہارا حامی ناصر ہو۔اور اپنی آنسو بھری آنکھیں چھپانے کے لیے چہرہ دوسری طرف کر لیتے ہیں۔طلاق کی دوسری وجہ معاشرتی برائیاں بھی ہیں۔بعض اوقات اوباش، جواری، نشے کے عادی دیگر بے شمار برائیاں لیے ہوئے مرد و زن بھی ہیں

۔لیکن زیادہ تعلیم یافتہ جوڑوں میں فرعونیت، بے راہ روی، عدم برداشت، ایک دوسرے کی عزت کا احترام نہ کرنا ،دونوں کی خاندانیت پر بھی منحصر ہے۔حسب نسب "pedigree" میں اگر ایک کمزور ہے تو وہ دوسرے کو ذلیل خوار کرتا رہے گا۔ یا اچھے حسب نسب والا دوسرے پر فوقیت چاہے گا۔جس کی وجہ سے لڑائی جھگڑا بڑھتے بڑھتے نوبت طلاق تک جا پہنچے گی۔

سوچوں کو بدلنے سے نکلتا ہے نیا دن
سورج کے چمکنے کو سویرا نہیں کہتے

وکلاء صاحبان طلاق کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ طلاق دینے سے دو خاندانوں میں بڑا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور بچوں کے مستقبل پر بُرا اثر پڑتا ہے۔طلاق یافتہ عورت کے لیے دوہری شادی مشکل ہو جاتی ہے۔ طلاق سے ذہنی سکون ختم ہو جاتا ہے۔لہٰذا میاں بیوی برداشت کا مادہ پیدا کریں۔منفی باتوں کو چھوڑ کر اپنی خامیوں کو دور کریں اور ایک دوسرے کی خوبیوں کو اجاگر کریں۔اللہ جل جلالہ شادی شدہ جوڑوں میں پیار محبت اور قوتِ برداشت میں برکت عطا فرمائے۔آمین ثم آمین۔گو کہ طلاق علیحدگی کا اسلامی طریقہ کار ہے مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ عمل ہے۔

تمام ایسی خواتین جو بطور زوجہ محترمہ کے اپنے فرائض ادا کر رہی ہیں ان کی خدمت میں درخواست ہے کہ ہر شخص کے پاس ایک تکلیف دہ کہانی ہوتی ہے اور ہر تکلیف دہ کہانی کا انجام کامیابی ہوتی ہے۔اس لئے تکلیف کو برداشت کرنے کی عادت پیدا کریں اور کامیابیاں سمیٹنے کے لیے تیار ہو جائیں۔اس طرح آپ کے شوہر کی نظر اور دل دماغ میں آپ کی محبت، عزتِ تکریم میں بے پناہ اضافہ ہوگا۔خوشی میں تو دشمن بھی ساتھی ہوتا ہے مگر تکلیف میں صرف ہمدم ساتھی ہوتا ہے اور ہمدم کبھی نہیں بھولتا۔جبکہ عورت کی جبلت اس قانون پر قائم ہے کہ اگر آپ اس سے محبت کرتے ہیں تو ماں بہنوں اور قابل احترام رشتوں کو چھوڑ کر آپ کو دنیا کی ہر عورت سے نفرت ہونی چاہیے۔

میں مرد حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک تمہیں دنیا میں لائی جس کو ''ماں کہتے ہیں'' دوسری ساری دنیا چھوڑ کر تمہارے پاس آئی ''جس کو بیوی'' کہتے ہیں۔لہٰذا ماں اور بیوی کو بے پناہ عزت دو۔جزاک اللہ خیر احسان الجزا۔آپ دونوں یا دونوں میں سے ایک پی ایچ ڈی ہو یا کئی بار پوسٹ پی ایچ ڈی ہو اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑتا۔کیونکہ ہمیں بہت زیادہ علم کے مقابلے میں ادب کی زیادہ ضرورت ہے۔میری اپنی زندگی کا راز جو کہ 54 سالہ عائلی تجربے پر محیط ہے، کچھ یوں ہے۔

فارمولا نمبر 1: بقول یونس

یاد تھا اک اسمِ اعظم

ورنہ میں مارا گیا تھا

فارمولانمبر2: سُسرال میں

Father In law, Mother in Law, Brother in Law, Sister In Law

اورگھر میں.Wife is the Law

اور ہر شریف آدمی، چھوٹے یا بڑے، جج صاحبان، وکلاء صاحبان، گورنمنٹ کا تمام دھڑا Law پر عمل کرنے کا پابند ہے۔حس مزاح اور جمالیاتی حِس کی ترجمانی کرتے ہوئے میں نے Wife is the Law کی مختصر ترجمانی کردی ہے۔آپ چاہیں تو اس کو سنجیدگی سے لیں۔چاہیں تو ایک دل لبھانے والی شام یا فروغِ شام کے طور پر لیں۔ہمت اور جرأت آپ کی ہے اور ہاں اگر بہار صبح کے طور پر لیں گے تو ایک شگفتہ زندگی آپ کی منتظر ہوگی۔ ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے رُوپ میں عورت اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا انعام ہے۔ان کی قدر کرنا، ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا، ہمیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور پسندیدہ کرسکتا ہے۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دعا فرمایا کرتے تھے جو قرآن شریف کی سورۃ فرقان کے آخر میں شامل ہے۔

''اے ہمارے رب ہماری بیویوں اور بیٹیوں کو اور وہ بیٹی جو آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہوں کو دنیا بھر کے متقیوں کا امام بنادے''۔(آمین ثم آمین)

جہاں تک عورت کی آزادی کا سوال ہے اسلامی معاشرے میں عورت کی آزادی کا تعین روز اول سے ہی محبوب باری تعالیٰ نے فرمادیا تھا۔جیسا کہ بلوغت کے بعد جب عورت کسی مرد سے منسوب کردی جاتی ہے اور ذہنی، معاشرتی طور پر نکاح کے بعد اسکی زوجہ قرار پاتی ہے تو اس کی آزادی شروع ہوجاتی ہے۔یہودیت، عیسائیت اور خود پسند، تہمت پسند، تنگ نظر مسلمانوں نے عورت کو ہر لحاظ سے نہ صرف نقصان پہنچایا بلکہ اس کی آزادی، معاشرے میں اس کا کردار اور دیگر انسانی حقوق غصب کر لیئے۔یہ تنگ نظری کی بدترین مثال ہے۔

لکھاریوں اور شاعروں نے اپنے اپنے انداز میں پری وش کے چہروں پر اُداسی، غم و یاس، خوشی اور مستی کی کیفیت کو مختلف تشبیہات سے نوازا ہے۔مثال کے طور پر شوخِ حزیں، ماءلقا، زہرہ جبیں، پردہ نشیں، بہشتی خواب، جانِ حیا، آہنگ طرب، جذبہ نہاں، بربط کی صدا، مطرب کا بیاں اور بقول فوزیہ

چشمِ یار ہے اردو زبان گویا
میر و غالب کا جیسے دیوان گویا

پری وِش۔رشکِ حُور، رشکِ پری، رشک مہر ماہ کی مشق تو راقم الحروف سے بھی بہ وقت عالمِ فرقت میں سرزد ہوتی۔بقول فوزیہ:

میری اپنی زندگی داستاں در داستاں رہی ہے
قصے اوروں کے پڑھوں اب کہاں فرصت مجھے

دلربا دیکھے تو قیامت ہے اور نہ دیکھے تو قیامت ہے۔

یہاں پر میں نوجوان بیٹیوں اور بیٹوں کے لیے ایک طلاق نامہ کا متن پیش کر رہا ہوں۔صرف مثال کے طور پر کہ طلاق کی وجہ کیا ہوئی۔اس طلاق نامہ میں سے دلہا دلہن اور دونوں کے ماں باپ،شہر وجگہ کے نام بوجہ احترام حذف کر دیے گئے ہیں۔لڑکیاں خاص طور پر اس کو پڑھیں اور پلے سے باندھیں۔طلاق کوئی حل نہیں ہے۔شرمندہ شرمندہ دوسرے آدمی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔واسطہ پھر بھی مرد سے ہی پڑتا ہے۔پرانی چیز نئی چیز کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی؟ سوچیں، جھوٹی اور برابری کی اکڑفوں چھوڑیں، انٹرنیٹ، لیپ ٹاپ، موبائل فون، بہن بھائی، ماں باپ اور سہیلیوں نے گھر نہیں بسانا۔آپ کی عقل وفہم، رواداری، اخلاقی اور خاندانی وقار نے گھر بسانا ہے۔یہ کہہ دینا کوئی حقیقت اور سچائی نہیں رکھتا کہ ہم سید ہیں اور سب سے افضل ہیں۔پہلے سیّد ہونا تو ثابت کریں۔کیوں کہ سیّد کے معنی تو محترم کے ہیں جو عزت کے پیرائے میں معزز آدمی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔جیسا کہ سعودی عرب میں ہوتا ہے۔وہاں ہر حاجی سید ہوتا ہے۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لقب سید تھا۔جس سید یا سیدازم کی آپ بات کرتے ہو اس کے لئے رگوں میں حسنؓ یا حسینؓ کا خون ہونا لازمی ہے۔پہلے اپنا شجرہ ثابت کریں۔اس ضمن میں ایک لطیفہ عرض کرتا ہوں۔ایک آدمی اپنے ایک دوست کی تعریف میں رطب اللسّان تھا اور بار بار کہہ رہا تھا کہ میرا دوست بہت محنتی ہے اور 100% Self-made ہے، وہ اتنا Self-made ہے کہ سیّد بھی خود ہی بنا ہے۔طلاق نامہ کا متن پڑھیں۔

خُلع نامہ بحق

آپ کا اور میرا نکاح مورخہ..... بہ روز آپ کے اور میرے والدین، بہنوں، بھائیوں اور شہر کے معززین کی موجودگی میں ہوا۔آپ کی میرے ساتھ رخصتی مورخہ.....کو ہوئی۔ہم دونوں چند روز میں میرے والدین کے پاس رہائش پذیر رہے اور پھر ہم چلے گئے جہاں میں عارضی طور پر بہ سلسلہ ملازمت قیام کرتا رہا ہوں۔

آپ تمام رات انٹرنیٹ پر مصروف رہتی تھیں اور تمام دن خوابِ خرگوش کے مزے لیتی تھیں گھر گرہستی سے

بالکل بے بہرہ تھیں۔ نہ خاوند کی عزت کا خیال، نہ ہی اس کا احترام آپ پر واجب تھا۔ چند روز لاہور میں قیام کرنے کے بعد اچانک ایک روز مجھے بتائے بغیر آپ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ چلی گئیں جبکہ میں اپنی ملازمت پر گیا ہوا تھا۔ چند ہفتوں کی کوششوں کے بعد میرے والدین نے آپ کو سمجھا بجھا کر واپس بلوالیا۔ آپ تقریباً ایک ماہ تک میرے والدین کے گھر قیام پذیر رہیں۔ آخر کار آپ وہاں سے بھی میری اور میرے والدین کی اجازت کے بغیر اپنی مرضی سے چلی گئیں اور وہاں جا کر ایک درخواست بنام سیکرٹری یونین کونسل کے نام ارسال کر دی جس میں خُلع کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ زبانی کلامی آپ اور آپ کے والد محترم خُلع کا مطالبہ بہت مرتبہ کر چکے تھے۔

آپ کی درخواست کی روشنی میں میرے والد محترم نے میری رضامندی سے آپ کو مصالحت کی درخواست بھجوائی۔ اس کے جواب میں آپ نے سمعی، بصری اور تحریری طور پر صرف خُلع خُلع کی تکرار جاری رکھی ہوئی ہے اور میری مصالحت کی کوشش کو ہر لحاظ سے مسترد کر دیا ہے۔ آپ کی طرف سے مصالحت سے تحریری انکار کے رجسٹرڈ لیٹر کی کاپی ready reference کے لئے بطور Annexure-C اس خُلع نامہ کے ساتھ لف ہے۔

حرف آخر کے طور پر میں یہاں آپ کے رویوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ آپ کے ذہن میں کچھ ایسے خیالات ہر وقت کلبلاتے رہتے ہیں جو آپ کی سہیلیوں اور بہنوں کے، Propagated, generated, created اور perpetuated ہیں۔ آپ کا ذہن اس سے بُری طرح متاثر ہوا جس کے consequences آپ کے سامنے ہیں۔

میری آپ کو Advice ہے کہ اگر ممکن ہو سکے تو آئندہ زندگی میں نئے اور پرانے رشتوں کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہر لڑکی کی friendship ایک حد تک ہوتی ہے جو کہ اس کی شادی کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ بجز اس کے کہ ایک نئی شادی شدہ دلہن اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر 2/3 دن اپنی طلاق یافتہ سہیلیوں کے ہاں قیام کرے جو کہ ناقابلِ برداشت حد تک بے وقوفی ہے۔ شادی کے بعد سسرال کے ہاں دلہن کی سہیلیوں کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔

اندریں حالات و واقعات اور آپ کے حتمی انکار مصالحت کی روشنی میں میرے پاس اور کوئی Choice نہیں ہے بجز اس کہ میں آپ کو خُلع دے دوں۔

محترمہ آپ کو بے حد افسوس اور بے بسی کے ساتھ طلاق دیتا ہوں۔ آپ کو طلاق دیتا ہوں۔ آپ کو طلاق دیتا ہوں۔

آج کے بعد آپ اور آپ کا جسم میرے لئے حرام ہیں۔ آپ میری طرف سے آزاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ آمین!

نوٹ: یہ خُلع نامہ بمعہ تین6 (Annexures) صفحات پر مشتمل ہے اور ہر قسم کی قطع و برید سے پاک ہے۔

میری گورنمنٹ آف پاکستان سے مودبانہ درخواست ہے کہ پاکستان کے ہر شہر سے حلالہ سینٹر یا حلالہ کاروبار کرنے والے لوگوں کا محاسبہ کریں اور ان کے سینٹر بند کرائے جائیں جو معصوم اور بھولی بھالی خواتین کی عزتوں سے کھیلنے اور ان سے پیسے بٹورنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ سچے اور کھرے علماء حضرات سے مشورہ کریں اور سورۃ بقرہ۔ سورۃ النساء سورۃ طلاق آیت نمبرز 232 /242 /228 کا مطالعہ اور تفسیر پڑھ لیں۔ ان کمرشل مولویوں سے خواتین کو محفوظ فرمائیں۔

انسان ہونے کے ناطے پہلا قدم علم ہے۔ دوسرا قدم عمل ہے اور تیسرا قدم انسانیت ہے۔ بہروپیا ہونا عام ہے جس کی کوئی کمی نہیں۔ عالم فاضل اور باعمل ہونا ولایت ہے جو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی۔ دنیا کسی بھی وقت ایٹمی ایندھن کی بھٹی میں بھسم ہو سکتی ہے۔ سب سے زیادہ ایٹمی جنگ کا خطرہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کا پون صدی پرانا قبضہ ہے۔ جس کو نہ تو امریکہ، یورپی ممالک اور نہ ہی UNO حل کرانا چاہتے ہیں۔ سٹاک ہوم انسٹیٹیوٹ فار پیس کی 2021 کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کے 9 ممالک کے پاس 13000 ایٹمی وارڈ ہیڈز سے بھی زیادہ موجود ہیں جن کا 90% روس اور امریکہ کے پاس ہے۔ مزید تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

(1) روس 6255 وارڈ ہیڈز
(2) امریکہ 5550 وارڈ ہیڈز
(3) چین 350 وار ہیڈز
(4) فرانس 290 وار ہیڈز
(5) برطانیہ 225 وار ہیڈز
(6) پاکستان 165 وار ہیڈز
(7) بھارت 156 وار ہیڈز
(8) اسرائیل 90 وار ہیڈز
(9) شمالی کوریا 50 وار ہیڈز

مسائل کی شدت اور ملکوں کی طاقت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ دنیا میں کشمیر اور فلسطین ہی ایسے مسئلے ہیں جو پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔ ذرا سی بھی انڈین بدمعاشی کے بدلے میں دنیا کی نمبر 1 پاک فوج فوراً Retaliate کرے گی جس کا نتیجہ پوری دنیا کو بھگتنا ہوگا۔ بھارت ایک بڑا ملک ہے۔ یورپ، امریکہ، آسٹریلیا بزنس اور اس بہت بڑی منڈی کو انجوائے تو کر رہے ہیں۔ مگر دونوں ملکوں کے درمیان مسئلہ کشمیر حل نہ ہونے کی وجہ

سے یہ ممالک نتائج بھی بھگتیں گے۔ ان ملکوں کے عوام کو چاہئے کہ سڑکوں پر نکلیں۔ اپنی سرکار کو مجبور کریں کہ دنیا کے سُلگتے ہوئے مسائل کو حل کروا کر اپنے عوام کی زندگی کو محفوظ بنائیں ورنہ.....؟

بقول عدم:

ہم تمہیں اپنی خبر دیں بھی تو کیا سوچ کے دیں
ہم کو رہنا ہی نہیں تم کو خبر ہونے تک

اب نہ خود کو اُداس رکھیں گے
ان کی یادوں کو پاس رکھیں گے

غم کی شب جس قدر اندھیری ہو
صبحِ روشن کی آس رکھیں گے

ہم کو دریا ہی کیوں نہ مل جائے
پھر بھی تھوڑی سی پیاس رکھیں گے

جانے کیسے گزر گئے موسم
دل میں حسرت نہ یاس رکھیں گے

کیوں نہ اکبر یہ فیصلہ کر لیں
اب نہ غم کا لباس رکھیں گے

محمد اکبر خان اکبر، کوئٹہ

عجب مذاق روا ہے، یہاں نظام کے ساتھ
وہی یزید کے ساتھی، وہی امام کے ساتھ
یہ جھوٹ موٹ کے درویش پھر کہاں کھلتے
کہ میں شراب نہ رکھتا اگر طعام کے ساتھ